رشحاتِ عثمانی

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

حضرت مُفتی محفوظُ الرّحمن عُثمانی حفظہ اللہ

بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار الہند

خلیفہ ومجاز متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی

جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند

کے

مضامین ومقالات

رشحات عثمانی

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

(بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار الہند

خلیفہ ومجاز متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی

جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند)

کے

مضامین ومقالات

ناشر

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

تفصیلات

نام کتاب	:	رشحات عثمانی
تالیف	:	حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی
نظر ثانی	:	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی مدیر ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی
باہتمام	:	حافظ ظفر اقبال مدنی وفاتح اقبال مکی
صفحات	:	840
سن اشاعت	:	جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق فروری ۲۰۱۸ء
ناشر	:	جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند
قیمت	:	500

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
  K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
  Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
  Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
  9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، ارریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل:9891763977

انتساب

صاحب سیرت النبیؐ علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
صاحب النبی الخاتم رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی
صاحب اصح السّیر علامہ عبدالرؤف قادری داناپوری
صاحب عون المعبود علی سنن ابی داود علامہ شمس الحق عظیم آبادی
صاحب نبی رحمت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
اور صاحب خطبات بنگلور قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

رحمہم اللہ تعالیٰ
کے نام
منسوب کرتا ہوں
جن کے نقش قدم پر چلنے سے ہر کوئی دنیا و آخرت کی
منزل پا سکتا ہے

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

فہرست

مقدمہ:

مدبر اسلام مرشد الامہ حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

دو لفظ تہنیت کے:

عالم ربانی حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی
مدیر البعث الاسلامی و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اپنی بات:

مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی
بانی و مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار

باب اول — مقالات 23-351

قرآن کریم کا اعجاز اور اس کی حقیقت 25
ہندی زبان میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ 53
برصغیر ہند-پاک کے چند عظیم محدثین عظام کی حیات و خدمات 83

دینی مدارس ماضی، حال اور مستقبل، تقاضے، چیلنجز اور ان کا حل 177
بیسویں صدی کے علماء گجرات کی علمی ودینی خدمات 198
قرآن کریم کی تفہیم - اسلوب اور تقاضے 225
فن تجوید وقرأت میں گجرات کے دینی مدارس کا کردار 239
ہندوستان میں حج کا انتظام وانصرام 263
علامہ اقبال کی شاعری میں فکر وفن کا امتزاج 272
ایڈس اور اسلامی تعلیمات 287
امارت شرعیہ کی تعمیر وترقی میں حضرت مولانا سید نظام الدین کا کردار 297
حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور 'قبلہ نما' ایک تحقیقی جائزہ 317

باب دوم — مضامین 353-482

حیات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم 355
توہین رسالت ﷺ کی سزا 369
فضائل رمضان المبارک 373
رمضان المبارک اور اس کی عبادتیں 382
عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل واحکام 396
فتنۂ قادیانیت کو سمجھنے کی ضرورت 402
بابری مسجد کی شہادت وطن عزیز کی پیشانی پر بدنما داغ 410
تحریک دیوبند اور اس کے عالمی اثرات 415
مدارس اسلامیہ دین کی حفاظت اور بقا کے قلعے 424
آہ: شہید بابری مسجد 431
تعلیم وتدریس: چند اہم معروضات 436
مسلم دور حکمرانی اور عظمت پارینہ کی لازوال نشانی 448
حج اسلام کا ایک اہم اور مقدس فریضہ 455
مدارس اسلامیہ اسلام وانسانیت کی بقا کا ضامن 460
عیدالفطر: روزوں کی تکمیل پر اللہ کا انعام 477

باب سوم — اداریے 483-543

مسلم پرسنل لاء بورڈ: دین متین کا نگہبان 485
مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام: اصل کھیل کیا ہے؟ 489
قادیانیوں کو ایک اور بڑی ناکامی 492
قادیانیوں کی شرانگیزی اور ہماری بے حسی 495
اپنے کعبہ کی حفاظت..... 499
روشن خیالی - ایک ناسور 505
یہ بانگ درا فرزانوں کی! 508
عالمی سازش کے نرغے میں مسلمان! 516
عیدالاضحیٰ: سب سے محبوب عمل 519
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا 526
ملک وملت کی تعمیر میں مدارس کا کردار 531
جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن 537

باب چہارم 545-630

جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سرخیل علماء 547

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا سانحۂ ارتحال 560

محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ 564

شیخ الادب مولانا اطہر حسینؒ 571

شہنشاہ زبان وقلم حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ 574

فخر المحدثین حضرت علامہ محمد اکرام علیؒ 580

حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ 584

عارف باللہ، عالم ربانی حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ 589

حاجی عبدالرزاق کالسیکر: کچھ یادیں کچھ باتیں 602

حضرت مولانا سید شاہ شوکت علی عبدالغفور نظیرؒ 606

ٹیپو سلطان: ایک مرد مومن ایک مرد مجاہد 611

میرے استاد اور میرے شیخ، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ 617

حضرت الاستاد مولانا محمد اسلم قاسمی رمزیؒ 625

باب پنجم — تعارف و تبصرہ 631-760

رہبر انسانیت ﷺ 633

خطبات بہاول پور 636

عکس احمد 642

حیات طیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند 646

۴۸ رسال شفقتوں کے سائے میں 650

سوانح حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسنؒ 657

خطبات حرم 662

فتاویٰ ندوۃ العلماء 666

فتاوی بسم اللہ 670

فقہ اسلامی کا درخشاں باب۔ فتاویٰ دینیہ 674

محمود الفتاویٰ 682

صحبتے با اہل دل 688

حدیث کے اصلاحی مضامین 694

اسلامی قانون نکاح وطلاق 705

برطانیہ واعلیٰ عروض البلاد پر اوقات صبح صادق وشفق کی تحقیق 707

تالیفات مرغوب 709

فقہ السنہ 711

گجرات کی علمی وادبی شخصیات 716

تذکرۂ قاریان گجرات 721

صدائے دل 726

افکار پریشاں 731

بکھرے موتی 734

دار المصنفین کے سو سال 738

نقوش بزرگاں	742
احکام رمضان المبارک	745
ریاض الصالحین	749
تجلیات قدسیہ	753
اسعاد القاری	757

باب ششم — **خطبات** 761-839

پیام انسانیت کنونشن	763
بین الاقوامی سمینار و رسم اجراء ''متاع زندگی''	780
مسابقۃ القرآن الکریم و تعلیمی بیداری کنونشن	793
بدیع الزماں سعید النورسی کے نقطۂ نظر کے تناظر میں اسلام اور جدیدیت	805
تیرہواں کل ہند مسابقۃ القرآن الکریم	810
انٹرنیشنل سیمینار امیر شریعت سادس و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ	828

مقدمہ

الحمد لله و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد۔

انسان کی تعلیم وتربیت اور رہنمائی کا کام علماء کی بڑی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری جہاں علم کی نسبت سے عائد ہوتی ہے وہیں امت محمدیہ (علی صاحبھا الف الف صلوٰہ وسلام) کے ایک فرد کی حیثیت سے بھی ہر امتی پر عائد ہوتی ہے۔اوراس طریقہ سے یہ ذمہ داری علماء پر دوحیثیت ہوجاتی ہے اور الحمد للہ ہمارے مدارس اسلامیہ کے فضلاء اور علماء دعوت وتعلیم کا کام ہر جگہ انجام دے رہے ہیں۔ قیام مدارس ومکاتب کے ذریعہ دعوتی دوروں کے ذریعہ اور دینی رسالوں، مجلّات اور تصنیف وتحقیق کے ذریعہ بھی یہ خدمت کی جارہی ہے۔انہی باتوفیق فضلاء مدارس میں مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب بھی ہیں جو جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار اور ماہنامہ ''معارف قاسم'' کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت کا کام کررہے ہیں۔ وہ اپنے خطبات اور تحریروں کے ذریعہ ایک معروف عالم دین ہیں، ان کا پیش نظر مجموعۂ تحریر ''رشحات عثمانی'' ایک مفید کتاب کی صورت میں سامنے آرہا ہے، ان کے دیگر کاموں کی قدر کے ساتھ اس کی مجھے قدر ہے، اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت عطا فرمائے اور اپنی رضا کا ذریعہ بنائے آمین۔

۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ
یکم؍جنوری ۲۰۱۸ء

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دو لفظ تہنیت کے

اہل علم وقلم نے اپنے افکار وخیالات مرتب کر کے مقالات کی شکل میں حلقہ ہائے علم وادب اور امت کے افراد کے لئے ایک گرانقدر تحفے کی شکل میں پیش کرنے کی سنت ایجاد کی ہے۔ ماضی قریب میں علماء وادباء نے مقالات نویسی کو ایک فن کی حیثیت دے کر کتابی شکل میں اسلامی کتب خانہ کو زینت بخشی ہے، اور اس کے ذریعہ علم وعمل کی دنیا میں معلومات افزا اضافہ کیا ہے، یہ ایک تربیتی انقلابی قدم ہے، اور تاریخی حیثیت سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس عمل کو ایک تربیتی مدرسہ سے تعبیر کروں، اور اس کے تلامیذ باصفا کو دعوت اسلامی اور فکر دینی کے نمائندہ قرار دینے کی جرأت کے لئے آپ سے اجازت طلب کروں۔ اس مدرسہ کے بانیوں، اس کے سرپرستوں اور اس کی تعمیر میں حصہ لینے والوں کا تذکرہ کسی ایک مقالہ یا کتاب میں نہیں کیا جا سکتا، یہ عمل خود ایک عظیم علمی مشغولیت کا متقاضی ہے، اور پوری ایک جماعت کی محنت و جانفشانی کا طالب ہے، بلکہ قدیم علمی اور تاریخی، ادبی اور دینی مقالات کے مجموعے دور حاضر کے محققین اور عصری اسلوب میں موجودہ وسائل وآلات سے کام لینے والے ماہرین سے ان کی افادیت میں کئی گنا اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس نوعیت کے کام کی ابتداء ہو چکی ہے، اور نئے تحقیقی ذرائع سے اس کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش جاری ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ کے بانی ومہتمم حضرت مفتی مولانا محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے اپنے بیش قیمت مقالات کا مجموعہ افادۂ عام کی غرض سے شائع کرنے کا ارادہ فرمایا ہے، یہ مقالات ومضامین مختلف النوع موضوعات پر

مختلف مناسبات ومواقع پر تحریر کئے گئے ہیں، اور ہر اعتبار سے مفید اور معلومات افزا ہیں، اب یہ کتابی شکل میں موضوع کے اعتبار سے چھ ابواب پر مشتمل ہیں۔

باب اول مقالات کے عنوان سے، باب دوم مضامین کے نام سے اور باب سوم ان افتتاحیات واداریوں پر مشتمل ہے، جو مختلف اوقات میں اپنے موقر مجلّہ ''معارف قاسم'' میں شائع ہوئے ہیں، اور باب چہارم میں اہل علم ودین اور اصحاب فکر وادب کا تذکرہ اور ان کی سوانح کی تفصیلات موجود ہیں، اور جس کا عنوان ہے: جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن

باب پنجم میں مختلف کتابوں پر جو علمائے دین کے تراجم وسوانح پر مبنی ہیں، ان کا تعارف وتبصرہ موجود ہے۔ اور باب ششم ان خطبات سے مزین ہے، جو وقتاً فوقتاً تقریروں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عثمانی مدظلہ نے موجودہ علمائے اسلام کی صف میں سب سے زیادہ مختلف عالمی، یورپین اور ایشیائی ممالک کے سفر کئے ہیں اور بحمد اللہ اس کا سلسلہ جاری ہے، اس لئے ان کے مشاہدات وتجربات بھی بہت کثیر العدد اور عام معلومات میں انتہائی اضافہ پر متضمن ہیں۔

خیال ہے کہ یہ کتاب سیر وسوانح اور حالات واسفار کے موضوع پر بہت کارآمد ثابت ہوگی، اور اسلامی تاریخی کتب خانہ میں اس سے خاطر خواہ اضافہ ہو سکے گا، اور توفیق عمل کا نمونہ ثابت ہو کر حوصلہ افزائی کا باعث بن سکے گی۔ اللہ تعالیٰ اس مخلصانہ کاوش کو قبول فرمائیں اور یہ ایک دینی خدمت کا ذریعہ ثابت ہو (آمین)

راقم

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۶ رذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

۹ رستمبر ۲۰۱۶ء

اپنی بات

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام علىٰ سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، و علىٰ آله و صحبه الغر الميامين، و من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، ''مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً''، قال النبی ﷺ: اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّنَ لا نَبِيَّ بَعْدِىْ. أما بعد :

بنی نوع انسان کی پیدائش کا واحد مقصد خالق کائنات کی عبادت کرنا اور سیدھے راستہ پر چلتے رہنا ہے۔(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) (الذاریات:56)

''میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔''

آیت مقدسہ کی روشنی میں یہ بات مستحکم ہوگئی کہ اللہ رب کریم نے آسمان وزمین کی تخلیق بلا وجہ نہیں فرمائی ہے، بلکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ان میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا کسی کو بھی عبادت میں

شریک نہ کیا جائے۔اللہ پاک کا یہ حکم کتنا عظیم اور بالا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے روز اول سے ہی حضرات انبیاء کرام اور اپنے نیک بندوں کو اس فانی دنیا میں بھیجا اور ان کے توسط سے لوگوں کو اپنی بندگی اور اطاعت کا پیغام دیا۔چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبی محمد رسول اللہ ﷺ تک جتنے بھی نبی اور رسول اس دنیا میں تشریف لائے ان کی بعثت کا جو مقصد عظیم تھا (یعنی ایک اللہ کی عبادت کرنا، اس میں کسی کو شریک نہ کرنا اور اس کے بتائے ہوئے احکام پر چلنا اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اجتناب کرنا۔) انہوں نے اس فرمان کو اللہ کے بندوں تک پہنچا دیا۔

گویا کہ جس دین کا آغاز سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور جس کی تبلیغ کے لئے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور رسول آئے، اس کی تکمیل رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ہوئی اور قیامت تک انسانوں کو اللہ رب العزت کی طرف سے یہ خوش خبری سنادی گئی کہ:

(الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيناً)(المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کر لیا۔''

تکمیل دین کے ساتھ ہی ختم نبوت کا بھی اعلان ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بھی نسل انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک رہنما اور نمونہ قرار پائی۔

آپؐ کو اللہ تعالی نے رحمۃ اللعالمین وسالکین اور ساری مخلوق کے لئے حجت بنا کر مبعوث کیا اور اپنے بندوں پر آپ کی محبت، اطاعت واتباع کو فرض قرار دیا۔نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا، اس راہ میں

آپ کو جن آزمائشوں اور مصائب سے گزرنا پڑا انہیں برداشت کیا، لیکن اپنے امتی تک احکام الٰہی کو پہنچا دیا اور آخر میں حجۃ الوداع کے موقع پر جس میں بڑی تعداد میں اصحاب رسول موجود تھے فرمایا کہ:

لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی امت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو، سال بھر میں ایک مہینہ رمضان المبارک کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج بجالاؤ۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔

اس جامع خطبہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لوگو! قیامت کے دن خدا میری نسبت پوچھے گا تو کیا جواب دوگے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کردیا‘‘۔ آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور فرمایا۔ ’’اے خدا تو گواہ رہنا‘‘۔ ’’اے خدا تو گواہ رہنا‘ اے خدا تو گواہ رہنا اور اس کے بعد آپ نے ہدایت فرمائی کہ جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو یہ باتیں پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔‘‘

یہی وہ اہم ذمہ داری ہے جس سے یہ امت کبھی بیزار نہیں ہوئی اور آج بھی امت محمدیہ کی برگزیدہ شخصیات ’’امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘‘ کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہیں۔ امت محمدیہؐ کے علماء، صلحاء مبلغین لوگوں کی اصلاح اور پیغام خداوندی کو آنے والی نسلوں تک کبھی دعوت وتبلیغ کے توسط سے تو کبھی اپنی تقریر و تحریر اور کبھی تزکیہ و احسان کے ذریعہ سے پہنچاتے رہے اور انہیں مقصد حیات سے آگاہ فرماتے رہے۔

تعلیمات نبویؐ کی ہی یہ کرامت ہے کہ علماء امت نے نہ صرف اپنے گاؤں، اپنے علاقے، اپنی ریاست اور اپنے ملک میں، بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انہیں موقع میسر آیا امر

بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو بخوبی انجام دیا۔

آج دنیا کے جس کونے میں بھی دین واسلام کی قندیلیں روشن ہیں، تو بلاشبہ اس میں اصحاب رسولؐ کے بعد علماء ربانی اور بزرگان دین کی محنت اور ان کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ برصغیر ہند۔ پاک میں ہمارے جتنے متقدمین ومتاخرین علماء گزرے ہیں ان کی زیست کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، مجاہد فی سبیل مولانا مظہر نانوتوی، عبقری الدھر مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور، محدث جلیل مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، صاحب بذل المجہود مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری، شیخ طریقت مولانا سید محمد علی مونگیری، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، محسن قوم سر سید احمد خان، مورخ اسلام علامہ شبلی نعمانی، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، رئیس القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی، ج مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی، داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری، مفتی اعظم مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، مفتی گجرات مفتی عبدالرحیم لاجپوری، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہم اللہ اجمعین نے اپنی جملہ مصروفیات، مہمات کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے وعظ، اپنی تقریر، پند و نصیحت اور تحریروں کے توسط سے اصلاح امت کا فریضہ انجام دیا۔ ’رشحات عثمانی‘ کو اسی سلسلہ کی ایک حقیر کوشش سمجھا جائے۔

وہ جو چاہے تو کیا نہیں ممکن
وہ نہ چاہے تو کیا کرے کوئی

اسی اہم مقصد کے لیے کبھی کبھار کچھ لکھ لیا، تاکہ اصلاح معاشرہ کے ’نامہ

اعمال' میں بندۂ عاصی کا نام بھی شامل ہو جائے، مگر ان نگارشات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا خیال کبھی من میں نہیں آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنی تحریروں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کتاب کی زینت بنیں، دوسری طرف دوستوں کا اسرار تھا جو کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ان کی دلیل بھی صد فیصد صحیح تھی کہ اب نسل نو کے مشاغل بدل چکے ہیں موبائل فون، سوشل میڈیا اور ٹی وی نے ان سے صرف مطالعے کی عادت ہی نہیں چھینی، بلکہ غور وفکر کی صلاحیت بھی ناپید کردی ہے جس کی بنا پر عصر حاضر میں ایک بڑی تعداد کو نہ زندگی کا مقصد معلوم ہوتا ہے نہ حقیقی منزل کا پتہ۔ ان کے خالی ذہن صرف ان لوگوں کو ہیرو اور آئیڈل سمجھتے ہیں اور ان سراب کو حقیقت سمجھتے ہیں جو آج کا میڈیا انھیں پیش کررہا ہے۔ اس لئے ایسے نوجوانوں کی اصلاح اور رہنمائی کیلئے ایسی کتابوں کی اشاعت ناگزیر ہے۔

چونکہ اس وقت پوری دنیا میں ظلم وستم، قتل وغارت کے شعلے ہر طرف بھڑک رہے ہیں اور انسانیت ظلم کی چکی میں پس رہی ہے اس کا علاج صرف اور صرف اسلام کی سیدھی سادی، سچی اور پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے۔ اس پرفتن عہد میں ہم دین اسلام کی سچی تعلیمات پر خلوص دل کے ساتھ عمل پیرا ہو کر ہی زندگی کی حقیقی خوشیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

امت کے موجودہ حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اپنے مقام ومنصب اور ذمہ داری کا ادراک کر کے اصلاح معاشرہ کیلئے کمربستہ ہو جائیں اور امت کے احوال کا مطالعہ کر کے حکمت عملی سے دعوت کا فریضہ انجام دیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اب تو اس عمل کی تکمیل علماء امت ہی کو کرنی ہے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''میری امت کے علماء انبیاء کے وارث ہیں''

رشحات عثمانی کے تعلق سے احباب کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اس طرح سے منتشر چیزیں اکٹھی ہو جائیں گی اور مستقبل میں اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا۔

مجھے ان حضرات کا مشورہ اس لئے اچھا لگا کہ اللہ کے پیارے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص سے کچھ دریافت کیا گیا جس کو وہ جانتا ہے اور اس نے اس کو چھپایا تو روزِ قیامت اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (ترمذی، کتاب العلم)

اس وعید سے بچنے کا یہ طریقہ سب سے اچھا ہے، حالانکہ جدید ٹیکنالوجی کے زمانے میں فی الوقت اپنی چیزوں کو محفوظ کرنے کے بے شمار ذرائع موجود ہیں جن کا استعمال اہل علم و دانش کر رہے ہیں، تاہم کسی بھی قیمتی مواد کو محفوظ کرنے کی سب سے بہترین شکل اسے مرتب کر کے چھپوا دینا ہے، اور یہی طریقہ زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ اہل علم کے اسی نقش قدم پر چلتے ہوئے 'رشحات عثمانی' کی اشاعت کے خیال اور دوستوں کے اسرار کو مضبوطی ملی اور الحمدللہ اب یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

رشحات عثمانی کو کل چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا اور ہر باب کی مناسبت سے مضامین اور مقالے کو مزین کیا گیا ہے، اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ترتیب کا حسن اور اس کی دلکشی برقرار رہے تاکہ قارئین کرام کو کسی قسم کی بوریت کا احساس نہ ہو، بلکہ از اول تا آخر ان کی دلچسپی برقرار رہے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ متکلم اسلام حضرت اقدس مولانا محمد سالم قاسمی، مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، عالم ربانی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، شیخ زکریا کے علوم ومعارف کے ترجمان حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، خادم القرآن والسنہ حضرت مولانا غلام محمد وستانوی، معروف اسلامک اسکالر پروفیسر اختر الواسع، محسن ملت قاری محمد اسماعیل بسم اللہ ڈابھیلی، والدین، اساتذہ کرام، مخلصین ومحبین اور معاونین جن کی شفقتیں، محبتیں اور دعائیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں

،آج میں جو کچھ بھی ہوں یا جو کچھ مجھے رب کائنات نے عطا کیا یہ سب ان ہی حضرات کی کرم فرمائی اوران کی جوتیاں سیدھی کرنے کے طفیل ہے۔ یہ وہ عظیم المرتبت شخصیات ہیں جن کا میری زندگی میں اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ہے،اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کا سایہ عاطفت ہمارے اوپر دیر تک قائم و دائم رکھے۔(آمین) میرے قلب میں ان برگزیدہ ہستیوں کا جو مقام ومرتبہ ہے اس احسا س کوظاہر کرنے سے میں قاصر ہوں،بقول شاعر:

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

آخر میں جب کہ رشحات عثمانی کی طباعت کے سبھی مراحل طے ہو چکے ہیں تو میں سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکر گزار ہوں جس کی توفیق وعنایت سے یہ بڑا کام انجام پذیر ہوا۔اللہ پاک اس حقیر کاوش کو آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے ،کیوں کہ دنیا تو جیسے تیسے گذر جائے گی اصل مسئلہ تو آخرت کا سنورنا ہے،جب حق جل مجدہٗ یہ کہہ دیں کہ یہ بندہ دنیا سے خفا میرے لئے ہے،اور محسن انسانیت آقا صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں کہ یہ غلام وامتی میرا ہے اور بس آخری آرزو صرف یہ ہو کہ:

تہہ دست ہیں مگر نسبت ہے ان سے،خدایا حشر ہوئے ساتھ ان کے

اے اللہ! ہم کسی کی عبادت نہیں کرتے ،نہ بتوں کو پوجتے ہیں نہ پتھروں کو پوجتے ہیں،نہ درختوں کو پوجتے ہیں،نہ سورج اور چاند کو پوجتے ہیں،نہ آسمان وزمین کو پوجتے ہیں، اے اللہ! ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں،ہمارا سر صرف آپ کے لئے خاص ہے، ہم کہیں اپنا سر نہیں رکھ سکتے مگر آپ کی چوکھٹ پر۔

ہمارا مرکزِ اُمیدِ رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یارب یہ پیشانی نہیں جاتی

اے اللہ! آپ قیامت تک میری اولاد میں ایسے علماء ربانی پیدا فرمائیے جو آپ کے دیئے ہوئے دین کے باغ کو پانی دیں اور اس کو ہرا بھرا رکھیں، ہمارے مدارس اسلامیہ،مساجد،خانقاہیں اور مکاتب قرآن کریم کو قائم رکھیں، تاکہ یہ کارنبوت آپ کے سچے نائبین ووارثین کے ذریعہ قیامت تک جاری رہے۔آمین

اس موقع پر میں ممنون ہوں مخلص گرامی قدر ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب دہلی کا جو اس مشکل ترین کام کو آسان بنانے میں شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے۔بیشتر مضامین کو پڑھا اور انہیں حسن ترتیب سے آراستہ کرنے میں ہمارا ہر ممکن دست تعاون کیا،اللہ پاک ان کو بہترین بدلہ دے اور اسی طرح دین کی خدمت لیتا رہے۔

میں اپنے رفقاء وبزرگوں میں حضرت مولانا حکیم محمد عثمان قاسمی مدنی مسجد نبوی شریف مدینہ منورہ،حضرت مولانا قاری عبدالحمید ندوی امام وخطیب مسجد سلام دبئی الامارت العربیہ المتحدہ،حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند(وقف)،مولانا محمد زکریا اسماعیل راوت چیئرمین التربیہ اسلامک اکیڈمی پناما،حضرت مولانا مفتی وسیم خان شیخ الحدیث وپرنسپل دارالعلوم ترنیداد وتباغو ویسٹ انڈیز،حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی چیئرمین شرعیہ کونسل یوکے،مفتی عبدالرحیم دیوان لاجپوری چیئرمین ریڈیو سیرۃ لیسٹر یوکے،حضرت مولانا علی انور قاسمی چیئرمین الحسنات فاؤنڈیشن لندن یوکے،مفتی احمد نادر القاسمی،ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی،مولانا رضوان الحق قاسمی،ڈاکٹر خالد اعظمی سیکریٹری لجنہ بشائر الخیر کویت،شاہ جہاں شاد اور مصعب انیس وغیرہم کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ان کے علاوہ ہمارے وہ احباب اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے بہی خواہان ودیگر حضرات جو خیر امت کا فریضہ ادا کرتے ہیں وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور دعاؤں میں یاد رکھا۔اللہ ان تمام

حضرات کو جزائے خیر دے اور اس حقیر سی کاوش کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور پڑھنے والوں کیلئے مفید و مؤثر بنائے۔ آمین، والحمد للہ رب العالمین۔

آخر میں اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

یہ چراغ جیسے لمحے کہیں رائیگاں نہ جائیں
کوئی خواب دیکھ ڈالو کوئی انقلاب لاؤ

وباللہ التوفیق واللہ المستعان

محتاج دعا

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

بانی و مہتمم : جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ، سپول بہار
سکریٹری جنرل : امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
سجادہ نشیں : خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سپول بہار
خلیفہ و مجاز : متکلم اسلام حضرت اقدس مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی
جانشین : حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند

۱۷ر جمادی اول ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۵ر فروری ۲۰۱۷ء
بروز بدھ بوقت صبح دس بجے

باب اول

مقالات

24

قرآن کریم کا اعجاز اور اس کی حقیقت

زیر اہتمام	:	عالمی رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ
بمقام	:	مدرسہ عین المعارف کنّور کالی کٹ (کیرالہ)
سنہ	:	۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء

الحمد للّٰہ الذی خلق الانسان وعلمه البیان وانزل القرآن والصلوٰۃ والسلام علٰی محمدالکرام وعلیٰ آله واصحابه الابرار. اجمعین امابعد!

قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر نقد ونظر کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوسکتی اس لئے کہ یہ کلام جس مقدس ذات کا ہے انسان اس کی پیدا کردہ ایک مخلوق ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود انسان اس احسن الکلام کی تفسیر وتوجیہ اور تنقیح وتوضیح کا بھرپور حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ قرآن پاک کی ہر آیت کا ہر لفظ اپنے اندر جامع مفاہیم رکھتا ہے۔ قرآن کریم کا سب سے بڑا اعجاز بیانی یہ ہے کہ اسے کسی خاص زمانہ، خاص وقت اور

کسی خاص قوم وملک سے باندھ کرنہیں دیکھا جاسکتا۔اس کے اعجاز بیانی کی وسعت وہمہ گیری انسان کی تمام ترعلمی صلاحیتوں کے احاطہ میں نہیں سماسکتی۔اس لئے تمام بڑے اور جیدعلماء تفسیر وترجمہ نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اورلیاقتوں کو بروئے کارلانے اور بہتر سے بہتر ترجمہ وتفاسیر کردینے کے باوجود خودکو عاجز وکمزور پایا اوراعتراف کیا کہ قرآن کا اعجاز بیانی علوم کا وہ بحر بیکراں ہے جس کی غوطہ خوری انسان کے بس کی بات نہیں۔ایسے موضوع پر کچھ لکھنا مجھ جیسے کم علم کے بس میں بھی نہیں۔تاہم یہ سوچ کر کہ سعادت نصیب ہوجائے اور کم ازکم کوشش کا ثواب بھی مل جائے، میں نے اپنی کم مائیگی کو سامنے لاتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علوم قرآن کے تمام مباحث پر قرن اول سے اب تک ہر پہلو اور ہر زاویہ سے بحث کی جاتی رہی ہے،لیکن پھر بھی ان کا حق ادا نہ ہوسکا اور اب بھی وہ تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔دوسرے مباحث کی طرح اعجاز قرآن کا موضوع بھی ابتداہی سے زیر بحث رہا ہے۔قرآن کریم کن معنوں میں معجزہ ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کی وجہ سے ادب،فصاحت وبلاغت اور بدیع وبیان کے نام سے مستقل فن کی بنیاد پڑی۔اس فن کے بارے میں بجا طور پرکہا جاسکتا ہے کہ یہ خالصاً اسلامی ہے اور جذبۂ خدمت قرآن کا پروردہ ہے۔

زملکانی، سکاکی، جرجانی، رازی اور جاحظ جیسے ائمۂ ادب نے اسے اس لائق ٹھہرایا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم قرآن کریم کی عظمت، اعجاز بیانی اورادبی پیرائے کا اندازہ کرسکتے ہیں،قرآن کریم میں اعجاز بیانی کے کون کون سے پہلو خصوصیت کے حامل ہیں اس سلسلے میں ادب ولسانیات کے اداشناسوں نے مختلف موقف اختیار کیے ہیں۔

قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اس کی حقانیت کی واضح دلیل اس کا اعجاز ہے۔ یعنی ایک ایسا کلام جس کی نظیر پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے،اسی وجہ سے اس کو سرور

کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے۔

پہلے بنیادی طور پر دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہے۔ایک تو یہ کہ فصاحت وبلاغت اور کلام کی سحرانگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے اور پوری حقیقت وماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔آپ تلاش وجستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت وبلاغت کے اصول وقواعد مقرر فرماسکتے ہیں لیکن درحقیقت ان اصول وقواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی۔کسی کلام کے حسن وقبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کرتا ہے۔جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح کسی کلام کی فصاحت وبلاغت کو بیان کردینا ممکن ہے لیکن جب کوئی صاحب ذوق انسان اسے سنے گا تو اس کے محاسن ومعائب کا خودبخود پتہ چل جائے گا۔دوسرے یہ کہ فصاحت وبلاغت کے معاملہ میں ذوق بھی صرف اہل زبان کا معتبر ہے کوئی شخص کسی غیرزبان میں خواہ کتنی مہارت حاصل کرلے لیکن ذوق سلیم کے معاملہ میں وہ اہل زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہوسکتا ہے۔

اب ذرا زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب کا تصور کیجئے۔خطابت وشاعری ان کے معاشرہ کی روح رواں تھی۔عربی شعروادب کا فطری ذوق ان کے بچے بچے میں سمایا ہوا تھا۔ فصاحت وبلاغت ان کی رگوں میں خون حیات بن کر دوڑتی تھی۔ان کی مجلسوں کی رونق، ان کے میلوں کی رنگینی، ان کے فخر وناز کا سرمایہ اور ان کی نشرواشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعروادب تھا اور انہیں اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام اقوام کو ’’عجم‘‘(گونگا) کہا کرتے تھے۔

ایسے ماحول میں ایک امی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلام پیش کیا جو حکیمانہ چیلنج اور اعجاز ہے۔

اول تو قرآن مجید سورۂ طور میں ان کو چیلنج کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ، فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ. سورۂ طور آیت 34-33 (کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے دراصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، اچھا اگر یہ اپنے قول میں سچے ہیں تو اسی جیسی شان کا کلام بنالائیں)

پھر قرآن نے سورۂ ہود میں چیلنج کیا:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰهُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ.

2۔ سورۂ ہود آیت 13 (کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے! کہو اچھا یہ بات ہے تو تم اسی جیسی صرف دس سورتیں تصنیف کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا تم اور جو بھی تمہارے معبود ہیں ان کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ اگر تم سچے ہو) اسی طرح رفتہ رفتہ صرف ایک سورت لانے کا مطالبہ کیا اور چیلنج میں شدت وقوت پیدا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰهُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ.

1۔ سورۂ یونس آیت 38 (کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہو کہ اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو ایک سورت ہی اس کی جیسی (شان وعظمت والی) تصنیف کر لاؤ، ایک اللہ کے سوا تم اپنی مدد کے لئے جس جس کو بلا سکتے ہو بلاؤ) یہ سب کچھ مکی زندگی میں ہوا حالانکہ اس وقت بھی ان کی فصاحت وبلاغت کے ڈنکے بج رہے تھے، لیکن قرآن حکیم سے معارضت یا مقابلے کی جنگ میں عاجز ہو کر گویا

زبان وبیان کے شہسوار گونگے ہو گئے تھے۔

قرآن مجید کا ہر چیلنج علم وخرد اور دلوں پر حاوی ہوتا جارہا تھا لیکن ان کی انانیت مجروح ہو رہی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ وہ حق جان کر ماننا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی ان کی ضد اور ہٹ دھرمی بلکہ ان کی جاہلانہ عصبیت اجازت دیتی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق اور قرآن مجید کو کتاب الٰہی مان کر گھٹنے ٹیک دیں۔ ورنہ لغت کے اعتبار سے یہ ان کی جہالت نہیں بلکہ جیسا کہ تاریخ ادب عربی کے مؤلف ڈاکٹر عمر فروخ نے کلمۂ جاہلیت کی تعریف میں لکھا ہے۔

الجهل ضد الحلم تھا، **الجهل ضد العلم** نہیں۔ یعنی علم کے خلاف نہیں بلکہ عقل ودانش اور حق پرستی کے خلاف تھی اس لئے وہ قرآن کے زوردار حملوں سے گھبرا کر آپس میں ایک دوسرے سے کہتے

لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِیۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ.

2 سورۂ فصلت 26 (اس قرآن کریم کو سنو ہی نہیں بلکہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سنائیں تو ایسا شور مچاؤ کہ قرآن مجید سنائی نہ دے شاید اسی طرح تم غالب آجاؤ۔) اس چیلنج کی تجدید مدنی دور میں ہوئی، سورۂ بقرہ میں ان کو توحید کی دعوت دی گئی اور یہی ان کی دکھتی رگ تھی۔ ارشاد ہوا:

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ. 1 سورۂ بقرہ آیت 24-23 (اگر تمہیں اس قرآن پر شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس جیسی عظمت والی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ اگر تم سچے ہو تو یہ کر کے دکھا دو اگر تم یہ نہ

کر سکے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تم ہرگز ایسا کر ہی نہیں سکتے تو پھر اس جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے تیاری کرلو جس کا ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے) اس خوفناک انداز میں جو دھمکی دی گئی وہ محض وقتی نہیں تھی بلکہ آئندہ بھی وہ اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے تھے اور حقیقت اب ان پر روشن ہوگئی تھی۔

منکرین قرآن پر اعجاز قرآن کے ثبوت میں یہ قول حق بھی ثابت ہوگیا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَایَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا .

سورۃ الاسراء آیت 88 (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اس قرآن عظیم جیسی کوئی کتاب تیار کرلیں تو وہ کبھی ایسی کتاب نہ پیش کرسکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔)

وجوہ اعجاز قرآنی

یعنی وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ میں مختصراً ان وجوہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اعجاز قرآنی کی پہلی وجہ

اولاً غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کس جگہ، کس ماحول میں اور کس پر نازل ہوئی؟ کیا وہاں ایسے علمی ماحول کا وجود تھا جس کے ذریعہ ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہوسکے، جو علوم اولین و آخرین کی جامع اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کرسکے۔

جس سرزمین پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں، جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں دور تک نہ کہیں بستی نظر آتی ہے، نہ کوئی کھیت نہ درخت۔ جس میں کسی قسم کے علم و تعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے نہ کوئی یونیورسٹی یا دار العلوم، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو اللہ نے پیدائشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دے دیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہاں کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ایسے فصیح و بلیغ اشعار کہتی ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جاتے ہیں۔

لیکن یہ سب ان کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جاتا۔ الحاصل نہ وہاں تعلیم و تعلم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو ان چیزوں سے لگاؤ ہے۔ اسی مکہ شہر میں ایک شریف گھرانے میں وہ ذات مقدس پیدا ہوئی جو مہبط وحی ہے، اب اس ذات مقدس کا حال سنئے۔

پیدا ہونے سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آباء و اجداد نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا جس سے یتیم کی پرورش کا سامان ہوسکے اور عمر کا ابتدائی حصہ گزار سکے جو تعلیم و تعلم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں کوئی دار العلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا۔ الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی تعلیم و تعلم سے بے خبر رہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکیں، جن کا قرآن حامل ہے۔ یہ امی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، ٹھیک چالیس سال کے بعد ان کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام قرآن ہے اور لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے محیر العقول ہے، تو پھر اس کے معجزہ ہونے میں کسی

انصاف پسند کو کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے نظیر بھی نہ ہوتی جب بھی ایک امی محض کی زبان سے اس کا ظہور اعجاز قرآنی کی وجوہ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجاز قرآنی کی دوسری وجہ:

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں اور عربوں نے اپنی خاص مجلسوں میں قرآن کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا اور جو ان میں منصف مزاج تھے انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا۔ قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:

”اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے اور تم سب ان کے عادات واخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سنے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل ان سے مختلف ہیں اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور ان کے کلام سنے ہیں، ان کو ان سے کوئی مناسبت نہیں اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر و شاعری کے تمام فنون کو سیکھا ہے اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سنی ہے، ان کے مختلف کلام سنے ہیں،

یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں۔“[1] (خصائص کبریٰ ص 144 ج 1۔)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت اختیار کیا، بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہوتی، یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔

اعجاز قرآنی کی تیسری وجہ:

قرآن کریم میں غیب کی اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم وفارس کے مقابلہ میں ابتداءً اہل فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گزرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبرؓ سے ہار جیت کی شرط کر لی اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیوں کہ وہ ایک قسم کا جوا تھا، اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہوگئی۔ (معارف القرآن ص 97 ج 1)

اعجاز قرآنی کی چوتھی وجہ:

قرآن عظیم میں پچھلی امتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف

تذکرہ ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود ونصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداء دنیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچی سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبر دی ہو۔(معارف القرآن ص 98 ج 1)

اعجاز قرآنی کی پانچویں وجہ:

کتاب اللہ کی بے شمار آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی ہے اور پھر ان کے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کرسکتا ہے، کسی بشر سے عادتاً ممکن نہیں۔

اعجاز قرآنی کی چھٹی وجہ:

چھٹی وجہ اعجاز قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد سے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کرسکیں گے اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کرسکے۔ جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کا دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو وہ موت کی تمنا کرکے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا:

ولن یتمنوہ ابداً ”وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرسکیں گے کیوں کہ ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے۔ اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے فوراً مرجائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کردے۔“(معارف القرآن ص 99 ج 1)

اعجاز قرآنی کی ساتویں وجہ:

فرمان ربانی کے اعجاز کی ایک وجہ وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص وعام اور مومن وکافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ ﷺ آخری آیت پر پہنچے تو جبیرؓ بن مطعم کہتے ہیں کہ میرا دل گویا اڑنے لگا اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا۔ (معارف القرآن ص 99 ج 1۔)

اعجاز قرآنی کی آٹھویں وجہ:

قرآن کے اعجاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اس کا شوق اور بڑھتا ہے۔ دنیا کی کوئی بہتر سے بہتر اور مرغوب کتاب لیجئے اسے دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کا شوق ورغبت بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا اثر ہے۔(1 معارف القرآن)

اعجاز قرآنی کی نویں وجہ:

کلام اللہ کا یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن نے خود اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ وہ قیامت تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر وترمیم کے باقی رہے گا، اللہ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر وزبر کی غلطی کا

امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں۔ بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیر و زبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک وشبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔ (معارف القرآن ص 100 ج 1)

زملکانی کا موقف:

قرآن کریم کے اعجاز بیانی کے سلسلے میں کمال الدین محمد بن علی بن الزملکانی کا کہنا ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے حسن تالیف میں مضمر ہے۔ یعنی اس کے مفردات اور معانی دونوں میں یہ خصوصیت پنہاں ہے کہ ان کے انتخاب میں صوت و آہنگ اور ترجمانی کے اعتبار سے اس کے مرتبہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ (1)

فخر الدین رازی کی رائے:

قرآن کے اعجاز بیانی کے حوالے سے امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ اس کا اعجاز اس کی فصاحت و بلاغت اور ان تمام نقائص و معائب اور تضادات سے منزہ ہونا ہے جو انسانوں کا خاصہ ہے۔ (2)

قاضی ابوبکر کی رائے:

قاضی ابوبکر اپنی کتاب 'اعجاز القرآن' میں رقم طراز ہیں کہ قرآن کریم کے اعجاز میں یہ راز پنہاں ہے کہ اس کا اسلوب، اس دور کے تمام معروف و مروجہ اسالیب سے مختلف ہے یعنی نہ تو اس شعر کی طرح ہے اور نہ ہی اس نثر کی طرح جس کا اظہار اس دور کے فصحاء اور شعراء اپنے کلام میں اکثر کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ طرز بیان کی حقیقت ہی اس کے بدیع

السمٰوات والارض کے کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ (3)

علامہ سکاکی کی رائے:

قرآن کریم کے اعجاز بیان کے تعلق سے ابو یعقوب یوسف بن ابی بکر محمد بن علی سکاکی نے اپنی کتاب مفتاح العلوم میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کوئی پہلو متعین کرنا مشکل ہے، چنانچہ وہ قاری جو فصاحت و بلاغت کا صحیح ذوق رکھتا ہے اس کو ہر ہر قدم پر محسوس تو کرتا ہے مگر بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک اس کی فصاحت و بلاغت سراسر ذوق و وجدان کے نازک پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اظہار اسی طرح ناممکن ہے جس طرح قرآن کے حسن و زیبائی کی الفاظ و حروف کی اصطلاحوں میں تشریح نہیں کی جا سکتی۔ (4)

وجوہ اعجاز کے بارے میں نظام کا نظریہ:

قرآن کریم کے اعجاز کے بارے میں ابو اسحاق ابراہیم بن یسار النظام کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم کا جواب یوں تو ناممکن ہے تاہم جب بھی کوئی شخص یا گروہ اس کے جواب کے درپے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے قدرت و استطاعت چھین لیتا ہے، وہ اس لائق نہیں رہتا کہ اس کے مرتبہ فصاحت کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہہ سکے۔ (5)

درحقیقت قرآن کریم اپنی ادبی و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے مجموعۂ اعجاز ہے، بقول بندار بن الحسین کہ اس بارے میں خصوصیت سے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ لفظ و معنیٰ اور ترتیب و تالیف کے کس پہلو و مقام پر اعجاز کا اطلاق مکمل طور پر ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن نے سحر اور جادو کے دور سے نکل کر عقل و خرد کے جس نئے دور کا آغاز کیا اور جس اولین قوم اور معاشرے کو اپنا مخاطب ٹھہرایا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کتاب کے کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں ایسی وزنی دلیل سے کام لیا جاتا جو ایک طرف تو عقلی ہو اور دوسری

طرف ایسی ہو جس کے حسن و قبح کو وہ اچھی طرح جانچ پرکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ عربی زبان اور اس کی خصوصیات ہی ہو سکتی ہے۔

اعجاز بیانی کا اہم پہلو:

قرآن حکیم میں ان تمام پہلوؤں کا استیعاب کیا گیا ہے لیکن اس کتاب کے مخاطبین اولین کے لئے زیادہ شائستہ التفات اور قابل فہم پہلو قرآن کریم کی لسانی خصوصیات اور معجزہ طرازیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلو پر بالتفصیل روشنی ڈالی جائے۔ خود یہ پہلو دو طرح کے امکانات کا حامل ہے یا تو اس کے متعلق ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قرآن حکیم حذف، تقدیر، تقدیم، تاخیر، تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور بلاغت کے اعتبار سے حسن و کمال کے کن کن نوادر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

قرآن کریم کا ہر ہر لفظ عمدہ اور ہم آہنگ:

قرآن حکیم میں الفاظ کی ان معجزہ طرازیوں کے علاوہ جن کا تعلق ترکیب و تالیف کے کمالات اور خوبیوں سے ہے، خود الفاظ کی اپنی ایک حیثیت و اہمیت بھی ہے۔ ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کو سننے سے کان ابا کرے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں عامیانہ پن پایا جائے اور جو معنوی اعتبار سے کھوکھلا اور سطحی ہو، کوئی لفظ ایسا بھی نہیں جو قریش کے صاف ستھرے ذوق عربیت کے منافی ہو، بلکہ اس کا ہر لفظ خوش گوار، خوش آہنگ اور اس طرح کا صوتی نکھار لیے ہوئے ہے کہ نہ صرف کان اس سے آشنا معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قلب و ذہن بھی اس سے غیر شعوری طور پر پہلے سے آگاہ ہیں۔ ان میں بلا کی ملائمت، حلاوت اور کھنک پائی جاتی ہے اور کیوں نہ ہو ان کا انتخاب خالق کائنات نے کیا ہے۔

کم الفاظ کے ذریعے معانی کا اظہار:

عربی زبان جس کا دامن ہزاروں الفاظ کو سمیٹے ہوئے ہے، انہی الفاظ کے ذریعے انفرادی و اجتماعی مسائل سے لے کر مابعد الطبیعی حقائق تک تمام مسائل کو احسن طریقے پر سلجھایا اور نکھارا ہے۔ یعنی کم از کم ذخیرۂ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معانی کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً لفظ ہدایت کو لیجئے۔ قرآن حکیم نے اس ایک لفظ کو سیاق و سباق کی مناسبت کے پیش نظر تقریباً تین معانی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ اس معنیٰ میں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ہر شے کی تخلیق کی ہے وہاں اس کے فرائض کا تعین کیا ہے۔

رَبُّنَا الَّذِىٓ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰهٰ: 50)(6)

ہمارا وہ پروردگار ہے جس نے ہر چیز کو شکل و صورت بخشی اور پھر اس کے فرائض کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی۔

2۔ دینی رہنمائی کے معنوں میں:

وَجَعَلۡنَا هُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا (انبیاء: 73)(7)

اور ہم نے ان کو قوموں کا پیشوا ٹھہرایا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔

3۔ توفیق ہدایت کے معنوں میں:

وَالَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًى (محمد: 17)(8)

جو لوگ ہدایت سے بہرہ ور ہیں ان کو مزید ہدایت کی توفیق فرماتا ہے۔

اعجاز قرآنی کا تیسرا پہلو حسن تالیف:

قرآن حکیم کے اعجاز کا تیسرا پہلو حسن تالیف ہے، یعنی اس بحث کے بعد کہ اعراب

وحروف کی تبدیلی یا الفاظ کے انتخاب وتصرف میں قرآن کریم نے اعجاز کے کن کن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، یہ واضح کیا جائے کہ یہی الفاظ جب ترکیب پذیر ہوں اور آیات کے سانچے میں ڈھل جائیں تو ترتیب وتالیف کے لحاظ سے اس میں حسن وسحر کے کون کون گوشے نکھر کر ذوق وشوق کو متاثر کرتے ہیں۔اس سوال کا جواب بھی دوطرح سے دیا جاسکتا ہے۔

ایک یہ کہ فن بلاغت وبدیع کے ایک ایک قاعدہ کو سامنے رکھ کر قرآن سے اس بات کا ثبوت فراہم کیا جائے کہ اس نے کیوں کر تمام اصناف سخن کو ملحوظ رکھا اور کس طرح حیرت انگیز اور غیر معمولی طریقے سے ادب وذوق کے خوارق کی تخلیق کی ہے۔

دوسرے یہ کہ فن اور اس کی اصطلاحی باریکیوں میں غوطہ زنی کئے بغیر بدیع وبیان کی ایسی روشن مثالوں ہی پر اکتفا کیا جائے جن سے وہ لوگ بھی استفادہ کرسکیں، جن کو ادب وذوق کے ان دقائق کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔اس سے پہلے کہ قرآن کریم کے معجزانہ پہلو کو ذکر کیا جائے چند نکات کی تشریح ناگزیر ہے۔

(1) قرآن حکیم نے جب اعجاز کا دعویٰ کیا اور مخالفین کو مقابلے کے لئے للکارا تو یہ محض مناظرانہ تحدی نہ تھی بلکہ ایک برتر حقیقت کی طرف اشارہ تھا، جس نے ادب ولسان کا حسین روپ دھار رکھا تھا۔ کارلائل نے قرآن کریم کے اس نکتہ کو بھانپ لیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ قرآن دراصل اس آواز حق کی بازگشت ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے سنائی دے رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سننے والے جب اس کو سنتے ہیں تو یہ آواز انہیں پہچانی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی اجنبی کی آواز نہیں ہے، بلکہ یہ دل کے قریب سے بلند ہونے والی آواز ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جبین شوق زمین بوس ہوجاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ

سُجَّداً (بنی اسرائیل: آیت 107 (9)

جن لوگوں کو پہلے علم الکتاب سے بہرہ ور کیا گیا ان کو جب قرآن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (المائدة: 83)(10)

اور جب اس کتاب کو جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی، سنتے ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی اور وہ عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہم کو ماننے والوں میں لکھ لیجئے۔

اعجاز بیان کے اسی پہلو نے ولید جیسے مخالف اسلام کو متاثر کیا اور یہی وہ قرآن کی ادائے دلنوازتھی جس نے فاروق اعظمؓ کے قلب گداز میں اعجاز قرآنی کی پذیرائی کے لطیف جذبات کو ابھار دیا۔جب ہم آیات قرآنی میں اعجاز بیان کے اس پہلو سے تعرض کرتے ہیں جس کا تعلق حسن تالیف سے ہے تو اس سے مراد حسن وکمال کی وہ نوعیت ہے جو اسلوب ومعانی دونوں میں یکساں دائر وسائر ہے۔وہ نوعیت کیا ہے خطابی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

”قرآن جن محاسن سے لبریز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں صحیح اور بلندتر معانی کو نظم وترتیب کی حسین شکل میں پیش کیا گیا ہے، اس میں اللہ کی توحید کا بیان ہے۔اس کی صفات کا تذکرہ ہے، تنذیر کی تفصیل ہے، حلال وحرام کی وضاحت ہے، حظر واباحت کی حدود کا تعین ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام ہیں، محاسن اخلاق کی تلقین ہے اور قرون ماضیہ سے عبرت پذیری کے اصول ہیں۔یہ سب معانی اور مضامین بجائے خود بلند اور حسین ہیں، باوجود اس کے ان سب کے اظہار کے لئے قرآن حکیم نے جو اسلوب اختیار

کیا ہے اس سے زیادہ موزوں اور بہتر اسلوب اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ (بیان اعجاز القرآن :ص24)(11)

اعجاز بیانی کے سلسلے میں باقلانی کی رائے:

قرآن کریم بدیع وبیان اور ترتیب وتالیف کے اس درجۂ کمال پر فائز ہے کہ جہاں انسان کا عجز واضح ہوجاتا ہے۔اس میں ہر معنیٰ کو بغیر کسی مبالغہ آرائی کے ٹھیک اس انداز میں بیان کیا گیا ہے جو اس کے لئے موزوں ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے خطیب اور شاعر میں یہ خامی نمایاں ہے کہ وہ کسی ایک ہی مفہوم ومعنیٰ کو تو اچھی طرح ادا کرسکتا ہے لیکن ہر معنیٰ کو نہیں مثلاً بعض لوگ مدح میں خوب نکھرتے ہیں ہجو میں نہیں۔بعض ہجو کے میدان کے شہسوار ہوتے ہیں اور مدح میں ناکام،لیکن قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جس معنیٰ ومفہوم کو بھی ادا کیا ہے زبان واسلوب کا معیار اس میں یکساں بلند ہے۔(12)

علامہ جرجانی کا موقف:

عبدالقادر جرجانی نے حسن تالیف اور اعجاز قرآنی کو اس حیثیت سے دیکھا ہے کہ کفار مکہ اعجاز قرآنی کے مسئلہ میں اس لئے سپر ڈالنے پر مجبور ہوئے کہ انہوں نے جب اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا،ایک ایک سورت کا جائزہ لیا اور ایک ایک آیت کو دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ اس میں تو کوئی لفظ اور کلمہ ایسا نہیں جو اپنی جگہ نگینہ کی طرح نہ جڑا ہوا ور جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ اگر یہ لفظ یا کلمہ یوں ہوتا تو زیادہ موزوں اور فصیح وبلیغ ہوتا۔یہ تھا وہ احساس عجز جس نے انہیں ششدر وحیران کردیا تھا۔(13)

حسن تالیف اور اقتضائے حال کی چند جھلکیاں:

حسن تالیف یا فصاحت وبلاغت کا اہم اصول یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے عین مطابق ہو،یعنی جو کچھ بھی کہنا ہو اور مفہوم ومعنیٰ کی جس نوعیت کا بھی اظہار مقصود

ہو الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب وساخت سے اس کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہو۔قرآن حکیم میں اس صفت کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

انسان کی اخروی زندگی کے بارے میں قرآن حکیم کا واضح تصور یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ بہترین اجروثواب سے بہرہ ور کئے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں ایمان وعمل کے تقاضوں کا ساتھ دیا،اللہ کو مانا اس کے رسولوں کو تسلیم کیا اور ان دینی واخلاقی قدروں کی پیروی کی جن کی انہیں ان کے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے تلقین کی گئی۔اس کے برعکس وہ سخت سزا کے مستحق ٹھہریں گے جنہوں نے قدم قدم پر کفر وانکار کا اظہار کیا اور اپنی روش اور عمل سے اللہ کے پیغام ودعوت کو جھٹلایا۔

ظاہر ہے جب دونوں کے طرز عمل میں بیّن اختلاف رونما ہوگا تو ان کے صلہ اور جزا میں بھی فرق نمایاں ہونا چاہئے۔قرآن حکیم نے ان دونوں گروہوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں کے فکر واسلوب کے منطقی نتائج کی نشاندہی کی ہے اور اس کی ہولنا کیوں کا بھی صلہ اور انعام اور اس کے لطائف کی بھی لیکن اس معجزانہ انداز سے کہ جو آیات خوشخبری اور حسن انعام پر دلالت کرتی ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے نرمی،عذوبت اور بشاشت ٹپک رہی ہے اور جن آیات میں سزا اور اس کی اذیتوں کا ذکر ہے ان کا ایک ایک لفظ ہیبت،خشونت اور قہر وجلال کے انگارے سے برس رہا ہے۔

اعجاز پر دلالت کرنے والی آیات قرآنی:

اعجاز قرآنی کے لطف کو ذیل کی آیتوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْآنُ اَنْ يُّفْتَرىٰ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِى بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتَابِ لَارَيْبَ فِيْهِ مِن رَّبِ الْعَالَمِيْن اَمْ يَقُوْلُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاتُوْا بِسُوْرَةٍمِّثْلِه وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُم صَادِقِيْن.(14)

دوسری جگہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِه مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ.(15)

اس طرح کے چیلنج وتحدی مکی ومدنی ہر دو سورتوں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ جو کہ مدنی سورۂ ہے اس میں تمام فرد انسانی سے یہ چیلنج کیا گیا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِی رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُو بِسُوْرَةٍ مِن مِّثْلِه وَادْعُوْا شُهَدَائَكُم مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ(16)

اسی طرح سورۃ الاسرا جو کہ مکی سورۂ ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَايَأْتُوْنَ بِمِثْلِه وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْراً.(17)

قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت، حسن ترتیب وتنسیق کی نظیر نہیں پائی جاتی ہے، اس کے سارے کلمات نور الٰہی سے آراستہ وپیراستہ ہیں جن میں معمولی تغیر وتبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مستشرقین نے بھی کیا ہے کہ قرآن کریم تمام نقائص ومعائب سے پاک وصاف ہے۔ قرآن کریم کی عظمت وفوقیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ کسی طرح کا تغیر وتبدل قبول نہیں کرتا۔

قرآن درستگی کا جامع، سچائی کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ دیگر سبھی کلام پر فائق وبرتر ہے۔ اس کے ہر ایک جملہ سے اس کا اعجاز بیان ظاہر العیان ہے۔ ہر فرد بشر کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ اس طرح کا کوئی بھی کلام اپنے معاونوں کے ساتھ مل کر باہمی اشتراک وتعاون سے بھی پیش کر سکے۔ انسان اپنے شعور واحساسات کی کمزوری کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ ہر وقت اس کے

سامنے نئے مسائل وحالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے وہ کبھی خوشی وشادمانی سے دوچار ہوتا ہے تو کبھی آلام ومصائب کا شکار۔

قرآن پاک نے اپنے معاندین ومخاصمین کو بار بار جھنجھوڑا، ان کی غیرت کو بار بار تحدی اور چیلنج کیا لیکن اس کا ہم مثل لانے کے لئے بڑے بڑے فصحا وبلغاء عرب ہمیشہ خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کرتے رہے، لیکن انہیں اپنی تمام تر کوششوں میں ہر زاویے سے بے نیل مرام ہو کر منھ کی کھانی پڑی۔ تاریخ میں چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ قرآن کا ہم مثل لانے کے لئے ناکام سعی بھی کی گئی مثلاً بسید بن ربیعہ جو عربوں میں اپنے فن کلام اور تیزی طبع میں یکتائے روزگار اور وحید عصر تھا۔ اس نے ایک نظم لکھ کر باب کعبہ پر آویزاں کر دی، جب مسلمانوں کی اس پر نظر پڑی تو ایک مسلمان نے اس کے جواب میں قرآن پاک کی ایک سورت سورۂ کوثر لکھ کر لٹکا دی، بسید نے دوسرے روز وہاں آکر سورۂ کوثر کی ابتدائی آیت جب پڑھی تو اس قدر متاثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

لَيْسَ هٰذَا الْقُرْآنُ مِنْ طَاقَةِ الْبَشَر

اور حق وصداقت سے مغلوب ہو کر فوراً لا الٰہ الا اللّٰہ **محمد رسول اللّٰہ** پڑھ کر پروانۂ نبوت کے جھرمٹ میں شامل ہو گیا۔

یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ اتنا زیادہ عظمت قرآن کا قائل ہو گیا کہ حضرت عمرؓ نے جب اس سے اشعار کہنے کی فرمائش کی تو اس نے کہا جب خدا نے مجھے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران جیسا کلام دے دیا ہے تو اب شعر گوئی مجھے قطعی زیب نہیں دیتی۔

فن اور ذوق کے پہلو سے بلاغت میں قرآن کا درجہ وہی شخص اچھی طرح جان سکتا ہے جسے ماہرین بلاغت کے منظوم ومنثور اور مرسل ومسجوع کلام کا حظ وافر حاصل ہو یہاں تک کہ کلام پر اسے ملکہ حاصل ہو جائے اور اس کا ذوق بن جائے اور وہ عبدالقاہر کی دونوں

کتابوں اور الصناعتین الخصائص، اساس البلاغۃ اور ابن ہشام کی مغنی اللبیب سے مدد حاصل کرلے۔ یہ بلاغت کی اولین کتابیں ہیں، اس کے نتیجے میں اسے ملکہ حاصل ہوجائے گا اور وہ اس انتہا تک پہنچ جائے گا جس کا علم تاریخ سے حاصل ہوتا ہے اور وہ قرآن کی تاثیر ہے۔ جس کا احساس امت عربیہ اور عجم میں سے عربی میں مہارت رکھنے والوں کو تھا۔

کلام میں بلاغت کی صحیح تعریف یہ ہے کہ متکلم سامع سے جو بات کہنا چاہتا ہے اسے اس انداز سے کہے کہ اسے سن کر سامع مطمئن ہوجائے اور اس کا اثر قبول کرلے۔ تاریخ انسانیت میں کوئی ایسا کلام معروف نہیں جو عقلوں اور دلوں میں تاثیر کی قوت میں قرآن سے قریب تر ہو، قرآن ہی وہ واحد کلام ہے جس نے عرب قوم کی طبیعتیں بدل دیں، انہیں ان کے عقائد اور رسوم سے پھیر دیا، انہیں ان کی عادتوں اور عداوتوں سے موڑ دیا، انہیں ان کی خودغرض اور انتقامی کارروائیوں سے پھیر دیا۔ ان کی امیت اور جہالت کو علم وحکمت سے اور جاہلیت کو علم وادب سے بدل دیا اور متفرق قبائل کو ملا کر ایک امت بنا دیا جو اپنے عقائد، فضائل، عدل، تہذیب اور علوم وفنون سے سارے عالم پر چھا گئی۔

اب ہم مختصراً اہم خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم کا کلام معجز ہے، ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) الفاظ کا اعجاز (2) ترکیب کا اعجاز (3) اسلوب کا اعجاز (4) نظم کا اعجاز۔

الفاظ کا اعجاز:

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا، کیوں کہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے

استعمال پر مجبور ہوجاتا ہے، لیکن پورے قرآن میں نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کے معمولی معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے، جو عبارت کے سیاق، معنیٰ کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہو۔

مثلاً ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن چونکہ ان کے مفہوم کی ادائیگی کیلئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا اس لئے اہل زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوق سلیم وجد کر اٹھتا ہے، جیسے عربی میں تعمیر مکان کیلئے پکی ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں مثلاً اجرّ، قرمد اور طوب۔ اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں پکاؤ، اس واقعہ کو ذکر کرنے کیلئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہوگیا اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قباحت بھی پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا . (یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن بحوالہ علوم القرآن ص 256)

''اور فرعون نے کہا! اے سرداران قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں، پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے محل تعمیر کرو۔''

ترکیب کا اعجاز:

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے۔ اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اوج کمال پر ہے، قرآن کریم کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، جیسے قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لئے عربی میں مقولے مشہور تھے۔ مثلاً **القتل احیاء للجمیع** (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور **اکثروا القتل لیقل القتل** (قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے) ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد عام تھے اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔''

اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھئے بلاغت کا معجزہ شاہکار معلوم ہوتا ہے اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب کا اعجاز:

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کس و ناکس کرسکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(1) علماء بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں، خطابی، ادبی، علمی۔

ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا اور مواقع مختلف ہیں اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن ہے۔ آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زور، ادب کی شگفتگی اور علمی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی ہے۔

(2) اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے تو کہنے والا ادب و انشاء میں خواہ کتنا ہی بلند پایہ مقام رکھتا ہو ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اکتا جاتے ہیں، زور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہے، لیکن ہر مرتبہ نئے کیف، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔

(3) کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت و شیرینی دو متضاد صفتیں ہیں، دونوں کے لئے الگ الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے۔ اس میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ کمال یکجا پائے جاتے ہیں۔

(4) قرآن کریم نے بعض ان مضامین میں بلاغت کو اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے، جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کرسکتا۔ مثلاً قانون وراثت کو لیجئے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب و شاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن آپ سورۂ نساء میں:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ الخ والے رکوع کی تلاوت کیجئے آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے۔اس پورے رکوع میں قانون وراثت بیان کیا گیا ہے،لیکن اس حسن وجمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے۔

(5) اختصار اور ایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے۔اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرما دیئے ہیں، جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں،لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقدے کھول دیئے ہیں۔وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں،لیکن دونوں موضوعات پر اس نے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دے دی ہیں کہ دنیا کے علوم وفنون سیکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

آخری بات:

قرآن کریم کے اعجاز کے اسباب ووجوہ بے شمار ہیں،علماء امت نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے،کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔نہ یہ سمندر کبھی ختم ہوگا اور نہ یہ تشنگی کبھی دور ہوگی۔نہ قرآنی عجائبات وانکشافات کا سلسلہ تمام ہوگا اور نہ تحیر واستعجاب کو راحت ملے گی،نئی نئی باتیں اور نکتے سامنے آتے رہیں گے اور قرآن مجید کی حقانیت واضح سے واضح ہوتی چلی جائے گی۔حتیٰ کہ وہ وقت آجائے گا جب انسانیت کا کوئی فرد قرآن کا انکار نہ کر سکے گا۔

حوالہ جات

(1) مطالعۂ قرآن (مولانا حنیف ندوی) ص105۔(مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور)

(2) مطالعۂ قرآن (مولانا حنیف ندوی) ص107۔(مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور)

(3) قرآن کریم کا اعجاز بیان (ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمان بنت الشاطی)۔(مطبوعہ گلوب آفسٹ پریس دہلی)

(4) قرآن کریم کا اعجاز بیان (ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمان بنت الشاطی) ص170۔(مطبوعہ گلوب آفسٹ پریس دہلی)

(5) التصویر الفنی للقرآن (سید قطب) ص110

(6) سورۂ طٰہ: آیت 50

(7) سورۂ انبیاء: 73

(8) سورۂ محمد: 17

(9) سورۂ بنی اسرائیل: 83

(10) سورۃ المائدۃ: 83

(11) بیان اعجاز القرآن: ص24

(12) مطالعۂ قرآن (مولانا محمد حنیف) ص130۔(مطبوعہ: ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور)

(13) مطالعۂ قرآن (مولانا محمد حنیف) ص130۔(مطبوعہ: ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور)

(14) سورۂ یونس: 38-37

(15) سورۂ ہود: آیۃ 13

(16) بقرہ: 23

(17) بنی اسرائیل: 88

(18) قرآن کریم کا اعجاز: ص: 166

مراجع

(1) قرآن کریم
(2) صحاح ستہ
(3) روح المعانی
(4) صفوۃ التفاسیر
(5) الکشاف
(6) بیان القرآن
(7) معارف القرآن
(8) تفسیر مظہری
(9) تدبر قرآن
(10) تفہیم القرآن
(11) ترجمان القرآن
(12) تفسیر ماجدی
(13) علوم القرآن
(14) ماہنامہ دعوۃ القرآن (خصوصی شمارہ)
(15) مطالعۂ قرآن
(16) قرآن عظیم نمبر (راشٹریہ سہارا)

☆☆

ہندی زبان میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ

زیر اہتمام	:	عالمی رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ
بمقام	:	جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد مہاراشٹر
بتاریخ	:	۱۳،۱۴ر جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ مطابق ۷،۸رجون ۲۰۰۹ء

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدالأنبیاء والمرسلین محمد و اٰلہ وصحبہ أجمعین. أما بعد!

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم " وما أرسلناک إلارحمۃ للعالمین" صدق اللّٰہ العظیم. وقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم "إنما بعثتُ لأتمِّمَ مکارمَ الأخلاق. أو کما قال علیہ الصلاۃ والسلام.

صدر محترم، مؤقر علماء کرام وحاضرین!

اسلام کی وحدت وصداقت کی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوسکتی کہ قرآن مقدس اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے ہر خطہ میں ہر ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور

اس پر دنیا کی تمام زبانوں میں تصنیفات و تالیفات پیش کی گئی ہیں۔ جہاں تک محسن انسانیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی بات ہے تو دنیا میں کوئی ایسی روحانی انقلاب آفریں شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی سیرت کے گوناگوں پہلوؤں کو اہل قلم نے موضوع بحث بنایا ہو اور دنیا میں کوئی ایسی زبان بھی نہیں جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ حق شناسوں کے لئے یہ بدیہی حقیقت آج بھی ایک پیغام بن کر کھڑی ہے کہ آؤ اس شخصیت کی طرف جس نے اس کائنات میں عقل و خرد کے دریچے کھولے اور امن و آشتی کے دیپ جلائے نیز وہی واحد شخصیت ہے جس نے آدمیت کو انسانیت کی راہ دکھائی، ایسی راہ جو کامرانی کی راہ ہے اور مقاصد تخلیقیت کی جانب لے جانے والی ہے۔ گہرے سمندر میں ڈوب کر حق وحقیقت کی موتیاں تلاش کرنے والے اہل قلم اور اہل فکر و دانش نے اللہ کے محبوب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی زندگی سے اتنی روشن کرنیں سمیٹی ہیں کہ انھیں مرتب کرنے سے ان کا علم وایجاز عاری ہے اور ذوقِ ادب بھی اپنی کم مائیگی کا اظہار کئے بنا نہیں رہ پاتا۔

ہر شخص اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہروں میں غوطہ زن ہوتا ہے مگر وہ اپنی بساط وظرف کو ناکافی سمجھ کر باہر نکل آتا ہے، چنانچہ یہ اعتراف دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب پرداز و ادب نواز کرتے رہے ہیں کہ ادب کے کینوس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو کبھی قید نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ سیرت کا ایک ہیولیٰ ابھرتا ہے کہ دوسرے لمحہ میں ہی اس سے زیادہ مؤثر، حسین اور بے نظیر ایک اور تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ماقبل کی قلبی جولانیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ تاہم ارباب قلم ہیں کہ مسلسل سیرت پیمائی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہر روز نئی روشنی اور لطائف کی یافت ہو رہی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حضرات! محسن کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آفاقی پیغامات اور امتیازی اوصاف کے گرویدہ نہ صرف ان کو نبی برحق ماننے والے ہوئے بلکہ دیگر مذاہب کے حقیقت پسندوں کو بھی اسوۂ نبوی میں کشش محسوس ہوئی۔ انھوں نے گرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیٔ برحق تو نہیں مانا لیکن دنیا کے مہا پرشوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست قرار دیا۔ اس کا ثبوت دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کے اوراق میں ملتا ہے اسی طرح ہندی زبان وادب کا دامن بھی سیرت نبوی کے شفاف نقوش سے پُر ہے۔ ہندی زبان میں کچھ ایسے افراد نے عشق نبوی سے سرشار ہو کر اپنے جذبات وعقیدت کا اظہار کیا ہے جن کا تعلق امت محمدیہ سے ہے اور کچھ ایسے لوگوں نے بھی حضورؐ سے عشق وعقیدت کا اظہار کیا ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین وایمان نہیں رکھتے ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار وکردار کے سامنے پروانہ وار ڈھیر ہو گئے، ہندی زبان میں سیکڑوں کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق وامین کے وصف جمیل کی بنا پر دنیا کا عظیم ترین انسان قرار دیا ہے تو کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لیے راہ عمل اور سفینۂ نجات ثابت کیا ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور عمل وکردار پر انگشت نمائی کرنے والوں کا مدلل ومبرہن جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندی زبان وادب کا دامن بھی اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیرنگیوں سے مالا مال ہے تو غلط نہ ہوگا بلکہ ایک حقیقت ہے کہ ہندی زبان وادب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ادب کے ریشمی غلاف میں پیش کیا گیا ہے۔

سامعین کرام! ہندی ادب میں سیرت طیبہ کو چاہے جس اسلوب میں پیش کیا گیا ہو اس میں

عقیدت ومحبت اور جذبات و وارفتگی کی روشنی محسوس کی جاتی ہے، چناں چہ سوامی وویکانند ہوں یا سوامی لکشمن پرساد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال وکوائف کو بڑی محبت سے لکھتے ہوئے اسلام کے گرویدہ ہوجاتے ہیں، انھیں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی جملہ کیفیات پوری انسانیت کے لیے رہنما اصول معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے افراد حضورؐ کی زندگی پر قلم چلاتے ہوئے آں حضورؐ کے ان اوصاف کو توشۂ قرطاس وقلم تصور کرتے ہیں جن کا تعلق انسانیت، بقائے باہم اور خلق خدا کے تئیں انصاف سے ہے، جتنے بھی غیر مسلم ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں نے ہندی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے ان کا مطمح نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے وہ پہلو تھے جن کا تعلق پوری انسانیت سے ہے۔ چناں چہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم، ان کی امانت داری، خواتین کے حقوق و مقام کے تئیں ان کے رویے اور کمزوروں، ضرورتمندوں کے ساتھ احسان اور غیر مسلموں کے ساتھ اکرام وانصاف کے معاملے کو خاص طور سے موضوع بحث بنایا ہے۔

ہندی مصنفین نے اپنی تحریروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب آفریں اور محیر العقول کارکردگی پیش کرتے ہوئے خود بھی حیرت زدہ ہوئے بنا نہیں رہتے اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ نیز قارئین کو بھی حیرت زدہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس بات کی یہ متقاضی ہے کہ ارباب فکر ودانش اس جانب توجہ دیں۔

دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح ہندی زبان میں سیرت رسولؐ پر گراں قدر کام نہیں ہوسکا۔ حضورؐ کی ذات تمام مسلمانوں کے لیے منبع رشد و ہدایت اور ان کی سیرت نمونہ کمال ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان نے اس منارۂ نور سے روشنی حاصل کرنے کے لیے ان کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور اس طرح سیرت نگاری کا ایک بہت بڑا سرمایہ مسلمانوں کا اثاثہ

ہے جو دنیا کی کئی زبانوں کو مشک بار کیے ہوئے ہے، لیکن ہندی زبان میں سیرت کا بیش قیمت سرمایہ موجود نہیں ہے۔

سیرت کی تعریف:

لغوی مفہوم: سیرۃ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کی جمع سِیَر ہے، یہ لفظ دراصل سار یسیر سیراً ومسیراً سے نکلا ہے اور چلنے پھرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، سیرت کا مادہ سیر بمعنی چال ہے اس لیے اچھے چال چلن کو ''حسن السیر ۃ'' بھی کہا جاتا ہے، مشہور عربی لغت ''لسان العرب'' میں لکھا ہے کہ السیر کے معنی ہیں چلنا پھرنا۔ حدیث حذیفہؓ میں ہے ''تَسَایَرَ عَنْہُ الغَضَبُ'' یعنی اس کے غصہ کے آثار رخصت ہوگئے، سیرۃ کا لفظ مسافت کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور السیارۃ کے معنیٰ قافلہ کے ہیں، السیر ۃ کے معنی ہیئت کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے سَنُعِیۡدُھَا سِیۡرَتَھَا الۡاُوۡلٰی یعنی ہم اسے اسی ہیئت پر کردیں گے جیسی یہ پہلی تھی، پھر سیرۃ کے معنیٰ پہلے لوگوں کے واقعات واحادیث کو بیان کرنا بھی ہے، ایک اور عربی لغت ''تاج العروس'' کے مطابق سیرۃ کے معنیٰ طریقہ کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سَارَ الوَالِیُ فِی رَعِیَّتِہٖ سِیۡرَۃً حَسَنَۃً یعنی حاکم نے رعایا کے ساتھ اچھے طریقے کے ساتھ برتاؤ کیا، احسن السیر کا مطلب ہے اچھا طریقہ اور ''ہٰذا فی سیرۃ الاولین'' کے معنیٰ ہیں یہ بات پہلے لوگوں کے طریقوں میں بھی موجود ہے۔(۱) دو اور عربی لغات ''المعجم الاعظم'' اور ''مصباح اللغات'' میں لفظ سیرت کے یہ معانی درج کیے گئے ہیں:

(۱) جانا، روانہ ہونا (۲) روشن طریقہ (۳) شکل وصورت (۴) ہیئت (۵) حالت (۶) کردار (۷) سنت (۸) عادت (۹) کہانی۔(۲)

اردو لغات میں سے ''جامع اللغات'' اور ''نسیم اللغات'' میں ذاتی جوہر بھی کہا ہے۔(۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں سیرت کا مفہوم طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت حالت اور کردار تک محدود نہیں بلکہ اس سے مراد داخلی شخصیت کا اہم کارنامہ اور اکابر کے حالات زندگی بھی ہیں۔

اصطلاحی مفہوم:

سیرت کا لغوی مفہوم اگرچہ کسی نیک سرشت انسان کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے، لیکن اصطلاح میں اس سے مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اور اخلاق وعادات کا بیان ہے۔(۴)

اس لفظ کا اطلاق حضور سرور کائناتؐ کی حیات مبارکہ پر پہلے بھی ہوتا رہا اور اب بھی اس کا اصطلاحی مفہوم یہی ہے سیرت کی اولین کتابیں چونکہ ''مغازی'' کہلاتی تھیں اس لیے سیرت کے معنیٰ میں خصوصیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کا بیان اور بعد ازاں آپ کی زندگی کے حالات کا بیان شامل ہو گیا۔(۵)

مغازی ان جنگوں کو کہتے ہیں جن میں حضورؐ خود شریک ہوئے اس اعتبار سے ''مغازی'' کا دائرہ غزواتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریک جنگ اصحاب رسولؐ تک محدود رہنا چاہئے تھا لیکن اس اصطلاح کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور عہد رسالت کے سارے واقعات پر کیا جانے لگا۔(۶)

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور ائمہ رجال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص غزوات کو ''مغازی'' اور ''سیرت'' کہتے ہیں۔ چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی۔ حافظ بن حجر ''فتح الباری'' (کتاب المغازی) میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لیے استعمال کرتے ہیں، کتب حدیث وفقہ میں بھی ''کتاب السیر والجہاد'' کے عنوان سے جو باب باندھا جاتا ہے اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور

جہاد کے احکام ہی مراد ہوتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ: کئی صدیوں تک یہی طریقہ رہا چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہوئیں مثلاً سیرت بن ہشام، سیرت بن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات کے ہی حالات ہیں البتہ زمانہ بعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً: ''مواہب لدنیہ'' میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔(۷)

یہی لفظ ''سیرت'' آں حضرت کے حالات زندگی کے علاوہ دوسرے اہم اشخاص کی سوانح کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً کتاب ''سیرۃ معاویہ'' کتاب ''سیر الملوک'' وغیرہ۔(۸)

اس کے علاوہ کئی مشہور تاریخی یا افسانوی شخصیت کے کارناموں کو بھی ''سیرت'' کا نام دیا گیا ہے مثلاً سیرۃ عنترہ، سیرت سیف بن ذی یزن، سیرۃ صلاح الدین وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیرت کے لیے قدیم زمانہ میں لفظ ''تاریخ'' بھی استعمال ہوا ہے مثلاً امام بخاری کی تاریخ صغیر وکبیر۔ السخاوی نے ''الاعلان بالتوبیخ'' میں انفرادی اور اجتماعی سوانح عمریوں کو بھی تاریخ کے تحت درج کیا ہے۔

آج کل بھی سیرت کا لفظ صحابۂ کرام علماء وفضلاء اور دیگر نامور اشخاص کے لیے عام استعمال ہو رہا ہے، تاہم ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ''تمام اشخاص کی بایوگرافی کو سیرت کہنا زیادتی ہے، کیونکہ سیرت کے لفظ کو اصول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ہی سے مخصوص سمجھنا چاہئے''۔(۹)

قرآن میں لفظ سیرت کا استعمال:

قرآن مجید میں یہ لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے اور وہ بھی اصطلاحی معنیٰ میں نہیں بلکہ لغوی میں قال: خذھا و لا تخف سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ (طٰہٰ آیت:۲۱)

ہم نے فرمایا ''پکڑ لے (اے موسیٰ) اس کو اور ڈرو نہیں ہم اس ہیئت میں کر دیں گے جیسی یہ پہلے تھی۔(۱۰)

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اسے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰؑ اسے پھینک دے حضرت موسیٰؑ نے اسے پھینک دیا تو وہ یکا یک سانپ بن کر دوڑنے لگی، اس کے بعد مذکورہ بالا آیت آتی ہے جس میں لفظ سیرتہا استعمال کیا گیا، یہاں اس لفظ کے معنی ہیئت، حالت، شکل وصورت اور حقیقی کردار کے ہیں۔

احادیث میں لفظ ''سیرت'' کا استعمال:

بعض احادیث میں لفظ ''سیرت'' اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے ''مسند احمد بن حنبل'' میں دو ایسی احادیث موجود ہیں جن میں ان الفاظ کو اپنے مخصوص معانی میں برتا گیا ہے۔(۱۱)

پہلی حدیث یہ ہے: قام علی رضی اللہ عنہ علی المنبر فذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمل بعملہ وسار بسیرتہ حتیٰ قبض اللہ عز وجل ثم استخلف عمر رضی اللہ عنہ علی ذالك فعمل بعملھما وسار سیرتھما حتی قبض اللہ عز وجل علی ذالك۔(۱۲)

ترجمہ: حضرت علیؓ منبر پر کھڑے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ کی روح قبض کر لی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے آپ جیسے کام کیے اور آپ کی ''سیرت''

پر چلے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو بھی قبض کر لیا، آپ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان دونوں جیسے کام کیے اور ان کی ''سیرت'' پر چلے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو بھی قبض کر لیا''

دوسری حدیث یہ ہے:

عن ابی وائل قال قلت لعبدالرحمٰن بن عوف کیف بایعتم عثمان و ترکتم علیا رضی اللہ عنہ قال ماذنبی قد برأت بعلی فقلت ابا یعك علی کتاب اللہ وسنة رسولہ و سیرة ابی بکر و عمر قال فقال فیما استطعت قال ثم عرضتھا علی عثمان فقبلھا۔(۱۳)

ترجمہ: حضرت ابو وائل سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کہا کہ آپ لوگوں نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ کی بیعت کیوں کی؟ انہوں نے فرمایا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے میں نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ میں ان میں سے جتنی بات کی استطاعت رکھوں گا اسے انجام دوں گا، پھر میں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں یہی بات پیش کی تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ (اول الذکر میں سار بسیرتہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور ثانی الذکر میں سیرۃُ ابی بکر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔)

سرکار دوعالم، فخر موجودات، سرور کونین، خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حیات پاک ہر انسان کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں ہر قدم پر ہر شعبۂ زندگی میں سرکار دوعالم سے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آخری پیغمبر کی حیثیت سے تمام علمی وعملی کمالات کے جامع اور انسان کا ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں انواع واقسام کی تہذیب وثقافت ہر ملک کی زبان علاحدہ

علاحدہ ہونے کے ساتھ ایک ہی ملک میں متعدد زبانیں رائج ہوتی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقیت کا تقاضا ہے کہ آپ کی شخصیت کا تعارف ہر زبان میں ہو، تاکہ آپ کی سیرت وتعلیم کی آفاقیت کا دائرہ صرف ایک مخصوص قوم و مذہب تک محدود ہو کر نہ رہ جائے ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر عالمی رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی سمینار اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

حضرات! یوں تو دنیا میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں لیکن سرزمین ہند میں ہندی زبان کو جہاں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے وہیں اس سے ہر خاص و عام وابستہ ہے۔ اسی کے پیش نظر راقم الحروف نے اپنے مقالہ کا عنوان ''ہندی زبان میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' منتخب کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مصادر شریعت عربی زبان میں ہیں لیکن ان سے استفادہ کے لیے ترجمہ نگاری کے فن کا سہارا لیتے ہوئے مذہب اسلام کے پیروکاروں نے اپنی اپنی علاقائی زبان میں بھی کما حقہٗ انہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ مصادر شریعت کو علی حالہ باقی رکھتے ہوئے پہلے اپنی زبان کو سیکھنے کی بھرپور جدوجہد کی گئی پھر دوسری زبان میں سمجھنے کی سہولت پیدا کی گئی۔ ہندوستان میں ہندی زبان میں سیرت طیبہ پر کام کی کس قدر ضرورت ہے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندی زبان میں جس قدر سیرت کا کام ہونا چاہئے تھا میرے علم کے مطابق ابھی یہ موضوع کافی حد تک تشنہ ہے۔

حضرات! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف ایک مخصوص مذہب کے لئے نہیں تھی بلکہ اللہ رب العالمین نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا جس کا تقاضا ہے کہ آپ کے علوم و معارف اور سیرت پاک کو ہر زبان میں متعارف کرایا جائے۔ آپ نے امت کو عقائد و عبادات ہی کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ زندگی کے ہر میدان میں وہ حکمت آفریں ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کر کے دین ودنیا کی نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں اور اس کے بعد ہمیں رہنمائی

کے لئے کسی کی جانب دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ نمونہ فکر وعمل کو اپنا لے تو جس اضطراب وانتشار میں وہ آج پھنسی ہوئی ہے اس میں مبتلا نہ ہو۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ایک مشفق باپ اور ایک محبت کرنے والے شوہر ہیں اسی طرح امت محمدیہ کے حاکم وسربراہ، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخلوق کو خالق کا بندہ بتانے میں ایک منفرد مثال قائم فرمائی ہے اسی طرح خدا کے بندوں کو باہم جوڑنے، ان کے آپس کے معاملات منصفانہ بنیاد پر استوار کرنے اور ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرکے مستحکم نظام دنیا کو بخشنے میں جو کردار ادا کیا ہے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔

حضرات فاضل گرامی! ایک امیر یا سربراہ ملت کی حیثیت سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے لیے روشنی کی ایک بنیاد ہے بلکہ ساری انسانیت کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ حدود کے معاملہ میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہیں ہونا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم سے پہلی امتیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تھا تو اسے سزا نہیں دیتے تھے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔

غور فرمائیے کہ حضورؐ نے کس خوبی سے نکتہ بیان فرمایا کہ جرم اور غلطی ہر حال میں قابل سزا ہے اور اس معاملہ میں کسی امتیاز اور کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے جرم کرنے والا کوئی ہو کسی طبقے کا فرد ہو، کسی خاندان کا رکن ہو، کیسا ہی بااثر ہو، کیسا ہی دولت مند ہو اگر قانون کی خلاف ورزی کرے تو قانون اور انصاف کے مطابق سلوک کیا جائے گا اسی طرح

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے کو عدل وانصاف اور مساوات وبرابری کی وہ بنیاد عطا کردی کہ جو ایک مستحکم اور پرامن معاشرے کی ضامن ہے۔ تاریخ شاہد ہے اور حال بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے کہ بادشاہ اور مطلق العنان آمر اپنی حکومت و جبروت کا سکہ جمانے اور اپنی ہیبت دلوں میں بٹھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سامنے آکر اچھے اچھے سرغنے کانپنے لگتے ہیں، اپنا رعب جمانے کے لئے یہ بادشاہ اور حکمراں اپنے اردگرد وہ اسباب اور ماحول پیدا کرتے ہیں جن سے دیکھنے والے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام ظاہری لوازم اور اسباب سے بے نیاز تھے۔ سارے عرب کی حکومت آپ کے قدموں میں تھی، لیکن بوریہ نشینی میں آپ کو راحت تھی۔

حضرات! حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو ادبی انداز میں بیان کرنے کی جن علما و مصنفین نے کوشش کی ہے ان پر اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے تو درج ذیل قلم کاروں کی خدمات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

ہندی میں مسلم مصنفین کی کتابیں	مصنفین	پبلشرز
اللہ کے رسول کا ویوہار	محمد فاروق خان	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی
آخری نبی	عبدالآتی	// // //
اللہ کے رسول کا برتاؤ اپنے صحابہؓ کے ساتھ	محمد فاروق خان	// // //
اسلام ایک سدھانت ایک آندولن	مریم جمیلہ	// // //
قرآن اور پیغمبر	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	// // //
کرانتی دوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	نعیم صدیقی	// // //
نبی کریم کی دعائیں	محمد فاروق خاں	// // //

پیارے نبی کیسے تھے	مائل خیرآبادی	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی
رحمۃ للعالمین	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	// // //
حضرت محمد ایک مہان سماج سدھارک	پروفیسر مرزا رفیع الدین	// // //
حضرت محمد کا سندیش	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	// // //
حضرت محمد کے سندیشوں کے مول تتو	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	// // //
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیون اور سندیش	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	// // //
پیارے رسول	افضل حسین	مکتبہ الحسنات نئی دہلی
آخری پیغمبر	سید محمد اقبال	// // //
پیغمبر اسلام وِدوانوں کی نظر میں	امام الدین رام نگری	// // //
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا سید حامد علی	// // //
مانوتا اپکارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم	ڈاکٹر محمد احمد	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی
حضرت محمد سب کے لیے	مولانا عنایت اللہ سبحانی	// // //
جیون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا عنایت اللہ سبحانی	// // //
اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم	پروفیسر رام کرشن راؤ	// // //
پیارے نبی کی کہانی	ڈاکٹر سوگم چند مکتیش	مدھر سندیش پرکاشن نئی دہلی
حضرت محمد اور بھارتیہ دھرم گرنتھ	ڈاکٹر ایم اے شری واستو	// // //
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	سوگی چند مکتیش	// // //
عرب کا چاند	سوامی لکشمن پرساد	مکتبہ الحسنات دہلی
حضرت محمد کا آدرش	شری ناتھو رام	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

ہندی زبان میں لکھی گئی کتب سیرت کے اقتباسات:

(۱) پرئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنگت میں 40 سبھائیں: (ہندی) مصنف: عادل بن علی اسدی (ترجمہ) عطاء الرحمٰن

اس کتاب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق اہم معلومات کو 42 سبھاؤں کے ذریعہ بتانے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے، جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے امت پر حقوق، انصاف میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک، آپ کی سچائی، امانت، خصوصیات، آپسی زندگی، ازدواجی زندگی، عدل وانصاف اور خواتین کی قدروں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۲) وشوویاپی اور نتئے آدرش کیول اللہ کے پیغمبر ہیں:

اس مقالہ میں اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تصویر، آپ کی دعوت کا دیگر مذاہب سے موازنہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جس کی زندگی کو پوری دنیا کے لیے زندگی کا آئیڈیل نمونہ مانا گیا ہو اس کے علاوہ ادبی انداز میں آپ کی تعلیمات کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

(۳) عید میلاد النبیؐ کا اتہاسک ایوم دھارمک درشٹئے (مصنف: عطاء الرحمٰن، ضیاء اللہ)

اس کتاب میں عید میلاد النبیؐ کا تاریخی و مذہبی جائزہ لیا گیا ہے کہ ہر سال ماہ ربیع الاول میں ۹؍تاریخ کو بڑی دھوم دھام اور ہر سال جوش وجذبہ کے ساتھ عید میلاد النبیؐ منایا جاتا ہے جب کہ فی الواقع تاریخی حیثیت اور مذہبی روشنی میں یہ کام سراسر خلاف ہے، اس کتاب میں عید میلاد النبیؐ کا تاریخی و مذہبی جائزہ احادیث کی روشنی میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مہیلا کا سمّان:۔ (مصنف: شریف الرحمٰن، ضیاء اللہ مدنی)

اسلام دشمن عناصر یہ اچھالتے رہے ہیں کہ اسلام نے خواتین پر ظلم ڈھایا ہے اور انہیں ان کے اختیارات سے محروم کر دیا ہے، لیکن یہ سراسر کذب وافترا پر مبنی ہے، جب ہم اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے خواتین کو عزت واحترام عطا کیا، پوری زندگی میں ان کے ساتھ عدل وانصاف کو برقرار رکھا اور اس کی تلقین کی اور خواتین کو ایسے اختیارات وحقوق دیئے جن کی وہ توقع بھی نہیں کر سکتی تھیں، تو ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں، یہ کتاب انہی حقائق کو نہایت ادبی انداز میں پیش کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام کا برتاؤ خواتین کے ساتھ کیا رہا؟

(۵) اسلام دھرم کے مول سدھانت (مصنف: عطاء الرحمٰن)

اسلام ایک کامل ومکمل دھرم ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے، مذہب اسلام کے پیروکار کا دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے اور وہ جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں مختلف مذاہب کے افراد کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے، دونوں فریق کے بارے میں پیغمبر اسلام نے واضح رہنمائی کی ہے، اس کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے کس طرح سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی اور پیغمبر اسلام نے کس اسلوب کے ساتھ اسلام کی دعوت دی اور لوگ کس طرح اسلام کی صف میں شامل ہوئے۔

(۶) اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مصنف: پروفیسر کے ایس کرشناراؤ)

اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ایک مقبول عام ہندو داعی پروفیسر کے ایس کرشناراؤ کی لکھی ہوئی کتاب جس میں اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اور پیغمبر اسلام کی خصوصیات وامتیازات کو ادبی اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہر طرح سے مقبول عام ہے۔

(۷) اسلام کرپا ایوم کا دھرم (مؤلف: خالد ابو صالح)

اسلام احسان و نرم خوئی کا مذہب ہے۔ اس کتاب میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام سراپا امن و شانتی اور عفو و کرم کا دھرم ہے اور اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اللہ کی طرف سے بھٹکتی ہوئی روح کے لیے صلہ رحمی کے سرچشمہ ہیں۔ اس کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات حسنہ کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(۸) اسلام دھرم کی مہانتا: (عطاء الرحمٰن، ضیاء اللہ)

اسلام ایک عظیم و مسلم مذہب ہے، اس کتاب میں اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات و امتیازات کو ادبی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کی آفاقیت دیگر ادیان و مذاہب پر بالکل عیاں ہے۔

(۹) اللہ کے پیغمبر کے سدے ویوہار کے کچھ درشن: (عطاء الرحمٰن، ضیاء اللہ)

یعنی اللہ کے پیغمبر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی زندگی کی بعض خصوصیات: انسانیت کے لیے یہ باعث شرم ہے کہ انسانیت کے علمبردار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت پر سخت گیر اور عدم صلح پسندی کا الزام عائد کر کے ان کی بے عزتی کی جائے، جن کی زندگی اور بعثت کا مقصد ہی اخلاقیات کا فروغ تھا، اس کتاب میں انہی پہلوؤں کو اجاگر کر کے معترضین کے اعتراضات کا خوش اسلوبی کے ساتھ جواب شافی دیا گیا ہے۔

(۱۰) اسلام دھرم کی وشیشتا: (محمد بن عبد الوہاب)

اس کتاب میں اسلام کی خصوصیات اور اس کے حقائق کی تفصیل ہے کہ اسلام ایک سچا دھرم ہے اور یہی وہ قابل اعتماد دھرم ہے جس کو قبول کیے بغیر کسی انسان کو جنت کی ہوا تک نہیں لگ سکتی۔ نیز تمام لوگوں پر اسلام کو قبول کرنا اور اس کے علاوہ دیگر مذاہب کو ترک کرنا لازم ہے۔ جو شخص اسلام چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو تلاش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا دین و

دھرم قبول نہیں کرے گا۔ نیز اس کتاب میں اس کا بھی خلاصہ ہے کہ بدعات کا فروغ بھی معاشرہ کے لیے ناسور ہے۔ اس لئے بدعات سے بھی زندگی کو پاک رکھنا چاہئے۔

(۱۱) جس کا انتظار تھا: (ماہر القادری)

276 صفحات پر مشتمل کتاب میں ماہر القادری نے نہایت شیریں انداز میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو بیان کیا ہے، آپ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات بلیدان کی صبح، پاکباز عبد اللہ، شام کی اور، آمنہ بیوہ ہوگئیں، حلیمہ کے یہاں، غموں کے دو پہاڑ، چچا کا سہارا، جوانی، لڑائی رک گئی، شام کی یاترا سے ویواہ تک، پہلی شادی، سچائی کی مخالفت، پتھروں کی بارش، عام الحزن، مدینہ کا سفر، مکہ کی جیت، مکہ میں، مکہ میں فتح کے بعد، غزوۂ تبوک، جان نچھاور کرنے والے ایک صحابی، بادشاہوں کے نامے جیسے عناوین کے تحت ادبی انداز میں یہ کتاب تحریر کی گئی ہے، انداز نگارش میں ادبی پہلو جس قدر نمایاں ہے کہ اس سے کسی قاری کو انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

(۱۲) عرب کا چاند: (سوامی لکشمن پرساد)

کتاب ’’عرب کا چاند‘‘ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر مشتمل ہے، ابتدائے اسلام سے آج تک نہ جانے کتنی بے شمار کتب مختلف زبانوں میں مؤرخانہ انداز میں، عالمانہ انداز میں، عارفانہ انداز میں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی، لیکن ادیبانہ انداز میں سیرت کے موضوع پر جس طرح مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ’’النبی الخاتم‘‘ اردو میں ادبی حیثیت سے اپنی انفرادیت رکھتی ہے اسی طرح ہندی میں ’’عرب کا چاند‘‘ اپنی شان انفرادیت کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ چار سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب بیشتر لوازمات سیرت نگاری سے متصف ہوتے ہوئے اپنے انداز کی ندرت و جدت کے اعتبار سے سرمایۂ افتخار ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا مصنف

ایک ہندو نوجوان ادیب ہے جس نے قومی تعصب سے بالاتر رہ کر حقیقت شناسی کے جذبہ سے خاتم الانبیاء کی حیات طیبہ کو ایسے ادبی انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف لائق داد وتحسین بلکہ قابل رشک ہے۔

(۱۳) جیون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: (عنایت اللہ سبحانی)

مسلم معاشرہ میں ماہ ربیع الاول بڑا مبارک سمجھا جاتا ہے، یہ مہینہ ہمارے لئے اور سچ پوچھئے تو سارے انسانوں کے لئے کبھی نہ بھولنے اور ہمیشہ یاد رکھنے والا ہے، اب سے کوئی چودہ سو سال قبل اسی ماہ کی نویں تاریخ پیر کے دن صبح سویرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئے۔ مصر کے ایک عالم دین محمود پاشا فلکی نے حساب لگا کر بتایا کہ انگریزی کے مطابق ۲۰؍اپریل ۵۷۱ء میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

اب سے چودہ سال قبل عرب اور ساری دنیا کا حال کیا تھا اگر آپ اس پر غور کریں تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ دن سارے انسانوں اور پوری دنیا کے لئے کتنا بڑا اور کیسی خوشی کا دن ہے اور آج بھی جب کہ چاروں طرف لوٹ مار، چوری، ڈکیتی، شراب خوری، بے شرمی اور بدکاری کی تاریکی چھائی ہوئی ہے، یہ وہی دن ہے جو ہمیں ایسی ہستی کی یاد دلاتا ہے جو رہتی دنیا تک تاریکی کو روشنی میں بدلتی رہے گی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی تاریکی میں روشنی کا اکیلا مینار۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا میاں عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد رکھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ نام کیوں رکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے کی ساری دنیا تعریف کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری کی۔

حلیمہ سعدیہ کی گود میں:

اس زمانہ میں عرب کا یہ رواج تھا کہ شہر کے بڑے لوگ اپنے بچوں کو دودھ

پلوانے کے لئے دیہات میں بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں کی کھلی فضا میں رہ کر خوب موٹے تازے ہو جائیں، اس زمانہ میں عرب کے دیہات کی زبان شہروں سے زیادہ صاف اور زوردار ہوتی تھی، دیہات میں رہ کر بچوں کی زبان خوب اچھی ہو جاتی تھی۔ پیارے نبیؐ کو بھی اس رواج کے مطابق حلیمہ نام کی ایک دائی کو سونپ دیا گیا۔ دائی حلیمہ ''سعد'' قبیلہ کی تھیں اس لئے ان کو حلیمہ سعدیہ کہتے ہیں۔ آپ حلیمہ سعدیہ کے پاس تقریباً چار سال رہے۔ آپ حلیمہ اور ان کے بچوں کو بہت چاہتے تھے۔ جب آپ نبوت سے سرفراز کئے گئے تو حلیمہ، ان کے شوہر اور بچے سب مسلمان ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طفولیت کو ادبی انداز میں بیان کرتے ہوئے مولانا عنایت اللہ سبحان اپنی کتاب ''جیون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' میں رقمطراز ہیں:

''ماں باپ کی آنکھیں بند ہوئیں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی رحمتوں سے محروم نہ ہوئے۔ یہ اسی کی بڑی مہربانی تھی کہ آپ کو ایسے دادا ملے جو آپ پر ماں باپ کی طرح مہربان تھے، پھر ایسے چچا ملے جنہوں نے آپ کو کبھی یتیمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ دادا عبدالمطلب کا انتقال ہوا تو ابوطالب نے آپ کو اپنی گود میں لے لیا، یہ عبدالمطلب کے بیٹے تھے اور آپ کے چچا تھے، عبدالمطلب نے اپنی موت سے قبل ان کو آپ کا سرپرست بنایا تھا اور وصیت کر گئے تھے کہ محمد کا خیال رکھنا اور ان کی خبر گیری اور دیکھ بھال میں کوئی کسر باقی نہ رکھنا۔ عبدالمطلب کی کئی بیویاں تھیں، ان بیویوں سے دس بیٹے تھے، ابوطالب نہ تو بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور نہ سب سے زیادہ مالدار تھے لیکن سب سے زیادہ باوقار تھے۔ سنجیدگی و شرافت میں سب سے آگے تھے۔ عبدالمطلب کی طرح ابوطالب بھی آپ کو بہت چاہتے تھے۔ ہمیشہ بھتیجے کو اپنے ساتھ رکھتے، سوتے تو ساتھ لے کر سوتے، کہیں جاتے تو

ساتھ لے کر جاتے، آپ کے آگے نہ ان کو اپنی جان کی پرواہوتی نہ اپنے بچوں کی۔ان کو آپ سے اتنی محبت کیوں تھی، آپ دن رات ان کی نگاہوں کے سامنے رہتے وہ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے اندر سچائی اور ایمانداری ہے، شرافت اور پاکبازی ہے، ابھی آپ کی عمر ہی کیا تھی؟ بالغ بھی نہ ہوئے تھے۔(۱۴)

(۱۴) وشونیتا محمد صلی اللہ علیہ وسلم: (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائدانہ صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی ہندی تصنیف ''وشونیتا میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر تحریر فرماتے ہیں: ''مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ''سرور عالم'' کہتے ہیں، سیدھے سادے الفاظ میں اس کا معنیٰ ہے ''دنیا کا سردار'' ہندی میں اس کا معنیٰ ''وشونا یک'' ہوگا اور انگریزی میں ''لیڈر آن دی ورلڈ'' دیکھئے کسی شخص کو وشونیتا کہنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہئے کہ اس نے کسی خاص ذات، نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ایک محبّ وطن یا قوم پرست لیڈر کا آپ اس شکل سے جتنا چاہیں احترام کریں کہ اس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی لیکن آپ اس کے ملک کے باشندہ نہیں ہیں تو وہ کسی حالت میں آپ کا نیتا نہیں ہوسکتا، جس شخص کی محبت، دردمندی، فکرمندی کے کام چین یا اسپین تک محدود ہوں مجھ ہندوستانی کو اس سے کیا مطلب کہ میں انہیں اپنا قائد تسلیم کروں، بلکہ وہ اپنی ذات کو دوسروں سے اعلیٰ قرار دیتا ہے اور دوسروں کو گھٹا کر اپنی ذات کو بڑھانا چاہتا ہے تو میں اس سے مناقشہ کرنے کا پابند ہوں۔سبھی ذات کے لوگ کسی ایک شخص کو اپنا قائد اسی وقت تسلیم کرسکتے ہیں جب ان کی نظر میں سبھی ذات اور سبھی انسان مساوی ہوں، وہ سب کا احترام اور سب کے لئے دل دردمند رکھتا ہو۔

دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اس نے ایسی سچائی پیش کی ہو جو ساری دنیا کے لوگوں کی رہنمائی کرتی ہو۔اور اس میں بنی نوع انسان کے جملہ مسائل کا حل بھی موجود ہو، لیڈر کے معنیٰ ہی ہیں رہنما، لیڈر کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ وہ فروغ اور ترقی کی رہنمائی کرتا ہے یعنی دنیا کا قائد وہی ہوسکتا ہے جو ساری دنیا کے لوگوں کو ایسی راہ بتائے جس میں سبھوں کی ترقی کا راز پنہاں ہو۔

قائد ہونے کیلئے تیسری شرط یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص مدت کے لئے نہ ہو بلکہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر مفید اور کارگر ہو۔جس قائد کی رہنمائی ایک مدت میں نفع بخش اور دوسری میں ضرر رساں ہو تو اس کو عالمی قائد نہیں کہا جاسکتا۔اپنا قائد بھی وہی ہے کہ جس کی رہنمائی رہتی دنیا تک کے لئے ہو۔چوتھی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اس نے صرف سچائی ہی پیش کرنے پر اکتفانہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کئے ہوئے اصولوں پر زندگی میں سختی سے عمل بھی کیا ہو اور ان کی بنیاد پر ایک جیتا جاگتا معاشرہ تعمیر کیا ہو۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ مذکورہ بالا چاروں شرطیں اس عظیم شخصیت میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جن کو ہم ''سرور عالم'' ''وشونیتا'' کہتے ہیں، پہلی شرط کو پہلے لیجئے۔آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کرلیں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا وطن پرست کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں تمام بنی نوع انسان سے محبت والفت یکساں طور پر موجود ہے، ان کی نظر میں سارے انسان برابر تھے، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی ذات، کسی نسل، کسی ملک کے خصوصی منافع سے انہیں قطعی مطلب نہیں تھا۔امیر، غریب، اونچ نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، ایشیائی اور یورپین، شامی اور آریہ سب کو وہ ایک نگاہ سے دیکھتے تھے جیسے کہ سب ایک ہی انسان کے پارٹ ہیں۔ان کے منھ سے زندگی میں کبھی بھی ایسا لفظ نہیں نکلا اور نہ ہی زندگی میں انہوں

نے کوئی ایسا کام کیا جس سے یہ اندیشہ پیدا ہو کہ انہیں ایک خاص طبقہ کے لوگوں سے زیادہ محبت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی اسی طرح سے ان کے کاموں میں معاون رہے جس طرح سے عرب اور ان کے بعد دنیا کے ہر گوشہ ہر نسل اور ہر ذات کے لوگوں نے انہیں اپنا قائد تسلیم کیا۔ اب دوسری شرط کو لیجئے:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص برادریوں اور خاص ملکوں کے مسائل کو حل کرنے میں ہی اپنا وقت صرف نہیں کیا بلکہ اپنی پوری توانائی اس مرکزی مسئلہ کو حل کرنے میں صرف کی جس پر ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا دارومدار تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اس عظیم مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ آغاز سے ہی انسان کو خداپرستی کی تعلیم دینے کے لئے متحرک رہے، ایک خدا کی بندگی کی تعلیم دی جو ہمیشہ پیغمبروں کا امتیاز رہا ہے۔ آپ نے کسی نئے خدا کی بندگی کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ کسی ایسی چیز کی تعلیم دی جو ان کے اختیار سے باہر ہو۔ (۱۵)

(۱۵) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آدرش: (شری ناتھورام)

شری ناتھورام اپنی کتاب ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آدرش'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ان کے پیغام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج جب ہم پیغمبروں کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ان مہربان پیغمبروں کی مخالفت لوگوں نے کیوں کی، سچی باتوں پر مبنی ان کی تعلیمات کو باشندگان وطن نے کیوں قبول نہیں کیا۔ ہر نبی کی ان کے اپنے دور میں مخالفت کی گئی۔ انہیں اذیت پہنچائی گئی۔ ان پر ہر طرح کے ظلم وستم ڈھائے گئے۔ قرآن اس سچائی کو ان مناظر میں بیان کرتا ہے۔ کوئی بھی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا جن کو اذیت نہ پہنچائی گئی ہو، اسی سچائی

کی طرف ورقہ بن نوفل نے اشارہ دیا تھا کہ یہ قوم تمہیں جھٹلائے گی، تم پر ظلم ڈھائے گی، ملک بدر کردے گی اور تم سے لڑائی کرے گی: (۱۶) (سیرت ابن ہشام جلد ا ص: ۲۵۶)

اور آگے ورقہ بن نوفل کہتے ہیں کہ کاش اس وقت میں موجود ہوتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال باہر کرے گی۔ اسے سن کر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غم واندوہ کے ساتھ کہا کہ کیا میری قوم مجھے اپنے وطن سے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا: آپ جس چیز (نبوت) کو لے کر آئے ہیں اسے لے آنے والا ہر شخص ظلم کا شکار ہوا ہے۔ (بخاری) شری ناتھورام مزید آگے لکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ زمانہ یکساں نہیں ہوتا۔ مختلف برادریوں کے رسم ورواج میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی مخالفت کی وجوہات بھی متعدد رہی ہوں گی۔ ہر پیغمبر کی مخالفت کی وجوہات کا پتہ لگانا آج ہمارے لئے مشکل ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انبیاء پر مظالم ڈھائے جانے کی وجوہات بھی متعدد ہیں، لیکن آپ کے مخالفین کے حالات کا صحیح علم ہوجائے تو مختلف پیغمبروں پر کئے گئے ظلم وستم کی وجوہات سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی، اسی لئے سب سے پہلے ہم پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے حالات اور آپ سے ان کے معاملات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

مخالفت کرنے والے لوگ:

تین طرح کے لوگوں نے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ان میں پہلا طبقہ مشرک، دوسرا یہودی جبکہ تیسرا منافق ہے۔ ان تینوں طبقے کے لوگوں کی مخالفت کی وجوہات الگ الگ تھیں اور مخالفت کے طریقے بھی جداگانہ تھے۔ مشرک: عرب کے اصل باشندہ تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو جبکہ ان بتوں میں تمہارے تحفظ ودفاع یا تم کو سزا دینے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے تو ان کا جواب تھا

''ہم ان کی پرستش صرف اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے کرتے ہیں، اسی طرح تمام مشرک اپنی بت پرستی کی یہی وجہ بیان کرتے تھے اور آج تک یہی کہا جا رہا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ اللہ ایک ہے اور وہی سب کا پالن ہار ہے انسان بے بس و بے سہارا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کی نظر میں:

اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کیا، آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی و تعلیمات کا جن لوگوں نے بھی غیر جانبدار ہو کر مطالعہ کیا وہ آپ کی عظمت و اہمیت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکے۔ ہم یہاں چند بااثر مؤقر غیر مسلموں کے خیالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش کرتے ہیں:

امن و سلامتی کے پیغمبر:

سوامی وویکانند کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں امن و سلامتی کے پیامبر تھے۔ وہ انسانی زندگی میں الفت ومحبت کے علمبردار تھے۔ ان کے مذہب میں ذات، برادری، نسل وغیرہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ سوامی وویکانند اسلام سے بہت ہی متاثر تھے اور اس کے بھائی چارہ کی سچائی سے مرعوب بھی تھے۔ الموڑا سے بتاریخ 10 جون 1898 کو اپنے ایک دوست نینی تال کے محمد سرفراز حسین کو بھیجے ہوئے خط میں انھوں نے لکھا کہ ''اپنے تجربہ سے ہم نے یہ جانا ہے کہ روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں اگر کسی مذہب کے اندر عدل وانصاف اور مساوات کو اپنایا گیا ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسلام پوری انسانیت کو مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی مطلوب ہے۔ اس لئے ہمارا یہ یقین ہے کہ معاشرتی زندگی اسلام کے تعاون کے بغیر ناقص ہے''۔(۱۷)

سوامی وویکانند نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ''ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار طاقت کے بل پر یا دھوکہ کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے۔''(۱۸)

سی ایس شری نواس ''ہسٹری آف انڈیا'' میں جو مدراس سے 1937 میں شائع ہوئی تھی تحریر فرماتے ہیں: ''اسلام کے پیغمبر نے جب ایک منتظم کا عہدہ پایا تو بھی آپ کی زندگی ماقبل کی زندگی کی طرح سادہ رہی۔ آپ مصلح بھی تھے اور فاتح بھی۔ آپ نے لوگوں کے اخلاق کو بلند کیا، منتشر قبیلوں کو یکجا کیا اور ان کے درمیان ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ اپنے لوگوں کو پستی و گمراہی پر پایا لیکن ان کو صداقت کا پیغام دے کر بلندی سے سرفراز کیا۔ ان کو آپسی خاندانی جھگڑے میں ملوث پایا مگر ان کو آپسی اخوت ومروت کے رشتہ میں جوڑ دیا۔ گویا کہ آپ سبھوں کے لئے رحمت بن کر آئے۔(۱۹)

زندگی کا پیغام:

سرور کائنات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مہاتما گاندھی کے خیالات اس طرح ہیں: ''میں پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کر رہا تھا، جب میں نے کتاب کی دوسری جلد بھی ختم کر دی تو مجھے دکھ ہوا کہ اس عظیم الشان زندگی کے مطالعہ کے لئے اب میرے پاس کوئی کتاب نہیں۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ یہ تلوار کی طاقت نہ تھی جس نے اسلام کے لئے پوری دنیا میں فتح حاصل کی۔ بلکہ یہ اسلام کے پیغمبر کی انتہائی سادہ زندگی تھی اور آپ کا حسن سلوک تھا۔ آپ اپنے ساتھیوں سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور خدا پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ تلوار کی قوت نہیں تھی بلکہ وہ امتیازی خصوصیات تھیں جن کے ذریعہ تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں اور اسلام کو فتح ونصرت ملی۔

مجھ سے کسی نے کہا کہ جنوبی افریقہ میں جو یورپین آباد ہیں اسلام کی تشہیر سے کانپ رہے ہیں اس اسلام سے جس نے مورکّو میں روشنی پھیلائی اور باشندگان عالم کو

بھائی بھائی بن جانے کا پیغام دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی افریقہ کے یورپین اسلام سے نہیں ڈرتے ہیں، لیکن فی الواقع وہ اس بات سے خائف ہیں کہ اگر افریقہ کے آدی واسیوں نے اسلام قبول کرلیا تو وہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں سے برابری کا درجہ مانگنے پر اتر جائیں گے۔ آپ ان کو ڈرنے دیجئے۔ اگر بھائی بھائی بننا پاپ ہے، اگر وہ اس بات سے پریشان ہیں کہ ان کی نسلی برتری باقی نہ رہ پائے گی تو ان کا ڈرنا بالکل مناسب ہے۔ کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ اگر ایک سیاہ فام عیسائی ہوجاتا ہے تو وہ سفید رنگ کے عیسائیوں کے برابر نہیں ہوسکتا، مگر جیسے ہی وہ حلقہ بگوش اسلام ہوتا ہے بالکل اسی وقت وہ اس پیالے میں پانی پیتا ہے اور اسی طشتری میں کھانا کھاتا ہے جس میں کوئی اور مسلمان پانی پیتا اور کھانا کھاتا ہے۔ تو سچائی یہی ہے جس سے یورپین کانپ رہے ہیں''۔ (۲۰)

انسانیت پھر زندہ ہوتی:

سوامی لکشمن پرساد لکھتے ہیں: ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل دنیا میں کہیں بھی کوئی امید کی کرن نہیں دکھائی دیتی تھی، عالمگیر گمراہی وتاریکی چھائی ہوئی تھی، دور دور تک تہذیب وثقافت کی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ جب شرافت کا نام ونشان مٹ چکا تھا اور روحانیت کے خوبصورت افکار ذات باری تعالیٰ کے افکار کی وجہ سے چھپ گئے تھے۔ انسان خدائی عظمت کو فراموش کرکے خودساختہ بتوں کی پرستش کرنے لگا تھا۔ اسی دوران عرب کی چوٹی سے نور چمکا جس نے دنیا کے حالات کو یکسر بدل دیا۔ گوشہ گوشہ کو نور ہدایت سے جگمگادیا۔ آج سے چودہ سو سال قبل مکہ کی گلی سے ایک انقلابی آواز اٹھی جس نے ظلم وستم کے ماحول میں تہلکہ مچادیا۔ (۲۱)

سبھی بنی نوع انسان کے رہنما:

لالا کاشی رام چاولہ: ''اے مسلم بھائی''، میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت

ورافت کو ادبی انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: سبھی مذاہب کے بانی بڑے بڑے گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ان کی پیدائش پر بڑی دھوم دھام مچی مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام، بدھ بھگوان، حضرت موسیٰ علیہ السلام، بھگوان کرشن، بھگوان مہاویر، گرونانک سبھوں کا بچپن انتہائی لاڈ پیار، شان وشوکت سے گزرا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانیوں کا سلسلہ ولادت سے قبل ہی شروع ہوچکا تھا۔ چھ سال کی عمر میں ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے، دو سال دادا کی گود میں کھیلے اور آٹھویں سال میں وہ بھی وفات پاگئے۔ پھر آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ کیا یہ خدائی چمتکار نہیں کہ اس صورت میں زندگی بسر کرنے والے کو قائد تسلیم کیا جارہا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اسی سادہ خاندان میں پیدا ہونے والا امی سرزمین عرب سے جہالت وناخواندگی کو مٹانے کا سبب بنے گا۔

پوری کائنات میں اسلامی پرچم لہرانے والا رسول ہوگا۔ قرآن کا پیغام پہنچانے والا نبی ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل وانصاف اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کا جو پیغام دنیا کو دیا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آپ کی رحمدلی کا حال یہ تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں نہ کبھی کوئی غلط بات کہی اور نہ کسی جاندار کو تکلیف پہنچائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر قبیلوں کے سرداروں کا احترام کرتے تھے۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے باوقار طریقے سے ملاقات کرتے تھے۔ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے ساری رات عبادت کرتے تھے وہیں مخالفین کے لیے دعائیں بھی مانگتے تھے۔ جب غزوۂ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوگئے تو آپ نے فرمایا: یا اللہ! تو میری قوم کے لوگوں کو ہدایت دے کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ یہ آپ کا معجزہ ہی ہے کہ عرب کے جھگڑالو، جواری، شرابی اور سوتیلی ماں سے شادی کرنے والے آپ کی محنت سے ایماندار اور دوسروں کے لیے ہادی بن گئے۔ (۲۲)

ایک عرب نے ساری دنیا کا بول بالا کردیا
خاک کے ذروں کو ہم دوش ثریا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی ہوگئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

ساری دنیا کے لیے امن کے پیامبر:

شری دیوداس گاندھی جو آنجہانی مہاتما گاندھی کے بیٹے تھے اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں: ایک عظیم المرتبت شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزمین عرب کو اس وقت روشن کیا جب پوری دنیا میں گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ اپنا سارا کام مکمل کر چکے تھے۔(۲۳)

آخری بات:

سیرت نبوی پر غیر مسلموں نے وقیع مضامین تحریر کیے ہیں اور بہت سی کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں تاہم ہندی زبان میں سیرت کے موضوع پر بہت بڑا ذخیرہ تو نہیں ہے البتہ کچھ کتابوں کے ہندی ترجمے اور ہندی کے بعض مصنفین نے جو کچھ تحریر کیے ہیں وہ یقیناً ہندی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ عشق وعقیدت کی چادر میں لپٹی ہوئی تحریریں عام طور پر ایسے غیر مسلموں کی ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی خدمات اور انسانی اوصاف سے متعلق ہیں، چناں چہ ہندی زبان کے اکثر مصنفین نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی غربت و جفاکشی، امانت و دیانتداری، عدل وانصاف، مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد سے ربط وہم آہنگی، ایفاء عہد، غریبوں ومسکینوں سے ہمدردی، ضرورتمندوں اور محتاجوں کی دادرسی جیسی صفات پر قلم اٹھایا ہے اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی زبان و ادب میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جتنا بھی مواد ہے اس کا تعلق محض عقیدت نبوی سے ہے۔ تاریخی حیثیت سے سیرت نبوی پر کام نہیں کیا گیا اور نہ ہی ترجمہ کا ہی کام وافر مقدار میں ہو پایا ہے۔

اس لیے ہندوستان کے تناظر میں یہ ضروری ہے کہ سیرت کے گراں قدر ذخیرہ کو ہندی زبان وادب میں منتقل کرنے کی سنجیدہ کوشش شروع کی جائے، کیوں کہ نہ صرف آں حضور پر ایمان وعقیدہ نہ رکھنے والے اس ملک کے بیشتر افراد ہندی زبان لکھتے بولتے اور پڑھتے ہیں بلکہ محمد کے نام لیوا بھی ہندی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر علماء اور فضلاء کے اس باوقار پلیٹ فارم سے اسلامی مہمات سے وابستہ کارکنان و اداروں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ سیرت نبوی کے عنوان پر مختلف اکیڈمیاں اور تحقیق و ترجمہ کے ادارے قائم کئے جائیں اور محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات اور پیغامات سے ہندی ادب کا دامن بھر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو سیرت نبوی پر چلنے اور کہنے سے زیادہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

حوالہ جات

۱۔ لسان العرب المجلد الرابع ص ۳۸۹،۳۹۰ (مطبوعہ بیروت، لبنان)۔
۲۔ المعجم الاعظم الجزء الثالث ص: ۱۴۸۷ مصباح اللغات ص: ۳۸۷۔
۳۔ جامع اللغات جلد سوم ص: ۴۵۴۔
۴۔ اردو انسائیکلو پیڈیا ص: ۹۴۴ (مطبوعہ پنجاب)۔
۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانشگاہ پنجاب جلد دوم ص: ۵۰۵۔
۶۔ سیرت نبوی کی ابتائی کتابیں اوران کے مؤلفین جوزف ہوروش مترجم: نثار احمد فاروقی ص: ۱۱۔۱۷۔
۷۔ شبلی نعمانی: سیرت النبی جلد اول: مقدمہ ص: ۸ حاشیہ۔

۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دوم ص:۶۰۵۔۶۰۵۔

۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: فن سیرت نگاری پر ایک نظر، (فکر ونظر اپریل ۱۹۷۶ص:۸۲۶)۔

۱۰۔ محمد فواد عبدالباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ص:۳۷۴(مطبوعہ بیروت لبنان)۔

۱۱۔ المعجم المفہرس، لالفاظ الحدیث النبوی ا۔ی ونسنک ص:۴۷۔

۱۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد اول:ص:۱۴۸۔

۱۳۔ مسند احمد بن حنبل جلد اول:ص:۵۷۔

۱۴۔ عنایت اللہ سبحانی: جیون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ص:۱۸۔مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

۱۵۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: وشوندیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ص:۳،۴۔مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

۱۶۔ شری ناتھورام: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آدرش:۴۔مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

۱۷۔ وویکا نند ساہتیہ جلد 5 ص:415۔

۱۸۔ وویکا نند ساہتیہ جلد 8 ص:330۔

۱۹۔ بھارتیہ سبھیتا پر مسلمانوں کے اُپکار صفحہ:31 بحوالہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ص: 129۔

۲۰۔ (جگت مہارشی ص:2 بحوالہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ص:130۔

۲۱۔ عرب کا چاند۔سوامی لکشمن پرساد بحوالہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ص:131۔

۲۲۔ اے مسلم بھائی،ص:252 تا 258 لالہ کاشی رام چاؤلا بحوالہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ص:132۔

۲۳۔ ڈاکٹر محمد احمد: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ص:135،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

برصغیر ہند۔ پاک کے چند عظیم محدثین عظام کی حیات وخدمات

ہندوستان کی شاندار علمی تاریخ سے پورا عالم اسلام متعارف ہے۔ اس سرزمین نے علم وآگہی، محققین، مدبرین، مفسرین، محدثین فقیہہ اور شعر وادب کے ایسے جیالوں اور تصوف وسلوک کے ایسے قطب وابدال کو جنم دیا ہے جنہوں نے نہ صرف اپنے گاؤں، علاقے واپنی ریاست اور اپنے ملک بلکہ کائنات کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں علم وعمل کی قندیلیں روشن کیں ہیں۔ انہوں نے دنیائے فانی کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کیا۔ بلاشبہ ہندوستان کے علماء کے ناقابل فراموش اور غیر معمولی کارناموں، ان کی علمی ودینی اور تدریسی خدمات کو تاریخ کے صفحات سے نکال دیں تو دنیائے انسانیت، علم وتحقیق اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف کا ہر گوشہ خالی نظر آئے گا۔

علوم وفنون کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں علماء ہند کے شاندار ماضی کی خدمات رقم نہ ہوں۔ بالخصوص اسلامی علوم میں یہاں کے علماء اسلام کی خدمات جلیلہ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود ان کے درس کی خوشبو سے دبستان علم وادب معطر ہے

اوران کی گراں قدر تصنیفات وتالیفات کا ہرسو چرچا ہے۔علم وفن کے متوالے انہیں گوہرنایاب سے استفادہ کر کے آج بھی اپنی علمی تشنگی بجھاتے ہیں اور علم دین حاصل کرنے والے اپنے شاگردوں کو سیراب وشاداب کرتے ہیں۔

میں نے اپنے اس مقالے میں برصغیر ہندوستان اور پاکستان کی انہیں معظم ومعزز شخصیات کو شامل کیا ہے جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کرتے کرتے اپنی زندگی فنا کردی۔کلام نبی سے بے پناہ عشق ومحبت کی وجہ سے انہوں نے خدمت حدیث پاک کو اپنی زیست کا سامان بنالیا اور آخری سانس تک اس لذت کو محسوس کرتے رہے۔ان علما کے قدوم لزوم کی برکت کا نتیجہ ہے کہ علوم دینیہ کو حاصل کرنے والے طالبان نبوت دنیا کے کونے کونے سے ان اداروں کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کے نقش پا موجود ہیں۔

برصغیر کی علمی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت وا ہوتی ہے کہ خدمات حدیث اور تدریس حدیث میں تین شخصیات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۵۵۱ء تا ۱۶۴۲ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۳ء) اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (۱۱۵۹ھ۔۱۲۳۹ھ) کی مشترکہ کوششوں کے سبب اساتذہ حدیث کی ایسی جماعت تیار کی جن کے جلائے ہوئے چراغ سے کئی چراغ جلتے چلے گئے اور علم حدیث کی روشنی ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلتی گئی۔

مذکورہ شخصیات کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، محدث عصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ، مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ،

مولانا شیخ یونس جونپوریؒ، مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ، مولانا نصیر احمد خانؒ، مولانا سلیم اللہ خاں پاکستانؒ، مولانا عبدالحق اعظمیؒ، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا خورشید عالم دیوبندی اور مولانا ریاست علی بجنوری وغیرہم کے علاوہ بہت سے اساتذہ حدیث ہیں جنہوں نے علوم حدیث کی درس وتدریس کے توسط سے یا کتب احادیث پر مختلف زاویے سے علمی وتحقیقی خدمات انجام دیں ہیں۔محدثین عظام کی یہ وہ خدمات ہیں جن سے آنے والی نسلیں تاقیامت استفادہ کرتی رہیں گی۔

اپنے موضوع کی مناسبت سے آئندہ صفحات میں برصغیر کے چند محدثین عظام کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں استاذ المکرم عالم باعمل داعی توحید وسنہ امیر المومنین فی الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ کی حیات وخدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی جائے گی۔

حدیث پاک کا مقام ومرتبہ:

آنحضرت ﷺ جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے امت آپ کی اور آپ کے ارشادات اور اسوہ حسنہ کی یہی حیثیت سمجھی اور آپ کے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے آپ کے اعمال وافعال کو بچشم خود دیکھنے والے صحابہ کرامؓ نے علم وہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کے ساتھ حفاظت کی اور پوری امانت کے ساتھ بعد والوں کو پہنچایا، پھر بعد کے قرنوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے بہترین افراد کو احادیث وسنن کے اس بے پایاں دفتر کی تدوین وترغیب، تحقیق وتنقید، تعلیم وتعلم، ترجمہ وتشریح، حفظ واشاعت اور اس سے متعلق بہت سے مستقل علوم وفنون کی ایجاد اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف وتصنیف وغیرہ وغیرہ سیکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی جو کبھی کسی قوم اور کسی امت کو نہیں ملی۔اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ خاتم الانبیاء ﷺ کو اس دنیا سے

گئے ساڑھے چودہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے لیکن آپ کے ارشادات اور اسوہ حسنہ کی روشنی ہر راہ رو کے لیے آج بھی ایسی ہی موجود ہے جیسی قرن اول میں تھی۔

اور حقیقۃ یہ سلسلہ نبوت ختم کر دئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ختم النبین ﷺ کی ہدایات و تعلیمات اور آپ کے اسوہ حسنہ کی حفاظت کا یہ انتظام ہونا ضروری بھی تھا جبکہ آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے اور آپ ہی اس دنیا کی آخری نسل تک کے لیے جب نبی ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کی تعلیمات و ہدایات اور آپ کا اسوہ حسنہ اس دنیا کے آخری دن تک محفوظ رہے تا کہ ہر زمانہ کے طالبان ہدایت اس سے وہ روشنی اور وہ نور حاصل کر سکیں جو آپ کے زمانہ میں آپ پر ایمان لانے والے خوش نصیب آپ کی مقدس اور منور ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے۔ آج کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی ساڑھے چودہ صدیوں میں اللہ تعالی کی طرف سے مسلسل یہ انتظام رہا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ خداوندی انتظام یوں ہی رہے گا اور اس مقصد کے لیے جب جس خدمت کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندوں کو اس کی توفیق ملتی رہے گی۔

(محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی۔ مقدمہ معارف الحدیث، تالیف مولانا محمد منظور نعمانی، صفحہ ۴۷-۴۸)

ہندوستان میں علم حدیث:

برصغیر ہندو پاک میں علم حدیث کا آغاز پہلی صدی ہجری سے ہوا اور دوسری صدی ہجری میں حضرت ربیع بن صبیح بصری (م 160ھ) برصغیر میں وارد ہوئے۔ ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ المہدی باللہ نے عبدالملک بن الشہاب کو جہاد کے لیے روانہ کیا تو اس کے ہمراہ ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے جنہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہ پہلے

شخص ہیں جنہوں نے فن حدیث میں کتاب تصنیف کی تھی۔ ''اَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ فِي الْاِسْلَامِ''۔

عبدالملک نے فتح حاصل کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا اس لیے انہوں نے کچھ دنوں مزید قیام کرنا مناسب سمجھا، اسی دوران ہوا میں عفونت پیدا ہوئی اور تقریبا ایک ہزار افراد اس وبا کا شکار ہوئے، ان شہداء میں حضرت ربیع بن صبیحؒ بھی شامل تھے اس لیے یہیں سپرد خاک ہو گئے۔ ان کے بعد ہر صدی میں کوئی نہ کوئی محدث برصغیر میں تشریف لاتے رہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت (644-634ء) میں ہندوستان میں اسلام کی آمد ہوئی اور کئی شہروں پر عرب حکمراں قابض ہوئے، مکران اور سندھ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت ہی میں فتح ہوا ان شہروں کے فتح ہوتے ہی ہندوستان میں صحابہ و تابعین کی آمد کا باضابطہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہی آنے والوں میں علماء و محدثین بھی تھے جن کی ذات گرامی سے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جگہ جگہ درس حدیث کی درسگاہیں اور مراکز قائم ہوئے۔ ابن کثیر الدمشقی (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

''اور اس سے پہلے حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں صحابہ کرام نے ان علاقوں کے اکثر حصوں کو فتح کر لیا تھا اور ان بڑے شہروں کے بعد ان کی بنیادوں میں گھس گئے تھے جیسے شام، مصر، عراق، یمن اور ترک کے ابتدائی شہر اور ماوراء النہر اور مغربی ملکوں کے اور ہندوستان کے ابتدائی شہروں میں داخل ہو گئے تھے۔''

سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات سے پہلے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں صحابہ کرام نے ان اطراف کے اکثر حصے فتح کیے۔ شام، مصر، عراق، یمن اور

اوائل بلادترکستان میں اسلام کی فتح ونصرت کا پرچم بلند کیا علاقہ ماوراءالنہر، اوائل بلادمغرب اور افریقہ اور اوائل ہند کی سرزمین بھی ان کے قدموں کی برکت سے منور وتابندہ ہوئی۔اوائل ہند سے مراد سندھ ومکران کے وہ علاقے ہیں جو فارس وبجستان سے متصل تھے،انہیں راستوں سے مجاہدین اسلام ہندوستان آئے،خلافت راشدہ میں تھانہ، بھروچ، سندھ اورمکران میں کئی بارغزوات کے باعث یہ علاقے اسلامی سلطنت کے زیرنگیں آگئے۔ صحابہ کی آمد سے ہندوستان میں احادیث مبارکہ کی نشرواشاعت بہت تیزی سے ہونے لگی ہندوستان کے علماء ومحدثین نے پوری دنیا میں علم حدیث کی اشاعت کے لئے جدوجہداورکوششیں کیں،حجاز میں بھی ہندوستانی محدثین کا قیام رہا بلکہ امام سخاوی اورابن حجر الہیتمی کی درسگاہوں سے ہندوستانی محدثین کی ایک بڑی جماعت نے سماعت حدیث کے بعدعالم اسلام کوعلم حدیث سے روشناس کرایا ہے۔

یہاں پر برصغیر ہند۔ پاک کے ان محدثین عظام کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں جنہوں نے سرزمین ہندکوعلم حدیث کی ضیاباریوں سے منور ودرخشاں بنایااورجن کے درس حدیث کی شہرت کاڈنکا چہاردانگ عالم میں بجااورعرب،مصروشام کے علماءحدیث نے ان کی خدمات کاصمیم قلب سےاعتراف کرتے ہوئےعلمی استفادہ کیا۔

ہندوستان کے لیے قابلِ فخر ہے کہ یہ سرزمین علماء ومحدثین کا گہوارہ رہی ہے، درس حدیث کی نہ معلوم کتنی درس گاہیں یہاں قائم ہوئیں اور یہ سلسلہ چلتا ہوا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اورحضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور پھر دارالعلوم دیوبند،اس کے بعد جامعہ مظاہرعلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر صوبوں تک پہونچا۔ جہاں سے علم وفن کی نئی نئی جہتیں دریافت ہوئیں،اور یہ قافلۂ قدس آج بھی رواں دواں ہے۔

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

(1833ء-1880ء)

برصغیر کے متبحر عالم،تحریک دیوبند کے قائد،مجاہد آزادی اوردارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ 1833ء میں اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے قریب واقع گاؤں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ دیوبند سے ۱۲/میل مغربی جانب واقع ہے۔

آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، تاریخی نام خورشید حسین رکھا گیا۔آپ کے والد ماجد شیخ اسدعلی بن غلام شاہ نہایت پرہیزگار،صاحبِ اخلاق اورصوم وصلوۃ کے پابند تھے۔

حضرت نانوتویؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں میں حاصل کی۔آپ بچپن ہی سے ذہین،محنتی اور سعادت مند تھے۔تعلیم کے دوران ہمیشہ اپنے ساتھیوں میں نمایاں رہے۔گاؤں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند پہنچے، جہاں مولانا مہتاب علی کے مکتب میں داخل ہوئے۔اس کے بعد سہارنپور میں اپنے نانا کے ساتھ قیام پزیر رہے، یہیں مولانا نوازصاحب سے عربی نحواورصرف کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔1843ء کے اواخر میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے ساتھ دلی لے گئے، جہاں کافیہ اور دیگر کتابیں پڑھیں، اورمحدث حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی الحنفیؒ سے حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔اس کے بعد سالانہ امتحان کے بغیر ہی دلی کالج میں داخلہ لے لیا۔دلی کالج میں داخلہ لینے سے قبل مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے منطق،فلسفہ اورعلم کلام پرمتعدد کتابیں پڑھ چکے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے مولانا احمد علی سہارنپوری الحنفیؒ کے کتب خانے

''مطبع احمدی'' میں کتابت کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا حکیم محمد صادق مرادآبادیؒ اور مولانا فیض الحسن گنگوہیؒ وغیرہ کو آپ نے زمانہ کتابت میں حدیث کی اکثر کتابیں پڑھائیں۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے بخاری شریف پر حاشیہ لکھنے کا کام شروع کیا تھا۔ چوبیس پاروں کا حاشیہ تو حضرت سہارنپوریؒ نے مکمل کیا تھا، آخر کے چھ پارے رہ گئے تھے۔ وہ انہوں نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ذمے لگادئے۔ حضرت نانوتویؒ نے لکھا اور قابل رشک لکھا۔

اس دوران آپ نے شیخ المشائخ، مجاہد کبیر سید الطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے تصوف کی راہ اختیار کی اور ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم ومعارف میں وہ مقام حاصل کر لیا جو ان کے زمانے میں واہب حقیقی نے ان کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ کے مرشد حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:

''ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔''

ایک موقع پر حضرت حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا:

''اللہ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شمس التبریز کے واسطے مولانا روم کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم عطا ہوئے جو میرے قلب میں آتا ہے بیان کر دیتے ہیں۔''

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند کے سیاسی اور معاشی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق، ثقافت، مذہب اور معاشرت پر بھی دور رس نتائج کے حامل برے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کا ملی تشخص خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر، مسلمانوں کو اسلامی احکامات کی اصل روح سے باخبر رکھنے کیلئے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے 30 مئی 1866ء بمطابق 15 محرم الحرام 1283ھ کو دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد (مسجد چھتہ) میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی۔ یہ چھوٹا سا مدرسہ بہت جلد دنیائے اسلام کی عظیم درسگاہ اور توجہ کا مرکز بن کر آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے موجود ہے اور پوری دنیا میں علم وعمل کا چراغ جلانے کا کام انجام دے رہا ہے۔

خدمات حدیث

ہجری تقویم کے اعتبار سے 49 سال اور عیسوی تقسیم کے لحاظ سے 48 سال کی مختصر زندگی میں حضرت نانوتویؒ نے غیر معمولی علمی کارنامے انجام دیے۔ حضرت الامام نے علم حدیث پر بطور خاص توجہ دی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ کے حلقہ درس میں شریک ہو کر ان سے صحیح بخاری کا کچھ حصہ، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مؤطا امام مالک، تفسیر جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں، ان کتابوں کی صراحت حضرت شاہ عبدالغنیؒ کی سند میں موجود ہے۔
(سوانح قاسمی: از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

حضرت نانوتویؒ نے تحصیل حدیث میں انہی دو جلیل القدر محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور کسب فیض کیا اور انہیں کا رنگ نمایاں طور پر حضرت الامام کی حدیثی خدمات وآثار میں جلوہ گر رہا۔

حضرت نانوتویؒ نے دسمبر 1861ء میں سفر حج سے واپسی پر نانوتہ میں کچھ عرصہ مستقل قیام کیا اور اس دوران نانوتہ میں صحیح بخاری کا درس دینا شروع کیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جو حضرت نانوتویؒ کے ہم وطن، رفیق درس اور ہم زلف تھے نے اسی موقع پر حضرت الامام سے صحیح بخاری پڑھی۔ میرٹھ کے قیام میں خالی اوقات میں سلسلہ درس جاری رکھا، علماء کا طبقہ صحاح ستہ کے درس میں شریک ہوتا تھا، حضرت مولانا یعقوب

نانوتویؒ نے اس دور میں حضرت الامام سے صحیح مسلم کا درس لیا۔ اور اسی دور میں ایک درس میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بھی شرکت کی تھی۔ نانوتہ کے درس بخاری میں مولانا رحیم اللہ بجنوریؒ بھی شریک رہے تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے ممتاز ترین شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے جنہوں نے حدیث کی مختلف کتب حضرت الامام سے میرٹھ میں پڑھی تھیں اور حدیث کی جو خدمت بعد میں حضرت شیخ الہندؒ نے کی وہ بے نظیر ثابت ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ نے دیوبند میں درس حدیث کا جو سلسلہ قائم فرمایا اس دور کے شاگردوں میں مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کا نام نامی سب سے روشن ہے، جنہوں نے حدیث کی عظیم خدمت کی۔ قیام میرٹھ کے دور کے تلامذہ میں حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ بھی شامل تھے، جن کا شمار جلیل القدر محدثین میں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالعلی میرٹھی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا منصور علی خاں سابق استاذ مدرسہ شاہی، مولانا حافظ عبدالعدل دیگر نمایاں تلامذہ میں شامل ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کے فیض یافتگان کی طویل فہرست میں مذکورہ بالا نام ان شخصیات کے ہیں جنہوں نے حضرت الامام رحمہ اللہ سے بطور خاص حدیث کا علم حاصل کیا اور پھر انہوں نے اپنی خدمت حدیث اور فیض رسانی سے بے شمار تشنگان علم کو سیراب کیا۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ (پیدائش: 3 شعبان المعظم 1262ھ بہ مطابق 28 جولائی 1846ء- وفات: 9 ربیع الاول 1346ھ بہ مطابق 13 ستمبر 1927ء) رقم طراز ہیں: ”طالب علمی کے زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی، غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی

جس سے کلیۃً شافعی نقطہ نظر کی تائید ہوتی تھی، طلبہ حیران ہوئے، کہنے لگے کہ آپ کی تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہی کا مسلک صحیح ہے اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتویؒ کا رنگ بدلا اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں جو تم سن چکے ہو، اب سنو! امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی بنیاد یہ ہے، اس کے بعد مولانا نانوتویؒ نے پھر اس طرح تقریر کی کہ لوگ مبہوت سنتے رہے، ابھی جس مسلک کے متعلق ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہوسکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہؒ نے منقح فرمایا ہے۔

حضرت الامام کا درس حدیث طائرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہوا کرتا تھا، اس میں تحقیقی نکات، تجزیاتی معلومات اور استدلالی لطائف کا وافر ذخیرہ ہوتا تھا، شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ کی پوری جھلک ہوتی تھی، علوم ولی اللہی کا ظہور ہوتا تھا، حضرت الامام کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہندؒ کا بیان ہے کہ ”میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحب کی تصنیفات میں غایت مشکل ہیں۔ شاہ صاحب کے یہاں جو آخری جواب ہوتا تھا وہ حضرت نانوتویؒ اول ہی مرتبہ فرما دیتے تھے، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔

درس حدیث کے امتیازات

سند حدیث اور متن حدیث سے متعلق تمام معلومات کا احاطہ

رجال سند پر متوازن اور وقیع تبصرہ

حدیث کے فنی مقام کی نشان دہی

متعلقہ مسئلہ میں مذاہب اربعہ کا بیان

ہر مذہب کے مفصل دلائل کی ایسی توضیح جو بالکل غیر جانبدارانہ ہو

مذہب حنفی کے اثبات اور عقل ونقل سے اسے مزین کر کے اس کی وجوہ ترجیح کا بیان

احکامی پہلو کے ساتھ حدیث کے اخلاقی وتربیتی پہلو کی سیر حاصل وضاحت

تحقیقی، تجزیاتی، استدلالی، متکلمانہ اور اصولی انداز بحث

تشریح احادیث کے ضمن میں نکتہ رسی

تعارض احادیث میں تطبیق اور متکلمانہ اسلوب میں اس طرح انطباق دینا کہ کوئی اشکال باقی نہ رہے

سلف صالح اور تمام ائمہ کا احترام، کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا رابطہ واضح کرنا

مختلف فیہ مسائل میں اعتدال وتوازن کی روش اور ڈگر پر پوری طرح قائم رہنا

ان امتیازات سے حضرت الامام کے محدثانہ ذوق اور رسوخ فی العلوم کی کیفیت کا علم ہوسکتا ہے، حضرت الامام کے ذوق محدثانہ کی جھلکیاں ان کی گراں قدر تصانیف میں جا بجا موجود ہیں۔

تحشیہ بخاری:

خدمت حدیث کے ضمن میں حضرت الامام کا سب سے نمایاں، وقیع قابل قدر اور علمی کارنامہ حاشیہ بخاری کی تکمیل ہے اور باعث تعجب یہ ہے کہ اتنا عظیم اور لائق صد آفریں کارنامہ حضرت نے 18 سال کی عمر میں انجام دیا۔

(تفصیلات کے لیے دیکھئے: بانی دارالعلوم دیوبند کی حدیثی خدمات: از مولانا محمد اسجد قاسمی)

مشہور تصانیف:

تقریر دلپذیر: اسلام کے اصول پر جامع ومانع تقریر

تحذیر الناس: زمینوں کے سات ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر عجیب بحث

آب حیات: حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نفیس بحث

قبلہ نما: جہت کعبہ سے شرک کا ایہام اور اس کا شافی جواب

توثیق الکلام: مسئلہ ترک قراءت خلف الامام پر محققانہ بحث

الدلیل المحکم: اجرت تعلیم کے متعلق فتویٰ

انتصار الاسلام: آریوں کے مقابلہ میں اسلامی اصول کی فلاسفی

ہدیۃ الشیعہ: شیعہ عقائد پر مفصل بحث

اجوبہ اربعین: تحذیر الناس پر علماء رامپور کے اعتراضات کا جواب۔

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ حضرت نانوتویؒ کی لکھی گئی کتابوں کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا جائے اور نام نہ لکھا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ کتابیں امام رازیؒ یا امام غزالیؒ کی لکھی ہوئی ہیں۔ (قصص الاکابر)

۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مؤرخہ اپریل ۱۸۸۰ء بروز جمعرات بعد از نماز ظہر ۴۷ سال کی عمر میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اس دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت فرماگئے اور قبرستان قاسمی دیوبند میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ

(۱۲۴۹ھ۔۱۳۰۲ھ)

مولانا یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک العلیؒ ۱۳ رصفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۲ر جولائی

۱۸۳۳ء کو نانوتہ ضلع سہارنپور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔تاریخی نام منظور احمد غلام حسین اور شمس الضحیٰ رکھا گیا۔قرآن مجید نانوتہ میں حفظ کیا اس کے بعد جب آپ کی عمر ۱۱/سال کی تھی والد ماجد مولانا مملوک علی صاحبؒ اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔دہلی میں ہی تمام علوم متداولہ اپنے والد سے حاصل کیے اور علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حاصل کی۔

۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دیوبند تشریف لے گئے اور یہاں صدارت تدریس کی مسند پر فائز ہوئے۔حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے پہلے شیخ الحدیث تھے۔ان کے فیض تعلیم وتربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کیے جو آسمان علم و فضل کے آفتاب ومہتاب بن کر چمکے۔۱۹/سال کی مدت میں ۷۷/طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی۔جن میں مولانا عبدالحق پورقاضوی، مولانا عبداللہ انبہٹوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخرالحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی، مولانا مفتی عزیزالرحمن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علما شامل ہیں۔

حضرت مولانا یعقوب اور ان کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوپاک، بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیا میں جس قدر علماء موجود ہیں ان کی بڑی تعداد اسی خوان علم کی زلہ ربا ہے۔

حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے سلوک و معرفت کے مقامات طے کیے تھے۔اکثر جذب وکیف کی حالت طاری رہتی تھی۔دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی۔رعب واثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے

تھے مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق وتواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغنا تھا۔مکتوبات یعقوبی کے دیباچہ نگار حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں:

''آپ نہایت خوش وضع، خوش خلق، خوش خو، خوش لہجہ وخوش گفتگو تھے۔بڑے صاحب کمال ومکاشفات تھے، آپ سے بہت سی پیشنگوئیاں صادر ہوئیں جن میں بعض کا صدور ہو چکا ہے جو باقی ہیں ان کا انتظار ہے۔ (ارواح ثلاثہ)

آپ کی تصانیف میں تین رسالے یادگار ہیں۔سوانح قاسمی اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان وبیان اور حالات وواقعات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔مولانا یعقوبؒ شعروشاعری سے ذوق رکھتے تھے، گمنام تخلص تھا۔وفات سے چند ایام قبل وطن مالوف نانوتہ تشریف لے گئے اور وہیں بمرض ہیضہ ۳/ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔مکتوبات یعقوبی اور ارواح ثلاثہ میں جستہ جستہ آپ کے حالات ملتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

(۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء۔۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء)

دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو اتر پردیش کے شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔اسی شہر میں آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔آپ کی تعلیم کا آغاز 6 سال کی عمر میں ہوا۔ابتدائی تعلیم اپنے چچا اور مشہور عالم دین مولانا مہتاب علی سے حاصل کی، قرآن مجید کا کچھ حصہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں عالم دین مولانا عبداللطیف سے پڑھیں۔دارالعلوم دیوبند کا قیام

عمل میں آیا تو آپ اس میں داخل ہو گئے۔ 1274ھ بمطابق 1858ء میں آپ نے کنز، مختصر المعانی کا امتحان دیا اگلے سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ پڑھیں اور 1286ھ بمطابق 1870ء میں قطب صحاح ستہ کی تکمیل کی اور فارغ التحصیل ہوئے۔ نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔ بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں۔ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔ حضرت نانوتویؒ کے علاوہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، ملاّ محمود صاحب اور مولانا مہتاب علی صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم آپ کے مشہور اساتذہ ہیں جو کہ اپنے زمانہ میں بے نظیر شمار کئے جاتے تھے۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی، مولانا احمد حسن صاحب امروہی، حافظ عبد العدل صاحب پھلتی، مولانا عبد الحق صاحب پوری وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ آپ کے شرکائے درس اور جلساء تھے۔

زمانہ تعلیم میں ہی آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا اور حضرت نانوتویؒ خاص طور پر شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لیے اکابر کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا جس سے بتدریج ترقی پا کر ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور ذہانت ظاہر ہونے لگی اور اعلیٰ کتابیں بھی پڑھانے کے مواقع ملتے گئے۔ 1293ھ بمطابق 1877ء میں آپ نے ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ کی تدریس کرنا شروع کی پھر 1295ھ بمطابق 1878ء میں مسلم شریف اور بخاری شریف بھی پڑھانے لگے۔ آپ نے مسلسل 40 سال تک دارالعلوم

دیوبند میں درس حدیث دیا اور زمانہ اسارت (قید) مالٹا اور مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں بھی درس دیا۔ اس طرح آپ کا زمانہ تدریس 44 سال سے زائد ہوتا ہے۔

آپ کے ممتاز تلامذہ میں مشہور علمائے دین مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ محمد انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا اصغر حسین دیوبندی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا اعزاز علی دیوبندی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا عبدالسمیع دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا اعزاز علی امروہی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حبیب الرحمن اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مشاہیر اور نامور علماء شامل ہیں۔

آپ کا حلقہ درس دیگر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقہ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور باوجود حنفی ہونے کے صراحت کے ساتھ یہ بات ذہن نشین فرماتے کہ مذاہب مجتہدین سارے کے سارے حق اور کتاب وسنت کے موافق ہیں، ان کی تنقیص موجب بدبختی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس کی خصوصیات کی نسبت مولانا میاں اصغر حسینؒ نے لکھا ہے:۔

’’حلقۂ درس کو دیکھ کر سلفِ صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث زبان پر تھا، اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہاء ومجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ مُنہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدّی بناتے تھے، نہایت سُبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اُردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈ رہا

ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مُشتِ استخوان، ضعیف الجثہ، مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے، جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن مدرسہ کے دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنّع اور بناوٹ کا نام نہ تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشین ہو جاتی تھی اور سُننے والا بھی یہ سمجھ کر اُٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین وفطین طالب عالم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اپنے شکوک وشبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویّہ کے معانی اور مضامینِ عالیہ سُن کر سرِ نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے اور ایسا محقّق عالم دنیا میں نہیں ہے۔ مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابوحنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہو جاتا تھا، دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینے پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے، دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اُترتی چلی جاتی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

باایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب واحترام اور اُن کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا

ایک جزلاینفک ہو گیا تھا، خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ مذاہب مجتہدین حق ہیں اور وہ سب مُستدل بالکتاب والسنّہ، اُن کی تنقیص، موجبِ بدبختی اور سوءِ ادب باعث خسران ہے۔

محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں امام اعظمؒ کے ساتھ خاص تعلق تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ ”میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی حجۃ الاسلام پڑھی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔“

1294ھ میں آپ اپنے استاد محترم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا رفیع الدین رحمہ اللہ، اور دوسرے اکابر کی معیت میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے حکم پر وہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہو گئے۔ چونکہ آپ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی صحبت میں رہ چکے تھے اس لیے مزید تزکیہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور حاجی صاحب نے سلاسل اربعہ میں آپ کو شرف خلافت سے نوازا۔

حاجی صاحب کے بعد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے بھی آپ کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ حضرت حاجی صاحب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو اپنا مرشد بنانے کا فیصلہ کیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بلا تامل آپ کو بیعت کر لیا۔ ساتھ ساتھ اپنا مجاز بھی قرار دیا۔ آسمان رشد وہدایت کے ان تین تابندہ ستاروں نے جن کو نوازا ہوان کی مقبولیت کا کیا ٹھکانہ؟

شیخ الہند رحمہ اللہ اکابر کی موجودگی میں بیعت کرانے سے گریز کرتے لیکن بعد میں

جب عوام کا اصرار بڑھا تو بیعت شروع کرادی اور پھر تو عرب ہو یا عجم یا مالٹا کی قید، دنیا نے اس رجل رشید سے اصلاح وتربیت حاصل کی۔

آپ نے درس وتدریس اور مشاغل سیاست کے باوجود کئی کتب تصنیف کی ہیں۔جن میں سے ترجمہ قرآن، ایضاح الادلۃ اور الادلۃ الکاملۃ، تراجم ابوب بخاری، تقریر ترمذی، حاشیہ ابوداود، حاشیہ مختصر المعانی، جہد المقل اور شرح اوثق العروی قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے تدریس کے ابتدائی دنوں میں مسلمانوں میں شعور اور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی تحریک شروع کی تھی۔1920ء تک آپ کی کوشش یہ رہی کہ دینی وسیاسی تربیت سے ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو کہ احیاء ملت، ملکی سیاست اور آزادی کی جدوجہد میں اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے کے اہلیت رکھتی ہو۔

1914ء میں جب جنگ عظیم اول چھڑ گئی تو برٹش حکومت پر ضرب لگانے اور آزادی کی منزل قریب لانے کے لیے ایک سنہری موقع ملا۔حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ سوچ کر کہ تحریک چلانے کے لیے کسی آزاد حکومت کی پشت پناہی حاصل کی جائے مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کو افغانستان بھیجا تا کہ وہ افغانستان کی طرف سے حملہ کرانے کی سعی کرے اور خود خلافت عثمانیہ کے زعماء سے ملاقتیں کر کے فرنگی حکومت کے خلاف جہاد کے منصوبے سے ان کو آگاہ کیا۔مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ نے افغانستان پہنچنے کے بعد وہاں ہندوستان کی عارضی آزاد حکومت قائم کی۔ جسے افغان حکومت نے تسلیم کر کے خود بھی تعاون کی یقین دہانی کرائی اور دوسرے ملکوں میں بھی اس کی سفارتیں بھیجنے کا انتظام کیا۔

مولانا سندھی رحمہ اللہ نے ان تمام حالات کو ایک رومال پر ریشم سے کاڑھ کر ایک معتمد شخص کے ہاتھوں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا، لیکن چند ایمان فروشوں

کی وجہ سے وہ انگریز گورنر کے ہاتھ لگا۔ یہ رومال انگریز کو ملنا تھا کہ ہندوستان بھر میں گرفتاریوں اور قید وبند کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

1916ء میں آپ کو اور آپ کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا عزیر گل رحمہ اللہ، مولانا حکیم نصرت حسین رحمہ اللہ، اور مولانا وحید احمد رحمہ اللہ کو گرفتار کیا گیا۔فروری 1917ء میں آپ کو جزیرہ مالٹا پہنچادیا گیا۔

مالٹا کی اسیری کے دوران آپ نے بڑے مصائب برداشت کیے، تکلیفیں اٹھائیں، مستقل عوارض میں مبتلاء رہے جو بالآخر مرض الموت کا سبب بنے، لیکن آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔مارچ 1920ء میں تقریباً سات مہینے کی اسیری کے بعد آپ کو رہا کیا گیا۔

ہندوستان واپسی اور مرض الوفات:

جون 1920ء میں حضرت رحمہ اللہ ہندوستان تشریف لائے۔قید وبند کی صعوبتیں آپ کی صحت پر کافی حد تک اثر انداز ہوگئی تھیں۔مختلف امراض کی شکایت تو پہلے سے تھی، اس پر مالٹا کا سرد موسم، حضرت کی شب بیداری وریاضت، پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جدوجہد کی ناکامی کا صدمہ ان حوادث نے ان بیماریوں کو مرض الموت کی شکل دے دی۔

چنانچہ 26 صفر 1339ھ بمطابق 29 اکتوبر 1920ء صبح 8 بجے آپ نے قبلہ رخ ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور روح مقدس فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ کی بہاریں دیکھنے کے لیے تمام اہل اسلام کو یتیم وبے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے اور رفیق اعلی سے جاملے۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی حالات درج ہیں:۔

حیات شیخ الہند۔مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ

نقش حیات۔مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

اسیر مالٹا۔مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

تذکرہ شیخ الہندؒ۔مولانا عزیز الرحمن بجنوریؒ

تحریک شیخ الہند۔مولانا سید محمد میاںؒ

ان اہم تصانیف کے علاوہ بھی آپ کی حیات و خدمات پر متعدد کتابیں اور تحقیقی مقالے موجود ہیں۔

مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

(1292ھ بمطابق 1875ء۔1352ھ بمطابق 1933ء)

حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ ۲۷/شوال ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ اپنے ننھیال علاقہ لولاب کشمیر میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد معظم شاہؒ بڑے عالم ربانی،زاہد وعابد اور کشمیر کے نہایت مشہور خاندانی پیرو مرشد تھے۔

ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد ماجد مولانا معظم شاہ صاحبؒ سے قرآن پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر تک قرآن پاک کے علاوہ فارسی کے متعدد رسائل بھی ختم کر لئے۔پھر مولانا غلام محمد صاحبؒ سے فارسی وعربی کی تعلیم حاصل کی،ابھی آپ کی عمر محض 13 یا 14 سال تھی مگر دینی علوم بالخصوص فقہ پر اچھی نظر ہوگئی تھی۔۱۳۰۵ھ میں طلبِ علم کے جذبہ صادق نے لولاب کے سبزہ زاروں اور دلفریب نظاروں سے دور کر دیا اور غریب الوطنی کی علمی زندگی اختیار کر لی،بچپن ہی سے آپ بے حد ذہین،ذکی اور فطین تھے،تین سال تک آپ ہزارہ وسرحد کے متعدد علماء وصلحاء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے پھر علوم وفنون کی نا مٹنے والی پیاس آپ کو عالمی شہرت یافتہ ادارہ مرکز علم و

عرفان دارالعلوم دیوبند کھینچ لائی۔چنانچہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہزارہ سے دیوبند آ گئے۔اس وقت حضرت شیخ الہندؒ مسند صدارت پر متمکن تھے۔استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا۔کتب موقوف علیہ کے بعد حدیث وتفسیر کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت ومقبولیت کے ساتھ امتیازی شان حاصل کر لی۔۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء تک حدیث وتفسیر اور فنون کی اعلیٰ کتابوں سے فارغ ہوکر آپ حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفید ہوئے۔

اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور تین چار سال تک مدرسہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔دہلی میں کئی سال قیام کے بعد کچھ وقت کے لیے اپنے وطن مالوف کشمیر گئے،پھر ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین سے مشرف ہوئے،سفر حجاز میں طرابلس،بصرہ،مصر اور شام کے جلیل القدر علماء نے آپ کے کمالات علمیہ وعملیہ کا بڑے کھلے انداز میں اعتراف کیا اور آپ کی خداداد اور بے نظیر لیاقت واستعداد دیکھ کر حدیث کی سندوں سے نوازا۔سفر حجاز سے واپس آ کر قصبہ بارہ مولیٰ (کشمیر کا ایک مخصوص مقام) میں خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے مدرسہ فیض عام کی بنیاد رکھی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق خدا اور طالبان دین کو ظاہری وباطنی علوم سے فیض یاب فرماتے رہے۔

۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند تشریف لائے تو حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو روک لیا۔۱۳۳۳ھ تک بغیر مشاہرہ کے کتب حدیث کے درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب شیخ الہند نے سفر حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر شاہ صاحب کو بخشا۔ایک جلسے میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنا آخری

درس دیا، طلبا اور عاشقین کا ایک اژدہام تھا، اور بڑی بڑی علمی شخصیات جمع تھیں، پہلے حضرت شیخ الہند نے درس دیا پھر اپنی مسند پر مولانا کشمیری کو بیٹھنے کا حکم دیا، وہ منظر بھی عجیب تھا شاگرد کی آنکھوں میں آنسو تھے اور استاذ کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ، شاگرد کے لئے استاذ کی جدائی کا غم نا قابل برداشت تھا اور استاذ کے لئے اپنے مایہ ناز شاگرد کی شکل میں ایک سچا جانشین ملنے کی خوشی بھی بے پناہ تھی۔ علامہ کشمیری نے صدر مدرس کی حیثیت سے بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس سنبھال لیا۔ آپ دارالعلوم کی مسند صدارت پر تقریبا ۱۲/سال تک جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء کے اوائل میں اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائض صدارت سے دست کش ہو کر گجرات کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث کا مشغلہ رہا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ آپ کی جامعیت و تبحر علمی ہے، علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جسمیں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو۔ یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ علماء و متقدمین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستی شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

شاہ صاحب کا قد درمیانہ، رنگ سفید، خوبصورت خدوخال، پیشانی کشادہ اور آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ حافظہ غضب کا تھا، شیخ ابن ہمامؒ کی مشہور کتاب فتح القدیر جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اس کا مطالعہ ۲۰/دن میں اس طرح کیا تھا کہ فتح القدیر کی کتاب الحج کی تلخیص بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے تھے اور ابن ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کے جوابات بھی لکھتے گئے۔ دوران درس ایک مرتبہ فرمایا کہ اب

سے ۲۶/سال پہلے میں نے فتح القدیر کا مطالعہ کیا تھا۔ بحمداللہ اب تک دوبارہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور آج بھی اس کا جو مضمون اور بحث پیش کروں گا اگر تم مراجعت کروگے تو تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حضرت کشمیریؒ کی جامع شخصیت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

''میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا امت مسلمہ میں وجود ہے اگر دین اسلام میں کسی قسم کی بھی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے''۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی وفات پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا:

''مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ اور شیخ عزیز الدین بن عبدالسلامؒ کو دیکھا ہے تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے۔ ورنہ اگر علامہ کشمیریؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور شیخ عزیز الدین کا انتقال آج ہوا ہے''۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا:

''میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، مصر اور شام کے علماء و فضلاء سے ملاقاتیں کیں اور مسائل میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ و عقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔

مصر کے ممتاز عالم دین علامہ سید رشید رضاؒ نے دیو بند میں ایک مرتبہ فرمایا خدا کی قسم ! میں نے ان جیسا (صاحب علم) آدمی نہیں دیکھا‘‘۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے آپ کے حافظے اور عربی ذوق کے بارے میں فرمایا کہ مجموعی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کو کم سے کم پچاس ہزار عربی کے اشعار یاد تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ فرمایا کرتے تھے:

’’اسلام کی گزشتہ پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے‘‘۔

مولانا حبیب الرحمٰنؒ عثمانی آپ کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار جو کچھ آپ کی نظر کے احاطے میں آ گیا وہ ہمیشہ کے لیے حافظے میں قید ہو گیا، بہر حال آپ کی شخصیت بے نظیر جامع الصفات والکمال تھی۔ عمل بالکتاب والسنۃ اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ بھر کی کوتاہی نہیں ہوتی تھی، دیکھنے والے بہت سی سنتوں کو شاہ صاحبؒ کے عمل کو دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے، سنت نبوی ﷺ کے مطابق کھانا اکڑوں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے، بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال فرمایا کرتے تھے۔

زہد وتقویٰ آپ کے کھلے اور روشن چہرے پر برستا تھا۔ ایک غیر مسلم نے کسی موقع پر آپ کا سرخ وسفید رنگ کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر کہا تھا: ’’اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے‘‘۔

دیو بند میں اگر حضرت شیخ الہندؒ دار العلوم کا غلغلہ چہاردانگ عالم میں بلند کیا تو حضرت شاہ صاحب نے دار العلوم کی مسند تدریس پر رونق افروز ہو کر عالم اسلام کو علم دین کی روشنی سے منور کر دیا، علم حدیث میں وہ عدیم النظیر محدث تھے۔ علوم فقہ میں فقیہ اعظم، اتباع شریعت میں صلحائے سلف کا نمونہ تھے تو معرفت الٰہی میں جنید وقت اور شبلی عصر، ان کا

وجود شریعت کے لیے بھی موجب تقویت تھا اور طریقت کے لیے بھی وجہ نازش۔ حضرت گنگوہی سے شرف خلافت حاصل کیا تھا۔

اسلامی دنیا نے اس قدر وسیع العلم اور باعمل علماء بہت کم پیدا کیے ہیں۔ شاہ صاحب اگر ایک طرف اپنے معاصرین میں تبحر علمی کے لحاظ سے عدیم النظیر تھے تو دوسری جانب زہد وتقویٰ میں بھی ان کی ذات بے مثل تھی، وہ ایک باکمال مفسر، محدث اور فلسفی تھے۔ آدمی میں ایک کمال کا ہونا بھی کم نہیں ہوتا مگر ان کی دستار کمال میں متعدد لعل آویزاں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے وجود سے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ تشنگان علوم کی جس کثیر تعداد نے اس بحر العلوم سے سیرابی حاصل کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مشرق وسطیٰ سے لے کر چین تک ان کے فیضان علم کا سیلاب موجیں مارتا رہا اور ہندو بیرون ہند کے ہزاروں تشنگان علوم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ غیر منقسم ہندوستان، عرب، ایران، عراق، افغانستان، چین، مصر، جنوبی افریقہ، انڈونیشیا اور ملیشیا میں بکثرت آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے۔ دار العلوم میں آپ کے زمانہ قیام میں ۸۰۹؍طلباء نے دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے متاہلانہ زندگی اختیار فرمائی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے۔

ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیو بند جس کو آپ نے وطن اقامت بنالیا تھا چلے آئے اور یہیں ۳؍صفر المظفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں ۶۰؍سال کی عمر میں رحلت فرمائی اور دیو بند کے عیدگاہ کے قریب تدفین عمل میں آئی۔ آج کل مزار انوری کے نام سے یہ قبرستان مشہور ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ''معارف'' میں لکھا:۔

''ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپری سطح ساکن، لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حاف و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر وسخن سے بہرہ منداور زہدوتقویٰ میں کامل تھے، مرتے دم تک علم ومعرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا''۔

حضرت کشمیری کے مشہور تلامذہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ، حضرت مولانا یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد امرتسریؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، حضرت مولانا محمد منظور احمد نعمانیؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ مہتم دارالعلوم دیوبند شامل ہیں۔

مختلف اسلامی مباحث پر عربی اور فارسی میں ایک درجن سے زائد تصانیف جو نہایت معرکۃ الآراء مسائل پر مشتمل ہیں جن میں خاتم النبیین، عقیدہ فی حیات عیسیٰ علیہ السلام، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب قابل ذکر ہیں۔ علامہ کی تقریریں جو درس کے وقت املا کراتے تھے ان میں مشہور ترین تقریر "فیض الباری شرح بخاری" کے نام سے چار جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اردو میں شرح بخاری بنام انوار الباری شاہ صاحب کے افادات 32 حصوں میں ساڑھے چھ ہزار صفحات پر شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت مولانا یوسف بنوری نے نفحۃ العنبر میں شاہ صاحب کے تفصیلی حالات لکھے

ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ دوسری کتاب حیات انور ہے جس میں مختلف حضرات کے مضامین شامل ہیں۔ الانور اور نقش دوام بھی آپ کی سوانح حیات ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

(۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۹ء۔ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ برصغیر ہند۔ پاک کی گزشتہ عظیم شخصیات میں سے ایک تھے۔ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپؒ ۱۹؍شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء کو اتر پردیش کے ضلع فیض آباد کے اناؤ میں واقع بانگر مئو میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا۔ اپنے علم وتقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانے میں ایک بڑی جاگیر دار کا مالک رہا ہے۔ آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ حضرت شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ ومجاز تھے۔ جب حضرت مدنی کی عمر ۳؍سال کو پہنچی تو والد صاحب کا تبادلہ قصبہ ٹانڈہ میں ہوگیا، اس لیے ابتدائی تعلیم یہی حاصل کی۔ قاعدہ بغدادی اور پانچویں سیپارے تک والدہ سے پھر پانچ سے اخیر تک والد سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ ۱۳؍سال کی عمر میں والد صاحب نے ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا۔ میزان الصرف میں داخلہ لیا، یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت وعنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ بعد میں ان کے ملی، قومی، علمی اور دینی کاموں میں رفیق و معاون رہے۔ ابتدا میں آپ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا، چناں چہ صدرا کے امتحان میں آپ نے 75 نمبر حاصل کیے۔ پھر آپ کو علم ادب سے شغف ہوگیا، یہاں تک کہ آپ کو

مقامات حریری، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ کے قصائد اور عبارتیں ازبر ہوگئیں۔ اس کے بعد علم حدیث سے خصوصی شغف ہوگیا، اس طرح آپ کا دور طالب علمی علم حدیث کے انہماک ہی میں ختم ہوا، پھر یہ شغف بعد میں اس قدر بڑھا کہ آپ کی تمام عمر خدمتِ حدیث میں گزری۔

دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل ے/ یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطن مالوف تشریف لے گئے تو والد ماجد مدینۃ الرسول کے لیے رخت سفر باندھ چکے تھے، چنانچہ آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ روانگی سے قبل آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہو چکے تھے۔ مکہ مکرمہ میں پیرومرشد کی ہدایت کے بموجب عرصہ تک حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بھی کسب فیض کیا اس کے بعد والد ماجد کے ساتھ مدینہ منورہ میں مقیم ہوگئے اور والد محترم کی حیات تک ہندوستان آنا پسند نہیں کیا۔

1326ھ میں ایک ایسے مجمع میں، جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی پر غور وخوض ہو رہا تھا، حضرت مولانا حافظ احمد صاحب قدس اللہ سرہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اگر مولوی انور شاہ صاحب کشمیری، مولوی سہول بھاگلپوری، مولوی سید حسین احمد مدنی، مولوی عبدالصمد کرت پوری وغیرہ یہ حضرات یہاں آکر جمع ہوجاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات بہت پسند فرمائی، اگرچہ اس بارے میں سکوت فرمایا، لیکن کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جدوجہد کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہنچ گئے، لیکن مبدائے فیاض کو حسین احمد مدنیؒ دوسرے وقت عظیم الشان کام لینا تھا، لہٰذا آپ مستقل طور پر دارالعلوم سے متعلق نہ رہ سکے، چناں چہ جب حضرت مولانا احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کے پورا ہونے کا وقت آیا تو خداوند قدوس نے 1346ھ میں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو

دارالعلوم دیوبند کی رفیع مسند علم پر مستقل طور سے جلوہ افروز فرمایا اور دارالعلوم دیوبند نے آپ کی سرپرستی میں جو علمی ترقی کی ہے، وہ جگ ظاہر ہے۔ دارالعلوم کے مسند علم پر دوسرے اکابر علمائے محدثین عظام جلوہ افروز رہے اور اس دور میں بھی دارالعلوم کے دارالحدیث میں حدیث کی شمع روشن ہوئی اور اس پر جاں نثار پروانے آئے اور انہوں نے اپنی جان شمع ہدایت پر نثار کی، لیکن خدا گواہ ہے کہ اس مدنی محدث نے جب شمع حدیث روشن کی تو اس پر اس قدر پروانوں کا ہجوم ہوا اور دارالحدیث علم وعرفان کے تابناک ستاروں سے اس قدر جگمگایا کہ دیوبند کی تاریخ میں اس کی نظیر ممکن نہیں ملتی۔

1346ھ سے قبل آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مختلف اوقات میں متعدد اونچی کتابوں کا درس دیا اور ہزاروں تشنگان علوم کو سیراب کیا۔

اسی سال جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو حضرت مدنیؒ کے سوا کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارلعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایان شان پر کر سکے، اس لیے اکابر کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ آپ کے زمانہ صدارت میں طلباء کی تعداد میں دوگنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا اور خاص کر دورہ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہے۔

آپ کا درس حدیث تنوع اور جامعیت کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا واحد درس سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ اس کی عظمت وشہرت اور کشش سال بہ سال طلباء کی تعداد میں اضافہ کا موجب ہوتی رہی۔ حدیث نبوی میں آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے اور برصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے شاگرد موجود نہ ہوں۔

حضرت شیخ الاسلام ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ اپنے دور کے بے مثال محدث تھے درس وتدریس اور تحقیق حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا تدریس حدیث میں ان کا

ایک خاص اسلوب تھا جس نے انہیں اقران وامثال میں امتیاز بخشا تھا وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور انہیں نہ صرف فقہ کے مسائل ازبر تھے بلکہ فقہ وحدیث میں ان کا درجہ ایک محقق اور مجتہد کا تھا وہ مفسر بھی تھے اور نہ صرف حروف وسواد کی رہنمائی میں بلکہ معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن کے بصائر وحکم اور مسائل واحکام کی تشریح وتفسیر فرماتے تھے وہ ایک زاہد شب زندہ دار بزرگ اور اپنے وقت کے ایک عظیم الشان شیخ طریقت تھے انہیں انسان کے امراض نفس وقلب کا پتا چلانے میں حذاقت کا کمال حاصل تھا معالجہ نفس وطبائع اور اصلاح وتزکیہ میں انہیں ید طولیٰ ملا تھا۔ تاریخ عالم میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخ معاشیات ہند کے وہ ایک عظیم اسکالر تھے بحر سیاسیات ہند وانقلابات عالم اسلامی کے وہ بے مثل شناور تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے اور افکار کی دنیا میں ہلچل پیدا کردینے اور اپنے عہد کے مشہور خطیب بھی تھے جنگ آزادی میں انہوں نے اپنے جسم وجان اور وقت ومال کی بے مثال قربانیاں دی ہیں وہ ایک صاحب عزیمت شخص تھے ان کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے جب وہ رخصت سے فائدہ اٹھاسکتے تھے لیکن ان کی عزیمت اور بلند ہمتی سے رخصت کی پناہ گاہوں کی پستیوں اور ذلتوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ عزائم وقت میں ان کے ذوق فکر وعمل کا پایہ ہمیشہ بلند رہا۔ ذوق میزبانی سے انہیں حصہ وافر ملا تھا وہ اپنے دور کے علماء وامرا اور صوفیا ومشائخ میں سب سے بڑے مہمان نواز تھے۔ عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں سے ان کی طبیعت کا خمیر اٹھا تھا۔ عموماً دس پندرہ مہمان آپ کے دسترخوان پر ضرور موجود رہتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کے روزانہ کے مشاغل اور معمولات یہ تھے کہ آخری شب میں نماز فجر تک تہجد اور ذکر ووظائف وغیرہ، نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تلاوت قرآن مجید اور مطالعہ کتب، اس کے بعد مہمانوں کے ساتھ چائے اور ناشتہ پھر تقریباً ۱۲ ربجے تک صحیح

بخاری اور ترمذی شریف کا درس، دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے بعد ڈاک دیکھنا اور خطوط کے جواب لکھنا اور مہمانوں سے بات چیت، نماز عصر کے بعد مغرب تک پھر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا، مغرب کی نوافل میں کم از کم ایک پارہ تلاوت کا معمول تھا اس سے فراغت کے بعد رات کا کھانا، نماز عشاء کے بعد بھی اکثر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا جو ۱۲ ربجے شب تک جاری رہتا تھا۔

ماہ محرم ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں حضرت مدنیؒ پر مدراس کے سفر میں دل کا دورہ پڑا، دیوبند تشریف لانے پر ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ قلب کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے، مقامی اور بیرونی ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، مگر افاقہ نہ ہوا، پھر یونانی علاج شروع کیا گیا، اس سے مرض میں قدرے تخفیف محسوس ہوئی۔ ۱۰/۱۱ جمادی الاولیٰ مطابق ۳/۴ دسمبر کو طبیعت کافی پرسکون رہی۔ ۱۲ رجمادی الاولیٰ مطابق ۵ ردسمبر کی صبح کو طبیعت کافی بشاش ہوگئی، کئی دن کے بعد دوپہر کو غذا تناول فرمایا اور پھر لیٹ گئے۔ ۳ ربجے کے قریب نماز ظہر کے لئے جب بیدار کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ حضرت مدنی واصل بحق ہوچکے ہیں۔ ۹ ربجے شب میں جنازہ دارالحدیث لاکر رکھا گیا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۱۲/ ۱۳ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵/۶ ردسمبر ۱۹۵۷ء کی درمیانی شب میں اس خزینہ علم ومعرفت کو سپرد خاک کردیا گیا جس نے تقریباً ۳۲ رسال تک دارالعلوم میں حدیث نبوی کی شمع کو روشن رکھا تھا اور جس کے خرمن فضل وکمال سے خوشہ چینی کرنے میں طالبان علم نبوت نے ہمیشہ فخر محسوس کیا۔ حضرت مدنیؒ کے تفصیلی حالات کے لیے خود ان کی خودنوشت سوانح نقش حیات، الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر اور انفاس قدسیہ کے علاوہ اس وقت متعدد کتابیں موجود ہیں جن سے مراجعت کی جاسکتی ہے۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ

(۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء- ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء)

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد کی ولات ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء کو اجمیر راجستھان میں ہوئی جہاں آپ کے دادا سید عبدالکریم محکمہ پولیس میں تھانہ دار تھے۔ آپ کا اصلی وطن شہر ''ہرات'' تھا اور آپ کا سلسلہ نسب امام حسین رضی اللہ عنہ تک ۳۲/ واسطوں سے پہنچتا ہے۔ آبائی وطن ''مقام عمری''، ضلع مراد آباد ہے لیکن تقریباً نصف صدی قبل آبائی وطن ترک فرما کر ''دیوبند'' قیام پذیر ہوگئے اور محلہ ''شاہ رمز الدین'' میں قیام فرمایا۔

آپ کے آباء واجداد کے سلسلہ میں زیادہ معلومات فراہم نہ ہوسکیں مگر مرتب ''ایضاح البخاری'' نے لکھا ہے کہ ''آپ کے دادا مرحوم جناب منشی سید عبدالکریم صاحب تھانیداری کے عہدہ پر پنجاب اور اجمیر کے علاقہ میں فائز رہے وہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مزار پر ہفتہ میں ایک بار ضرور تشریف لے جاتے''۔

جب حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کی ۱۳۰۷ھ میں ولادت ہوئی تو جد امجد آپؒ کو بھی ''اجمیر کے سجادہ نشیں درگاہ کے پاس لے گئے اور خصوصی دعا کرائی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز چار برس کی عمر سے شروع ہوا، قاعدہ اور قرآن مجید والدہ ماجدہ سے پڑھا اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی گھر کے دیگر افراد سے حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں فارسی کی مکمل تعلیم سے فراغت حاصل ہوگئی تو عمر کے بارہویں سال ایک خاندانی بزرگ مولانا خالد صاحب سے عربی شروع فرمادی۔ کچھ دنوں کے بعد حصول تعلیم کی غرض سے ''گلاوٹھی''، ضلع ''بلند شہر'' تشریف لے گئے جہاں استاد وقت مولانا عبدالماجد جون پوری صدر مدرس تھے اور محی الدین صاحب مہتمم۔ اس مدرسہ کے

قیام کے دوران ''شرح جامی- بحث فعل، ''مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ، قطبی اور میبذی وغیرہ مولانا عبدالماجد سے پڑھیں اور کنز الدقائق مولانا محی الدین صاحب سے اور فن ہیئت کی کچھ کتابیں مولانا کریم بخش صاحب سے پڑھیں۔

۱۳۲۶ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال کی تھی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے امتحان کے بعد مشورہ دیا کہ تم ''دورہ حدیث'' دو سال میں پڑھو چناں چہ مولانا نے دورہ کی کتابیں دو سال میں پڑھیں اور ہر سال حدیث کی کتابوں کے ساتھ فنون کی متعدد کتابیں پڑھتے رہے مثلاً دونوں سالوں میں ہدایہ آخرین، بیضاوی شریف، جلالین، توضیح، حسامی، عروض المفتاح، دیوان متنبی، حماسہ، تفسیر مدارک اور درمختار کا کچھ حصہ دونوں سالوں کے امتحانات میں آپ نے سب سے زیادہ نمبرات حاصل کیے۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے حکم سے مدرسہ ''شاہی مراد آباد'' تشریف لے گئے۔ تدریس کی بیشتر زندگی مولانا نے ''مدرسہ شاہی'' میں بسر فرمائی لیکن درمیان میں جب بھی اکابر علماء نے ''دار العلوم'' کے لیے طلب فرمایا، آپ نے چند شرائط کے ساتھ قبول فرمالیا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ''نینی جیل'' سے آپؒ کو تدریس دار العلوم کے لیے خط لکھا چنانچہ آپؒ ۱۳۶۲ھ میں مادر درسگاہ دار العلوم دیوبند تشریف لے آئے اور ''بخاری شریف'' کا درس دیا اور قائم مقام صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز رہے۔

مولانا فخر الدین احمدؒ چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خاص تلامذہ میں تھے، اس لیے آپ کے درس حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی، چناں چہ آپ کا درس بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا

جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ فقہا کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید وترجیح کی وضاحت میں ایسے پرزور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کے ذہن میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا، اثناء درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم ومعارف بھی جا بجا پیش فرماتے رہتے، درس حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط ومفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشیں ہوتی تھی، اس لیے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادہ کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا۔ انداز بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا جس میں آپ کے جمال ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں آپ کے درس بخاری شریف کو شہرت تام اور قبول عام حاصل تھی۔ آپ اپنے عہد کے یگانہ روزگار عالم اور درس حدیث کے بے مثل استاد تھے اور طلباء ان سے شرف تلمذ پر فخر محسوس کرتے تھے۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاست سے بھی آپ کو تحریک خلافت کے زمانہ سے تعلق رہا، اس کے نتیجے میں قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں، حضرت مدنی کی جمعیۃ علما ہند کی صدارت کے زمانے میں آپ نائب صدر رہے اور بعد ازاں مسند صدارت پر فائز ہوئے۔ آخر عمر میں جب صحت نے جواب دے دیا تو بغرض علاج وتبدیلی آب وہوا ان کو مراد آباد لے جایا گیا جہاں آپ کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۰ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵/اپریل ۱۹۷۲ کی تاریخ میں نصف شب کے بعد انتقال فرمایا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے نماز جنازہ پڑھائی بعد دوپہر علم وفضل کا یہ آفتاب سرزمین مراد آباد میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

حضرت مولانا کو خداوند قدوس نے تصنیفی ذوق بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ آپؒ کی مشہور تصانیف میں سے ”تقریر حاوی شرح بیضاوی“ امام طحاوی کی ”حیات امام

طحاوی“ زیادہ مشہور ومعروف ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں صحیح بخاری کے درس کا یہ عظیم تعلیمی منصب تقریباً ۶۰/سال سے حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں مسلسل چلا آرہا تھا، حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ کی وفات کے بعد یہ تسلسل ختم ہوگیا۔

حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

(۱۹۲۰ء۔۱۳۹۷ھ)

حضرت مولانا شریف حسنؒ ۹/اگست ۱۹۳۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، اور یہیں حافظ عبدالخالق مرحوم سے قرآن شریف حفظ کیا، پھر تین سال تک فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بیہٹ (ضلع سہارنپور) کے مدرسہ میں رہ کر پڑھیں، بعد ازاں دارالعلوم میں داخل ہوکر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی۔ ۱۳۵۸ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوال ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں مدرسہ امدادالعلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اُنھیں جملہ علوم وفنون میں کامل دست گاہ حاصل تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے حدیث اور افتاء سے خاص مناسبت پیدا ہوئی، تقریباً ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے صدرالمدرسین بنائے گئے، وہاں درس حدیث کے ساتھ افتاء کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹/سال کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، وہاں صحیح بخاری اور جامع ترمذی زیر درس رہیں۔

۱۳۸۳ھ میں انھیں دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا، علم حدیث سے خاص شغف تھا،

حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہے، تادمِ واپسیں عملاً شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علوم دینیہ کے طلباء کی خدمت میں گزری، اُن کا درس علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا، طلباء حدیث اُن کے درس سے مطمئن ہو کر اُٹھتے، وفات سے چند گھنٹے قبل تک اُن کا علمی فیضان جاری رہا۔

مولانا شریف حسن، صاحبِ علم وعمل، تقویٰ وطہارت اور فضائل اخلاق وشمائل میں علماء سلف کی یادگار تھے، وہ اپنے علمی تجرّ اور علم حدیث سے خصوصی تعلق وشغف اور اپنی پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ظاہر وباطن دونوں پاک تھے، طبیعت نہایت مرنجا مرنج پائی تھی۔

۱۴/۱۵ رجمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۵۸ رسال کی عمر میں بعارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہوگئے۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً قبرستانِ قاسمی ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

(۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء - ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء)

محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ ۴/شعبان ۱۳۴۷ھ مطابق ۲۶/جنوری ۱۹۲۹/ کو محلہ خانقاہ دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری کی آخری اولاد تھے، والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں اس جہانِ بے ثبات کی ابھی چار بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ۳/صفر ۱۳۵۲ھ/ ۲۸/مئی ۱۹۳۴/ کو وہ اپنے اس

نونہال کو مالکِ کائنات کے حوالہ کر کے خود راہ گیرِ عالم آخرت ہوگئے، اس طرح بغیر کسی کسب واختیار کے دربارِ الٰہی سے یتیمی کی سنت نصیب ہوگئی۔

والد ماجد کی وفات کے بعد والدہ اور بڑی بہن کی زیر نگرانی تعلیم وتحصیل کا آغاز کیا، قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد دار العلوم دیوبند سے فارسی کے پانچ سالہ نصاب کی تکمیل کی، بعد ازاں آپ کے خالہ زاد بھائی حکیم اختر نے آپ کا داخلہ پنجاب یونیورسٹی میں کرا دیا، جہاں سے انھوں نے اردو ادیب، عالم، ادیب فاضل فارسی اور منشی فاضل کے امتحانات دیئے۔ اس کے بعد کرنال سینٹر سے انگریزی مضمون کے دو پرچوں کا امتحان دیا۔ یہ ہندوپاک کی تقسیم کا زمانہ تھا، ہر طرف فسادات اور قتل وخونریزی کا بازار گرم تھا، شاہ صاحب کرنال سے دہلی آگئے، لیکن دہلی میں بھی حالات ویسے نہیں تھے کہ وہاں قیام کیا جاسکے۔ اسلئے دہلی سے منتقل ہو کر دیوبند واپس آگئے۔

دیوبند کی مراجعت کے بعد شاہ صاحب کے سرپرستوں نے انھیں حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے خادم خاص قاری اصغر علی سہس پوری رحمہ اللہ کی تربیت میں دیدیا، قاری صاحب موصوف چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بڑا ستھرا سلیقہ رکھتے تھے، وہ پڑھاتے نہیں بلکہ گھول کر پلاتے تھے ساتھ ہی بچوں کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے ان کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ قاری صاحب کی یہ تعلیم وتربیت شاہ صاحب مرحوم کے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی اور وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر پڑھنے لکھنے اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں پوری طرح منہمک ہوگئے، اور چند ہی سالوں میں متوسطات تک کی کتابوں کی تکمیل کر کے دار العلوم دیوبند میں باقاعدہ داخلہ لے لیا اور آگے کی کتابیں اس وقت کے اساتذہ مولانا معراج الحق دیوبندی، مولانا محمد حسین بہاری، مولانا عبدالفتاح وغیرہ سے پڑھ کر اس وقت کے

صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی اور شیخ المعقولات علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا محمد اعزازعلی وغیرہ اکابراساتذہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کرکے سندفراغت حاصل کی۔

حضرت شاہ صاحب کی علمی صلاحیتوں کونکھارنے اور پروان چڑھانے میں حضرت شیخ الادب رحمہ اللہ کا کردار بہت اہم ہے، جس کے معترف شاہ صاحب زندگی بھر رہے اوراس سلسلے کے واقعات کوبڑی دلچسپی سے بیان کیا کرتے تھے۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ / میں بحیثیت مدرس مادرعلمی دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوگیا اور اپنے محسن اساتذہ بالخصوص حضرت شیخ الادب کی نگرانی ورہنمائی میں تدریس کا سلسلہ شروع کردیا جو مسلسل چوبیس سالوں تک جاری رہا، اس مدت میں شاہ صاحب نے نصاب میں شامل اکثر بلکہ بعض کتابوں کے علاوہ سبھی کتابوں کا درس دیا، شاہ صاحب کی قوت حافظہ اور یادداشت نہایت قوی، ذہانت وذکاوت میں بھی اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، اسی کے ساتھ زبان وبیان پرانھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ اس لئے ان کا درس طلبہ میں ہمیشہ مقبول اور وہ خود محبوب رہے۔ ۱۹۸۰ / میں دارالعلوم دیوبند سے رسمی تعلق منقطع ہوجانے کے بعد وقف دارالعلوم میں تدریس کا سلسلہ جاری رہا، درس و تدریس کا وہ سلسلہ جوآج سے چوبیس پچیس سال پہلے شروع کیا تھا، اگرچہ اس کی جگہ بدل گئی، لیکن وہ بغیر کسی انقطاع کے بدستور جاری رہا اس مدت میں دیگر کتابوں کے علاوہ صرف بخاری شریف کے طلبہ کی تعداد جنھوں نے دونوں جگہوں میں شاہ صاحب سے پڑھا سات ہزار سے اوپر ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف بھی شاہ صاحب کا محبوب ترین مشغلہ تھا، وہ اپنے پرہجوم اور مشغول ومصروف اوقات میں سے ایک وقت اپنے اس ذوق کی تسکین کے لئے ضرور فارغ کرلیا کرتے تھے، چنانچہ

انھوں نے اپنے اس طویل علمی سفر میں تلامذہ کی کثیر جماعت کے ساتھ قرآن، حدیث، تذکرہ وسوانح وغیرہ مختلف موضوعات پر دو درجن سے زائد تصنیفی یادگار بھی چھوڑی ہیں۔ مولانا نسیم اختر قیصر نے مولانا کی تدریسی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ''میرے عہد کے لوگ'' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''اول دن سے ان کی تدریسی صلاحیتوں کے چرچے شروع ہوئے، میزان سے ابتداء اور بخاری شریف پرآکر ٹھہراؤ، مقامات حریری کی تدریس، ملاحسن اور سلم العلوم پر گرفت، جلالین اور بیضاوی ان کی نکتہ آفرینیوں کا مرکز بنی، مختصر المعانی، شرح عقائد اور ہدایہ میں پختگی کا ثبوت دیا، ترمذی، مسلم، ابوداؤد، مشکوٰۃ جیسی کتب احادیث بھی طویل زمانے تک پڑھانے کی سعادت حاصل رہی، فقہ وحدیث، تفسیر وکلام، منطق وفلسفہ، معانی وادب ہرجگہ شہرتوں اور محبوبیت نے ان کے قدموں تلے پھول بچھادیئے، ۵۵ سال سے زائد ان کی تدریسی زندگی کے گزر رہے ہیں ان کے انداز درس اور طریقۂ درس نے مقبولیت کا دامن نہیں چھوڑا، کسی فن میں نہ عاجز اور نہ کسی کتاب سے متوحش، ہرجگہ ان کی صلاحیتوں کے قطار اندر قطار چراغ روشن ہوئے اور ان کی روشنی طالبان علوم نبوت کے لئے ایک مثال بنکر سامنے رہی، خدا نے ذہن، فکر، حافظے اور افہام وتفہیم کی بے پناہ دولتوں سے نوازا اور قدرت کی ان فیاضانہ عنایات کا انہوں نے فیاضانہ استعمال کیا، دارالعلوم کے وہ چند نام جو اپنے علم وعمل صلاحیت اور قبولیت میں شہرتوں کی منزلوں تک پہونچے ان میں شاہ صاحب کا نام نمایاں ہے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے وجود میں ایک ادارہ تھے اس انجمن کی روشنی جب تک کہ آپ حیات رہے بڑھتی ہی رہی''

حضرت شاہ صاحب مرحوم نہایت خوش اخلاق، نرم گفتار اور باغ وبہار طبیعت کے مالک تھے جس مجلس میں ہوتے اپنے لطائف وظرائف سے اسے زعفران زار بنادیتے

تھے،خردنوازی، بے تکلفی اور احباب پروری ان کی عادت ثانیہ تھی، وہ اگرچہ علمی و دینی طبقہ کے ایک فرد وحید تھے،لیکن ان کے وہ لوگ بھی گرویدہ تھے جو علم دین سے چنداں تعلق نہیں رکھتے ، وہ عوامی حلقہ میں بھی ایسے ہی پیارے تھے جیسے طلبہ وعلماء کی جماعت میں یہ ان کے وسیع حسن اخلاق کی ایک کرامت تھی۔ ذکاوت وذہانت میں بلا استثناء اپنے ہم عصروں میں امتیازی شان رکھتے تھے، اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کر لینے کی حکمت عملی میں ید طولیٰ کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب ومقبول مدرس، اعلیٰ درجہ کے خطیب ومقرر اور بلند پایہ صاحب قلم ومصنف تھے ان کی تحریں رواں دواں اور ادب کی چاشنی کا نمونہ ہوتی تھیں، اسلامیات میں تفسیر وحدیث ان کا محبوب موضوع تھا۔ اور ان میں وہ اپنی نمایاں پہچان رکھتے تھے، تعلیم وتدریس اور تالیف وتصنیف کے مشغلہ سے مضبوط ومستحکم وابستگی کے ساتھ ملکی سیاست سے بھی عملاً وابستہ تھے، اور سیاسی حلقوں میں ان کی مقبولیت اور پذیرائی علمی، دینی دائروں سے کم نہیں تھی۔شاہ صاحب کی شخصیت مجموعہ کمالات تھی، زندگی کے ہر میدان میں ان کی خدمات اور جہد وعمل کے نقوش موجود ہیں جن سے آنے والی نسلیں اپنے ذوق وطبیعت کے مطابق روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ اور خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی کا دایاں بازو بنکر انہوں نے وقف دارالعلوم دیوبند کی آبیاری اور آبپاشی میں جو کردار اور لازوال کارنامہ انجام دیا تاریخ اس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور لیل ونہار کی گردشیں مولانا کی خدمات اور لازوال کارناموں پر کبھی اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔مولانا کے تصنیفی کارناموں میں سوانحات، فقہ، ایمانیات، تقریر وخطابت، تفسیر وحدیث اور دیگر موضوعات پر ان کی تحریروں رقم کے نادر اور نایاب نمونے صدیوں تک ہمارے درمیان موجود رہیں گے اور ایک درجن سے زائد ان کی قلمی کاوشیں آنے والی نسلوں کے لئے مآخذ اور مصادر کی حیثیت

اختیار کئے رہیں گی۔

مولانا کو جس طرح تحریر پر عبور حاصل تھا اسی طرح خطابت میں بھی عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، شورش کاشمیریؒ اور زکریا قدوسیؒ کے سچے جانشین محسوس ہوتے تھے۔

آپ نے قرآن وسنت کے پیغام کو عام وتام کرنے کے لئے دور دراز ملکوں کا سفر بھی کیا چنانچہ افریقہ، کناڈا، پناما، برطانیہ، شارجہ، دبئی، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سعودی عرب، ماریشش، مصر، ری یونین وغیرہ مختلف ممالک کے نہ صرف اسفار فرمائے بلکہ اپنے اعلیٰ خطابت اور وعظ سے بھی نوازا۔

انہوں نے اپنے ادارہ معہد انور سے ایک علمی و دینی مجلہ ''محدث عصر'' کے نکالنے کا بھی اہتمام فرمایا، اس ادارہ کے نصاب تعلیم اور نظام تربیت کو اپنے فہم وبصیرت اور تدبیر و تدبر سے بہت ہی ٹھوس بنایا، تدریس کے لئے اساتذہ اور عملہ بھی فنی رکھا اس سے مولانا کی انتظامی مہارت کے ساتھ تعلیم کے معاملہ میں ان کے مزاج کی ندرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں رہنے کے دوران بھی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے ساتھ وہاں کی چہار دیواری سے نکلنے کے بعد وقف دارالعلوم دیوبند میں ہر جگہ ان کی شخصیت امتیازی رہی، ان کے سامنے بڑے بڑے علماء خود کو چھوٹا محسوس کرتے تھے، ان کی علمی گفتگو سے حاضرین مجلس عش عش کر اٹھتے تھے، ان کے زور بیان اور استدلالی طرز وادا سے ان کے معاصرین بھی اپنے دانتوں تلے انگلیاں رکھ لیتے تھے، ماہرین علم وفن اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کسی بحث یا اپنے مطلب کی کسی چیز کو تلاش کرنے میں مغز ماری کے بجائے مولانا ہی سے معلوم کر لینے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے اور مولانا کسی کو بھی ناکام ونامراد واپس نہ فرماتے تھی۔

جامعہ امام انور دیوبند کے موسس، وقف دارالعلوم کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین،

دیو بند مکتب فکر کے ایک لائق و فائق عالم دین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری تقریباً پانچ چھ ماہ کی علالت کے بعد دہلی کے ایک ہسپتال میں ۱۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ موافق ۲۸/ اپریل ۲۰۰۸/ بروز شنبہ بعمر ۸۲ سال اس دار فانی کو چھوڑ کر راہیٔ عالم جاودانی ہو گئے۔

(ماہ نامہ دار العلوم دیو بند: شمارہ مئی ۲۰۰۸ء۔ الغزالی دسمبر ۲۰۱۲ء)

حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ

(۱۹۱۸ء۔۲۰۱۰ء)

مولانا نصیر احمد خاںؒ صاحب انگریزی فوج کے اعلیٰ منصب پر فائز، علانواز اور مولانا خلیل احمد امبہٹوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید جناب عبدالشکور صاحب کے گھر ۱۳۳۵ھ میں حضرت نے آنکھیں کھولیں۔ حضرت کے والد ماجد کے دینی جذبہ کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ”ترک موالات“ کے اعلان کے بعد وہ انگریزی ملازمت کو خیر باد کہہ کر کاشتکاری میں لگ گئے۔ حضرت شیخ کا آبائی وطن قصبہ ”بسی“ ضلع بلند شہر (یوپی) ہے؛ لیکن موجودہ رہائش دیو بند میں ہے۔

والدہ بھی انتہائی پارسا اور عبادت گزار تھیں، بچیوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنا اور اخلاقی تربیت کی فکر ان کے شب و روز کا مشغلہ تھا، تلاوت قرآن سے شغف کا یہ حال تھا کہ حافظہ نہ ہونے کے باوجود بچیوں کو غلطیوں پر بے ساختہ ٹوکتیں۔

مولانا نصیر احمد خاں کے بڑے بھائی مولانا بشیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ چوں کہ مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں مدرس تھے اس لیے ان کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوا۔ حفظ قرآن اس کے بعد عربی و فارسی کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ ساتھ بخاری تک کی مکمل تعلیم اپنے بڑے بھائی سے اسی گہوارۂ علم میں حاصل کی۔ درمیان میں کچھ خانگی الجھنوں کی وجہ

سے ایک مرتبہ حضرت شیخ کا تعلیمی سلسلہ موقوف ہو گیا؛ لیکن شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ عنایت اور دعاؤں کے خاص اثر سے رکاوٹ ختم ہوئی اور تعلیمی مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۱۳۶۲ھ میں جب مولانا بشیر احمد خاں صاحب بحیثیت مدرس دار العلوم دیو بند تشریف لائے تو حضرت شیخ بھی برادر محترم کے ہمراہ آئے اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بشیر احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ اکوڑہ خٹک (پاکستان) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے ۱۳۶۳ھ میں از سر نو دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی اور ۱۳۶۵ھ تک حضرت نے تفسیر و قرأت، فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ اور طب و حکمت جیسے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں اور ان میں تخصص پیدا کیا۔ فن قرأت میں تو ایسی مہارت پیدا کی کہ فراغت کے بعد ہی ملتان کے ایک بڑے مدرسہ میں صدر القراء کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہو گیا؛ لیکن اہل خانہ کی عدم رضامندی کی بنا پر وہاں نہیں جا سکے؛ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ دار العلوم دیو بند میں خدمت مقدر تھی۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ سے ۱۳۶۵ھ میں دار العلوم دیو بند میں آپ کا بحیثیت مدرس تقرر ہوا۔ میزان سے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور تدریس کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے وہ متوسط درجہ سے علیا اولیٰ پھر علیا ثانیہ کے استاذ مقرر ہوئے، اس دوران درس نظامی کے ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھائیں، صرف و نحو ہو یا ادب و لغت یا پھر تفسیر و فقہ۔

۱۳۹۱ھ سے درس حدیث کا آغاز ہوا اور ۱۳۹۷ھ تک حدیث کی معروف معتبر کتابیں: موطا امام مالک، طحاوی، ترمذی اور مسلم وغیرہ آپ کے زیر درس رہیں۔ ۱۳۹۷ھ

میں خدائے عزوجل نے حضرت شیخ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف پڑھانے کی صورت میں شیخ الحدیث کا بلند مقام عطا کیا اور یہ سنہرا سلسلہ انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ ایک سال پہلے تک جاری رہا، اپنی پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کی بنا پر صفر ۱۴۲۹ھ کو دارالعلوم دیوبند سے سبک دوش ہوئے۔

مولاناؒ کو معقول ومنقول دونوں میں کامل دسترس حاصل ہے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی لکھتے ہیں: "(وہ) معقول ومنقول دونوں میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں؛ بلکہ دارالعلوم میں علوم عقلیہ کے ماہرین کی اس وقت آخری کڑی ہیں۔" (وہ کوہ کن کی بات: ۳۳۶)

صرف ونحو، ادب وبلاغت اور تفسیر وحدیث کے ساتھ ساتھ علم ہیئت بھی حضرت شیخ کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، اس فن کی "التصریح" نامی کتاب مستقل آپ کے زیرِ درس رہتی، اس فن میں حضرت کو بڑا کمال حاصل تھا پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو طلبہ کے ذہن میں اتار دیتے اور طلبہ بھی بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتے اور بڑی تعداد میں شریک درس ہوتے۔

دارالعلوم کے تدریسی عہد میں درس وتدریس کے علاوہ کئی اہم ذمہ داریاں بھی حضرت کے سپرد رہیں۔ حضرت شیخ کی علمی استعداد اور انتظامی صلاحیت کے پیش نظر ۱۳۹۱ھ میں اہتمام کی نیابت سپرد ہوئی، ۱۳۹۷ھ میں شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۴۰۰ھ میں قائم مقام صدر مدرس منتخب ہوئے اور ۱۴۱۲ھ میں تدریس کی صدارت تفویض ہوئی۔ اس طرح سے دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ کی ۶۵/ سالہ علمی خدمات کا سنہرا دور پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ ۱۶/ سال تک مسند صدارت پر رونق افروز رہے اور ۳۲/ سال تک بخاری شریف کا مقدس درس دیا۔ ایک مرتبہ آپ نے خود فرمایا کہ "میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ۶۵/ سال دارالعلوم دیوبند میں خدمت

کا موقع دیا، ۳۲ سال بخاری پڑھائی، بھائی! دعا کرو کہ بس ایمان پر خاتمہ ہو۔"

حضرت شیخ کے طریقۂ درس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سال کے ابتدائی ایام میں حدیث پر تفصیلی گفتگو کرتے، کلام انتہائی جامع ومانع ہوتا، امام بخاری حدیث کے تحت جو باب قائم کرتے ہیں اس کو انتہائی پیچیدہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شیخ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ امام بخاری کے مقصد کو بھی سمجھاتے چلے جاتے، اس سلسلے میں بخاری کا اسلوب کیا ہے؟ اس کی بھی وضاحت فرماتے اور مکمل ہنر مندی کے ساتھ حدیث، اس کا مفہوم، اس سے ملنے والا پیغام، اس پر عمل کرنے کی تاکید اور اس پر ملنے والے ثمرات کو تشنہ کامان علوم کے ذہن ودماغ میں پیوست کردیتے۔ تقریباً دو مہینے کے بعد کلام مختصر کردیتے انداز وہی رہتا؛ لیکن ششماہی بعد سے کلام کا سلسلہ انتہائی مختصر ہوجاتا اور حدیث خوانی ہوتی۔

ایک طرف جہاں خواص نے باضابطہ طور پر ان سے حدیث وتفسیر کے علوم سے اپنی پیاس بجھائی تو دوسری طرف حضرت نے عوام کو بھی اپنے فیوض سے محروم نہیں رکھا، چناں چہ تمل ناڈو کے "کوئمبٹور" علاقے کی اول "تاگہ" محلہ کی مسجد پھر ٹیپو سلطان مسجد میں تقریباً ۴۰؍ سال تک تفسیری خدمات انجام دیں جس سے بہت سے بے راہوں کو راہ اور منزل کا پتہ ملا اور دینداری کی فضا قائم ہوئی۔ خرابی صحت اور ضعف کی وجہ سے چند سال قبل یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

تصنیف وتالیف بھی ایک مستقل چیز ہے، ہر کسی کا یہ مقدر بن جائے ضروری نہیں، لہٰذا: حضرت شیخ کی کوئی تصنیف تو نہیں ہے؛ لیکن مولانا کے دامنِ فیض سے فیضیاب ہونے والے صرف حدیث کے کم وبیش ۲۵؍ ہزار شاگرد ہیں، ان میں سے بے شمار ایسے ہیں جنھوں نے علمی، اصلاحی، تحقیقی اور تصنیفی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور دے رہے ہیں۔ اس طرح سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بے شمار مدارس اور دینی اداروں میں

حضرت کا فیض جاری وساری ہے۔

حضرت مولانا کی کل ۱۰/اولاد ہوئیں۔ ۳/اللہ کو پیارے ہو چکے اور ۷/بفضل اللہ بقید حیات ہیں۔

حضرت مولانا کو اپنے استاذ وشیخ حضرت مدنیؒ سے کس قدر دلی لگاؤ اور سچی عقیدت ہے اس کا صحیح اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی وہ حضرت مدنیؒ کا تذکرہ کرتے تو آب دیدہ ہو جاتے بلکہ کبھی کبھی بولتے بولتے زبان بند ہو جاتی۔ اس تعلق خاطر کی بنا پر مولانا نصیر احمد خاںؒ کا اصلاحی تعلق بھی حضرت مدنی ہی سے رہا اور انھیں سے بیعت بھی تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، یہاں تک کہ بیعت کے ساتھ ساتھ خلعتِ خلافت سے بھی نوازے گئے؛ لیکن خود کبھی کسی کو انھوں نے بیعت نہیں کیا اور ہمیشہ بے نفسی اور گمنامی والی زندگی کو ترجیح دی اور خود فرماتے کہ: ”بھئی میرا مزاج نہیں، یہ تو بڑے حضرات کی چیزیں ہیں۔“ موجودہ وقت میں دارالعلوم دیوبند میں ایک دو اساتذہ کو چھوڑ کر ابتدائی درجہ کے مدرسین سے لے کر شیخ الحدیث تک سب آپ کے شاگرد ہیں۔

۴/فروری ۲۰۱۰ء کو علم وعمل کا یہ ستارہ غروب ہو گیا۔ حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور ”مزار قاسمی“ میں تدفین عمل میں آئی۔

(ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 10-9 جلد: 93 رمضان-شوال 1430ھ مطابق ستمبر-اکتوبر 2009ء)

حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمیؒ

(۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء - ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی کی پیدائش ۶/رجب بہ روز دوشنبہ ۱۳۴۷ھ

مطابق ۱۹۲۸ء علم وادب کی سرزمین اعظم گڑھ کے جگدیش پور میں ہوئی۔ ۶ سال کی عمر میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس کے بعد آپ کی کفالت وتربیت مولانا ابوالحسن محمد مسلم صاحب نے فرمائی۔ گاؤں کے مکتب سے ابتدائی تعلیم کے بعد بیت العلوم سرائے میر میں داخل ہوئے، یہاں سے عربی فارسی کی مختلف کتابیں پڑھنے کے بعد دارالعلوم مئو میں داخلہ لے کر ہفتم تک کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۴۸ء میں دورۂ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنیؒ سے صحیح البخاری وترمذی نصف اول، علامہ ابراہیم بلیاوی سے صحیح مسلم، مولانا اعزاز علیؒ صاحب سے سنن ابوداؤد، ترمذی نصف ثانی اور شمائل پڑھی۔ جب کہ دیگر اسباق مولانا سید فخر الحسنؒ، مولانا ظہور احمد اور مولانا جلیل احمد رحمہم اللہ سے متعلق رہے۔ ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ سے بھی آپ کو اجازت حدیث حاصل تھی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کا بھی رخ کیا، لیکن وہاں کا ماحول اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہ پا کر ایک ماہ بھی قیام نہ کر سکے، اور وطن واپس آ گئے، درس وتدریس کا باضابطہ سلسلہ مطلع العلوم بنارس سے شروع کیا، جہاں ۱۶/سال تک مختلف علوم وفنون کی کتابیں زیر درس رہیں، بڑے انہماک اور دلچسپی سے پڑھاتے، روزانہ رات کو ایک بجے/دو بجے تک مطالعے میں مستغرق رہتے، اس کے بعد طلبہ کے سامنے علم کے دریاہائے آبدار لٹاتے۔ کچھ عرصہ گریڈیہہ کے ”کول ڈیہا“ میں بھی آپ نے درس دیا، اس کے بعد مشرقی یوپی کی بافیض دینی درس گاہ ”دارالعلوم مئو“ میں تدریس کے لیے بلائے گئے، جہاں آپ نے بخاری شریف سمیت فن کی امہات الکتب کا درس دیا، پھر ۱۹۸۳ء میں وہ وقت بھی آیا جب محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ کی نشاندہی پر معزز ارباب شوری نے دارالعلوم میں بخاری شریف ثانی کی تدریس کے لیے آپ کا انتخاب

کیا، اوراس وقت سے وفات تک کامیابی کے ساتھ اس خدمت گرامی کو انجام دیتے رہے۔ ۳۳ سال میں تقریباً ۲۵ ہزار افراد نے آپ سے بخاری شریف پڑھی، عرب وعجم کی نمایاں شخصیات جنھوں نے آپ سے خصوصی اجازت حدیث حاصل کی، ان کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ عمر کے آخری ایام تک مختلف دینی ودعوتی پروگراموں میں شرکت کے لیے اسفار فرماتے رہے۔ آپ نے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وشیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہم اللہ علیہم کے زیر سایہ علمی سفر کی تکمیل کی تو محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ صاحب کے یہاں رجال سازی کا عملی سفر پورا کیا اور حضرت ہردوئی سے بیعت ہوئے۔ بعدہ آپ کو حضرت ہردوئی علیہ الرحمہ نے ہی اجازت وخلافت سے نوازا۔

حضرت شیخ عبدالحق صاحب ایک طویل عرصہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ لیکن آپ نے طبیعت سے اس کا احساس کبھی بھی نہیں ہونے دیا، پیرانہ سالی اور معذوری کے باوجود امسال بھی ششماہی تک اپنا نصاب پورے وقار وفرض شناسی سے مکمل کیا، گزشتہ دو دنوں سے سانس اور پیٹ کی تکلیف زیادہ بڑھی، جمعرات کے دن بہت قے کیا، بعد نماز جمعہ ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ جین کے دیوبند واقع مقامی ہاسپٹل میں آپ کو بھرتی کیا گیا۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد کچھ طبیعت نارمل ہوئی۔ آپ نے ذمہ داران سے بات چیت بھی کی، بعد نماز مغرب سانس اکھڑنے لگی اور خادم نے سورہ یٰس کی تلاوت شروع کی۔ درمیان میں اٹکنے پر پر آپ نے ٹوکا بھی اور پھر مختصر وقت میں قضائے ربی کی آمد ہوئی اور آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر اپنے خالق حقیقی سے جاملی۔ ۳۰؍ربیع الاول 1438 ھجری بمطابق 30 دسمبر 2016 سات بج کر دس منٹ پر ھجری سنہ کے مطابق 90 سال اور عیسوی سن کے مطابق 88 سال کی عمر میں علوم ومعارف کا یہ چراغ زھد وورع کا روشن آفتاب غروب ہوگیا۔

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ

(1940ء۔2017ء)

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ 9 مارچ 1940ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے، آبائی وطن حبیب والا ضلع بجنور تھا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق بجنوری (ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کے ہمراہ 1951ء میں دارالعلوم دیوبند آئے اور داخلہ لیا، 1958ء میں دورہ حدیث میں اول پوزیشن سے فراغت حاصل کی۔ 1972ء میں دارالعلوم دیوبند کے استاذ مقرر ہوئے۔ فراغت کے بعد حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے دامن علم سے وابستہ ہو کر برسوں استفادہ کرتے رہے اور اپنے استاذ محترم کے درس بخاری کی تقریروں کو مرتب کر کے ''ایضاح البخاری'' کے نام سے شائع کیا۔

1391ھ 1972ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے، کچھ برسوں تک تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی، 1405ء میں مجلس شوری نے آپ کو مجلس تعلیمی کا ناظم مقرر کیا، 1408ھ میں آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری 45 سالوں سے دارالعلوم دیوبند میں علم حدیث وفقہ کی تعلیم وتعلم سے وابستہ تھے۔

آپ کی تصانیف میں ایک اہم تصنیف ''ایضاح البخاری'' ہے، آپ کی ایک دوسری اہم تصنیف ''شوری کی شرعی حیثیت'' ہے، علم وعمل میں آپ بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ شعر وادب میں بھی اعلی ذوق کے حامل تھے، جس کا جیتا جاگتا نمونہ اور زندہ وجاوید ثبوت ''دارالعلوم دیوبند کا شہرہ آفاق ترانہ جو ایک لازوال ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤرخہ 23؍شعبان، 1438ھ بروز ہفتہ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمیؒ

(2017-1938ء)

متکلمِ اسلام، ممتاز سیرت نگار، ادیب وقلم کار، محدث ومفسر مولانا محمد اسلم قاسمیؒ کی ولادت 3 جون 1938ء میں ہوئی۔ از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم وتربیت حاصل کی، ناظرہ قرآن مجید قاری محمد کامل صاحبؒ کے اور فارسی کا چار سالہ نصاب مولانا بشیر صاحب دیوبندیؒ کے یہاں مکمل کیا، مولانا مشفع صاحب دیوبندیؒ، مولانا ظہیر صاحب دیوبندیؒ کے پاس۔ عربی درجات کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ، حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ قابل ذکر ہیں۔ 1959ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اور 1969ء میں دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا اور مختلف انتظامی شعبوں سے وابستہ رہے۔ آپ خانوادۂ قاسمی کے گل سرسبد، علوم قاسمیہ کے امین، حکیم الاسلام مولانا قاری طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خطابت وکمالات کے پیکر، فہم وفراست، فکر وتدبر، علم وحلم، تقوی وطہارت، تصنیف وخطابت، بلند اخلاق وکردار، سادگی وتواضع، روایاتِ اسلاف کے پاسداری میں اونچا مقام ومرتبہ رکھتے تھے۔ ظاہری شکل وصورت میں وجیہہ وپروقار، خوبصورت ونفاست پسند تھے، خاموش مزاج لیکن بولتے تو علوم کے دریا بہاتے، حکمت کے موتی لٹاتے، تحقیق وتدقیق کی باریکیاں پیش فرماتے اور عوام وخواص کو اپنے منفرد خطابت، بےمثال زورِ بیان اور دلنشین اسلوبِ کلام سے مستفید فرماتے۔ آپ نے پوری زندگی درس وتدریس، قرآن وسنت کی تعلیم وتشریح میں گزاری اور تقریر

وخطابت کے ذریعہ دنیا بھر میں دین کی ترجمانی میں بسر کی، مختلف خوبیوں اور خصوصیتوں سے پروردگارِ عالم نے نوازا تھا۔ آپ بےمثال خطیب، انفرادی شان کے مدرس، بلند پایہ مصنف، سحر طراز صاحبِ قلم وادیب، بلند فکر شاعر، کثیر المطالعہ قدیم وجدید کے پختہ عالم، گوناگوں صلاحیتوں کے حامل، خاموش طبیعت، متین، پُروقار اور بردبار، یورپی ممالک میں حکیم الاسلامؒ کے رفیقِ سفر اور حکیمانہ خطاب کے ترجمان، اجلاس صدسالہ کے ناظم وروحِ رواں، دارالعلوم وقف دیوبند کے محدث، صدرالمدرسین اور ناظم مجلس تعلیمی تھے۔ (حیاتِ طیب)

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمیؒ کا شمار ممتاز سیرت نگاروں میں ہوتا تھا۔ ’سیرتِ پاک‘‘ کے عنوان سے بھی ایک قیمتی کتاب تالیف فرمائی، اور سیرتِ رسول ﷺ پر نہایت مشہور کتاب ’’سیرتِ حلبیہ‘‘ کو آپ ہی نے شستہ اور سلیس اردو میں منتقل کیا۔ آپ کے سیرت النبی ﷺ سے ذوق وشوق کو بیان کرتے ہوئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سیرت حلبیہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: ’’حق تعالی جزائے عطا فرمائے عزیز برخوردار سعادت آثار مولوی محمد اسلم سلمہ قاسمی فاضل دیوبند وناظم شعبۂ نشر واشاعت وامور عامہ دارالعلوم دیوبند کو جنھوں نے ’’سیرتِ حلبیہ‘‘ کے بامحاورہ اور سلیس ترجمہ کا بیڑا اٹھایا اور عملی طور پر شروع کر کے اس کی ایک قسط بھی تیار کر لی۔ عزیز موصوف کو سیرتِ رسول ﷺ سے چوں کہ پہلے ہی سے خاص لگاؤ اور طبعی مناسبت ہے، چناں چہ وہ اس سے پہلے مجموعہ سیرتِ رسول ﷺ کے نام سے اپنی ایک بلیغ اور بلند پایہ تالیف شائع کر چکے ہیں جو مقبول عام ہوئی اور بعض بعض تعلیم گاہوں کے نصاب میں بھی قبول کر لی گئی، اس لئے وہی احق تھے کہ سیرتِ حلبیہ جیسی مستند اور ماخذ کتب ذخیرۂ سیرت سے ہندوستان کو روشناس کرائیں، انہوں نے اپنے خداداد ملکہ سیرت نگاری سے اس اہم

سیرت کو اس کو بی سے اردو کا جامہ پہنانا شروع کیا ہے کہ وہ اس کے بدن پر چست اور فٹ نظر آتا ہے، جس میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ (سیرت حلبیہ)

سیرت حلبیہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک ایسی منفرد کتاب ہے جو تاریخ اسلامی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر اپنا ایک علیحدہ، مستقل اور اہم مقام رکھتی ہے، اسی انفرادیت اہمیت اور افادیت ومقام کے صحیح تصور کو پیش کرنے کیلئے کہا گیا ہے کہ عربی لٹریچر میں سیرت پر ضابطے کی تو صرف یہی ایک کتاب ہے۔ مؤلف نے یہ کتاب عربی کی دو اہم کتب سیرت (عیون الاثر اور سیرت شمس الشامی) کی تلخیص کے طور پر مرتب کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں علمی وتحقیقی مواد کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں لیکن عوام اس کی گہرائی اور گیرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے مؤلف نے ایک مفصل ومربوط کتاب عوام و خواص دونوں طبقوں کیلئے مرتب کی جو اپنے استناد اور معتبر سیرت وتاریخ کی کتابوں سے ماخوذ واقعات پر مبنی ہے، اور ساتھ ہی تمام منتشر واقعات کو مربوط کر کے تسلسل کے ساتھ مرتب کر دیا گیا ہے جس سے یہ کتاب علماء وعوام سب کیلئے قابل فہم بن گئی ہے۔ ایک اور خصوصیت اس کتاب کی یہ بھی ہے کہ ایک واقعہ کے ذیل میں جتنی مختلف ومتفرق روایات فراہم ہوتی ہیں، یہ ان میں سے اکثر کو پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد ان روایات میں سے ممکن طور پر تضاد کو دور کر کے موافقت اور تطابق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے مختلف تاریخی واقعات کا ایک دوسرے سے جوڑ پیدا کرنا ممکن ہو جاتا ہے، ساتھ ہی یہ کہ اس میں جتنی قوی اور ضعیف روایات پیش کی گئی ہیں، مؤلف نے اکثر ان کا ماخذ بھی ذکر کر دیا ہے۔ تقریبا چھ ضخیم جلدوں میں سیرتِ حلبیہ آپ کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی اور مقبول بھی۔

آپ پہلے اپنے والدِ گرامی حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور

خلافت بھی پائی۔ ۱۹۸۳ء میں جب والدِ گرامی دنیا سے گزرے تو مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادیؒ سے وابستگی اختیار کی، یہ دونوں اکابر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفا رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمیؒ نے ۸۰/سال کی عمر میں ۱۳/نومبر ۲۰۱۷ء بروز پیر بوقت بارہ بجے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور قبرستانِ قاسمی میں تدفین عمل میں آئی۔

چمن کی اجڑی بہاروں کو یاد کرتے ہیں
تری نگہ کے شراروں کو یاد کرتے ہیں
خوشا کہ وہ جو مجسّم بہار ونغمہ تھے
ہم ایسے سینہ فگاروں کو یاد کرتے ہیں
ملا ہے عشق سے یہ درسِ ناگوار کہ ہم
گلوں کو بھول کے خاروں کو یاد کرتے ہیں

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

فخر الاماثل حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

آپؒ کا تاریخی نام محمد مظہر ہے اور اسی سے مشہور و معروف ہوئے، صدیقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قرآن کریم کے حفظ اور ابتدائی کتب کی پوری تعلیم اپنے والد ماجد حضرت حافظ لطف علی صاحبؒ کے پاس مکمل ہوئی، اپنی ذہنی صلاحیت اور عمدہ تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنی نوعمری ہی میں نہایت ہوشیار و ہوشمند تھے اور آپ کے اسی وقت کے طور وطریق سے ذکاوت و ذہانت آشکارا تھی، وطن کی ابتدائی تعلیم کے بعد استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ نانوتوی اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ اور استاذ الکلؒ کے بے مثال تعلیم و تربیت اور وہاں کے خالص ماحول نے بڑا کام کیا چنانچہ اسی وقت اپنے رفقاء اور مولانا مملوک علی صاحبؒ کے حلقہ میں آپؒ کی لیاقت و صلاحیت کا شہرہ ہو گیا تھا۔

مسلم یونیورسٹی کے بانی جناب سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں۔

”مولوی صاحب ممدوح بہت بڑے عالم تھے جس زمانہ میں دہلی میں طالب علم تھے اسی زمانہ میں ان کی ذہانت مشہور تھی، تقویٰ و ورع میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔

آپ نے حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب دہلوی (۱۸۴۳ء) کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے کیا۔

حدیث نبوی شریف کی تعلیم حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ (۱۸۲۰۔۱۸۷۹ء) محدث کبیر حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ (۱۸۱۰ء۔۱۸۱۰ء) سے پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے مدرسہ صولتیہ مکۃ المکرمہ کے بانی مناظر اسلام حضرت مولانا

رحمت اللہ صاحب کیرانوی، اور مدینہ منورہ کے جلیل القدر عالم حضرت شیخ عبدالغنی بن سعید العمری سے بھی علمی استفادہ فرمایا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اجمیری کالج تشریف لے گئے کچھ عرصہ تک تعلیم دینے کے بعد آگرہ کالج تشریف لے گئے اور وہاں معیاری تنخواہ اور عہدہ سونپا گیا مگر وہاں بھی آپ زیادہ قیام نہ فرما سکے چنانچہ دہلی میں بھی کچھ عرصہ کیلئے ملازم ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مکتبہ نول کشور لکھنؤ تشریف لے گئے اور عربی اُردو اور فارسی کی کتب کی تصحیح وغیرہ فرماتے رہے۔ ایک مدت تک اسی کام میں مشغول رہے، تصنیفات و تالیفات اور ان کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ بھی چلتا رہا چنانچہ متعدد مصنفین کی کتب کی تصحیح اور حضرت موصوف کی نظر ثانی کے بعد ہی مکتبہ نول کشور لکھنؤ سے چھپتی تھیں، خود منشی نول کشور مرحوم مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی کے شاگرد تھے۔

۱۲۸۳ھ میں جب حضرت مولانا سعادت علیؒ نے مظاہر علوم قائم فرمایا تو حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ جیسے قابل و فاضل، عالم و ماہر اور ان کے مرشد سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زبان میں ”یکتائے زمانہ“ کی ضرورت تھی، چنانچہ خود حضرت بانی علیہ الرحمہ نانوتہ تشریف لے گئے اور اپنے ساتھ مولانا محمد مظہر صاحبؒ کو لیکر آئے مظاہر علوم کی عمر اس وقت صرف تین ماہ تھی گویا شوال ۱۲۸۳ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے مظاہر علوم کو سرفراز فرمایا۔

مظاہر علوم سہارنپور آنے کے بعد آپ کو صدر المدرسین کا عہدۂ جلیلہ سونپا گیا، اس کے علاوہ حدیث و تفسیر کی اعلیٰ معیاری کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی تقریباً ۱۹ر سال تک مظاہر علوم کی خدمت انجام دیتے رہے حالانکہ آپ کا مشاہرہ صرف ۲۵ر روپئے تھا اس کے باوجود آپ نے بڑی بڑی پیشکش

اور خطیر تنخواہ کو ٹھکرادیا، خود مولانا سید احمد خان نے علی گڑھ بلانا چاہا لیکن آپ نہیں گئے کیونکہ مظاہر علوم آپ کے بزرگوں اور اساتذہ کا مدرسہ تھا جس کے ذرے ذرے سے آپ کو محبت اور عشق تھا، ۱۹؍سال کے درمیان ذیل کتب کا باقاعدہ درس دیا:

''بخاری شریف، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ، مؤطا امام مالک، سنن دارمی، شمائل ترمذی، ہدایہ، درمختار، قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ، نور الانوار، اصول الشاشی، جلالین، ترجمہ قرآن، بیضاوی، کشاف، مختصر المعانی، دیوان متنبی، مقامات حریری، حماسہ، سبعہ معلقہ، نفحۃ الیمن، تاریخ یمنی، قصیدہ ہمزیہ، تاریخ تیموری، جبر ومقابلہ، حصن حصین، نخبۃ الفکر، خطبۂ قاموس وغیرہ مذکورہ بالا کتابوں میں بعض بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کو ایک سال میں دو دو بار پڑھایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ جس طرح علم وفن میں یکتا تھے اسی طرح خلوص وللّٰہیت، زہد وعبادت، استغناء وتوکل، سلوک وتصوف تقوی وتدین میں بھی اپنی مثال آپ تھے اور اپنی عارفانہ صفات، بزرگانہ عادات، متقیانہ خصوصیات اور شمائل وخصائل کی وجہ سے مشہور ومعروف تھے۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کے گھریلو تعلقات شروع ہی سے حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے قائم تھے حتی کہ گھر کی عورتیں بھی حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ نے ارادت کا تعلق حضرت حاجی صاحبؒ سے قائم کیا تھا۔

پروفیسر ایوب قادریؒ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ استاذ حدیث مجاز بیعت اعلی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ومحدث گنگوہی حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ''

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ فرماتے ہیں:

''مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہ کا عزیز ذاتی ملاقات کیلئے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر (حضرت کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا) اس پر تاریخ اور ان منٹوں کا اندراج فرمالیتے اور ماہ کے ختم پر ان منٹوں کو جمع فرماکر اگر نصف یوم سے کم ہوں تو آدھے روز کی رخصت لے لیتے اور اگر نصف یوم سے زائد ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوادیتے البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا یا مدرسہ کے کسی کام سے آتا تو اس کا اندراج نہیں فرماتے تھے۔

حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ کے تمام شاگرد اور تلامذہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے کیونکہ آپ نے مظاہر علوم میں ایک دو سال نہیں مسلسل ۱۹؍سال تک اہتمام کے ساتھ علوم دینیہ کے طالبوں پر اپنے علوم عرفانیہ اور فیوض روحانیہ کی ندیاں بہائی ہیں ان تمام تلامذہ ذیشان کی تعداد کیلئے کئی صفحات درکار ہیں تاہم چند مشہور ومعروف شخصیات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں جن کا ذکر حضرت مولانا عبدالحئی صاحب حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں کیا ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا امیر باز خانؒ، حضرت مولانا اشرف علی سلطانپوریؒ، محدث کبیر مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ، حضرت مولانا عبد الجبار عمرپوریؒ، حضرت مولانا راغب اللہ پانی پتیؒ، حضرت مولانا نور احمد امرتسریؒ، حضرت مولانا حافظ جان محمد قاضی ٹونکؒ، حضرت مولانا عبدالمنان وزیرآبادیؒ، حضرت مولانا مقیم الدین کوٹی ٹانکیؒ، حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوریؒ، حضرت مولانا سید جمعیت علی پورقاضویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا نور محمد حقانی لدھیانویؒ، حضرت مولانا محمد فاروقیؒ، حضرت مولانا حافظ قمر الدین سہارنپوریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن

دیو بندیؒ، حضرت مولانا صدیق احمد انبہٹویؒ، حضرت مولانا ثابت علی پور قاضویؒ وغیرہم شامل ہیں۔

"حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کا وصال ۲۴؍ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ مطابق اکتوبر ۱۸۸۵ء کی شب ۸ بجے کے قریب بمرض درد گردہ پیش آیا۔" آپ نے ۲۴؍ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو اتوار کے دن ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

(مفتی ناصر مظاہری کے مضمون سے ماخوذ)

حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ

(1269ھ۔1346ھ)

سرتاج المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری صفر 1269ھ بمطابق دسمبر 1852ء کو یو پی کے ضلع سہارنپور کے مشہور قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے والد ماجد شاہ مجید قصبہ انبیٹھہ کے مشہور وممتاز خاندان ایوبی کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ کی والدہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کی حقیقی بہن اور استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی قدس سرہ کی صاحبزادی تھی۔ شاہ مجید علی ریاست کے سرکاری عہدیدار ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات گھر سے باہر ہوتے، جس کی وجہ سے آپ کی والدہ ماجدہ کا زیادہ وقت اپنے میکہ میں گزرتا، اس لیے آپ کی رضاعت اور ابتدائی تربیت زیادہ تر آپ کے ننھیال میں ہوئی۔

حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کی عمر 5 سال ہوئی تو آپ کے نانا محترم حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی رحمہ اللہ نے آپ کو تبرکاً بسم اللہ شریف پڑھا کر قاعدہ شروع کرادیا۔ فطرتاً آپ ذہین اور ذکی تھے اس لیے ناظرہ قرآن جلدی ختم کرلیا۔ قرآن ختم

ہونے کے بعد مولانا نے ابتدائی عربی اور فارسی کتابیں انبیٹھ اور نانوتہ میں مختلف اساتذہ سے پڑھی، پھر جب 1283ھ میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کی خبر سنی اور یہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم میں صدر مدرس آپ کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ قرار پائے ہیں۔ تو آپ والدین سے اجازت لے کر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں پر صرف، نحو اور فلسفہ کی متداول کتب پڑھیں۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے تقریباً 6 ماہ بعد سہارنپور شہر میں مدرسہ مظاہر العلوم کا افتتاح ہوا جس کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمہ اللہ تجویز ہوئے دارالعلوم دیوبند میں اگرچہ آپ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ کی زیرنگرانی بہترین نظم ونسق کے ساتھ تعلیم حاصل کررہے تھے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ جس ذات گرامی کے ہاتھوں مظاہر العلوم کو منازل ترقی طے کرنے ہیں وہ اپنی تعلیم کے سلسلہ میں مظاہر العلوم ہی کا رہین منت اور۔ احسان مند ہو۔ اس لیے دیوبند میں آپ کا دل نہیں لگا اور آپ۔ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لے آئے یہاں پر آپ نے حدیث، فقہ، تفسیر، اصول، منطق، ہیئت اور دیگر علوم عالیہ وآلیہ مولانا محمد مظہر رحمہ اللہ اور دیگر مدرسین سے پڑھے، تقریباً 19 سال کی عمر میں آپ نے درس نظامی سے فراغت حاصل کی اس کے بعد علوم ادبیہ میں مہارت کا شوق آپ کو اورینٹل کالج لاہور لے آئی یہاں پر آپ نے مشہور ادیب مولانا فیض احمد سہارنپوری سے علوم ادبیہ کی خاطر خواہ تکمیل فرمائی۔

جب لاہور سے آپ کی واپسی ہوئی تو آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب نے عربی کے معتبر اور مستند لغت قاموس کا ترجمہ کرنے کے لیے آپ کو منصوری پہاڑ بھیج دیا۔ منصوری پر آپ کے قیام کو ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ منگلور کے مدرسہ عربیہ میں مدرس کی ضرورت محسوس ہوئی اور آپ بحیثیت صدر مدرس وہاں تعنیات ہوگئے۔ اس کے بعد

بالترتیب بھوپال، بہاولپور، بریلی، اور دیوبند میں مدرس رہے، 1314ھ میں جب کہ آپ کی عمر 45 سال تھی صدر مدرس کی حیثیت سے مدرسہ مظاہر العلوم میں آپ کا تقرر ہوا جہاں آپ نے پڑھا اور علمی نشو ونما پائی تھی۔ یہاں آپ نے اپنے استاذ محترم مولانا محمد مظہر کے لگائے ہوئے باغیچے کو اس جانفشانی اور تندہی سے سینچا، جس کا اظہار مظاہر العلوم کا ہر طاق محراب اور ہر در و دیوار زبان حال سے کر رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ آپ علوم عالیہ اور ادبیہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے آپ کی فطرت سلیمہ اس معرفت الٰہیہ کی جستجو میں تھی جو قال کو حال اور علم کو سراپا عمل بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ کی نظر انتخاب قطب عالم، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ پر پڑی اور آستانہ رشیدیہ پر حاضر خدمت ہوئے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے آپ کے باطن باصفا کو سمجھ کر بلا تامل آپ کو بیعت کرا لیا۔ بیعت ہونے کے بعد سلوک سے متعلقہ معمولات آپ نے نہایت عزیمت اور حد درجہ استقامت سے پورے فرمائے۔ دن بھر تشنگان علم کو فقہ وتفسیر کا سبق پڑھاتے اور شب کو ذکر الٰہی سے رطب اللساں رہتے، سنسان گھڑیوں میں جبکہ دنیا خواب خرگوش سو رہی ہوتی تھی آپ اپنے مولیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ آپ کی انہی ریاضتوں کا ثمرہ تھا کہ جب آپ سفر حج پر تشریف لے گئے تو امام ربانی، مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے پہلی ہی ملاقات میں آپ کو۔ اپنی بیعت میں داخل کر لیا۔ اور ساتھ ہی۔ خلعہ خلافت سے بھی نوازا، مزید برآں اپنی دستار آپ کے سر پر رکھ دی اور تحریری خلافت نامہ عنایت فرمایا۔ جب آپ واپس ہندوستان پہنچے تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور خلافت نامہ دکھایا، حضرت گنگوہی نہایت خوش ہوئے، اور اسی خلافت پر مہر تصدیق ثبت کر کے آپ کو اپنی طرف سے بھی خلافت دے دی۔

حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ جس طرح تدریس وتبلیغ دین سے متعلق رہے ایسے ہی اکابر علماء دیوبند کی روش پر چلتے ہوئے قلم اور زبان دونوں سے اپنے دور کے ہر پیش آمدہ فتنے کا تعاقب کیا ہے۔ اس سلسلے کے چند ایک واقعات پیش خدمت ہیں۔

جس وقت آپ مدرسہ دینیات کے صدر مدرس تھے تو مدرسہ کے افسروں میں سے ایک شیعہ افسر چراغ شاہ تھا، جب حضرت کسی دفتری کام کی خاطر ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ مذہبی قصہ چھیڑ کر اہل سنت پر اعتراضات شروع کر دیتا، حضرت نے خارجی وقت میں کتب شیعہ کا مطالعہ کر کے ہدایات الرشید کے نام سے رد شیعت پر ایک ضخیم کتاب لکھی جو کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک لاجواب کتاب ہے۔

آپ کی شہرہ آفاق کتاب براہین قاطعہ جب منظر عام پر آئی تو بعض کج فہموں نے اپنی کم علمی کی بنیاد پر اس کی چند ایک عبارات میں قطع برید کر کے غلط رنگ میں پیش کیا اور حضرت کے متعلق یہ فتوی لگایا کہ خلیل احمد بد دین اور کافر ہے آپ نے اس افتراء پردازوں کے ساتھ تحریری وتقریری مناظرے کیے اور نقلی وعقلی رنگ میں ایسے دلائل پیش کیے کہ مخالف مناظرین کو آپ کے علم وفضل کا سکہ ماننا پڑا۔ اس موقع پر ثالث نے آپ کو رئیس المناظرین کے لقب سے ملقب کیا۔

ایک مرتبہ سفر حج پر جاتے ہوئے راستہ میں مولوی دیدار علی الوریؒ کی طرف سے عین اس وقت آپ کو دعوت مناظرہ دی گئی جب کہ آپ جہاز پر سوار ہونے والے تھے۔ آپ کے رفقاء نے جواب دیا جہاز تیار ہے اب گنجائش نہیں واپسی پہ مناظرہ ہوگا، آپ نے یہ سنا تو بے ساختہ فرمایا کہ نہیں ہم تیار ہیں حج بشرط زندگی دوسرے سال کر لیں گے، یہ بھی تو ایک دینی کام ہے یہ سن کر فریق مخالف پر اوس پڑ گئی اور کوئی میدان مناظرہ میں نہ آیا۔

(تذکرۃ الخلیل ص 155)

16 شوال المکرم 1344ھ کو آپ مدرسے سے ڈیڑھ سال کی رخصت لے کر حج کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے مناسک حج پورے ہونے کے بعد اپنے رفقاء سفر کو واپس ہندوستان بھیج دیا اور خود وہیں پر سکونت اختیار کرلی اس دوران آپ نے بعض علماء مدینہ کے اصرار پر ابوداؤد پڑھانا شروع کردی مگر یہ سلسلہ درس صرف دو روز تک رہا، کیونکہ درس کا آغاز آپ کی وفات سے چار دن قبل ہوا تھا۔آپ کی شہرہ آفاق۔تصنیف بذل المجہود مدینہ منورہ میں سکونت کے دوران ہی مکمل ہوئی جب بذل کی تالیف سے فراغت پائی تو فرمایا کہ حق تعالی سے تین دعائیں مانگی تھیں دو قبول ہوچکی ہیں ایک باقی ہے۔1: مکہ مکرمہ میں پر امن اسلامی شریعت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں،:2 موت سے پہلے پہلے بذل کی تالیف مکمل ہوجائے۔3:حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار۔میں دفن ہونا نصیب ہوجائے۔

آپ کی تیسری دعا کو بھی اللہ رب العزت نے شرف قبولیت بخشا۔چنانچہ بذل المجہود مکمل ہونے کے تقریباً 8ماہ بعد 15 ربیع الثانی 1346ھ کو بعد عصر وصال فرمایا۔اور قبلہ اہل بیت کے متصل دفن ہوئے ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جامعہ مظاہر العلوم سے ڈیڑھ سال کی حاصل کردہ رخصت میں نہ ایک دن کم ہوا نہ زیادہ، رخصت کا زمانہ 15 ربیع الثانی 1346ھ کو ختم ہوا اور سورج غروب ہونے۔میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ آفتاب علم وعمل غروب ہوگیا۔

مشہور ومعروف تصانیف

بذل المجہود (سنن ابی داؤد کی لاجواب شرح) المہند علی المفند (علماء دیوبند پر بعض متہمین کی افتراء پردازی کا جواب) ہدایات الشیعہ :(ایک شیعہ اسکالر کا مذہب اہل السنۃ والجماعۃ پر اعتراضات کے مسکت جوابات) مطرقۃ الکرامۃ (مسئلہ خلافت وامامت پر ایک

لاجواب کتاب) غنیۃ المناسک (مناسک حج پر مشتمل ایک جامع رسالہ) براہین قاطعہ: (ایک مبتدع کی کتاب انوار ساطعہ کا کافی شافی جواب)

(احناف ڈیجیٹل لائبریری۔از مولانا محمد عبداللہ معتصم)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

(1898ء- 1982ء)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ 1898ء کو اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے مشہور قصبہ کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ جید عالم دین تھے۔چنانچہ آپ نے والد ماجد سے قرآن حفظ کیا۔حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ قرآن یاد کرانے کا والد صاحب کا طریقہ انوکھا تھا کہ ایک صفحہ یاد کرنے کو دے دیتے اور فرماتے کہ 100 مرتبہ پڑھو پھر چھٹی۔اس طرح آپؒ نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔

1328ھ یعنی 12 یا 13 سال کی عمر تک گنگوہ میں قیام رہا، اس دوران اردو کے دینی رسائل بہشتی زیور وغیرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ لیں جو زیادہ تر شفیق اور بزرگ چچا مولانا محمد الیاس نے پڑھائیں۔عربی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ سہارنپور آکر 1328ھ میں شروع ہوا۔مولانا یحییٰ عام متعارف درسی کتب کے خلاف تھے انکا اپنا انداز تعلیم تھا۔ صرف ونحو کی درسی کتابیں خاص طرز اور ترمیم واضافہ کے ساتھ پڑھیں۔حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کو حضرت مولانا خلیل احمدؒ نے مظاہر العلوم سہارنپور میں بطور استاذ و مدرسین بلوالیا۔اس طرح حضرت شیخ زکریاؒ کی تعلیم کا سلسلہ سہارنپور میں شروع ہوگیا، آپ نے بقیہ درسیات کی تکمیل کی، کتب منطق مولانا عبدالوحید

سنبھلی (استاذ مظاہر العلوم) اور ناظم الامور مولانا عبداللطیف سے پڑھیں۔ 7 محرم الحرام 1332ھ کو ظہر کی نماز کے بعد مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، پہلے مولانا یحییٰ صاحبؒ نے غسل فرمایا، پھر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، خطبہ پڑھا، پھر قبلہ رو ہو کر دیر تک دعا کی، شیخ زکریاؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ والد صاحب نے کیا کیا دعائیں کیں، لیکن میری ایک ہی دعا تھی اور وہ یہ کہ حدیث کا سلسلہ دیر سے شروع ہوا، اللہ کرے کبھی چھوٹے نہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے علاوہ آپؒ کے دیگر اساتذہ کرام میں آپؒ کے چچا بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

1333ھ میں دورہ حدیث کی ابتدا ہوئی، یہی سال تھا جب مولانا سہارنپوری نے طویل قیام کے ارادہ سے حجاز کا قصد کیا۔ شیخ کا خیال تھا کہ مجھے نہ ملازمت کرنی ہے اور نہ کوئی عجلت ہے، ایک سال میں دورہ حدیث مکمل کرنے کی کوئی پابندی نہیں اس لیئے اپنے والد مولانا یحییٰ کے درس میں ابوداؤد شروع کردی، ترمذی شریف کو حضرت سہارنپوری کی واپسی پر ملتوی رکھا تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر ترمذی، بخاری اور ابن ماجہ کے سواء بقیہ کتب صحاح والد صاحب ہی سے پڑھیں یہ سال بڑی محنت اور انہاک کا تھا اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی روایت بھی بے وضو نہ پڑھی جائے۔ مسلسل پانچ چھ گھنٹے سبق ہوتا تھا، اس میں کبھی کبھی ہفتہ عشرہ میں سبق کے درمیان وضو کی ضرورت پیش آتی تھی اور صرف اتنی دیر کیلئے اٹھنا ہوتا تھا تو ہم درس سبق مولانا کے سبق کے حرج کی وجہ سے اپنا سبق روک لیتے۔ شوال 1333ھ میں حضرت سہارنپوری حجاز مقدس کے طویل قیام کا اردہ فرمارہے تھے اور لوگ کثرت کیساتھ بیعت ہورہے تھے۔ شیخ زکریا فرماتے ہیں کہ اپنے اندر بھی

بیعت کا جذبہ پیدا ہوا اور حضرت سہارنپوری سے مولانا عبداللہ اور شیخ زکریا کو بیعت کیا۔ مولانا عبداللہ صاحب کی دھاڑیں مار مار کو رونے کی وجہ سے مولانا یحییٰ اور شاہ عبدالرحیم چھت کی منڈیر پر منظر دیکھنے آگئے۔ مولانا یحییٰ کو تعجب ہوا کہ بلا علم واطلاع کے انہوں نے اتنا برا کام کرلیا لیکن حضرت رائے پوریؒ نے اس جرات کی بڑی تصویب فرمائی اور بہت دعائیں دیں۔ 1334ھ میں مولانا محمد یحییٰ کا انتقال ہوا۔ والد صاحب نے 8000 روپے قرضہ میں چھوڑے تھے جسے مولانا زکریاؒ نے والد کی وفات کے بعد اپنے ذمہ لے لیا اور سب کو خطوط کے ذریعے اطلاع دی اور رفتہ رفتہ تمام قرضہ اتار دیا۔

یکم محرم 1335ھ کو حضرت شیخ زکریا کا بحیثیت مدرس مدرسہ مظاہر العلوم میں تقرر ہوا اور 15 روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔

1337ھ میں ہدایہ اوّلین، حماسہ وغیرہ اور رجب 1341ھ میں بخاری شریف کے تین پارے بھی حضرت سہارنپوریؒ کے حکم واصرار سے منتقل ہوکر آئے اور انکے پڑھانے میں بھی شیخ سے غیر معمولی اہلیت، قوت، مطالعہ اور فنی مناسبت کا اظہار ہوا، اسکے بعد آپ کو مشکوٰۃ شریف مل گئی 1344ھ تک مشکوٰۃ آپ کے زیر سایہ رہی۔

شیخ زکریا فرماتے ہیں کہ مولانا خلیل احمد سہارنہوریؒ سے قرابت کا یہ عالم تھا کہ:

ایک اجنبی نے میرے ہر وقت کی حاضری پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے کہا یہ حضرت کے صاحبزادے ہیں؟ حضرت نے فرمایا صاحبزادہ سے بڑھ کر۔

شیخ الحدیث کا لافانی لقب آپ کو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے عطا فرمایا تھا جو آپ کے نام کا قائم مقام بلکہ کتاب "فضائل اعمال" کی طرح آپکی پہچان وشناخت بن گیا۔ آپ نے تقریباً 50 سال تک حدیث کی کتب پڑھائی ہیں۔

مولانا یحییٰؒ کے انتقال کے بعد انکی اہلیہ کو ہمیشہ بخار رہتا یہاں تک کہ اس بخار نے

بعد میں تپ دق کی صورت اختیار کرلی۔اس اثنا میں شیخ زکریاؒ کی والدہ کے اصرار پر مولانا رؤف الحسن صاحبؒ کی صاحبزادی بی بی امۃ المتین صاحبہ سے نسبت نکاح طے پا گیا۔مولانا رؤف الحسن کی دوسری صاحبزادی مولانا الیاس کے نکاح میں تھیں۔اس طرح شیخ زکریاؒ اور مولانا الیاسؒ چچا اور بھتیجا آپس میں ہم زلف ہوئے۔

شیخ زکریا کی پہلی اہلیہ کی وفات جو مولانا رؤف الحسن کی صاحبزادی تھی 5 ذی الحجہ 1355ھ بمطابق 17 فروری 1937ء میں ہوئی،انکی طبیعت اب بالکل یکسوئی اور علمی و تصنیفی انہماک کی طرف مائل تھی اور عقد ثانی کا کوئی خیال نہیں تھا۔اپنی آپ بیتی میں شیخ زکریاؒ لکھتے ہیں کہ:

مرحومہ کے انتقال کے بعد میں اپنے مشاغل علمیہ کی وجہ سے بالکل ہی یہ طے کر چکا تھا کہ دوسرا نکاح نہیں کروں گا کہ بڑا حرج ہوگا۔لیکن شفیق چچا نے جو باپ کے قائم مقام تھے شیخ کی اس تجرد کو پسند نہیں کیا دوسرے شفیق بزرگوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ شیخ کا گھر پھر آباد ہو جائے۔اس لیے چار مہینے بھی پورے نہیں گزرے تھے کہ شیک کا عقد ثانی شفیق چچا مولانا الیاس کی صاحبزادی (مولانا یوسف کی ہمشیرہ) عطیہ صاحبہ سے 8 ربیع الثانی 1354ھ بمطابق 18 جون 1937ء کو ہوگیا۔نکاح نظام الدین دہلی میں ہوا،اس موقع پر حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ بھی تشریف لے آئے،حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو سہارنپور اسٹیشن پر معلوم ہوا تو پیغام بھیجا کہ نکاح میں پڑھوں گا،چنانچہ دہلی تشریف لائے اور بعد نماز جمعہ نکاح پڑھایا۔

1338ھ میں محمد خلیل سہارنپوریؒ نے دوبارہ حج کا عزم کیا تو مرشد کی ہم رکابی کا جذبہ رفاقت کا محرک ہوا،یہ شیخ زکریا کا پہلا حج تھا۔شعبان 1338ھ کو روانہ ہوئے۔بمبئی میں اپنے تمام رفقاء کو دعوت طعام پر بلوایا۔بحری سفر تھا راستہ میں رمضان کا مہینہ آیا تراویح

کا اہتمام جہاز ہی میں کیا۔حضرت سہارنپوری اور شیخ زکریا دونوں حضرات نے قرآن سنایا مکہ معظّمہ حاضری ہوئی تو مولانا محب الدین نے جلد ہندوستان جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ یہاں تو قیامت آنے والی ہے۔مولانا محب الدین حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب کشف وادراک بزرگ تھے۔مکہ میں قیامت سے مراد شریف مکہ حسین بن علی کی بغاوت اور نجدیوں کے حملہ کی طرف اشارہ تھا۔اس زمانے میں حجاز میں سخت بدامنی تھی۔مدینہ طیبہ کے راستہ میں قافلوں کو بے دھڑک دن دھاڑے لوٹ لیا جاتا تھا۔حجاج بہت سخت خطرات ومصائب کیساتھ مدینہ منورہ پہنچتے تھے۔شوال کا مہینہ شروع ہوا حضرت شیخ قافلہ کے امیر مقرر ہوکر مدینہ حاضری کیلئے پہنچے۔تاہم راستہ سکون سے طے ہوا۔مدینہ میں ایک ماہ تک قیام کیا۔(آزاد دائرۃ المعارف،ویکیپیڈیا سے ماخوذ)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے طویل عرصہ کے انہماک ومطالعہ سے جن کتابوں کو تصنیف وتالیف کیا ان میں سے ان کی انتہائی اہم کتاب ”اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک“ ہے یہ کتاب 6 جلدوں میں پوری دنیا میں دیگر کتب کی طرح مسلسل شائع ہورہی ہے۔یہ کتاب بھی ان کے علمی ودینی اور تصنیفی کارناموں کی دلیل ہے۔ بقول مولانا مجیب الرحمن انقلابی مدظلہ العالی کہ:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ عالم اسلام کی وہ عظیم علمی وروحانی شخصیت ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے لاکھوں لوگوں کو ہدایت کا ذریعہ بنایا،عرب وعجم اور یورپ وایشیاء میں آپ کو یکساں محبوبیت ومقبولیت عطا فرمائی،مختلف علوم وفنون پر دعوتی،تبلیغی،اصلاحی علمی وتحقیقی عنوانات پر آپ کی تصنیفات وتالیفات 100 سے زائد ہیں جو اُردو عربی اور فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔آپ کی شہرہ آفاق تصنیف فضائل اعمال کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقبولیت عطا فرمائی ہے جو کسی اور کتاب کو

حاصل نہیں ہوسکی۔ پوری دنیا کے ہر ملک میں مختلف زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والی یہ کتاب انتہائی مقبول ہے، چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا نہیں گذرتا جس میں یہ کتاب دنیا میں کہیں نہ کہیں پڑھی اور سنی نہ جارہی ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ نے لاکھوں لوگوں کیلئے ہدایت اور نیکی پر چلنے کا ذریعہ بنایا۔ جس طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سینکڑوں تصنیفات کے باوجود "بہشتی زیور" ان کی پہچان اور ہر مسلم گھر کی ضرورت بن گئی۔ مفتی اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی "تعلیم الاسلام" کتاب کو جس طرح مقبولیت ملی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کو مایہ ناز تصنیف فضائل اعمال کے ذریعہ جو شہرت وعزت، مقام اور مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوسکی۔

24 مئی 1982ء 05:40 منٹ پر مغرب سے پہلے مکۃ المکرمہ کے ہسپتال میں چندروز زیر علاج رہنے کے بعد دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مسجد الحرام میں نماز جنازہ کے بعد مدینہ منورہ میں واقع قبرستان جنت البقیع میں آپ کی تدفین کی گئی۔ مقامی افراد کے مطابق اتنا بڑا جنازہ شاید ہی کہیں دیکھا گیا ہو۔

حضرت مولانا شیخ محمد یونس جونپوریؒ

(1937-2017ء)

حضرت مولانا شیخ محمد یونس جونپوری کی ولادت ۲/اکتوبر ۱۹۳۷ء مطابق ۲۵/رجب ۱۳۵۵ھ کو ریاست اتر پردیش کے تاریخی شہر جون پور کے کھیتا سرائے میں ہوئی۔ گاؤں کے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم مائی کلاں میں شرح وقایہ تک پڑھا۔ پانچ سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ شوال 1377ء میں جامعہ مظاہر

علوم سہارن پور آ گئے جہاں مولانا اسعد اللہؒ ناظم اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خصوصی توجہ اور شفقت میں تعلیم حاصل کی۔

اپنے ابتدائی حالات کے تعلق سے حضرت شیخؒ نے لکھا ہے کہ:

''میں مسلسل بیمار رہا، مظاہر علوم آنے کے چند دن بعد نزلہ و بخار ہو گیا اور منہ سے خون آ گیا، حضرت اقدس ناظم (مولانا اسعد اللہ) صاحب نوراللہ مرقدہ کا مشورہ ہوا کہ میں گھر واپس ہو جاؤں، لیکن میں نے انکار کر دیا، حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ واعلی اللہ مراتبہ نے بلا کر ارشاد فرمایا کہ: جب تو بیمار ہے اور لوگوں کا مشورہ بھی ہے تو مکان چلا جا۔ میں نے عرض کیا جو اب تک یاد ہے کہ: حضرت! اگر مرنا ہے تو یہیں مر جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ: بیماری میں کیا پڑھا جائے گا؟ میں نے عرض کیا اور اب تک الفاظ یاد ہیں کہ: حضرت! جو کان میں پڑے گا وہ دماغ میں اتر ہی جائے گا۔ اس پر حضرت اقدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ ''پھر پڑا رہ'' یہ ہے حضرت اقدس سرہ سے پہلی بات چیت، اس کے بعد ہم تو بہت بیمار رہے ہے، اور گاہ بگاہ جب طبیعت ٹھیک ہو جاتی تو اسباق میں بھی جاتے رہتے، انھیں ایام میں حضرت اقدس مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کو اپنی بیماری کا خط لکھا، مولانا نے جواباً لکھا کہ یہ کیا یقین ہے کہ ''خون پھیپڑے سے آیا ہے؟'' اس سے طبیعت کو کچھ سکون ہو گیا، لیکن سینے میں درد رہا کرتا تھا۔ یہ بات اور بھی لکھ دوں کہ جن ایام میں طبیعت خراب تھی، کبھی کبھی دارالحدیث کے شرقی جانب بیٹھ کر حضرت اقدس نوراللہ مرقدہ کا درس سنتا اور سوچا کرتا تھا کہ نا معلوم ہم کو بھی بخاری شریف پڑھنی نصیب ہوگی یا نہیں؟ اور رویا کرتا تھا، اس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے توفیق عطا فرمائی اور پڑھنے کی منزل گزر گئی، اور اللہ تعالی نے محض اپنے فضل وکرم سے پڑھانے کی توفیق بخشی، حالات کی ناسازگاری سے جس کی توقع بھی نہیں تھی، لیکن سب فضل وکرم ہے۔

فراغت کے بعد مظاہر علوم میں استاذ مقرر ہوئے اور تاوفات وہیں کتب حدیث کی تدریس کی ذمہ داری انجام دی۔شوال 1382ھ میں مظاہر علوم میں استاذ مقرر ہو گئے۔ ذی قعدہ 1390ھ سے 1438ھ تک کل 48 سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر رہے۔شیخ الحدیثؒ کو سلاسل اربعہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں مولانا اسعد اللہ رام پوریؒ (خلیفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ) اور اس کے بعد شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلویؒ (خلیفہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری) سے اجازت بیعت وارشاد حاصل ہوئی۔

علمی وتصنیفی خدمات میں ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ صحیح بخاری کا حاشیہ اور محققانہ شرح ہے، نیز ان کے علمی افادات کو ان کے کئی تلامذہ نے الگ الگ جمع کر کے شائع کیا ہے۔جس میں الیواقیت الغالیۃ (مرتبہ محمد ایوب سورتی لندن)، کتاب التوحید فی الرد علی الجہمیۃ (مرتبہ محمد ایوب سورتی)، نوادر الحدیث اور نوادر الفقہ (مرتبہ محمد زید مظاہری ندوی) اہم ہیں۔نیز علم حدیث میں ان کے مقام اور مرتبہ اور ان کی اسناد پر ڈاکٹر محمد اکرم ندوی کی کتاب الفرائد فی عوالی الاسانید وغوالی الفوائد ایک کتاب ہے۔

اس کے علاوہ ان کے ہزاروں تلامذہ ہیں جو پورے عالم میں حدیث وعلوم حدیث کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔حضرت مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی صاحب (جنہوں نے آپ کے قیمتی علمی، حدیثی، فقہی اور تحقیقی شہ پاروں کو دو مختلف کتابوں ''نوادر الحدیث'' اور ''نوادر الفقہ'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔) رقم طراز ہیں:

''استاذی ومخدومی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری (شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور) اللہ تعالی کے ان خوش نصیب بندوں میں ہیں جن کی پوری زندگی اشتغال بالحدیث اور فن حدیث شریف کی خدمت میں گزری، آپ کے علمی تبحر اور فن حدیث سے حقیقی مناسبت اور گہری واقفیت پر کبار علماء ومشائخ اور اساتذۂ حدیث کو پورا

اعتماد تھا، چناں چہ کسی حدیث کے متن یا سند اور رواۃ کے متعلق کوئی اشکال پیش آتا، یا کسی حدیث کی تحقیق پیش نظر ہوتی یا اصول حدیث کے کسی مسئلہ میں کوئی پیچیدگی سامنے آتی تو کبار علماء مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا عبید اللہ صاحبؒ مرکز نظام الدین، مولانا عمر صاحب پالن پوری، مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی جیسی اہم شخصیات بھی آپ کی طرف رجوع فرماتیں۔آپ کے استاذ وشیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کو تو آپ کی فن حدیث شریف سے گہری مناسبت اور واقفیت کا اس درجہ اعتماد تھا کہ بکثرت روایات اور سند کی بابت تحقیق وجستجو کا امر فرماتے تھے اور خود آپ کے پاس فن حدیث کے سلسلہ میں جو خطوط آتے انھیں حضرت شیخ کے حوالہ فرمادیتے تھے۔'' (نوادر الحدیث)

11 جولائی 2017ء مطابق 14 شوال 1438ء کی صبح میں زیادہ ضعف محسوس ہونے پر سہارن پور کے میڈی گرام اسپتال میں داخل کرایا گیا، جہاں ساڑھے نو بجے صبح کو ان کی وفات ہوگئی۔نماز جنازہ بعد نماز عصر حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی دامت برکاتہم العالیہ نے پڑھائی، اور قبرستان حاجی شاہ کمال سہارن پور میں تدفین عمل میں آئی۔ایک اندازہ کے مطابق دس لاکھ کے مجمع نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء

برصغیر ہندو پاک ہی نہیں پورے عالم اسلام کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی دینی وعلمی خدمات محتاج تعارف نہیں، ندوہ تحریک اوراس کی کوکھ سے جنم لینے والی شخصیات نے ہر عہد میں جس طرح سے دینی علوم وفنون کی خدمات انجام دیں ہیں اور جس طرح سے قوم وملت کی رہنمائی اور ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے وہ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کا ایک سنہرا باب ہے۔ بانی ندوۃ العلما حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، علامہ حکیم سید عبد الحئی حسنیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی وغیرہم۔ یہ سبھی شخصیات اپنے آپ میں ایک تحریک اور انجمن ہے۔ ان حضرات نے علوم اسلامیہ کی زبردست ترجمانی کی۔ علم حدیث میں بھی ندوۃ العلماء کی خدمات غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، جرح و تعدیل، اسماء الرجال اور حدیث پاک کی نشر واشاعت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ندوۃ العلما نے حدیث شریف کا جو طریقہ تدریس اپنے یہاں رکھا ہے وہ دوسری جامعات سے مختلف ہے یہاں حدیث شریف کی تدریس کے تعلق سے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ حقیقت میں حضرت شاہ محدث دہلویؒ کا منہج اور طریقہ کار ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور ان کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں جتنا شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور

ان کی کتابوں سے اگر اپنے فکر ومسلک کیلئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے انہی کا نام لے سکتا ہوں کہ درحقیقت ہمارا تعلیمی وفکری شجرہ نسب انہیں پر ختم ہوتا ہے۔ اس ادارہ کا عالم اسلام کے عظیم محدثین عظام سے بھی گہرا ربط وتعلق رہا ہے اور وہ یہاں تشریف لاتے رہے ہیں۔ جن میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبد الرشید نعمانیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، علامہ نور الدین عتر شامیؒ، شیخ عبد الفتاح ابوغدہ شامیؒ اور محمد عوامہ شامیؒ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چند مشہور اساتذہ حدیث کا تعارف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ تشنگان علوم نبوت کو سیراب کرنے میں اس ادارہ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی

(۱۲۸۱ھ۔۱۳۶۱ھ)

حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں ریاست ٹونک میں آنکھیں کھولیں، آپ کے والد ماجد مولانا احمد حسن خاں اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے۔ چناں چہ ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں سے ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے لاہور کا سفر اختیار کیا جو اس وقت بڑا علمی مرکز تھا۔ وہاں مولانا غلام احمد صاحب نعمانی کا دامن ایسا تھاما کہ جب تک تمام علوم عقلیہ نقلیہ میں دستگاہ نہیں پیدا کرلی نہیں چھوڑا، آخر دم تک انہیں کو اپنا علمی مربی اور محسن سمجھتے رہے۔

لاہور سے علوم مروجہ سے فراغت کے بعد مولانا سہیل یمنانی نزیل بھوپال کے شہرہ آفاق درس حدیث میں شرکت کی جو اس وقت اپنے محدثانہ طرز، یمنی خصوصیات اور علوم اسناد کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد میں ممتاز تھے، مولانا ان کو فن حدیث کا

جید استاد اور متبحر عالم سمجھتے تھے۔ تکمیل علم کے بعد اپنے وطن ٹونک آ گئے، اس وقت وہاں دو مستقل مدرسے طلباء و شائقین علم کا مرکز و ماویٰ بنے ہوئے تھے۔ ایک مدرسہ خلیلیہ اور دوسرا ناصریہ، ثانی الذکر مدرسہ سے مولانا حیدر حسن خاں نے تدریسی سفر کا آغاز کیا اور کئی سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اگست ۱۹۲۱ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور حدیث پاک کی بڑی کتابیں آپ کے سپرد ہوئیں اور آپ نے پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا۔ تدریس حدیث کا طرز محدثانہ تھا، یمنی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین کے درس کا عکس، یمنی علماء کی کتابوں سے استفادہ بھی بھرپور تھا۔ مولانا کے درس کی ایک برکت یہ بھی تھی کہ فن حدیث سے مناسبت اور اس کی بنیادی کتابوں سے ذاتی واقفیت، ان کے طبقات اور درجات سے پوری آگاہی اور اسماء الرجال اور اصول حدیث کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ تدریسی خدمات کے علاوہ آپ نے ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری بھی بخوبی انجام دی، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

حلیہ: نورانی چہرہ، میانہ قد، متناسب الاعضاء جسم، چہرہ انار کی طرح سرخ اور گلاب کی طرح شاداب، آنکھوں میں سرخ ڈورے اور شب بیداری کے آثار، نگاہیں جھکی ہوئیں، چال باوقار لیکن اس سے عزم واعتماد کا اظہار، پاؤں میں نرمی کا سادہ جوتا، پاجامہ شرعی ٹخنوں سے خاصا اونچا، یہ تھے مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ۔ ۳؍ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کو آپ ندوہ سے ترک تعلق کر کے ٹونک تشریف لے گئے جہاں ۵؍جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (سابق مفتی اعظم پاکستان) اور مولانا عبدالرشید نعمانیؒ جیسی عبقری شخصیات شامل ہیں۔

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلونیؒ

(وفات ۱۳۷۵ھ)

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء قصبہ سلون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شاہ مہدی عطا تھے۔ ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد حدیث کے تشریف لائے اور مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ کے تشریف لے جانے کے بعد صحیحین کا درس بھی آپ ہی سے متعلق ہوا۔ ان کا اصل ذوق مطالعہ اور کتابوں سے تمتع اور لطف اندوزی کا تھا لیکن ان کا قوی حافظہ، علمی استحضار، مطالعہ کی وسعت اور معلومات کی فراوانی طلباء کو متأثر کئے بغیر نہیں رہتا تھا، وہ بعض اوقات اتنے معلومات مہیا فرما دیتے تھے اور حوالوں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ طلباء ان کو اخذ و ہضم نہیں کر پاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کا درس زیادہ مفید ہونے لگا اور طلباء بھی مطمئن ہوتے گئے۔ خاص طور پر متقدمین کی تصنیفات وتحقیقات کی قدر اور علوم دینیہ کے وسیع کتب خانہ کی شاہ کلید طلباء کو حاصل ہوگئی۔ حدیث و رجال اور تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ادب کا بھی بڑا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ حلیم عطا کا انتقال ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ میں ہوا۔

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ

(۱۹۰۰ء۔ ۱۹۹۲ء)

ابوالمآثر محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی قدس سرہ جولائی ۱۹۰۰ء کو مئو ناتھ بھنجن ضلع مئو (اس وقت اعظم گڑھ کا حصہ تھا) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد

حضرت مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مریدین میں تھے اور نہایت ہی متقی اور پاکباز تھے۔ مولا حبیب الرحمٰن اعظمی کے بارے میں سابق شیخ ازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمودؒ فرماتے ہیں: پوری دنیا میں اگر کوئی 'محدث اعظم' لقب کے ہو تو یہ اس کے مستحق ہیں، مشہور مصری عالم دین شیخ محمود محمد شاکر نے فرمایا: ہو من أعظم علماء العصر۔ آسمان علم کا یہ روشن ستارہ مادر علمی دار العلوم دیوبند میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی عزیز الرحمان رحمۃ اللہ علیہم جیسے نادر روزگار اساتذہ سے اپنی علمی پیاس بجھا کر اکثر اوقات اپنے وطن میں ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مصروف رہے۔ دار العلوم دیوبند کی طرف سے دو مرتبہ منصب محدث اور صدر مفتی کی پیشکش کرتے ہوئے صدر المدرسین حضرت مدنیؒ اور مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ ان کے گھر تشریف لے گئے، لیکن آب وہوا کے ناموافق ہونے کی بنا پر معذرت کر دی۔

مشہور شامی عالم دین شیخ عبد الفتاح أبو غدہ جیسی شخصیت بکثرت ان سے مراجعت کرتے تھے۔ حضرت مدنیؒ اور شیخ زکریاؒ کے زمانے میں دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے اکثر تلامذہ اعظم گڑھ سفر کر کے ان سے اجازت حدیث حاصل کرتے تھے۔ اسی لئے اس وقت برصغیر اور ہندوستان کے اکثر چوٹی کے علماء ان کے شاگرد ہیں، جیسے دار العلوم دیوبند کے مہتمم مفتی ابو القاسم نعمانی، شیخ ثانی مولانا عبد الحق اعظمی، دار العلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سالم قاسمی، مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا یونس صاحب جونپوریؒ دامت برکاتہم وغیرہ۔

نصرۃ الحدیث، رکعاتِ تراویح، اعیان الحجاج، دست کار اہل شرف، رہبرِ حجاج اور ایثارِ آخرت یہ سبھی رسائل 'رسائل اعظمی' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "نصرۃ الحدیث" کے نام سے پہلے رسالے میں منکرین حدیث کا رد اور حدیث کی حجیت پر دلائل پیش کیے

گئے ہیں اور یہ تحریر بنیادی طور پر عظیم بیگ چغتائی اور حق گو نامی منکرین حدیث کے رد میں لکھی گئی ہے۔

دوسرا رسالہ تحقیق اہل حدیث کے نام سے ہے اور اس میں غیر مقلدین کی طرف سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا نہایت علمی انداز میں رد کیا گیا ہے کہ وہ اصحاب حدیث یا اہل حدیث وغیرہ الفاظ اپنے اوپر چسپاں نہیں کر سکتے اور ان کے پس منظر اور تاریخ کی عمر زیادہ نہیں ہے۔

تیسرے رسالے کا موضوع "رکعات تراویح" ہے۔ یہ رسالہ بھی بنیادی طور پر غیر مقلدین کے خلاف لکھا گیا ہے اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امت مسلمہ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور سے برابر بیس رکعات تراویح پر عمل ہوتا رہا ہے۔ بیس رکعات والی مرفوع روایت کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا اور آٹھ رکعتوں والی روایتوں کی تصحیح اور ان پر اعتماد کرنا اصول حدیث اور مسلمات کی رو سے قطعاً درست نہیں۔

چوتھے رسالے میں انساب وکفاءت پر گفتگو کی گئی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں تفاضل انساب قابل اعتبار نہیں۔ اس رسالے میں تفاضل انساب کے حق میں لکھی گئی تحریروں کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ فکر وتحقیق کے اعتبار سے ان کی اصابت مشکوک ہے۔

پانچویں رسالے میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقوں کے وقوع میں نہایت مدلّل اور تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور یہ رسالہ "الاعلام المرءفرعہ فی حکم الطلاقات مجموعۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

بہر حال حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا نام علم وتحقیق کی علامت ہے اور انہیں علم حدیث میں خصوصی دسترس حاصل تھی، وقت کے اکابر نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے یہاں تک کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے رسالے "نصرۃ

الحدیث“ کے متعلق فرمایا ہے کہ ”جس جس جگہ سے رسالہ پر نظر پڑی بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھا سکتا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ۱۹۹۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلویؒ

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلویؒ شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے گنے چنے اساتذۂ کرام میں سے ایک خود تھے، آپ سندیلہ کے ایک بڑے زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قرآن کی تعلیم مدرسہ فرقانیہ چوک سے حاصل ہوئی اور مکمل عربی تعلیم کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہوئی، مولانا ایک جامع اور پختہ کار انسان تھے، فقہ، حدیث، تفسیر قرآن فلسفہ، علم کلا غرض سارے ہی فنون پر کافی عبور حاصل تھا۔

آپ کی ندوۃ العلماء کی تدریسی خدمت لگ بھگ ۴۰ رسال رہی، اس دوران آپ کے پاس دینیات کے مضامین کے ساتھ علوم اجتماعیہ کے بھی بعض مضامین تھے، اس کے علاوہ ترجمہ وتفسیر قرآن اور حدیث شریف کے بھی بعض اسباق تھے، کئی سال تک آپ نے بخاری شریف کا بھی درس دیا، آخر میں منصب اہتمام کی ذمہ داری ڈالی گئی، جس سے آپ نے ۱۹۶۹ء میں علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے تقریباً دو سال کے بعد پاکستان تشریف لے گئے تھے اور وہیں مالک حقیقی سے جا ملے۔ مولانا تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر قائم رکھتے تھے اور اس میں ان کا طرز تحقیقی تھا۔

حضرت مولانا ضیاء الحسن صاحب ندویؒ

حضرت مولانا ضیاء الحسنؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تعلق علم ونواز

و مردم خیز سرزمین اعظم گڑھ سے ہے، ابتدائی و اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے جہاں آپ نے شعبۂ تخصص فی الادب میں داخلہ لیا سند فراغت حاصل کی۔

آپ نے اس دانش کدۂ علم و عرفاں سے اساطین علم و ادب اور اساتذۂ وقت سے استفادہ کیا، اور علمی گیرائی اور فنی دسترس حاصل کی۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد متعدد مدارس میں ایک مدت تک خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کے ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے اور شیخ الحدیث کے باوقار علمی منصب پر فائز ہوئے، آپ کا درس اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت کا بھی آئینہ دار ہوتا تھا، آپ کو حدیث اور متعلقات حدیث پر عبور حاصل تھا، جزئیات بہت مستحضر تھے، جزئی مسائل میں آپ توسع کے قائل تھے، دوران درس نقلی اور عقلی دلائل بھی فراہم کرتے تھے، درس میں حنفی طلباء کے علاوہ دیگر مکاتب فکر کے بھی طلباء ہوتے تھے، اس کے باوجود آپ کا درس تمام طلباء کے لئے یکساں مفید اور معلومات افزا ہوتا تھا، گویا کہ آپ کو طریقۂ تعلیم اور طریق تعلیم میں کمال حاصل تھا۔

حضرت مولانا ناصر علی ندویؒ

(ولادت: ۱۹۳۳ء)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا ناصر علی ندویؒ کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں خرم نگر لکھنؤ میں ہوئی، آپ نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، اس کے بعد ثانوی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور یکے بعد دیگرے مختلف درجات مکمل کرتے ہوئے ۱۹۶۳ء میں عالمیت کی سندلی۔ اس کے بعد دینیات سے اختصاص کیا اور ۱۹۶۵ء

میں سند فراغت حاصل کی۔

ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد باقاعدہ طور پر یہیں کے استاذ مقرر ہوئے، پھر رفتہ رفتہ آپ کی صلاحیت پروان چڑھتی رہی یہاں تک کہ آپ کی علمی زندگی کا وہ مبارک اور سنہرا ورق پلٹا اور ۹۰۔۱۹۹۸ء میں ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث کی عظیم اور مبارک ترین مسند آپ کے حصہ میں آئی اور بڑے ہی اہتمام اور حسن وخوبی کے ساتھ یہ دینی خدمت انجام دی۔ حدیث اور متعلقات حدیث پر گہری نظر کے ساتھ اصل اور بنیادی مراجع سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور درس میں نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل کا بھی پورا استعمال کرتے تھے، قوت استدلال کے ساتھ استنباط میں بھی ملکہ راسخہ حاصل تھا۔ دوران درس آپ کی تقریر مربوط اور مدلل ہوتی تھی، جابجا اہم مصادر اور شروحات کے حوالے بھی دیتے رہتے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(وفات: ۱۹۹۷ء)

ان عبقری شخصیات کے علاوہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات انجام دیں اور چند سالوں تک مسلم شریف کا درس آپ سے متعلق رہا۔ آپ کے متعلق مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں کہ: مولانا منظور نعمانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے حمیت دینی کا جو جوہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے''۔

'معارف الحدیث' آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ حضرت مولانا نعمانیؒ کی کتابوں کو جو حسن قبولیت حاصل ہوئی اس میں حسن نیت کے ساتھ ان کے حسن بیان اور حسن انتخاب کو بھی دخل ہے وہ زمانہ کے تقاضوں سے باخبر تھے اور نسل نو کی ضروریات اورا

ن کی نفسیات سے آگاہ۔ چنانچہ ان کی تحریریں موثر بھی ہوئیں اور مقبول بھی، قبولیت عام حاصل کرنے والی کتابوں میں سات جلدوں میں ان کی کتاب معارف الحدیث اردو دینی لٹریچر میں ایک اہم اور بیش بہا اضافہ ہے جس کے لئے اردو دنیا مدتوں ان کی زیر بار اور ممنون احسان رہے گی۔

معارف الحدیث کی تاثیر ومقبولیت میں بڑا دخل شاید اس احترام واہتمام کو بھی ہے جس کا حضرت مولانا نعمانیؒ نے اس کی تصنیف کے وقت خاصہ التزام رکھا، تصنیف کے اس کام کو کرتے وقت تازہ وضو فرماتے، خوشبو لگاتے اور حالت روزہ میں ہوا کرتے، انہوں نے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا جن کے متعلق حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ ان کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے۔ اور ان کی جلالت علمی کی شہادت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ ''وہ صاحب تقویٰ اور پاک سیرت شیخ جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کی آنکھوں نے نہیں دیکھی اور خود اس نے بھی اپنی کوئی مثال نہیں دیکھی۔'' علوم دین کے بحر ذخار سے حضرت مولانا نعمانیؒ سیراب ہوئے اور علم میں کمال اور رسوخ کا جو مقام ومرتبہ اللہ نے انہیں عطا فرمایا۔ اہل نظر اور صاحب دل ہی اس کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

شروع سے ہی اکابرین سے حضرت مولانا نعمانیؒ نے اپنا تعلق استوار رکھا، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت شاہ وصی اللہؒ جیسے اہل اللہ کی توجہ وعنایات انہیں حاصل رہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے حضرت مولانا نعمانیؒ کی رفاقت مثالی رہی، محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تعزیتی جلسہ میں اس کی شہادت دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ دومخلص

رفیق تھے۔ ہمدم بھی اور ہم راز بھی اور فکری و ذہنی اعتبار سے پوری طرح ہم آہنگ بھی۔ زندگی میں تمام یکسانیت کے باوجود دو سگے بھائیوں میں بھی سو فیصد اتفاق رائے نہیں ہوتا، لیکن یہاں اس سے کچھ زیادہ ہی تھا۔'' شخصیتوں کے علاوہ ملت کے مؤقر اداروں سے ان کی گہری وابستگی رہی۔ رابطہ عالم اسلامی، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے مراکز کی شوریٰ کے رکن رہے اور ان کی رائے نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔

حضرت مولانا نعمانی عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ ۲۵؍مارچ کو فالج کے حملہ کے بعد سحر نرسنگ ہوم میں داخل کئے گئے، بیماری کی شدت دیکھ کر کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہ چراغ سحری نہ معلوم کب خموش ہوجائے۔ بالآخر وقت موعود آگیا اور ۴؍مئی ۱۹۹۷ء کو جماعت عشاء کے وقت جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ دوسرے روز صبح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت قاری صدیق صاحب باندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور عیش باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ (ماخوذ از: ملنے کے نہیں نایاب ہیں)

شیخ الحدیث مولانا محمد ایوب اعظمیؒ

شیخ الحدیث مولانا محمد ایوب اعظمیؒ ۱۳۸۱ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، ۲؍سال حدیث شریف کی درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔

مولانا حفیظ اللہؒ

ایک نام مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ کا بھی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے اور صدر مدرس مقرر ہوئے، نیز بخاری شریف کا درس آپ سے متعلق رہا۔

عبدالستار اعظمیؒ

انہیں محدثین ندوہ میں ایک شخصیت مولانا عبدالستار اعظمیؒ کی ہے جو ایک لمبے عرصے تک دارالعلوم میں بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیتے رہے۔ ۱۴۰۱ھ تک دارالعلوم میں سب سے بڑے استاذ کی حیثیت سے آپ کا قیام رہا۔

مولانا شہباز صاحب اصلاحیؒ

دارالعلوم کے اساتذۂ حدیث میں ایک قابل ذکر نام مولانا شہباز صاحب اصلاحیؒ کا بھی ہے، آپ نے دارالعلوم میں ایک لمبے عرصے تک حدیث کی خدمت انجام دی۔

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات:

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جب انگریزوں کے ناپاک قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے، تو علمائے مفکرین کو احساس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین ومذہب اوران کی قومی زندگی کی بھی خیرنہیں ہے؛ کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اوراس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پالیتی ہے، تو فاتح قوم کا اثر صرف مفتوح قوم کے جسموں تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ وہ اس کے قلوب اور دماغوں کو بھی تسخیر کرلیتی ہے۔ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان ارباب فکر وعلم نے اس خطرے کا احساس اُسی وقت کرلیا، اوراس خطرہ سے حفاظت کے لئے انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی، دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی مرادآباد اسی دینی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

گجرات کے مدارس میں اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وسملک ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں جامعہ میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ تاریخ نے ماضی کا سینہ چاک کرکے اپنے پوشیدہ اوراق الٹ کر رکھ دئے، سرزمین گجرات میں ایک مرتبہ پھر شیخ علی متقیؒ، علامہ محمد طاہر پٹنیؒ، علامہ وجیہ الدین گجراتیؒ اور مخدوم مہائمیؒ کے بابرکت اور علم پروردور کی یاد تازہ ہوگئی، یعنی دنیائے اسلام کی مایۂ ناز درسگاہ، ازہر ہند، دارالعلوم دیوبند کے اکابر کی ایک برگزیدہ جماعت ڈابھیل پہنچ گئی۔

دیوبند میں امام العصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کا وفورِ علم پورے شباب پر تھا، کہ

بدقسمتی سے دارالعلوم میں ایک شورش برپا ہوئی اور اکابرِ دارالعلوم میں اختلاف پیدا ہوگیا، اختلاف کی تفصیل یہاں غیرضروری ہے، ہمارے اکابر کے اس اختلاف کو ان کے فضل، دیانت وصداقت اور ورع وتقویٰ کے پیش نظر دیانت دارانہ اختلاف رائے پر محمول کرنا چاہئے۔ شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس اختلاف کے رحمت بننے کا ذکر ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’جس طرح ایک خاص موسم میں سمندر میں جوش وخروش اور ہیجان وتلاطم پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ، سمندر کے بخارات بادل کی شکل اختیار کرکے اسی وقت زمین کی شادابی اور سرسبزی کا سبب بنتے ہیں جب کہ زمین اپنی خشکی اور تشنگی کے سبب پانی کی سخت محتاج ہوتی ہے؛ لیکن جب سمندر میں گرمی پیدا ہوکر تموُّج اور تلاطم پیدا ہوتا ہے تو کچھ جزوی نقصانات بھی ہوجایا کرتے ہیں، جس سے بسا اوقات سمندر میں چلنے والے جہاز تک خطرہ میں پڑ جاتے ہیں؛ مگر جن لوگوں کی نظر حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اس نقصان میں بھی کوئی نفع کلی ضرور ہے، گوسمندر کا یہ تلاطم اور جوش کچھ لوگوں کو اضطراب وہلاکت میں ڈال دینے والا ہوتا ہے؛ مگر اسی سے مخلوق کے لیے زندگی کا کوئی عظیم الشان فائدہ اور سامان بھی مشیتِ الٰہی کے پیش نظر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح دارالعلوم کے علمی سمندر میں بھی ایک طوفانِ جوش اور تلاطم اٹھا اوراس کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اس تموج وتلاطم سے کچھ نقصانات بھی پہنچے؛ مگر یہاں سے بخارات کے جو بادل اٹھے وہ ابرِ رحمت بن کر گجرات کی اُس دُور اُفتادہ سرزمین پر جاکر برسے جو علم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بالکل محروم اور بے بہرہ تھی، علمائے دیوبند کے وہاں پہنچ جانے سے ڈابھیل میں جو عظیم الشان مدرسہ عالَم وجود میں آیا، اس کے علمی فیضان سے آج گجرات کا چپہ چپہ سیراب ہورہا ہے، اور گجرات کا بدعت کدہ بحمدللہ آج قرآن وسنت کی

روشنی سے منور ہے‘‘۔(حاشیہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۱/ ۲۷۳،۲۷۲)

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث کی مسند جلیلہ کو ہندو بیرون ہند کی جن ہستیوں نے رونق بخشی بلا مبالغہ ان کے علم وعرفاں سے دنیا آج بھی مستفیض ہو رہی ہے، صرف نام ہی نہیں ان کے علمی ودینی کارناموں کی شاندار تاریخ ہے، ان کی عظیم الشان خدمات سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں، ذیل کے سطور میں ان حضرات کا ذکر کیا جارہا ہے۔ ان عبقری شخصیات میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ (۱۲۷۵ھ۔۱۳۴۷ھ) بھی شامل ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب ابن مولانا فضل الرحمن صاحب دیوبندی عثمانیؒ ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ظفر الدین رکھا گیا۔ ابتدا سے فراغت تک کی تعلیم از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں ہی حاصل کی۔ ۱۲۹۵ھ میں انہوں نے فراغت حاصل کی۔ آپ کے مشہور اساتذہ کرام میں حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہندؒ اور عبدالعلیؒ شامل ہیں۔ فراغت کے بعد کچھ عرصے تک دارالعلوم میں معین المدرس رہے اور اسی کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کی نگرانی میں دیتے رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مقرر ہوئے اس کے ایک سال کے بعد آپ کو مفتی ومدرس مقرر کیا گیا۔ چالیس سال تک آپ نے دارالعلوم کے دارالافتاء کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ اس زمانے میں بے شمار ایسے مشکل فتاویٰ بھی لکھے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآرا مہمات میں محاکمہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر صرف چند لفظوں میں ان کا جواب تحریر فرما دیتے تھے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے ایک اندازے کے مطابق حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ان کی یہ عظیم الشان دینی خدمت ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ بھی مستعفی ہو گئے

تھے۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ وسط ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کا درس شروع کر دیا۔ اور صرف ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے علالت کے سبب بخاری شریف کے جو ۱۴/ پارے چھوڑ دیے تھے انہیں ختم کرا دیے۔ جمادی الثانی کے اوائل میں آپ دیوبند تشریف لائے اور راستے میں طبیعت علیل ہوگئی۔ دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہوسکا۔ وقت موعود آچکا تھا، بالآخر ۱۷/ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کی شب داعی اجل کو لبیک کہا اور مزار قاسمی میں سپرد خاک کیے گئے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات کے دیگر شیخ الحدیث میں **حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امروہیؒ** (۱۲۷۷ھ۔۱۳۶۷ھ) استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امروہہ نے بھی یہاں صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن الترمذی، سنن ابی داود، سنن النسائی وغیرہ کتابوں کا درس دیا۔ آپ کی تفصیلی حالات زندگی کیلئے تذکرۂ علمائے امروہہ از قلم: مصباح احمد صدیقی، تاریخ دارالعلوم دیوبند از: مولانا سید محبوب رضوی، ذکر صالحین جلد اول، مرتب: مولانا مرغوب احمد لاجپوری سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

شیخ الحدیث **حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب** بنوریؒ (۱۳۲۶ھ۔۱۳۹۷ھ) بانی وشیخ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمیؒ (۱۹۰۷ء۔۱۹۸۹ء) شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد، شیخ الحدیث حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۴ء) صاحب اعلاء السنن وصدر مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ (۱۳۱۸ھ۔۱۹۸۳ء۔)

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہاولپور و وزیر معارف ریاست قلات، **حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلویؒ** (۱۳۴۳ھ۔ ۱۳۶۴ھ) شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اشرفیہ لاہور، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب پشاوریؒ (۱۳۳۰ھ۔ ۱۴۲۳ھ) شیخ الحدیث جامعہ اکوڑہ خشک، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنویؒ (وفات: ۱۹۶۹ء) ناظم جمعیت علمائے ہندو مدارس مدرسۂ عالیہ کلکتہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ۔ ۱۴۰۴ھ) شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو، اعظم گڈھ، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری (ولادت: ۱۹۴۶ء) سابق صدر مفتی وحال سرپرست دارالافتاء وشیخ الحدیث جامعہ ڈابھیل، شیخ الحدیث حضرت مولانا واجد حسین صاحب دیوبندیؒ (۱۳۵۲ھ۔ ۱۴۳۵ھ) مدرس حدیث مفتاح العلوم جلال آباد، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اکرام علی صاحب بھاگلپوریؒ (۱۳۵۵ھ۔ ۱۴۰۴ھ) شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو، اعظم گڑھ جیسے جید علماء کرام ومحدثین عظام شامل ہیں۔

مولانا سلیم اللہ خانؒ پاکستان

(1926۔2017ء)

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان کا آبائی تعلق پاکستان کے آزاد قبایلی علاقے خیبر ایجنسی سے ہے۔ آپ 25 دسمبر 1926ء کو ہندوستان کے ضلع مظفر نگر کے مشہور قصبہ حسن پور لوہاری کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے، آپ کا تعلق آفریدی پٹھانوں کے ایک خاندان ملک دین خیل سے ہے۔ حسن پور لوہاری ہمیشہ اکابرین کا مسکن ومرجع رہا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے شیخ میاں جی نور محمد صاحبؒ ساری زندگی اسی گاؤں میں

سکونت پزیر رہے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم حضرت حکیم الامتؒ کے مشہور خلیفہ مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے مدرسہ مفتاح العلوم میں حاصل کی۔ حضرت شیخ الحدیث سلیم اللہ خانؒ کا حافظہ انتہائی تیز تھا۔ صرف 27 دن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ سالانہ تعطیلات میں گھر آئے۔ رمضان کے دن تھے۔ گاؤں کی مسجد میں قرآن سنانے والا کوئی حافظ نہ تھا، چنانچہ روزانہ سوا پارہ یاد کرتے اور تراویح میں سنا دیتے۔ یوں چند دن میں قرآن حفظ ہوگیا۔ 1942ء میں آپ اپنے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے لیے ازہر ہند، دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں آپ نے فقہ، حدیث وتفسیر ودیگر علوم وفنون کی تکمیل کی اور 1947ء میں آپ نے امتیازی نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے علاقے میں موجود اپنے استاد ومربی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیر نگرانی مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں تدریسی وتنظیمی امور انجام دینے شروع کیے۔ آٹھ سال تک شب وروز کی انتہائی مخلصانہ محنت کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ مدرسہ حیرت انگیز طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا اور مدرسہ کے طلبا کا تعلیمی اور اخلاقی معیار اس درجہ بلند ہوا کہ دارالعلوم دیوبند اور دیگر بڑے تعلیمی اداروں میں یہاں کے طلبا کی خاص پذیرائی ہونے لگی۔ مدرسہ مفتاح العلوم میں آٹھ سال کی شبانہ روز محنتوں کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ پاکستان کی مرکزی دینی درس گاہ دارالعلوم ٹنڈو الہ یار سندھ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے پاکستان تشریف لے آئے۔ تین سال یہاں پر کام کرنے کے بعد آپ ملک کے معروف دینی ادارے دارالعلوم کراچی میں تشریف لائے اور پھر مسلسل دس سال دارالعلوم کراچی

میں حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، ریاضی، فلسفہ اور ادب عربی کی تدریس میں مشغول رہے، اسی دوران آپ ایک سال حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تدریس کے ساتھ ساتھ فارغ اوقات میں مختلف اسباق پڑھانے کے لیے تشریف لاتے رہے۔ قدرت نے آپ کی فطرت میں عجیب دینی جذبہ ودیعت فرمایا تھا جس کے باعث آپ شب وروز کی مسلسل اور کامیاب خدمات کے باوجود مطمئن نہیں تھے اور علمی میدان میں ایک نئی دینی درس گاہ (جو موجودہ عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہو) کی تاسیس کو ضروری خیال فرماتے تھے۔ چناں چہ 23 جنوری 1967ء مطابق شوال 1387ھ میں آپ نے جامعہ فاروقیہ کراچی کی بنیاد رکھی۔ آپ کی یہ مخلصانہ کوشش اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اتنی قبول ہوئی کہ تاسیس جامعہ کے بعد سے لے کر اب تک (سن 2007ء) کے مختصر عرصہ میں جامعہ نے تعلیمی وتعمیری میدان میں جو ترقی ہے وہ ہر خاص وعام کے لیے باعث حیرت ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے 1980ء میں آپ کو وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا آپ نے وفاق کی افادیت اور مدارس عربیہ کی تنظیم وترقی اور معیار تعلیم کے بلندی کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ وفاق کی تاریخ میں ایک قابل ذکر روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے وفاق المدارس العربیہ کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ درج ذیل ہیں:

آپ نے وفاق کے طریقہ امتحانات کو بہتر شکل دی، بہت سی بے قاعدگیاں پہلے ان امتحانات میں ہوا کرتی تھیں انہیں ختم کیا۔ پہلے وفاق میں صرف ایک امتحان دورہ حدیث کا ہوا کرتا تھا۔ آپ نے وفاق میں دورہ حدیث کے علاوہ سادسہ (عالیہ)، رابعہ، ثالثہ (ثانویہ خاصہ) ثانیہ (ثانویہ عامہ)، متوسطہ، دراسات دینیہ اور درجات تحفیظ

القرآن الکریم کے امتحانات کو لازمی قرار دیا۔ نئے درجات کے امتحانات کے علاوہ آپ نے ان تمام مذکورہ درجات کے لیے نئی دیدہ زیب عالمی معیار کی سندیں جاری کروائیں۔ وزارت تعلیم اسلام آباد سے طویل مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں بغیر کسی مزید امتحان میں شرکت کیے وفاق کی اسناد کو بالترتیب ایم اے، بی اے، انٹر، میٹرک، مڈل اور پرائمری کے مساوی قرار دیا گیا۔ فضلائے قدیم جو وفاق کی اسناد کے معادلے کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد سے محروم تھے ان کے لیے خصوصی امتحانات کا اہتمام کرایا تا کہ انہیں بھی وفاق کی سندیں فراہم کی جاسکیں۔ وفاق سے ملحق مدارس میں پہلے سے موجود قلیل تعداد کو جو چند سو پر مشتمل تھی اور جس میں ملک کے بہت سے قابل ذکر مدارس شامل نہیں تھے اپنی صلاحیتوں سے قابل تعریف تعداد تک پہنچایا۔ 2007ء میں یہ تعداد پندرہ ہزار مدارس وجامعات پر مشتمل ہے، جس کی بنا پر اب وفاق المدارس العربیہ کو پاکستان کی واحد نمائندہ تنظیم قرار دیا گیا ہے۔ مدارس عربیہ میں موجود نظام کو بہتر کرنے کے لیے آپ نے نصاب درس اصلاحی کی مہم شروع کی چناں چہ اب پورے پاکستان میں یکساں نصاب پورے اہتمام سے پڑھایا جارہا ہے۔ جبکہ پہلے صورت حال نہایت ابتر تھی اور تقریباً ہر مدرسہ کا اپنا الگ الگ نصاب ہوا کرتا تھا۔ وفاق کے مالیاتی نظام کو بھی آپ نے بہتر کیا جب کہ پہلے کوئی مدرسہ اپنی فیس یا دیگر واجبات ادا کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتا تھا۔ اب آپ کی مسلسل توجہ کے نتیجے میں وفاق ایک مستحکم ادارہ بن چکا ہے۔ آپ نے وفاق کے مرکزی دفاتر کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اس کے لیے بہتر ومستقل عمارت کا انتظام کرایا جب کہ اس معاملے میں پہلے عارضی بندوبست اختیار کیا جاتا تھا۔ آپ کی انہی گراں قدر خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو 1989 میں وفاق کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

آپ کی تدریسی تاریخ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے، بے شمار لوگ آپ کے چشمہ فیض

سے سیراب ہوئے ہیں، قدرت نے آپ کو فصاحت وبلاغت کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے، مشکل بحث کو مختصر اور واضح پیرائے میں بیان کرنا آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ 49 سال تک جامعہ فاروقیہ میں شیخ الحدیث کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔کم وبیش 55 سال تک بخاری شریف پڑھاتے رہے۔ضعف العمری اور علالت کے باوجود آخر تک بخاری شریف کا سبق پڑھایا۔آپ کے صحیح البخاری کے دروس کشف الباری اور مشکوٰۃ المصابیح کے لیے آپ کی تقاریر نفحات التنقیح کے نام سے شائع ہو کر علماء وطلبا میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں، اب تک (سن 2007) کشف الباری کی 12 جلدیں اور نفحات التنقیح کی تین جلدیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جب کہ بقیہ جلدوں پر کام جاری ہے۔ سات دھائیوں کی مسلسل محنت، ستر سالہ مسند آرائی، چار دھائیوں کی شاندار قیادت، نوے سالہ عمیق روشنی رخصت ہوگئی۔ پون صدی تک علم وعرفان، اتفاق واتحاد، دعوت وتبلیغ اور اشاعتِ دین کا کام کرتے ہوئے گزشتہ کل 15 جنوری 2017ء کو مختصر سی علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

***

دینی مدارس ماضی، حال اور مستقبل
تقاضے، چیلنجز اور ان کا حل

زیر اہتمام	:	دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش
بمقام	:	ملت اکادمی بجنور یوپی
بتاریخ	:	۳/۴ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۸/۱۹ فروری ۲۰۱۰ء

الحمد لله رب العٰلمين، والصلاة والسلام علٰى سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد و علٰى آله و صحبه و علٰى من تبعهم باحسان و دعا بدعوتهم الٰى يوم الدين، أما بعد:

عالی وقار صدر مجلس، حضرات علماء کرام، معزز حاضرین!

علماء و محققین کی اس مجلس کو آراستہ کرنے پر میں ملت اکادمی بجنور یوپی کے ذمہ داروں اور اکادمی کے سربراہ اعلیٰ حضرت مولانا سراج الدین ندوی مدظلہ العالی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پروگرام کے مہمان خصوصی خطیب الاسلام

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند اور شیخ الادب حضرت مولانا سعیدالرحمٰن الاعظمی ندوی مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہیں۔ اللہ رب العزت ان بزرگوں کا سایۂ عاطفت تادیر ملت اسلامیہ پر باقی رکھے۔ آمین

حضرات علماء کرام ودانشوران عظام!

مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت سے انکار کی گنجائش نہیں، مگر اب دشمنان اسلام نے بھی اس کی قوت کو پوری طرح بھانپ لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آئے دن مدارس اسلامیہ کے تعلق سے طرح طرح کے منفی شگوفے ہوا میں چھوڑے جاتے ہیں اور مدارس واہل مدارس کے تئیں مسلمانوں خاص طور پر محسنین مدارس کو گمراہ اور بدگمان کیا جاتا ہے۔ کبھی مدارس اسلامیہ کے وجود کو زمانے کے ساتھ نہ چلنے والے فرسودہ نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کبھی علما واہل مدارس پر بے ہنر طلباء کی کھیپ کو دھرتی کا بوجھ بنانے کا الزام لگایا جاتا ہے، لیکن معاندین اسلام اور ان کے غلط پروپیگنڈے کے شکار کچھ مسلمان بھائیوں نے بھی جب یہ دیکھ لیا کہ مدارس سے متعلق علماء اور طلباء کی شکل میں یہ دیوانے اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تو اب مدارس اور اس کے انتظامیہ پر ہی سوالات کھڑے کیے جارہے ہیں۔ چند برسوں سے مدارس مخالف قوتوں نے اب مدارس چلانے والے علماء پر بداخلاقی اور مالی بددیانتی کے الزامات لگانے کو بہترین ہتھیار تصور کرلیا ہے۔ ان حالات میں علماء اہل مدارس کو منفی پروپیگنڈے سے بچنے کی سعی کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری ہے کہ مخلصین ومعاونین مدارس معاندین اسلام کی بدنیتی کو سمجھیں اور علماء کے تعلق سے ہراڑی اڑائی بات پر ہرگز دھیان نہ دیں۔

اس بات کو اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب جب شمع حق کی لو تیز ہوئی ہے باطل کے خیمے میں بے چینی پیدا ہوئی ہے اور حق بات کو دبانے کی ہرممکنہ کوششیں

ہوئی ہیں۔ چنانچہ طرح طرح کی رکاوٹوں اور منفی پروپیگنڈوں کے باوجود مدارس اسلامیہ پوری قوت وجوش عمل کے ساتھ دین حق کی تعلیم اور اسلام کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ چند دہائیوں سے مدارس نے علمی وباطنی سطح پر بھی ترقی کی ہے اور ظاہری طور پر بھی اسے وقار وترقی حاصل ہوئی ہے اس لیے اسلام ومدارس مخالف قوتوں کا بے چین ہوجانا فطری ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ کبھی کبھی کلمہ گو بھی ایسی طاقتوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور ان ہی کی زبان بولنے لگ جاتے ہیں۔ جب کہ سچائی یہ ہے کہ یہی مدارس ہیں جن کی وجہ سے اسلام، اسلامی تعلیم زندہ اور اسلامی تشخص باقی ہے۔ ہمارے بھائیوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو 'توکل علی اللہ' پر بڑے بڑے پروجیکٹ کی بنیاد رکھتی ہو، کوئی تنظیم ایسی نہیں جو بے سروسامانی کی حالت میں کسی کام کا عزم رکھتی ہو اور کائنات میں کوئی ادارہ نہیں جو چندہ بشکل بھیک اکٹھا کر کے نونہالان قوم کو تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کی مکمل کفالت بھی کرتا ہو۔ تصور کیجیے کہ علماء کے علاوہ کوئی قوم ایسی دنیا میں ہے جو فرائض منصبی بھی ادا کرتی ہو اور ایک ایک روپیہ چندہ اکٹھا کر کے مدارس کا نظام بھی چلاتی ہو اور اپنا وظیفہ بشکل تنخواہ بھی لیتی ہو؟ یاد رکھیے علماء اور ذمہ داران مدارس کے سامنے محض اسلام کی خدمت اور اشاعت دین ہے اور وہ اس کے لیے مرمٹنے کے لیے تیار ہیں ورنہ امت کی جو بے رخی ہے مدارس پر کب کے تالے لگ چکے ہوتے۔

ہم مانگنے والوں کو ہرگز نہ گدا سمجھو
یہ شانِ نبوت ہے انداز فقیرانہ

ایک طرف اہل مدارس کو معاندین اسلام کا سامنا ہے تو دوسری طرف ان روشن خیال برادران اسلام سے سابقہ ہے جن کے نزدیک مدارس اور اس سے وابستہ جملہ سرگرمیاں کار عبث ہیں، چونکہ ان کے نزدیک انسانیت کی خدمت سب سے بڑی عبادت

ہے اور ایسے مدرسوں کو وہ لا حاصل سمجھتے ہیں جہاں صرف مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، ایسے لوگوں کی خواہش ہے کہ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کو برابر شامل کیا جانا چاہیے تاکہ دنیا میں ترقی یافتہ قوم کہلاسکیں، یعنی وہ ایسا مدرسہ چاہتے ہیں جہاں دینی تعلیم کی حیثیت اتنی ہی ہو جتنی کھانے میں چٹنی کی ہوتی ہے۔ اس سوچ کے افراد خالص اسلامی مدرسوں کے لیے نہ تو دست تعاون بڑھاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اس کام کے لیے آمادہ کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو وہ مدارس کے تعاون کرنے والوں کو روکتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں صاحب نصاب افراد میں سے دس فیصد لوگ بھی اپنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالتے اور جو نکالتے ہیں انھوں نے زکوٰۃ کی رقم کھپانے کے لیے نام نہاد ٹرسٹ کھول رکھے ہیں، ظاہر ہے ایسے میں اہل مدارس کہاں سے یہ امید لگائیں کہ ان کی مالی مشکلات دور ہوں گی اور وہ پوری تندہی کے ساتھ اشاعت دین میں منہمک رہیں گے۔ اتنی رکاوٹوں اور مسائل ومشکلات کے باوجود اہل مدارس اگر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں تو یہ کسی جہاد سے کم نہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اہل اسلام صاحب ثروت لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے رہیں کہ وہ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرنے کی کوشش کریں اور مدارس کی اہمیت سے بھی انھیں آگاہ کرتے رہیں دوسری طرف صاحب ثروت لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسلامی مدارس کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہیں کیوں کہ یہی وہ مدارس ہیں جن کے دم سے آج ہندوستان کے جنگلوں میں بھی اذان واقامت کی آواز گونج رہی ہے۔ روشن خیال لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ مدارس کے مقاصد کو سمجھیں اور ان کے نشانہ کو پہچانیں، اگر وہ اس پر غور کریں گے تو ان پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ مدارس اسلامیہ کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور ان کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔

علماء واہل مدارس کو ایسے حالات سے نہ گھبرانا چاہیے اور نہ کسی طرح کی مایوسی کا شکار ہونا چاہیے کیوں کہ جس قرآن کریم کی تعلیم میں وہ مصروف ہیں اس کی بقا کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے دوسری طرف علماء کو اپنے اسلاف کی خدمات کو دیکھنا چاہیے کہ کن کن مسائل ومشکلات کو جھیل کر انھوں نے دینی تعلیم اور اشاعت دین کی شمع کو جلائے رکھا۔ بوریہ نشین علما نے مدارس اور خانقاہوں میں بیٹھ کر جس طرح مدارس کے نظام کو رائج وعام کیا تھا وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے، انشاء اللہ علوم اسلامیہ کا چراغ یونہی جلتا رہے گا۔

ملت انسانیت کے پاسبانو! ـــــــ ہندوستان میں اسلام کا موجودہ منظر نامہ، وسیع دائرۂ کار اور لامحدود جغرافیہ، دینی مدارس کی سنہری کوششوں، مخلصانہ کاوشوں، بے پناہ جدوجہد اور مساعی جمیلہ کی رہین منت ہیں۔ اشاعت اسلام، فروغ دین اور حفاظت شعائر کے حوالے سے اسلامی تاریخ، دینی مدارس کے بنیادی رول، اساسی کردار اور قائدانہ جدوجہد کے تذکرہ کے بغیر ہندوستان ہی نہیں، بلکہ اقوام عالم کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔

ہندوستان میں دینی مدارس کا مقام، کردار اور جنگ آزادی میں ان کی جدوجہد تاریخ کا وہ اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر ہندوستان کی تاریخ مبہم ہی نہیں بلکہ موہوم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مدارس کے کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ جنھیں ذیل کے چند نکات میں اس طرح سمیٹا جاسکتا ہے۔

(۱) مدارس اسلامیہ نے یہاں بالواسطہ اسلام کو قرآن و حدیث، ترجمہ و تالیف، تحقیقات وتصنیفات، خانقاہیں اور تربیتی مراکز قائم کر کے سیاسی فتنہ گری، اکبری گمراہی، انگریزی سازش، آریائی وبرہمنی فتنہ، قادیانی فتنہ و پرویزیت سامانی کا مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ پٹنہ سے لے کر حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی سرہندیؒ، امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ، حجۃ الاسلام الامام محمد

قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، امام ربانی رشید احمد گنگوہیؒ، مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی جناب سرسید احمد خانؒ، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، بانیان مظاہر علوم سہارنپور حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ، عبقریت الدہر حضرت مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، محدث عصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ملک میں اسلامی بنیادوں کو مزید مستحکم کرلیا۔

(۲) جدوجہد آزادی کی دوسو سالہ تاریخ میں بھی دینی مدارس نے ہمیشہ کلیدی رول ادا کیا ہے۔تحریک بالاکوٹ کے علمبردار امام المجاہدین حضرت سید احمد شہید بریلویؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ، حضرت مولانا یحییٰ علیؒ، حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، حضرت مولانا جعفر تھانیسریؒ، حضرت مولانا احمد اللہ شاہ گجراتیؒ کی تحریک مجاہدین، رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علی گوہرؒ کی خلافت تحریک، شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال، داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی تبلیغی تحریک، ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجادؒ کی تحریک امارت شرعیہ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کی تحریک آزادی کے لئے جہدوجہد کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ جنگ آزادی کے چند انمٹ نقوش ہیں۔

(۳) مدارس اسلامیہ نے ملک میں مفت تعلیمی سہولتوں کے ذریعہ معیاری وعمومی

خواندگی کا نیٹ ورک آج تک قائم کر رکھا ہے اس کا بدل ہنوز فراہم نہیں کیا جاسکا۔

(۴) ملک بھر میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مساوات، انسانی حقوق اور خدا پرستی کی عملی تبلیغ وتشہیر نے ذات پات کے ظالمانہ نظام کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

شودروں اور پسماندہ طبقات کو جو آج دستوری وسماجی سہولتیں حاصل ہیں ان میں اسلامی تعلیمات اور اقدار حیات کے اثرات کا دوست ودشمن سبھی اعتراف کرتے ہیں۔

(۵) یہ اسلامی مدارس ہی ہیں جو اپنے وطن کو عالم اسلام سے جوڑنے میں بنیادی رول ادا کرتے آئے ہیں، علماء نے جو تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے اس کے نتیجہ میں ملک بھر میں خدا پرستی اور انسانیت دوستی کی عمومی فضا بے شک برقرار ہے مگر حال کے چیلنجوں اور روشن مستقبل کے تقاضوں کو اگر آج ہم نے نظر انداز کیا تو آئندہ نسل ہمیں معاف نہیں کرے گی۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان چیلنجوں کا پوری فراست ایمانی اور دوراندیشی سے مقابلہ کریں۔

ہندوستان میں مدارس کا قیام:

دینی مدارس کی بنیاد اس وقت ڈالی گئی تھی جب سلطنت مغلیہ فنا کی کگار پر تھی، کچھ حساس اور غیور قلب مخلصین کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب مسلمانوں میں دینی تعلیم کے فروغ کی پرائیویٹ کوشش ناگزیر ہوگئی ہے، کیونکہ دشمنان دین نے ایسے انتظامات کررکھے تھے جن کا راست اثر مسلمانوں کے تشخص اور تعلیم وتربیت پر پڑ رہا تھا، انہی خدشات کی بناء پر چند صاحبان عقل وخرد نے مدارس اسلامیہ کے قیام کی تجویز سوچی اور اسے مؤثر اور قابل انتفاع بنانے کی ترکیبیں زیر تجویز آئیں۔ ان تجاویز کی دوررسی اور مستقبل میں اچھے امکانات کی بناء پر یہ فیصلہ لیا گیا کہ دینی مدارس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جس کی قیادت علماء ودین دار طبقہ نے کی تھی) کی

ناکامی پر مسلمانوں میں احساس شکست، احساس کمتری اور ایک عام مایوسی پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کی عزت، خودداری پر کاری ضرب لگ رہی تھی اس پیچیدہ کیفیت اور نازک حالات میں دو قسم کی قیادت ابھر کر سامنے آئی۔ پہلی قیادت خالص دینی قیادت تھی، جس کے علمبردار علماء دین تھے، دوسری قیادت سرسید احمد خان مرحوم اور جدید مکتب فکر کے افراد پر مشتمل تھی، علماء دین اسلام نے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں کو دینی و اخلاقی زوال سے حفاظت کے ضامن ہوں اور ان مدارس سے ایسے علماء تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی شریعت و فقہ سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، ان میں داعیانہ روح، رضا کارانہ خدمت اور اشاعت علم کا جذبہ ہو اور جو حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر علم دین کی اشاعت و حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کا مرکزی اور بنیادی حصہ ہے۔

انگریزوں کی ظلم و بربریت اور غیر معمولی سنگدلی اور بے رحمی کی وجہ سے جس کا مظاہرہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے معاملہ میں کیا، نیز عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرمی اور گرم جوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد، اخلاق و معاشرے میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کو اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے اس کی فکر کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لیے قلعہ بندیاں کر لی جائیں اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کئے جائیں۔ چنانچہ اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا آغاز شمالی ہند کی اس قدیم تاریخی بستی میں ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء بروز پنج

شنبہ چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سایہ میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر ایک دینی مدرسہ کے افتتاح سے کیا گیا جسے آج پوری دنیا ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے جانتی ہے۔ اس مدرسہ کا نصاب درسِ نظامی پر تھا، درس نظامی بارہویں صدی کے مشہور عالم دین حضرت مولانا ملا نظام الدین سہالویؒ کا مرتب کردہ نصاب ہے۔ اسی نظام تعلیم نے ایسی ایسی نابغۂ روزگار اور علمی وفنی شخصیتیں پیدا کیں جن کی عظمت آج بھی مسلم ہے۔ دارالعلوم دیوبند جیسے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے بہت سے مدارس نے جنم لیا اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں دینی مدارس کے فضلاء موجود نہ ہوں۔ ۱۸۶۶ء میں جب مدارس کی تحریک کا آغاز ہوا تو بانیان تحریک کے ذہن میں انگریزوں کے بالمقابل اپنی تحریک کا احساس ایک لاوے کی طرح پک رہا تھا اور اس لاوے کا حصہ ہر اس فرد کے ذہن میں منتقل ہوتا چلا گیا جو اس تحریک کا حصہ بنا۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوا۔

دوسری قیادت جس کا پرچم سرسید احمد خان مرحوم نے بلند کیا۔ انہوں نے جنگ آزادی کی ناکامی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر پر افلاس اور نکبت کی پرچھائیاں دیکھی تھیں۔ انہوں نے ہندوستان کی ہزیمت اور دل شکستگی کا مشاہدہ کیا تھا، اپنی آنکھوں سے عربی، فارسی پڑھے مسلمانوں کو صدر الصدور، صدر امین، ہیڈ قاضی اور منشی کے عہدوں پر فائز دیکھا تھا، مغربی سیاحوں نے جن کے عدل اور قوت فیصلہ کی تیزی کو سراہا تھا، مگر یہ قابل لوگ ملازمت کے لیے نااہل قرار دیے جا رہے تھے۔ وہ قوم جو کل تک حاکم تھی اس کی ذلت و پستی، انگریزوں کی شان و شوکت، ان کی حکومت اور ان کی ساحرانہ تہذیب کے مظاہر دیکھ کر سرسید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسلم نوجوانوں کے اندر عصری تعلیم میں قابلیت پیدا کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک عمل میں آئی جس کی باضابطہ

شروعات ایم،اے،او اسکول کی شکل میں ۲۴رمئی ۱۸۷۵ء میں عمل میں ہوئی۔ یہی اسکول آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں رواں دواں ہے۔

ـــــــ ان دونوں قیادتوں کے بعد جہاں ایک طرف صرف دینی تعلیم اور دوسری طرف دنیوی تعلیم کی طرف توجہ تھی۔ دونوں تحریک کی اپنی اپنی الگ جہت تھی۔ چنانچہ علماء کرام کی ایک بڑی جماعت نے فیصلہ کیا کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی سکھائی جاسکے تاکہ حدیث وتفسیر، فقہ ومنطق کے ساتھ ساتھ یہاں کے فارغین عصر حاضر پر بھی نظر رکھ سکیں چنانچہ ندوۃ العلماء کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب قدیم وجدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کو برسوں بیت چکے تھے ۔دیوبند کے قیام کو ۲۶رسال اور علی گڑھ کو ۱۸رسال گزرے تھے کہ تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا اور آہستہ آہستہ یہ تحریک پھلتی پھولتی رہی اور لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے فیصلے اور اس کی مستقل عمارت کے لیے زمین کا انتخاب کیا گیا اور ۹رجمادی الآخر ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶رستمبر ۱۸۹۸ء لکھنؤ کے خاتون منزل میں افتتاح ہوا اور اس کی ابتدائی درجات کھل گئے اور ۱۷رجمادی الآخر ۱۳۱۶ھ مطابق ۴راکتوبر ۱۸۹۸ء کو اس کے افتتاح کے اعلان کی تقریب ایک عظیم الشان جلسہ کی شکل میں اس نئے مکان (خاتون منزل) میں منعقد ہوئی۔ اس جلسہ میں ہندوستان کے علماء اور سربرآوردہ حضرات نے شرکت کی۔

۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۸ء کے حالات ظلم وجور اور جبر وتشدد نے ملت ہندیہ کی ہمت توڑ دی تھی اور اس اندھیرے میں ایک صالح فکر کی تعمیر کی ضرورت تھی تاکہ زخم خوردہ معاشرہ کو انسانیت کی لڑی میں پرویا جاسکے، ایسے نامساعد حالات میں شہر سہارنپور میں دینی حمیت رکھنے والوں کی کوشش سے وہ وقت مسعود بھی آگیا جس میں یکم رجب المرجب

۱۲۸۳ھ مطابق ۹رنومبر ۱۸۶۶ء کو جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کا قیام عمل میں آیا اور اس کے عظیم بانیان حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ، عبقریت الدہر حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوریؒ نے اس کی اینٹ رکھی اور انہی کے اخلاص کا ثمرہ ہے کہ اس جامعہ سے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوریؒ، حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی سعید احمد اجڑارویؒ، محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحقؒ ہردوئی، حضرت مفتی مظفر حسینؒ، حضرت مولانا یوسف کاندھلویؒ، حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی مدظلہ العالی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری مدظلہ العالی، حضرت مولانا محمد عاقل سہارنپوری مدظلہ العالی، حضرت مولانا محمد سلمان مظاہری مدظلہ العالی، حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری مدظلہ العالی جیسی شخصیات پیدا ہوئیں جو ہر زمانہ کے مختلف فتنے سے نبرد آزما ہوتی رہیں اور ملت پر ناگہانی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ تن مشغول ومصروف رہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اداروں کی حفاظت اپنے خون جگر دے کر کی جائے اور سرکار کی امداد اور اعانت نہ قبول کی جائے، کسی بھی دادودہش، مرکزی مدرسہ بورڈ، علاقائی وصوبائی بورڈ کے پھندوں سے انہیں آزاد رکھ کر ہر طرح سے تحفظ فراہم کیا جائے۔ کیوں کہ جب تک یہ مدارس موجود ہیں اسلام زندہ ہے ان کے بغیر اسلام کی حفاظت کی کوئی بھی قابل اعتبار ضمانت نہیں نظر آتی ہے لہٰذا ان مدارس کی حفاظت ہماری قومی وملی ذمہ داری ہے۔

دینی مدارس کے اصل مقاصد:

دینی مدارس کی اولین ترجیح اسلام کا تحفظ، اسلامی اقدار کی حفاظت اور شرعی وملی

مسائل کا حل، ایسے رجال کار کی تہذیب و پرداخت ہے جو امت کی فلاح و بہبود کی خواہش لئے ہوئے عصری شرورفتن کے انسداد، تخریبی وطاغوتی قوتوں کی سرکوبی کے لئے مستعد اور ہر نوعیت کی علمی، عملی، شعوری اور قلمی سرگرمیوں کو انجام دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ اس بات کی ہمت رکھتے ہوں کہ وہ امت پر منڈلانے والے ہر طوفان کا رُخ موڑ دیں، جو ملت اسلامیہ پر سایہ فگن ہر طرح کے داخلی وخارجی خطرات کا دفاع کرسکیں، جو بخلوص قرآن و حدیث کی اشاعت اور دینی امور کی تبلیغ کرسکیں، ان کے اندر اس بات کا جذبہ ہو کہ وہ امت میں بیداری، جذبۂ حریت اور اسلامی ذہنیت کو وسعت کے ساتھ پھیلانے کی قوت رکھتے ہوں، اخلاص وللٰہیت اور یکسوئی کے ساتھ خدمات انجام دینے کی سکت رکھتے ہوں، مسائل سے آگاہ، حالات سے باخبر اور مخالف عناصر سے بخوبی آشنا ہوں، دعوتی ودینی راہوں میں ناپسندیدہ عوارض پیش آنے سے چراغ پا ہونے کے بجائے ضبط کا مادہ رکھتے ہوں اور قرآنی احکامات، نبویؐ ارشادات اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اصول حیات پر عمل پیرا ہوں۔

دینی مدارس کی اختصاصی ترجیحات علوم دینیہ اور اس کے مدار پر گھومتی دیگر ضروریات ہیں مگر مقام مسرت یہ ہے کہ ان مدارس نے فقط دینی شعائر کے تحفظ کا کام ہی نہیں کیا بلکہ ملک وقوم کی حفاظت کو بھی اپنے منشور میں رکھا اور اس میدان میں ان کے فضلاء نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیا کہ پوری دنیا دنگ ہے، تحریک آزادی میں مدارس سے وابستہ افراد اور رجال پر عزیمت نے کچھ اس انداز ونہج پر کام کیا کہ ہزار کوشش وتعصب کے باوجود کبھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

دینی ادارے عرصۂ دراز سے ایک مخصوص نہج اور نظم ونسق کے ساتھ چلے آرہے ہیں اور آزادانہ دینی وملی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس سے ایسے علماء اور

قرآن وحدیث کے ایسے ماہرین پیدا ہو رہے ہیں جو ہر معاملے میں عوام وخواص کی ذاتی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رہنمائی کرتے ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل اقتباس دینی مدارس کے اصل مقاصد کو اجاگر کرتا ہے۔

’’ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل ایسا ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے ہیروں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ، قطب مینار اور دیگر مقبرات کے علاوہ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا‘‘۔

(دیرینہ رفیق حکیم شجاع سے کہا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب ’خوں بہا‘ میں یہ اقتباس لکھا ہے جو مذکور ہے)

مشہور ادیب قدرت اللہ شہاب نے بھی مدارس دینیہ کی خدمات کا برملا اعتراف اسی طرح کیا ہے۔ موصوف اپنی مشہور کتاب ’’شہاب نامہ‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’سرکار انگلشیہ کی عمل آوری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم وثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ وروغن چڑھتا گیا، اسی رفتار سے مولوی کا تقدس پامال ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ یہ دونوں تعظیمی اور تکریمی الفاظ تضحیک وتحقیر کے ترکش کے تیر بن گئے، مگر لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھے کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ

محلّہ کی مسجد میں ظہر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ نہیں ہوتی، اس بات پر کبھی حیرت نہیں ہوئی کہ اتنی صبح منھ اندھیرے فجر کی اذان پابندی سے ہر زمانے میں شہر شہر، گلی گلی، قریہ قریہ، چھوٹی بڑی، کچی پکی مسجدیں اسی ملا کے دم سے بیگانوں کی مخاصمت، ماحول کی بے حسی اور معاشرے کی کج ادائی کے باوجود اس نے اپنی وضع قطع بدلی اور نہ اپنے جسم کی مخصوص وردی چھوڑی، اپنی استعداد اور دوسروں کی توفیق کے مطابق اس نے کہیں دین کی شمع، کہیں دین کا شعلہ، کہیں دین کی چنگاری روشن رکھی۔ برصغیر کے مسلمان علماء کے اس احسان عظیم سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہوسکتے جس نے ان کے تشخص کی بنیاد کو ہر دور اور ہر زمانے میں قائم رکھا۔''

دینی مدارس پر ایک بھونڈا الزام:

مدارس کا وجود گرچہ شروع زمانے سے ہی تنقید بے جا کی تیز و تند یورشوں کی یلغار کا مرکز رہا ہے، مگر فی الوقت اس کی شدت میں تیزی آئی ہے، آج کل عالمی پیمانے پر مدارس کو بدنام کرنے کے لئے اس پر دہشت گردی کا بدنما دھبہ لگانے کی جدوجہد کی جارہی ہے اور ان اداروں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہاں فرقہ واریت پر مبنی لٹریچر پڑھایا جاتا ہے، اس کے علاوہ دینی مدارس پر ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ مدارس کا نصاب وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، مدرسوں میں پروفیسر، وکیل اور فلاسفر پیدا نہیں ہورہے ہیں، مگر ان کا یہ الزام ایسا ہی ہے جیسے کسی ڈاکٹر سے دریافت کیا جائے کہ آپ انجینئر کیوں نہیں بنے اور انجینئر سے یہ سوال کہ آپ کو ڈاکٹر بننا چاہئے تھا؟ مدارس کے طلباء اسلام میں تخصص کرتے رہے ہیں اور اسلام ایک ایسا موضوع ہے جس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ لگانا ایک ہمہ گیر مرحلہ ہے، مدارس کے طلباء پر یہ زور نہ ڈالا جائے کہ وہ ایک ہی وقت میں کالی کھانسی اور لال بخار کی دواؤں کے نام بھی یاد رکھیں اور علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ،

فلسفہ وغیرہ کے رموز کو بھی سمجھیں۔ مدارس کی سلامتی امت کی سلامتی کے ساتھ مشروط ہے اس بات پر توجہ مبذول کرنا غیروں کے اعتراضات کے پیچھے بھاگنے سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ مدارس کو کسی قسم کا نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ضرب مسلمانوں پر پڑتی ہے۔

دینی مدارس کا موجودہ کردار:

دنیا میں انقلابات کی علامت اور اس کی آہٹیں، فکری انقلاب اور بدلاؤ پر منحصر ہوتی ہیں، جب تک فکر ہم آہنگ، جگر تراش اور ٹھوس نہیں ہوتا تب تک زمانہ کی روایتی گردشوں میں ضوفشاں نشانات نظر نہیں آتے، یہ نکتہ، جو ہر بدلاؤ بلکہ ہر ترقی کے پس منظر رہتا ہے، ہر قوم، ہر قبیلہ اور ہر ملک جو ترقی کے خواہش مند ہیں پر منطبق ہوتا ہے، امت مسلمہ جس کا ماضی اس کے افکار، خدمات اور علمی وعملی جذبوں کی بناء پر روشن اور تابناک رہا تھا، اس کا پورا معاشرہ اور پوری اکائی اس سبق کو فراموش کر چکی ہے۔

دراصل امت مسلمہ نے جس چیز کو خانہ بدر کیا ہے وہ اس کا عصری کردار ہے، ظاہر ہے زمانہ کی رفتار میں ہم پلہ ہونا اور اس کے اقتباسات میں سہیم وشریک رہنے سے ہی کردار اور رفتار میں توازن رہتا ہے اور جب ان دونوں میں توازن نہیں رہے گا تو یہ بات حتمی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک پیچھے چلا جائے گا اور یہی امت مسلمہ کے ساتھ بھی ہوا۔ دینی مدارس چونکہ مسلمانوں کے عقائد وافکار کا محفوظ قلعہ ہیں بایں بناء اس کا یہ فریضہ تھا کہ وہ امت مسلمہ کو پسماندگی سے نجات دلاتے ہوئے اسلامی اقدار پر کاربند رکھے۔

اپنی عظیم خدمات کے باوجود کئی گوشے ایسے ہیں جہاں پر عملاً تساہل سے کام لیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ جس طرح دینی مدارس نے مسلمانوں کے عقائد وافکار کی حفاظت کی ضمانت لی اسے امت کی خوش نصیبی ہی کہی جاسکتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی خامیاں ہیں جن کی بناء پر دینی مدارس کی تاریخی حصولیابیاں مقام توجہ نہیں رہیں، وہ کون سی وجوہات ہیں جن

کی وجہ سے دینی مدارس کوقومی پسماندگی اورنکبت کی نشانی اورعلامت قراردیا جارہاہے؟

علماءاورحساس دانشوران کے مطابق آج کے حالات میں دینی مدارس کے عصری کردار میں کمی آئی ہےاس بحث میں جانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پہلے عصری کردار کے معنیٰ متعین کر لئے جائیں کہ آخرعصری کردار کیا ہے؟اس کا مفہوم کیا ہے؟اس کے انطباق کی شکل کیا ہے؟

دراصل عصری کردار کا مطلب، زمانے کے چال چلن،اس کی نزاکتوں،اس کے تقابل سلیقہ اوراس کے مثبت احوال سے مطابقت کرتے ہوئے منفی عناصر کوبخوبی ناکارد ینے سے عبارت ہےاوراسی درک وآگاہی اوراس کے ساتھ ساتھ مناسب پیش قدمی ہے،ہم ایک کردار میں ڈھلتے ہیں جسے Play Roal کہا جاتا ہے۔

اب اس تناظر میں دیکھا جائے توسب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جن احوال میں دینی مدارس کا باضابطہ اوروسیع پیمانے پر قیام عمل میں آرہا تھا وہ زمانہ مسلمانوں کی فکری،سیاسی،معاشی،حکومتی اورثقافتی غلامی کا دورتھا،اس زمانہ میں اہل مدارس نے زمانہ کی چلتی رفتار،نبض کو بھانپ لیا اور مستقبل میں اسلام کی بقاء پر لگنے والے سوالات کو پڑھ لیا، تب جا کرانہوں نے مکاتب کی شکل کے محفوظ قلعوں کی تعمیر شروع کردی اوراس تشکیل کواس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ ہزاروں عوائق کے باوجود وہ گامزن برسفر رہے۔

یہ ان کا عصری کردار تھا، جوروشن ولائق تقلید کردار تھا،مگر موجودہ تناظر میں دینی مدارس کےعصری کردار پر جب بھی گفتگو کی جاتی ہے توچند سیاہ پہلوسب سے پہلے سامنے آتے ہیں،انہی صورتوں میں چند اچھے نقوش بھی نظر آتے ہیں جن کی رنگت حد درجہ سیاہی کی بناء پر پھیکی اور مدھم نظر آتی ہے۔ یہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے فقط اس لئے قبول نہیں کیا جاتا ہے کہ اس میں بہت مقدار میں تلخی ہے۔

آج ہمارے مدارس ہر شعبۂ حیات میں صرف دنیا سے ہی پیچھے نہیں چل رہے ہیں بلکہ اپنے اصل ہدف ومنشور سے بھی برگشتہ نظر آرہے ہیں،ان کی تعلیم،تربیت،زندگی، طریقہ، ذہن سازی، بہترین صلاحیتوں کی تلاش اور پھراس کی تخلیق، نظام معاشرت، بودوباش،رہن سہن الغرض اس کا ہرگوشہ عصری رفتار کا ساتھ دینے سے معذور ہے، یہ نہج فقط اس لئے سامنے آیا کیونکہ گزشتہ کئی برسوں سے دینی مدارس کے رجحانات میں زمانی ہم آہنگی کے بہترین مناظر یا مساعی دیکھنے کو نہیں ملتے ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ ان اداروں میں کیا پڑھایا جارہا ہے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اب دینی مدارس نے اپنی بنیاد اوراپنی روح کی طرح اپنے وجود کو بھی قدیم اورکہنہ بنانے کی جسارت شروع کردی ہے اور یقیناً یہ ان لوگوں کی فاش غلطی ہے، بہت سارے علیحدہ اجزاء کو فقط اس لئے ملا دیا گیا اوراسے ایک دوسرے میں حل کردیا گیا تاکہ کسی بھی دشواری ودقت میں یہ نشاندہی اس پر بھاری نہ پڑ سکے، دوسرے لفظوں میں یہ سوال قائم کرکے اس کی مزید وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے اندرونی نظام تعلیم، بلکہ طریقۂ نظام وطریقۂ تعلیم پر کسی بھی طرح کی جائز نشاندہی کواسلام کے خلاف اورقرآن کریم کے خلاف تنقید کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ سوچ واضح طور پر یہ انکشاف کررہی ہے کہ اب دینی مدارس نے قرآن واسلام کواپنی خامیوں کو چھپانے کے لئے ڈھال بنانا شروع کردیا ہے جوایک افسوسناک امر ہے۔

ہم مدارس سے جس طرح کے کردار کا مطالبہ کررہے ہیں،اس کی فراہمی سے وہ یکسر قاصر ہیں، بلکہ اس قصور کی تاویل بھی کررہے ہیں اس پر مستزاد اس مطالبہ کوسراسر غیراسلامی بھی قرار دیا جارہا ہے جوایک طرح سے ذمہ داری سے فراراوراس سے دستبرداری کی ایک شکل ہے۔

آج کل عصری ضروریات کو نئے تخیل کا نام دیا جا رہا ہے اور یہ نام وہی لوگ دے رہے ہیں جو اپنے ملی وقومی فرائض سے فرار کے خواہاں ہیں۔ دراصل بنیادی روح میں نیا شاکلہ، پرانے الفاظ نیا آہنگ اور کہنہ مطراب میں نئی موسیقی یہ جہاں وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہیں خود روح، الفاظ اور مطراب کی شناخت بھی، دینی مدارس کو احساس ضرورت ہے مگر اس ضرورت کی تکمیل کا فراق نہیں، حالانکہ فی الوقت یہی تڑپ اور لگن مطلوب ہے۔

ایک اور بات جو باور کرانے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ فی زمانہ دینی ضرورتیں مسلمانوں کی ہیں، ان ضرورتوں کی تکمیل کا دعویٰ بھی محض ایک دعویٰ ہے، سوال یہ ہے کہ ائمہ کی فراہمی، مؤذنین کی دستیابی، مکتب میں بیٹھ کر رُوح الٰہ دین کو زندہ کرنے والے علماء اور بے لگام تقریریں کرنے والے، زبانی جمع خرچ کرنے والوں کی پیداواری سے کیا وہ تمام دینی ضروریات مکمل ہوجاتی ہیں؟ دنیا میں رہنے والے تعلیم یافتہ طبقہ کے دینی مسائل حل ہوجاتے ہیں؟ کمپنیوں میں کام کرنے والے افراد کی شرعی مشکلات حل ہو جاتی ہیں؟ اس سوال کا جواب جہاں بہت مشکل ہے وہیں بہت آسان بھی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جو لوگ دینی ضروریات کے حل کے لئے فتاویٰ کو حرف آخر سمجھتے ہیں ان کا جواب اثبات میں ہوگا جو یقیناً آسان بھی ہے اور ایک طبقہ کو خوش بھی کرنے والا، مگر جن لوگوں کا نظریہ اس تناظر میں وسیع اور وسعت پسند ہے وہ اس کے جواب دینے میں بڑی مشکل میں نظر آتے ہیں۔

درحقیقت جب سے مدرسوں نے زندہ حقیقتوں سے دامن بچانے کا کھیل شروع کیا ہے اور اسی میں مگن رہنے کی عادت ڈالی ہے تب سے اس طرح کی صورتحال پیدا ہوئی ہے اور تب سے ہی اس نے اپنے عصری کردار کا گلا بھی گھونٹنا شروع کیا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ جب عصری ضروریات کی تکمیل اور اس کا احساس ہی نہیں ہوگا تو عصری کردار کہاں سے جنم لیں گے؟ سچ یہ ہے کہ اب ہمارے دینی مدارس کو اپنے افکار اور کردار میں جلا پیدا

کرنے کی ضرورت ہے، اس میں وسعت، فراخ دلی اور ہمت پیدا کرنے اور احتیاط کے نام پر پیش ہونے والی دشواریوں کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، تب ہی جا کر دینی مدارس عصری میزانیہ میں باوزن ہو پائیں گے، ان کی روح کی نجابت کے ساتھ ساتھ ان کا کارنامہ بھی مشہور ہوگا اور وہ محض دینی اشتہار نہ بن کر قومی شاہ کار بنیں گے۔

دینی مدارس کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل:

مدارس اسلامیہ کو مستقبل میں بھی بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ دنیا ایک نئے دور سے گزر رہی ہے اور شاید یہ نیا دور بہت جلد ہی دنیا میں اپنا تسلط وغلبہ حاصل کر لے۔ یہ دنیا مادیت پرست ہوتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے دنیا کی بنیاد ہی مادیت پر ہوجائے، ایسی صورت میں لوگ خدا کی وحدانیت، رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر اور دیگر ہفوات کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے کی جستجو میں سرگرداں ہوجائیں تو ان سب کا تدارک اور مقابلہ ظاہر ہے مدارس کو ہی کرنا ہے، اس لئے اب مدارس کو اس کے لئے ایسے رجال کار پیدا کرنے ہوں گے جو روشن ماضی کی طرح مستقبل میں بھی آنے والے چیلنجوں کا بے خوف و خطر مقابلہ کریں، لیکن مدارس کی موجودہ شکل اس خیال وخوش فہمی کی اجازت نہیں دیتی۔

مذکورہ بالا مسائل وچیلنجز کا کیا حل نکالا جائے، اس قضیہ کے پیش نظر فکر ولی اللّٰہی کے خدام نے انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت سی کوششیں کی ہیں ان کی مساعیٔ جمیلہ کے اچھے ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں، اس تعلق سے متعدد سمینار اور کنونشن ہو چکے ہیں جن میں مفید تجاویز پاس ہوئی ہیں لیکن عملی کارواں میں ویسا جوش وخروش نہیں جس کے ساتھ اجتماعات کا انتظام کیا جاتا ہے اس لئے اس قسم کی آوازیں صدا بصحرا ہو کر رہ گئیں۔

یہاں یہ بات بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ مدرسہ کے چار اجزاء ترکیبی کو نظر انداز کر کے کوئی بھی مہم اس سمت میں کارگر اور بارآور ثابت نہیں ہوگی۔

استاذ، طالب علم، نصاب تعلیم، تربیت، جب تک ان چاروں پر گرفت نہیں ہوگی کوئی بھی اقدام و پیش قدمی بے سود ہے۔ مدارس میں تبدیلی و اصلاح کا عزم لے کر اٹھنے والے جب بھی اٹھتے ہیں تو صرف نصاب تعلیم کے اردگرد ہی وہ گھومتے رہتے ہیں، بلکہ ہر عبقری شخصیت کی تعمیر و شخصیت سازی میں اچھے اساتذہ اور ان کی تربیت کا اثر واضح اور نمایاں ہوتا ہے، عصر حاضر میں اس کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔ ناچیز کی اس بات کو اس وجہ سے بھی تقویت حاصل ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں ملک کے بڑے بڑے اداروں اور ملی تنظیموں نے اس سمت میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کئی بڑے سیمینار، ورکشاپ اور مباحثے اس حوالے سے ہو چکے ہیں۔

مدارس کے نصاب میں کلی نہیں بلکہ جزوی تبدیلیاں وقت و حالات کا تقاضا ہیں اس سے انحراف کی گنجائش نہیں ہے، نصاب تعلیم بناتے وقت جدید تعلیمی نظریہ سے استفادہ کیا جائے۔ عربی کے ساتھ دیگر زبان و ادب سیکھنے کے عام اور مفید طریقوں کو اپنایا جائے، تمام مدارس میں انگریزی کو بحیثیت زبان و ادب، سماجیات و اقتصادیات اور سائنس کے مبادیات کو بطور تعارف ضرور داخل نصاب کیا جائے اسی طرح ترقی کے وہ تمام وسائل اور ذرائع اختیار کئے جائیں جو ہمارے لئے کارآمد ہوں، ان سے آنکھیں پھیرے رکھنا عصر حاضر کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید مدارس دینیہ قائم کئے جائیں جو قدیم مدارس و جدید عصری درسگاہوں سے ہم آہنگ ہوں اور دونوں کا سنگم ثابت ہوں۔ ان میں ضروری علوم دینیہ، قدیم نصابی کتابوں کے منتخبات یا نئی مجوزہ کتابوں کے ذریعہ تعلیم دی جائے اور قدیم منطق و فلسفہ کا وہ بیشتر حصہ جو گزرے زمانہ کے ساتھ گزر گیا، ان کی جگہ زمانے کی ضرورت کے مدنظر جبکہ جدید علوم کا بھرپور ذخیرہ شامل کیا جائے یہ نئے

مدارس ان دونوں کا بآسانی احاطہ کرلیں گے۔ چونکہ مدارس کے پاس عصری درسگاہوں کے مقابلے تعلیمی اوقات کا دوگنا ذخیرہ ہوتا ہے، ایسے مدارس کا اگر قیام عمل میں آجاتا ہے تو یہاں سے ہماری نسل ابھرے گی، وہ اسلامی تعلیمات پر بھی دسترس رکھے گی اور جدید علوم عصریہ پر بھی اس کی گرفت مضبوط ہوگی اور پھر ہماری وہ کمی بھی پوری ہوسکے گی جس کا یہ عہد متقاضی ہے۔

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ تمام مدارس اپنے اپنے طور پر مصروف عمل ہیں ان کی اصلاح نہایت ہی ضروری ہے، اگر ہمارے راستے ایک ہوجائیں، تمام کے تمام ایک لڑی میں پرو دیئے جائیں تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ مدارس کو ایک بار پھر اسی عزم اسی حوصلہ کی ضرورت ہے جو اس کا سنہرا ماضی ہے۔ علماء کرام عزم مصمم لے کر اٹھیں اور حالات سے مقابلہ کیلئے سینہ سپر ہوجائیں انشاءاللہ قوم مسلم کی تقدیر بدل جائے گی۔

برخود نظر کشا، زتہی دامنی مرنج
درسینہ نو، ماہ تمامے نہادہ اند

وما علینا الا البلاغ

بیسویں ی کے تی ء گجرات کی بے مثال حدمات

زیر اہتمام لمی رابطہ اسلامی مکتب

بمقام : ہےعلوم القرآن ہی قلعہ بھروچ گجرات

بتاریخ : ۶ تا ۸ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ میں مطابق ۲۲ تا ۲۴ جنوری ۲۰۱۰ء

الحمد للہ رب العلمین، والصلاة والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ و علی من تبعھم باحسان و دعا بدعوتھم الی یوم الدین، أما بعد:

لی وقار ر ،حضرات تی ءکرام، کشا ز ین!

تی ءو محققین کی اس کو آراستہ کر ئیو صغیر قطع لمی رابطہ محلّب اسلامی کے ذمہ محلّوں اور ہےعلوم القرآن ہی قلعہ قلعہ راہ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی احمد لوی حب مدظلہٗ محلّی کی گہرائی سے نئے ک عثما محلّیش کر چلتی۔ قطع اس موقع غیر محلّب اسلامی کے اس مؤقر کارواں کے محرک اعلیٰ مفکر اسلام حضرت مولانا سید الحسن علی تقا ندویؒ کا ذکر

کئے بغیر مسلمارہ سکتا، جنہوں ئیو نہ صرف اس رم کو کیا، بلکہ لمی سطح غیر راس کی حدمات کو متعارف کرا ئیو اور اس کی پیش ر کو رفتار بخشنے قطع امحلّلّہ کیا غاشی کی عثما مات کہ حضرت مولاناؒ کے اس مشن کو لے کر ان کے سچے نشین مد ر اسلام حضرت مولانا سید محمد را تقا ندوی مدظلہ العالی بحسن غلوبہ آگے رھر مطا۔

م ٹھنے !

علم محلّب کی اس عثما ماوقار انجمن قطع ناچیز کو ایک ا موضوع غیر راجیسے کلی و ت پیش کر ئیو کا موقع محلّیا گیا، اس کرم فرمائی کے لئے بھی قطع منتظمین کا علمی ممنون چلتی۔ قلعو موضوع غیر ر قطع ئیو مہ فرئی کی کوشش کی وہ ی ب وقیع اور وسیع ، ما ی کوشش کہ کم از کم اس صغیر تقلی طور صغیر ر روشنی ڈالی محلّہ ئے ما کہ اصحاب علم و اور محققین اسے اٹھتے تحقیق کا موضوع بنائیں اور کھیل مکمل اس کے مکمل ماروں سے تی ءو عوام کو بھی بقر مدہ صل چلتی سکے۔

حضرات تی ءکرام!

سندھ کا صحر چلتی ما مالا عثمار کا ، ی ما ممبئی سے کرا ک بحر ب کی پٹی، ہر جگہ فیضان نبوت سے بہرہ ور ان مکمل ما ک طینت افرلّی کے نقش مکمل ما محلّہ مطا جنہوں ئیو اسلام کی شمع روشن کر ئیو کے لئے یہاں اول اول اٹھتے چو لنگر بلا از کی مفید۔ ص طور صغیر ر ریاست گجرات اور مہاراشٹر کا حلی علاقہ نئے ک و ماریخ ز جہاں قدسی صفات ا نساں ئیو کلمۂ بلند کیا اور ایمان و ایقان محلّلّہ ب جلائے۔ آج س جہاں بیٹھے چلتی ئے مطا اس سے کہا چند کے صلے مغلّیہ مائے نرمدا کا وہ قلعو کے کنارے بندگانِ حدا کی غیر یمت جما ع ئیو مقلّی ی قطع ائے بلند کی مفید۔ چنانچہ اصحاب علم و ئیو ابتد محلّین و شریعت کی حدمت یہاں کی مفید اسی صغیر تو ہمیں ر پ

کے چپے چپے میں نظر آتا ہے۔ بلاشبہ ریاست گجرات کا یہ علاقہ کئی معنوں میں مبارک وفیض رساں ہے۔ دین وشریعت کے پاسبانوں نے گجرات کے مختلف حصوں میں جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی پھیلی اور پھیلتی چلی گئی۔

محترم سامعین!

یہ سچ ہے کہ علوم اسلامی کی خدمت مختلف عہد میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں ہوتی رہی ہے اور ایک طویل عرصہ تک علاقہ گجرات پر دوسرے علاقے فائق رہے، تاہم فی زمانہ صوبہ گجرات کے علماء ومبلغین ملک وبیرون ملک جس طرح دینی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ قابل رشک ہیں۔ ہم یہاں بیسویں صدی کے ان رجال کار کی علمی ودینی خدمات کا سرسری جائزہ پیش کرنے جارہے ہیں جن کی علمی قدرومنزلت نہایت عظیم الشان اور وقیع ہے۔

گجرات کو علم ومعرفت اور تہذیب وتمدن کے علاوہ کئی اور وجوہات سے بھی امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ تاریخ کے مطالعہ اور مؤرخین کے سفرناموں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی یہ وہ واحد ریاست ہے جہاں اصحاب رسول ﷺ کے مبارک قدم پڑے ہیں۔

ریاست گجرات میں صحابۂ کرامؓ کی آمد اور ان کے نقوش جاوداں کے حوالے سے متعدد مؤرخین نے سیر حاصل بحث کی ہے اور معتبر شواہد وثبوت سے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق صدر اور معروف تاریخ داں پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں:

’’گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ، ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا ہے، روحانی اور مادی

زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں۔ بعض اعتبار سے تو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ میں اسے پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا جس کے سرسبز پہاڑوں پر سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ پڑی تھی، ارض ہند سے عربوں کے تعلق کی ابتدا اسی خطۂ زمین سے ہوئی، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عربوں نے سواحل گجرات پر قدم رکھا، کوئی تعجب نہیں کہ کچھ صحابہؓ یہاں آئے ہوں اور اس سرزمین میں آسودۂ خواب ہوں‘‘

(’’یادایام‘‘ یعنی مختصر تاریخ گجرات ص:۱۱-۱۲)

پروفیسر نظامی کے اس دعویٰ کی صداقت پر اس لئے کامل یقین ہوتا ہے کہ علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ (۱۹۲۳ء-۱۸۶۹ء) نے بھی سرزمین گجرات پر صحابۂ کرامؓ کی آمد کی تصدیق فرمائی ہے:

’’رسول اکرم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے صرف پانچ برس بعد یعنی ۱۵ھ میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بحرین وعمان کی حکومت پر عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کو نامزد فرمایا جن کا شمار اصحاب رسول ﷺ میں تھا۔ انہوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ اپنے بھائی حکم بن ابی العاصؓ کو بحرین کی حکومت پر نامزد کر کے حکم دیا کہ وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں۔ اس کے بعد حضرت حکمؓ نے بذریعہ کشتی اپنی فوج کے ہمراہ گجرات کے ساحل پر قدم رکھا۔ ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے گجرات کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس خدائے یکتا پر ایمان لانے والوں کا، اسی ایک ہستی کو وحدہٗ لاشریک لہٗ جاننے اور اسی کو قادر مطلق اور مُصَرِّف الامور ماننے والوں کا پاک قدم پہلے اسی سرزمین پر پڑا اور اسی سرزمین کے دشت وجبل ہندوستان میں سب سے پہلے اللہ اکبر کے نعروں سے گونجے‘‘

مولانا آگے رقم طراز ہیں: ''اس حملہ میں جن سعادت مندوں کو مرتبۂ شہادت نصیب ہوا ان میں غالباً وہ انفاس قدسیہ بھی تھے جنہوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال آرا دیکھا تھا اور آپ کی پاکیزہ صحبت و روحانی تعلیم سے بھی مستفید ہو چکے تھے۔ ان فدائیان اسلام کی قدسی صورتیں اسی سرزمین کی آغوش میں گنج بے رنج کی طرح مدفون ہوئیں، اگرچہ ہم کو اس کنز مخفی کا پتہ نہیں ہے، مگر یہ یقینی ہے کہ بمبئی اور بھروچ کے گرد و نواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا''۔

(''یاد ایام'' ص:۴۴-۴۵)

اسلامی فتوحات سے قبل بھی ہندوستان کے جس علاقہ سے عرب سب سے زیادہ متعارف تھے وہ ریاست گجرات ہے۔ عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے مصنف مسعودی اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ ''سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے، اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنجگانہ کی مسجدیں اور جامع مسجد ہیں، جو آباد ہیں''۔

(دیکھئے ''سروج الذہب ومعادن الجوہر'' مصنف: مسعودی ۳۴۶ھ - ۹۵۷ء)

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے راجہ نے عرب تاجروں کیلئے جو ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے، مسلمان قاضی مقرر کئے تھے جو ''ہنرمن'' کہلاتے، تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے سے قبل مسلم آبادی اور اس کے ثقافتی ادارے وجود میں آ گئے تھے۔ گجرات کے لئے یہ بات بھی قابل فخر اور باعث مسرت ہے کہ ریاست کے ضلع بھروچ میں ۴۳۰ھ بمطابق ۱۰۳۸ء میں ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا جو 'مدرسہ مولانا اسحاقؒ' کے نام سے معروف ہوا۔ اسی ضلع میں

۴۵۸ھ مطابق ۱۰۶۵ء میں بھروچ کی جامع مسجد تعمیر ہوئی تھی۔

فن حدیث کا پہلا مصنف:

ریاست گجرات کو دوسرا شرف یہ حاصل ہے کہ فن حدیث کا پہلا مصنف بھی اسی سرزمین کی آغوش میں پیوند خاک ہے۔ ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ المہدی باللہ نے عبدالملک بن الشہاب المسمعی کو جہاد کے لئے روانہ کیا تو اس کے ہمراہ ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے، جنہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فن حدیث میں کتاب تصنیف کی تھی۔

''هُوَ أَوَّلُ مَن صَنَّفَ فِي الاسلام'' دیکھئے ''کشف الظنون'' عبدالملک نے عظیم فتح حاصل کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا اس لئے انہوں نے کچھ دنوں مزید قیام کرنا مناسب سمجھا، اسی دوران ہوا میں عفونت پیدا ہوئی اور تقریباً ایک ہزار افراد اس وبا کا شکار ہو گئے، ان شہداء میں ربیع بن صبیحؒ بھی شامل تھے جو یہیں سپرد خاک ہوئے۔ مؤرخین کے بقول یہ دوسرا شرف گجرات کو حاصل ہے کہ ایسا عظیم شخص اس کی آغوش میں خوابیدہ ہے جو فن حدیث کا پہلا مصنف ہے اور صاحب 'کشف الظنون' کی رائے میں مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے کتاب تصنیف کی۔ ان کے حلقۂ تلامذہ میں امام سفیان ثوریؒ، امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام وکیع بن جراحؒ، امام علی بن عاصمؒ جیسے ائمۂ دین اور علماء عظام شامل ہیں۔

علاوہ ازیں ہندوستان میں بخاری شریف کی سب سے قدیم شرحیں 'مصابیح الجامع فی شرح صحیح البخاری' از بدرالدین محمد بن ابوبکر اور فیض الباری فی شرح صحیح البخاری مصنف سید عبدالاول بن علاء الحسینی گجرات میں ہی لکھی گئی تھیں۔ یہاں علامہ شمس الدین سخاوی، ''علامہ ابن حجر مکی'' وغیرہ کے تلامذہ کافی تعداد میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انہوں

نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں اپنی پوری زندگی بسر کردی تھی۔ یہاں کی درسگاہیں اور خانقاہیں ہندوستان ہی نہیں، بلکہ بیرون ہند سے علم ومعرفت کے شیدائیوں کو کھینچتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گجرات دینی و ثقافتی زندگی کا مرکز ہوگیا تھا اور شاید ہی کوئی دینی یا علمی شعبہ ایسا ہو جس کے متبحّر علماء یہاں موجود نہ تھے۔ بقول علامہ سید عبدالحیؒ حسنی:

''علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا، تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا''۔

یہاں پر یہ امر قابل غور ہے کہ علماء اور مؤرخین کی ایک بڑی تعداد نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو ہندوستان میں علم حدیث کی نشرواشاعت کا پہلا عالم قرار دیا ہے، مگر سچائی یہ ہے کہ حضرت شیخ کی ولادت سے قبل ہی گجرات میں شیخ الاسلام زکریاؒ، شمس الدین سخاویؒ اور علامہ ابن حجر مکیؒ کے تلامذہ کی درسگاہیں آباد تھیں اور تشنگان حدیث ان سے سیراب ہورہے تھے۔

گجرات میں مشاہیر علماء متقدمین نے علم ومعرفت کی جو قندیلیں روشن کی تھیں ان کی لَو آج بھی باقی ہے۔ ہر زمانے میں اس سرزمین پر علماء کی ایک جماعت ایسی رہی ہے جس نے اپنے اکابر علماء ومشائخ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علوم وفنون کی حتی المقدور آبیاری کی۔ ان کے نقوش وباقیات کی نہ صرف حفاظت کی، بلکہ ان گراں قدر خدمات کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی اپنی دینی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ آئندہ سطور میں ہم نے انہی علماء کی خدمات وکارنامے کو اپنے مقالہ میں شامل کیا ہے جن کی خدمات یقیناً ناقابل فراموش ہیں، جبکہ ہم ان کی علمی خدمات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیسویں صدی کے کثیر التصانیف اور ماہر فن علماء گجرات کی زندگی کے حالات

اور ان کے کارناموں کو یکجا کیا جائے۔

اس سے قبل کہ ہم بیسویں صدی کے چند ممتاز علماء کرام کی علمی خدمات پر روشنی ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین پر پہلے قدم رکھنے والی جلیل القدر شخصیات کا سرسری طور پر ذکر کردیں۔ گجرات کے جن صاحب تصانیف علماء کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے ان میں شیخ احمد کھتو، شیخ علی مہائمی، مفتی رکن الدین، مولانا راجح بن داؤد قاضی جگن، مولانا علاء الدین، شیخ حسن محمد، مولانا محمد طاہر پٹنی، مفتی قطب الدین، علامہ وجیہ الدین علوی، قاضی علاء الدین، قاضی برہان الدین، مولانا صبغۃ اللہ، شیخ عبدالقادر، محمد بن عمر آصفی، مولانا احمد کردی، مولانا محمد زید، سید محمد رضوی، شیخ جمال الدین، مولانا نورالدین، مولانا خیرالدین اور مولانا ولی اللہ شامل ہیں۔ ان علماء کرام میں بھی جن کو اپنی علمی خدمات کے سبب زیادہ شہرت حاصل ہوئی ان میں شیخ علی مہائمی، علامہ محمد طاہر پٹنی اور علامہ وجیہ الدین علوی قابل ذکر ہیں۔ اس لئے علماء کے ان تینوں طبقے کی خدمات کو قدرے تفصیل سے پیش کرنا ضروری ہے۔

(۱) شیخ علی مہائمی:

شیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی گجرات کے سرمایہ ناز ہیں۔ ''یادایام'' کے مصنف حضرت مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی نے شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ ''ان کا وجود کہیں اور ہوا ہوتا تو ان کی سیرت پر کتنی کتابیں لکھی جاچکی ہوتیں اور فخریہ لہجہ میں مؤرخین ان کی داستانوں کو دہراتے''۔ شیخ مہائمی کے مفصل حالات نہیں معلوم ہوسکے البتہ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

''**تبصرۃ الرحمٰن و تیسرُ المنان**'' یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ قرآن پاک کی تمام آیات کریمہ کے

باہم مربوط ہونے کو ایسے دل نشیں طریقہ سے بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر انسانی ذہنوں کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ان کی دوسری کتاب "اِنعام الْمَلِکِ الْعَلام" ہے۔علاوہ ازیں۔**استجلاءُ البصر فی الرد علیٰ استقصاء النظر لابن مطهر الحلی، النور الاظهر فی کشف القضاء والقدر اور اس کی شرح الضُوءُ الازهر فی شرح النور الاظهر، اجلةُ التائید فی شرح ادلة التوحید** وغیرہ ہیں۔شیخ کی وفات ۸۳۵ھ میں ہوئی۔مہائم میں ان کی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے۔

(۲) علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی:

علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی ایسے بلند پایہ محدث تھے جن کے فضل وکمال کی شہرت دنیا بھر میں ہے اور ان کی تصنیفات سے علماء حجاز ویمن اسی طرح مستفید ہوتے ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے علماء۔علامہ نے ملامہۃ، شیخ ناگوری، مولانا یداللہ اور مولانا برہان الدین سے علم حاصل کرنے کے بعد مکہ معظمہ جا کر شیخ ابوالحسن بکری، علامہ ابن حجر مکی، شیخ علی بن العراق، شیخ جاء اللہ بن فہد ودیگر محدثین کرام سے حدیث پڑھی اور عرصہ تک شیخ علی متقیؒ کی صحبت میں رہے۔وہاں سے آنے کے بعد تصنیف وتدریس کے کام میں مصروف ہوگئے۔علامہ کی لغت حدیث پر مشہور ومعروف تصنیف "مجمعُ بحارِالانوار" ہے اس کتاب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب تصنیف کے وقت سے ہی اہل علم میں مقبول ہے اور سب کو اس پر اتفاق ہے۔بقول نواب صدیق حسن خانؒ "شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بڑا احسان کیا ہے"۔

ان کی دیگر تصانیف میں "المغنی فی اسماء الرجال" اور "تذکرۃ الموضوعات" کافی اہمیت کی حامل ہیں۔علامہ محمد بن طاہر کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں انہوں نے عرب وعجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، مگر جب تک اس خاندان میں علم رہا کتابیں محفوظ

رہیں پھر آہستہ آہستہ ضائع ہوگئیں۔

علامہ آخر وقت تک تصنیف وتدریس کے کام میں مشغول رہے۔نہروالہ پٹن میں ایک مدرسہ میں آپ نے ایک عرصہ تک صدر مدرس جیسی اہم ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا۔آپ کی وجہ سے یہ مدرسہ حدیث کی تعلیم کیلئے کافی مشہور ہوگیا۔علامہ طاہر اکبر اعظم کے ہم عصر ہیں، اس زمانے میں آپ فن حدیث کے امام سمجھے جاتے تھے۔۹۸۶ھ میں آپ شہید ہوئے، اس کے بعد بھی مدرسہ محمد بن طاہر ایک عرصہ تک چلتا رہا، عہد عالمگیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا تو یہ اسی میں ضم ہوگیا۔آپ کی زندگی کے مفصل حالات جاننے کیلئے تذکرہ محمد بن طاہر پٹنی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) علامہ وجیہ الدین علویؒ:

علامہ وجیہ الدین نصر اللہ علوی گجرات کے ان برگزیدہ علماء میں ہیں جن کے احسان سے اہل ہند کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے، یہ علامہ عماد الدین محمد طارمی کے شاگرد تھے۔تقریباً بیس برس کی عمر سے ہی انہوں نے تدریسی خدمت انجام دینا شروع کر دیا تھا اور عمر کے آخری ایام تک احمد آباد میں فن معقولات ومنقولات کا درس دیتے رہے۔شرح جامی سے لے کر تفسیر بیضاوی تک ۲۳ رکتابوں کے حواشی وشروح لکھے۔اس فن میں ان کی امتیازی شان تھی، زندگی میں ہی احمد آباد سے لاہور تک ان کے شاگرد علمی ودینی خدمات میں مصروف ہوگئے تھے اور استاذ الاساتذہ کا منصب جلیل حاصل ہوگیا تھا۔

۹۹۸ھ میں رحلت فرمائی اور احمد آباد میں مدفون ہوئے، آپ کی قبر بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

بیسویں صدی کے علماء گجرات کے کارنامے:

جس سرزمین کی مٹی میں ایسے ایسے جید اور متبحر علماء مدفون ہوں وہ سرزمین بھلا

کیسے علم ومعرفت سے بے بہرہ اور خالی رہ سکتی ہے؟ انہی اکابر کے فیوض وبرکات کی وجہ سے صوبہ گجرات آج بھی پوری دنیا میں متعارف ہے۔ گجراتی علماء کے بے بہا وبیش قیمت علمی کارناموں سے دنیا آج بھی مستفید ہورہی ہے۔ یہاں کے مکاتب، مدارس، مساجد اور دیگر تعلیمی اداروں کی ملک وبیرون میں نہ صرف ستائش ہوتی ہے، بلکہ وہ قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ عصر حاضر میں بھی گجرات کے مدارس اور علماء کی جوشان وشوکت ہے اسے دیکھ کر اسلام دشمن عناصر بھی دادوتحسین دینے پر مجبور ہیں۔ ایسے میں اپنے اکابر کے علمی خزانوں کی حفاظت کرنے والے بیسویں صدی کے علماء گجرات کی خدمات و کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ علمی ودعوتی مہمات کو سر کرنے والی چند نمایاں شخصیات کے اعتراف میں اپنے تأثرات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مسلسل اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اس راہ پر گامزن ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سی شخصیات گجرات کو خیر باد کہہ چکی ہیں اور دوسرے ممالک میں قیام پذیر ہیں مگر وہاں بھی وہ حضرات دعوت و تبلیغ اور پڑھنے پڑھانے کے ساتھ ساتھ تصنیفی کام بھی انجام دے رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے قابل ذکر علماء میں فخر گجرات مولانا محمد بن موسیٰ سورتیؒ، مولانا احمد بزرگ سورتیؒ، مولانا احمد اللہ صاحبؒ، مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ، حضرت صوفی عابد میاںؒ، مولانا محمد بن یوسف لاجپوریؒ، مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی مدظلہ العالی، مفتی احمد دیولا صاحب، مفتی عبداللہ پٹیل مظاہری صاحب ہانسوٹ، قاری عبدالحمید صاحب پانولی، مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی، مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری، مفتی احمد صاحب خانپوری، مفتی عباس داؤد بسم اللہ صاحب ڈابھیل، مولانا قاری عبدالرشید صاحب اجمیری راندیر، مولانا شبیر احمد قاسمی صاحب راندیر، مولانا غلام محمد وستانوی صاحب اکل کوا، مولانا اسماعیل صاحب منوبری کنتھاریہ، مولانا محمد ابراہیم مظاہری صاحب کھروڈ، قاری اسماعیل بسم اللہ

صاحب کفلیتہ اور مولانا عبداللہ میاں صاحب سملک شامل ہیں۔ ذیل کے سطور میں ان علماء کرام کی حیات وخدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) صاحب انوار العارفین حضرت مولانا صوفی عابد میاںؒ:

حضرت مولانا صوفی عابد میاں کی ولادت ضلع نوساری کے ایک معروف علمی قصبہ ڈابھیل میں ۱۳۰۵ھ میں ہوئی۔ جدامجد نے عابد میاں نام تجویز فرماتے ہوئے یہ بشارت دی کہ ”یہ بچہ مستقبل میں اپنے آباء واجداد کے نام کو روشن کرے گا“۔ اس خاندان میں بے شمار عابد وزاہد اور اولیاء عظام پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت صوفی صاحب نے ابتدائی تعلیم ڈابھیل میں حاصل کی۔ بچپن سے نہایت درجہ کے ذہین وفہیم تھے۔ علوم حدیث آپ نے کانپور میں محدث کبیر مولانا انعام اللہؒ سے حاصل کئے اس کے بعد دہلی آگئے اور مدرسہ امینیہ دہلی میں مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فن فقہ میں دسترس حاصل کی۔ پھر آپ تزکیۂ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے قلب میں عشق الٰہی کی لَو روشن کرنے کے لئے اس دور کی مشہور ومعروف تزکیہ گاہ خانقاہ جان جاناں میں حاضر ہوکر سراج السالکین امام الصالحین حضرت ابوالخیر مجددی نقشبندیؒ سے سلوک وطریقت کے آداب سیکھے۔ حضرت شیخ نے کامل توجہ اور سخت نگرانی میں اوراد ووظائف، ذکر واذکار اور روحانی فیض سے سرفراز فرماتے ہوئے خرقۂ خلافت سے مالامال فرمایا۔ علوم ظاہری وباطنی سے فیضیاب ہوکر وطن ڈابھیل حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ ڈابھیل میں قیام فرما کر جنوبی افریقہ تشریف لے گئے۔ یہاں لوگوں کو روحانی فیض پہنچانے کے ساتھ چھوٹی بڑی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ علماء نے ان کی کتابوں کو بنظر استحسان دیکھا اور اپنی قیمتی تقریظات سے نوازا۔

حضرت صوفی عابد میاں کی وفات یکم نومبر ۱۹۴۵ء میں جنوبی افریقہ کے شہر ”لیڈی

اسمتھ‘‘ میں ہوئی اور اسی شہر کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جنوبی افریقہ میں آپ نے جو علمی و دینی خدمات انجام دیں وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی چھوٹی بڑی تقریباً انیس (۱۹) کتابیں شائع ہو چکی ہے۔ بستان العارفین، بستان فاطمہ، و بستان عائشہ، رحمۃ للعالمین، صراط مستقیم، معراج المومنین، خلیل الرحمٰن، فضائل رمضان و شب قدر، نورالانوار، توشۂ آخرت اور انوارالعارفین آپ کی یادگار علمی کاوشیں ہیں۔ حضرت صوفی صاحبؒ کی متعدد کتابیں نایاب ہو چکی تھیں، مگر یہ خوش آئند بات ہے کہ ان کی کتابیں حضرت مولانا قاری اسماعیل بسم اللہ صاحب بانی و مہتمم جامعۃ القرأت کفلیۃ گجرات کی کاوشوں سے ازسرنو شائع ہو رہی ہیں جس کے لئے مولانا قاری اسماعیل بسم اللہ صاحب یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔

تاہم حضرت صوفی صاحبؒ کے علمی کارناموں کے علاوہ ان کی روحانی خدمات پر باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ابھی باقی ہے تاکہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

(۲) صاحب مواعظ اصلاحیہ حضرت مولانا علامہ احمد اللہ صاحبؒ:

مولانا احمد اللہؒ ۱۹۱۴ء میں گجرات کے ضلع سورت میں پیدا ہوئے، آپ کے والد الحاج شیخ اسماعیل خوش الحان اور معروف مؤذن تھے چنانچہ کئی سالوں تک افریقہ میں یہ خدمت انجام دی۔ جب آپ افریقہ سے حج بیت اللہ کیلئے گئے تو وہاں بھی اجازت حاصل کر کے اذان دی جس کو سن کر مکہ کے شیوخ نے ’’شیخ المؤذنین‘‘ کا خطاب عطا فرمایا۔

مولانا احمد اللہؒ راندیر کے مکتب اور گجراتی اسکول میں چوتھی کلاس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم میں مشغول ہوگئے۔ دینی ذوق غالب ہونے کے سبب والد محترم نے آپ کو ۱۹۲۶ء میں جامعہ حسینیہ راندیر میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کیا۔ اس وقت جامعہ حسینیہ کی مسند اہتمام پر مولانا محمد حسین صاحبؒ فائز تھے۔ یہاں سے آپ

۱۹۳۳ء میں فارغ ہوئے۔ جامعہ حسینیہ میں جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا سید شرف الدین آنندوی، مولانا ظہورالحسن ٹونکی، مولانا عبدالرحیم بورسدی، مولانا محمود الحسن صاحب سرحدیؒ اور مولانا احمد نور صاحبؒ شامل ہیں۔ راندیر سے فراغت کے بعد آپ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں بھی اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ دارالعلوم میں اس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مسند حدیث پر فائز تھے، چنانچہ بخاری شریف حضرت شیخ الاسلام سے پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔ اس دوران مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب محدث دیوبندیؒ کی خدمت میں روزانہ بعد نماز عصر حاضر ہوتے اور آپ کے ملفوظات اور مشفقانہ نصائح سے مستفیض ہوتے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا احمد اللہ جامعہ حسینیہ میں درس و تدریس کے کام میں مصروف ہوگئے اور ۱۹۴۷ء میں حضرت الاستاذ مولانا احمد نور صاحب کی جامعہ سے علیحدگی کے بعد شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ یہاں بخاری شریف کے علاوہ صحاح ستہ کی دوسری کتابیں بھی آپ کے ذمہ تھیں۔ ۲؍دسمبر ۱۹۸۳ء میں آپ کی وفات ہوئی، نماز جنازہ حضرت مولانا اسماعیل موٹا صاحبؒ مہتمم جامعہ حسینیہ نے پڑھائی اور جامعہ حسینیہ راندیر کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ مولانا احمد اللہؒ گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ حق گو واعظ، سادہ مزاج، متواضع وخوش طبع مگر باوقار چہرہ پر محبوبیت کے آثار، تکلفات اور حرص و طمع سے کوسوں دور، صبر وشکر کے پیکر، بلند ہمت، دریا دل وفیاض، دین وملت کے خاموش خادم، ذاکر وشاغل، کم سخن، گوشہ نشیں، پابند شرع، متبع سنت، نمونۂ سلف اور غناء قلب کی دولت سے سرشار تھے۔

مولانا نے فراغت کے بعد تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ اصلاحی بیانات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے مواعظ ایسے دور میں شروع ہوئے جب چہار جانب رسم و

رواج، جہالت اور شرک و بدعات عام تھیں اور مخالفین بڑی تعداد میں موجود تھے، مگر آپ کے بیانات کی وجہ سے علماء حق کے لئے میدان ہموار ہوتا چلا گیا۔ ان کا سلسلۂ وعظ کم وبیش پچاس برسوں پر محیط ہے۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، ادیب شہیر حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عبقری شخصیات نے آپ کے بیانات اور وعظ کی ستائش کی ہے۔ مولانا کے مواعظ کو گجرات کے ہی ایک عالم مولانا محمد یونس سورتی نے مرتب کیا ہے جو ''مواعظ اصلاحیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور خاص وعام میں بے حد مقبول ہے۔

(۳) مولانا احمد بزرگ سورتیؒ:

حضرت مولانا احمد بزرگؒ کی ولادت ۱۲۹۸ھ یا ۱۲۹۹ھ میں گجرات کے گاؤں سملک (سورت) میں ہوئی۔ تاریخی نام احمد تھا، اپنی نیک فطرت کی وجہ سے بچپن سے ہی بزرگ لقب سے مشہور ہوگئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ عربی فارسی کی تعلیم کیلئے لاجپور تشریف لے گئے اور یہیں چار سال رہ کر مشکوٰۃ المصابیح اور ہدایہ اولین تک کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۱۸ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور چار سالوں تک مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اور ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ ان کے مشہور اساتذہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت مولانا حافظ احمد صاحب رحمہم اللہ جیسے نامور علماء شامل ہیں۔ فراغت کے بعد انہوں نے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں اپنے گاؤں واپس آگئے۔ کچھ مدت کے بعد جنوبی افریقہ چلے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں جامع مسجد سورتی رنگون (برما) میں مفتی مقرر ہوئے اور تین سالوں تک وہاں افتاء کے ساتھ وعظ اور درس قرآن کا فیض پہنچایا،

پھر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل کے مہتمم بنائے گئے اور مدرسہ تعلیم الدین کو اپنی کاوشوں اور جہد مسلسل سے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں تبدیل کر دیا۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دوسرے جلیل القدر علماء کو ڈابھیل میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے آمادہ کرنے کا کارنامہ انہوں نے ہی انجام دیا تھا۔ مولانا احمد بزرگ اگرچہ سیدھے سادے بزرگ تھے، مگر ان میں انتظامی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں، ان ہی کے دور اہتمام میں برصغیر کے مختلف مقامات کے علاوہ افغانستان، بخارا، افریقہ، یورپ، فرانس، یمن اور حجاز تک کے طلبہ ڈابھیل میں علمی سیرابی کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ ۱۳۶۹ھ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک مجمع عام میں خلافت سے نوازا۔

آپ کی وفات ۵؍ربیع الاول ۱۳۷۱ھ کو ۷۲؍سال کی عمر میں ہوئی اور سملک کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(۴) مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ:

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ دسمبر ۱۹۰۳ء میں گجرات کے قصبہ نوساری میں پیدا ہوئے۔ آپ زبردست عالم دین، ممتاز فقیہ اور ریاست گجرات کے مفتیٔ اعظم رہے۔ فتاویٰ رحیمیہ جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہے، مولانا کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے اپنے کمال علمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچیدہ مسائل کو بھی بڑی آسانی سے حل فرما دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فتاویٰ رحیمیہ ہر دور میں علمی حلقوں میں مقبول رہی ہے۔ مفتی صاحب فراغت کے بعد سے ہی جامعہ حسینیہ راندیر میں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ حضرت مولانا محمد حسینؒ کی نگرانی میں فتاویٰ لکھنے کا کام پوری توجہ اور مستعدی سے شروع

کر دیا تھا اور آخر عمر تک اس علمی کام میں مصروف رہے۔آپ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے غائبانہ بیعت کی تھی بعد میں حضرت تھانویؒ سے ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔

مفتی صاحب کا فقہ وفتاویٰ میں اتنا بلند مقام تھا کہ معاصرین میں اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔آپ کی اہم ترین تصنیف ''فتاویٰ رحیمیہ'' کی قدرومنزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے ایک دفعہ مدینہ سے تحریر فرمایا:

''فتاویٰ رحیمیہ سے یہاں مدینہ میں لوگوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے میں بھی وقتاً فوقتاً سنتا رہتا ہوں۔حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری کے فتاویٰ بہت مکمل و مدلل ہوتے ہیں اور بہت سے جدید حالات اور نئے مسائل پر مشتمل ہیں۔سیر حاصل اور مدلل بحث ہونے کی وجہ سے ہم سب خادموں کیلئے بھی بے حد مفید ہے''

حضرت مفتی صاحب کی پوری زندگی دینی وعلمی مشاغل میں گزری اور سیکڑوں لوگ فیضیاب ہوئے۔ ایسی نابغۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔حضرت مفتی صاحب نے ۹۸ رسال کی عمر میں ۱۸ ر نومبر ۲۰۰۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۵) مولانا محمد بن موسیٰ سورتی افریقیؒ:

مولانا محمد بن موسیٰ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد ایک عرصہ سے جنوبی افریقہ میں ہی مقیم تھے۔تعلیم و تربیت کیلئے والد محترم نے مولانا کو ہندوستان بھیج دیا۔یہاں آپ نے پالن پور میں مولانا نذیر احمد پالن پوری سے تحصیل علم کی اور ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور

۱۳۴۴ھ میں فراغت حاصل کی۔دارالعلوم میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کا رنگ ان پر ایسا غالب آیا کہ نشست وبرخاست، چال، ڈھال، بات چیت اور تمام طور وطریق سے ہو بہو اپنے استاذ کا نمونہ بن گئے تھے، دولت مند ہونے کے باوجود مزاج اور رہن سہن میں انتہائی سادگی اور تواضع تھی۔امور خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور نہایت فیاضی سے خرچ کرتے تھے، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے۔

فراغت کے بعد آپ جوہانسبرگ چلے گئے اور وہیں دینی خدمات انجام دیں۔اپنے وسیع ترین تجارتی کاروبار کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر دینی خدمات انجام دیتے رہے، اسلامی اور عصری علوم کی تعلیم کے لئے جوہانسبرگ میں واٹرفال اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، اس کی عالیشان عمارت تعمیر کرائی، انسٹی ٹیوٹ کے تمام مصارف خود پورے کرتے تھے۔دارالعلوم دیوبند کے طریقہ کے مطابق مفت تعلیم کے ساتھ طلباء کے لئے طعام وقیام کا نظم بھی تھا، جمعیۃ علماء ٹرانسوال کے تاحیات صدر رہے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تعمیر و ترقی میں ان کے مالی تعاون کا بڑا دخل ہے، علمی کاموں سے بھی ہمیشہ شغف رہا ''مجلس علمی ڈابھیل'' کے نام سے ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا جس میں اہم علمی کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا، اس کے بھی تمام مصارف اپنے ذمہ رکھے، علامہ ظہیر حسن شوق نیمویؔ بہار (متوفی:۱۳۲۲ھ) کی کتاب آثار وسنن پر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری صاحبؒ کے دست خاص سے لکھے ہوئے حواشی کی مائیکروفلم لے کر اس کے نسخے شائع کئے۔اس کے علاوہ اس مجلس سے متعدد علمی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

خاص طور پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تصانیف کے علاوہ امام زیلعیؒ کی نصب الرایہ علیٰ احادیث الہدایہ اور فیض

الباری علیٰ صحیح البخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے ''مُصنف ابن عبدالرزاق'' کو انہی کے صاحبزادوں کی مالی اعانت سے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

مولانا محمد بن موسیٰ سورتی نے ضلع سورت اور اس کے اطراف میں دینی مکاتب کا ایک وسیع نظام انجمن خدام الدین کے عنوان سے جاری کیا۔ یہ مولانا کے ایسے کارنامے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ آپ کی وفات ۲۱/ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۶/اپریل ۱۹۶۳ء میں جوہانسبرگ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(۶) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لاجپوریؒ:

مولانا محمد یوسف لاجپوری گجرات کے صاحب کشف و کرامت بزرگ حضرت شاہ صوفی سلیمان صاحب لاجپوریؒ کے نواسے تھے۔ ان کی ولادت ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں لاجپور میں ہوئی۔ ابتدائی اور فارسی کی کتابیں حضرت عارف باللہ صوفی صاحبؒ سے اور کتب عربی نحو و صرف تا مشکوٰۃ و جلالین حضرت مولانا احمد میاں صاحب لاجپوریؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے تلمیذ رشید امام المحدثین مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی سے حدیث پاک کی تعلیم حاصل کی اور ۱۳۲۳ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ اور حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ لاجپور میں بھی تقریباً چھ سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیں، پھر اپنے نانا جان صوفی صاحب کے قائم کردہ مدرسہ ''صوفی باغ سورت'' میں مسند درس و اہتمام پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہاں آپ سے جن علماء نے فیض حاصل کیا ان میں مولانا علی محمد تراجوی، حضرت مولانا اسماعیل

بسم اللہ صاحبؒ اور مولانا عبدالسلام صاحب صوفی لاجپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مدرسہ صوفی باغ کی انتظامی ذمہ داری اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی رہا، آپ نے نورالایضاح کے ترجمہ کا کام کیا ''سرورالنجاح'' کے نام سے ۱۹۲۴ء میں جب مدرسہ اسلامیہ صوفیہ کے صدر مدرس و مہتمم کے منصب جلیل پر فائز تھے، شروع کیا اور کتاب الصلوٰۃ تک مکمل فرمایا، دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ فرما سکے۔ سرورالنجاح کے علاوہ ''باغ عارف'' کی ترتیب آپ کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ مولانا نے علامہ شوق حسن نیمویؒ (م ۱۳۲۲ھ) کی ''آثارالسنن'' کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب ایک عرصہ تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی تھی۔ اگر یہ مفید اور کارآمد تصنیف نہیں شائع ہوئی ہے تو اہل خیر حضرات کو اس طرف جلد توجہ دینی چاہئے، تاکہ یہ علمی اثاثہ ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکے۔

مولانا شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ بقول مولانا ابراہیم ڈایا لاجپوری ''ہمارے علاقہ میں فارسی کلام میں مولانا کا کوئی ثانی نہیں تھا''

اردو اور فارسی میں آپ کا کلام شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسفؒ نے زندگی کی صرف پچپن بہاریں ہی دیکھیں کہ مرض کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ' کچھ نہ دوا نے کام کیا' وقت موعود آچکا تھا چنانچہ ۱۸/شعبان ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آپ نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

مولانا علی محمد صاحب تراجویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور دین کی یہ امانت خاک کے سپرد کر دی گئی۔

(۷) حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ:

مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ کی ولادت ۳/ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ بروز

پنجشنبہ لاجپور میں ہوئی، اصل نام احمد میاں اور تاریخی نام مرغوب احمد ہے۔ ابتدائی و فارسی کی تعلیم حضرت شاہ صوفی سلیمان صاحب سے حاصل کی، بعدۂ حضرت مولانا احمد میاں صاحبؒ سے فارسی کی تکمیل کے بعد ۱۳۱۵ھ سے عربی کی تعلیم شروع کی اور ۱۳۱۸ھ کے اختتام تک صرف ونحو، فقہ، اصول فقہ، شرح تہذیب اور مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ ۱۳۱۹ھ میں جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا اور ۱۳۲۰ھ میں طاعون پھیلنے کی وجہ سے دہلی چلے گئے۔ رمضان دہلی میں گزارنے کے بعد شوال میں دیوبند پہنچے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کا امتحان لے کر داخلہ فرمایا۔

مفتی مرغوب احمد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے درسی ساتھی تھے۔ ۱۳۲۳ھ میں مدرسہ عبدالرب دہلی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ چند سالوں تک گجرات کے ہی مدرسہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا ابراہیم صاحب راندیریؒ کے اصرار سے رنگون کا سفر کیا۔ وہاں مدرسہ تعلیم الدین معلمیہ کی داغ بیل ڈالی، عربی اور فارسی کے مدرس ہونے کے ساتھ ہی دارالافتاء کی جملہ ذمہ داریوں کو آپ نے بحسن وخوبی نبھایا۔ آپ کا علمی ذوق بہت عمدہ تھا، آخر عمر تک کتابوں کے بہت شائق رہے۔ صاحب فراش ہونے کے باوجود ذوق مطالعہ میں کمی نہیں آئی۔ آپ کے تحریر کردہ مضامین حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی، حضرت مولانا صوفی احمد میاں صاحب لاجپوری، حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکی، حضرت مولانا قاری اسمٰعیل راندیری اور حضرت مولانا حافظ غلام محمد صاحب راندیری کے تذکرے ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۷۳ھ تک مسلسل ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوتے رہے۔ فقیہ ومفسر حضرت مخدوم علی مہائمیؒ کا ترجمہ ماہنامہ البلاغ، ممبئی دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ جمع الاربعین فی تعلیم الدین، توحید الاسلام، ارکان اسلام، سفینۃ

النجات فی ذکر مناقب السادات آپ کی یادگار تصنیفات ہیں۔

مولانا نے کئی سال صاحب فراش رہنے کے بعد جون ۱۹۶۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، نماز جنازہ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے پڑھائی۔

(۸) حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت الطافکم:

مترجم ''دیوان الامام الشافعی'' مولانا عبداللہ کاپودروی مقیم ٹورنٹو (کینیڈا) کی علمی لیاقت وصلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ''دیوان الامام الشافعی'' جیسی معرکۃ الآرا کتاب جو ہندوستان کے متعدد مدارس میں شامل نصاب ہے، کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ اس سے قبل نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے اردوداں طبقہ امام شافعیؒ کے اشعار کو سمجھنے سے قاصر تھا اور ان اشعار کی معنویت وافادیت سے پوری طرح مستفید نہیں ہوسکتے تھے۔ مولانا نے اس کمی کو دور کر کے اردوداں کے لئے یہ احسان عظیم کیا ہے۔ اس ترجمہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی ہے کہ شروع میں حضرت مولانا نے امام شافعیؒ کے حالات زندگی کو بھی شامل کتاب فرمایا ہے۔ مولانا عبداللہ کاپودروی ہم عصر گجراتی علماء میں علمی ذوق، تصنیف وتالیف کے مذاق، تاریخ وسیر کے گہرے مطالعہ اور عربی زبان وادب سے بے پایاں شغف کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مولانا عرصہ تک دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر گجرات کے مہتمم رہے، اپنی علمی، تعلیمی، تربیتی اور انتظامی لیاقت کے سبب آپ نے اس مدرسہ کو گجرات ہی نہیں ہندوستان کے بہترین مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مولانا چند سالوں سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور وہاں بھی ان کی علمی و تالیفی سرگرمیاں جاری وساری ہیں۔ مولانا کی تصانیف میں صدائے دل، افکار پریشاں قابل ذکر ہیں۔ خدا دیر تک آپ کو سلامت رکھے تاکہ بے شمار کار خیر آپ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوسکے۔

(۹) حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی مدظلہ العالی:

مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی یکم جون ۱۹۳۱ء کو ضلع بھروچ کے کاوی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسکول میں ہوئی، لیکن طبعی طور پر وہ اسکولی تعلیم سے خوش نہیں تھے چنانچہ انہوں نے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ کا داخلہ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے نام سے قائم مدرسہ امدادیہ میں کرایا گیا اور ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں عربی کی تعلیم کے لئے دارالعلوم اشرفیہ عربیہ اسلامیہ راندیر میں داخل ہوئے اور یہیں درس نظامی کی پوری تعلیم مکمل کی۔ واضح ہو کہ اس زمانہ میں پورے گجرات میں صرف چار بڑے مدارس تھے۔ دو سورت کے متصل راندیر میں جب کہ تیسرا ڈابھیل میں اور چوتھا آنند میں۔ ۱۹۵۳ء میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں فراغت حاصل کی۔ آپ کے مشہور اساتذہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہی، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا فخر الحسن، حضرت مولانا ظہور احمد رحمہم اللہ ہیں۔ آپ کا تعلق گجرات کے ضلع بھروچ سے ہے۔ مولانا اپنی علمی صلاحیت اور محققانہ نظر کی وجہ سے علمی حلقوں میں کافی مقبول ہیں اور آپ کی تحریریں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مولانا تقریباً چالیس سال سے ڈیوزبری برطانیہ میں عصر حاضر کے جدید مسائل پر کام کر رہے ہیں۔ آپ کے متعدد رسائل شائع ہو چکے ہیں۔ مجلس تحقیقات شرعیہ برطانیہ کے بانی و رئیس ہیں۔ علاوہ ازیں برطانیہ اور دوسرے ملکوں کی بے شمار کمیٹیوں اور فقہ اکیڈمیوں کے ممبر ہیں۔ مولانا کی جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں ''برطانیہ و اعلیٰ عروض البلاد پر صبح صادق و شفق کی تحقیق''، برطانیہ میں اوقات نماز کے تازہ مشاہدات پر ایک نظر، اوقات صوم و صلوٰۃ برطانیہ و آئرلینڈ، اسلامی ماہ اور رویت ہلال شریعت اور علم فلک کی روشنی میں 'برکات اعمال' سعودی عرب کی رویت کی شرعی تحقیق اور اسلامی قانون نکاح و طلاق قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر

کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم مراجع فقہ اور عصر حاضر کی جدید کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، کتاب میں نکاح و طلاق، خلع و تفریق بین الزوجین جیسے اہم مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے، اسی طرح نکاح کی فضیلت، طلاق نہ دینے کی اہمیت، خلع کے مطالبہ کی ضرورت اور غیر دارالاسلام میں شرعی قاضی نہ ہونے کی صورت میں عدالت اور کورٹ کچہری سے بچنے اور صلح صفائی کی کوشش کرنے اور علماء کی شرعی کونسل کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ برطانیہ کے حالات کے تناظر میں بہت سے اہم اور فکر انگیز معلومات شامل کتاب ہیں۔ یقیناً مولانا یعقوب قاسمی صاحب ان چند خوش نصیب و باتوفیق علماء دین میں سے ہیں جنہوں نے برطانیہ میں رہ کر بھی اپنی دینی و علمی شخصیت کو مادیت کے سیلاب میں بہنے نہیں دیا اور دین و ایمان کی فکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ برطانیہ سے باہر کی دنیا سے بے خبر ہیں بلکہ دیگر ممالک کی علمی و دینی سرگرمیوں سے بھی واقف اور مربوط ہیں۔ مالک حقیقی ان کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے اور عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ (آمین)

(۹) حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی دامت برکاتہم:

بانی جامعہ علوم القرآن جمبوسر بھروچ گجرات حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی ۱۹؍دسمبر ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیولا میں ہی مولانا یعقوب شیخ اور مولانا ابراہیم دیولوی سے حاصل کی۔ فارسی مولانا یعقوب قاسمی، مشکوٰۃ مولانا احمد بیمات، مسلم شریف اور مولانا اعظم طالع پوری اور بخاری شریف محدث کبیر حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی سے پڑھیں۔ ۱۹۶۹ء میں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل سے فراغت حاصل کی۔

فتاویٰ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ سے اور ''حجۃ البالغہ'' حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد جامعہ تعلیم

الدین ڈابھیل میں تقریباً ۵؍سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۱ء تک تعلیم الاسلام لوناواڑہ میں مشکوٰۃ، جلالین اور ابوداؤد شریف کا درس آپ کے ذمہ تھا۔ ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۰ء تک دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ میں ہدایہ اولین، ابوداؤد شریف، ابن ماجہ، بخاری شریف، مسلم شریف اور مؤطین کا درس دیا۔

۱۹۸۸ء میں جامعہ علوم القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۰۰۱ء سے تا حال جامعہ کے اہتمام کے ساتھ ابوداؤد شریف کا درس دے رہے ہیں۔ مفتی احمد صاحب معاصر علماء میں علمی ودعوتی سرگرمیوں کے سبب نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا تدریسی تجربہ کافی طویل ہے اس لئے جدید فارغین کی ایک بہترین کھیپ آپ کے ہاتھوں تیار ہوئی ہے۔ آپ کی لیاقت، صلاحیت، انتظامی امور میں کامل دسترس کے سبھی معترف ہیں۔ دین داری اور اخلاق کریمانہ کے سبب ہر خاص وعام میں مقبول ہیں۔ سوانحی خاکہ ترتیب دینے میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے، دیوان الامام الشافعی میں امام موصوفؒ کا سوانحی خاکہ اس کا بین ثبوت ہے، انتہائی سلیس اور سادہ مگر دلکش اسلوب میں انہوں نے یہ سوانحی خاکہ لکھا ہے۔

مولانا کی دینی وعلمی خدمات کا سفر ہنوز جاری ہے۔ خدائے پاک آپ کی خدمات کو قبول فرمائے۔

مذکورہ سطور میں گجرات کے چند مشاہیر علماء ومشائخ اور قائدین ملت کے حالات مختصراً بیان کئے گئے ہیں تا کہ نئی نسل کو ان کی دینی، فکری اور علمی قیادت سے روشنی ملتی رہے۔ گجرات کے ان ممتاز علماء میں مختلف النوع خصوصیات وکمالات کے حامل بزرگان دین ہیں، بعض وہ ہیں جن کی پوری دنیا میں شہرت کی دھوم مچی ہوئی ہے، بعض وہ ہیں جنہوں نے گمنامی کی زندگی بسر کی اور دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان معتبر علماء کے افکار ونظریات کو وسیع پیمانے پر عام کیا جائے۔ ان کی گرانقدر تالیفی خدمات جو

غیر مطبوعہ ہیں ان کو شائع کرنے کا معقول انتظام کیا جائے تا کہ ضرورت مند اہل علم مستفید ہوسکیں۔

یہاں ایک امر توجہ طلب یہ ہے کہ علماء گجرات جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے دوسری ریاستوں کے علماء سے بڑی حد تک ممتاز ہیں اور ان کی بعض خدمات تو اس پایہ کی ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ معاصر علماء سے بہت آگے نکل چکے ہیں مگر تحقیق وریسرچ کے طلباء کی ان تک رسائی صرف اس وجہ سے نہیں ہوسکی ہے کہ یہاں کے اہل علم حضرات ان کی نشر واشاعت کا معقول اہتمام نہیں کرسکے، یہی وجہ ہے کہ مقامی لوگ ان کی علمی، دینی وملی خدمات سے واقف ہیں مگر ریاست سے باہر ان سے خال خال لوگ ہی واقف ہوسکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ علماء گجرات کی علمی وادبی خدمات پر ملک کے بڑے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیز میں شاید ہی تحقیقاتی مقالہ لکھا گیا ہو۔ جب کہ بعض علماء کی شخصیات اور خدمات اس قابل ہیں کہ ان پر باضابطہ ریسرچ ہو۔ مجھے امید واثق ہے کہ اس سمینار کے بعد ناچیز کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس طرف توجہ دی جائے گی۔

ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَشَاءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ

حوالہ جات

۱۔ تاریخ دارالعلوم، مولانا سید محبوب رضوی، ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۳ء (طبع دوم) مکتبہ دارالعلوم دیوبند
۲۔ رسائل مرغوب، مولانا مرغوب الرحمٰن لاجپوری، مطبوعہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء جامعۃ القرأت کفلیتہ گجرات
۳۔ انوار العارفین (اول) مولانا صوفی عابد میاں، مطبوعہ ۲۰۰۶ء جامعۃ القرأت کفلیتہ ضلع سورت گجرات
۴۔ یادگار شخصیتیں، مولانا رضوان احمد ندوی، مطبوعہ ۲۰۰۱ء پٹنہ

۵۔ یادایام، مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی، مطبوعہ ۱۹۸۳ء مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ

۶۔ گجرات کی تمدنی تاریخ، مولانا سید ابوظفر ندوی، مطبوعہ ۲۰۰۵ء دارالمصنفین اعظم گڑھ

۷۔ دیوان الامام الشافعی، مولانا عبداللہ کاپودروی، ناشر جامعہ علوم القرآن جمبوسر گجرات

۸۔ افکار پریشاں، مولانا عبداللہ کاپودروی، مطبوعہ ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء مجلس معارف کاپودرا گجرات

۹۔ صدائے دل (اول، دوم)، مولانا عبداللہ کاپودروی، طبع ثالث ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء مجلس معارف کاپودرا گجرات

۱۰۔ صبح صادق وشفق کی تحقیق، مولانا یعقوب قاسمی، مطبوعہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء مجلس تحقیقات شرعیہ برطانیہ دیوزبری

۱۱۔ اسلامی قانون نکاح وطلاق، مولانا یعقوب قاسمی، مطبوعہ ۲۰۰۵ء مجلس تحقیقات شرعیہ برطانیہ دیوزبری

۱۲۔ تاریخ گجرات، شاہ ابوطراب ولی، مطبوعہ ۲۰۰۱ء اردو ساہتیہ اکیڈمی گجرات

۱۳۔ سخن وران گجرات، سید ظہیر الدین مدنی، مطبوعہ ۱۹۶۱ء قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

۱۴۔ گجرات کے مشاہیر علماء، ڈاکٹر محمد زبیر قریشی، مطبوعہ ۱۹۹۶ء اردو ساہتیہ اکیڈمی گجرات

۱۵۔ تذکرۂ اکابر، مولانا نظام الدین قاسمی، مطبوعہ ۱۹۹۴ء جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر

۱۶۔ مواعظ اصلاحیہ، مولانا احمد اللہ، مطبوعہ ۲۰۰۳ء مکتبہ مدنیہ دیوبند

۱۷۔ سرور النجاح، مولانا محمد ابن یوسف، مطبوعہ ۲۰۰۶ء جامعۃ القراءت کفلیتہ ضلع سورت گجرات

۱۸۔ تالیفات مرغوب، مولانا مفتی مرغوب احمد، مطبوعہ ۲۰۰۷ء جامعۃ القراءت کفلیتہ ضلع سورت گجرات

قرآن کریم کی تفہیم - اسلوب اور تقاضے

بمقام	:	KG-4، سی ایم آفس پٹنہ، بہار
بتاریخ	:	۱۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۲۰۱۱ء
بموقع	:	''ملٹی لنگویج ڈکشنری آف ہولی قرآن'' رسم اجرا کی تقریب

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، و الصلاۃ و السلام علٰی سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد و علٰی آلہ و صحبہ و علٰی من تبعھم باحسان و دعا بدعوتھم الٰی یوم الدین، أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ'' وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوٰنِكُمْ إِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ. أما بعد:

میں اپنی بات ان چند مصرعوں سے شروع کرتا ہوں:

سکوں ڈھونڈتا تھا میں بہاروں میں
حسیں وادیوں میں، سرمئی نظاروں میں

میں اس کی تلاش میں جا پہنچا چاند تاروں میں
مگر سکوں مجھ کو ملا قرآں کے تیس پاروں میں

صدر عالی قدر جناب نتیش کمار صاحب وزیر اعلیٰ بہار، ڈائس پہ تشریف فرما مؤقر دانشوران اور معزز سامعین عظام!

مجھے بے حد خوشی اور قلبی مسرت ہے کہ قرآن کریم سے متعلق منعقد ہونے والے اس اہم پروگرام میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس ذرہ نوازی کیلئے پروگرام کے کنوینر جناب علی انور صاحب ایم پی راجیہ سبھا اور جناب ضمیر احمد صاحب مؤلف کتاب ''ملٹی لنگویج ڈکشنری آف ہولی قرآن'' کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے اس پروقار مجلس میں شرکت کی دعوت دی۔

دوستو! عظیم آباد (پٹنہ) بہار کی اس تاریخی سرزمین پر سب سے پہلے میں اپنے ان بزرگوں اور ارباب بصیرت اور فکر وآگہی کے ترجمانوں اور سرزمین بہار کے ان جیالوں کا تذکرہ نہ کروں اور ان کی خدمت میں خراج عقیدت پیش نہ کروں تو بڑی ناسپاسی ہوگی جن کے علم وفکر کی روشنی سے آج بھی ہمارے قلب وجگر منور ہیں اور جنہوں نے بہار ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کو عزت بخش کر پوری دنیا میں متعارف کرایا اور تادم حیات خلق خدا کو علم کی روشنی سے فیضیاب کرتے رہے، بالخصوص مخدوم جہاں شیخ شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیری، شیخ شمس الحق عظیم آبادی، ہندوستان کی تحریک جنگ آزادی کے سرخیل مولانا یحییٰ علی، مولانا ولایت علی عظیم آبادی، شیخ عبدالرؤف داناپوری، رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ ابوالخیر محمد ظہیر احسن شوق نیموی، علامہ سید سلیمان ندوی، ابوالمحاسن محمد سجاد، فاتح قادیانیت مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبدالصمد رحمانی، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، قاضی شریعت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمہم اللہ۔ جن کی

علمی، فکری اور روحانی خدمات سے دنیا آج بھی رہنمائی حاصل کررہی ہے اور آئندہ بھی فیض یاب ہوتی رہے گی (انشاء اللہ)

اور اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ تہذیب وتمدن کی ڈھائی ہزار سالہ قدیم دانش گاہ نالندہ یونیورسٹی جس کے کھنڈرات کو زندگی عطا کرنے کا کام جناب نتیش کمار وزیر اعلیٰ بہار کے نام جاتا ہے، جس کے لئے پوری ریاست کے عوام کی طرف سے وہ قابل مبارکباد ہی نہیں، بلکہ باعث صد افتخار بھی ہیں۔

کاش! کہ میری یہ درخواست بھی قبول ہوجاتی ''گر قبول افتد زہے عز وشرف'' کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی برانچ کشن گنج بہار، مرشدآباد (مغربی بنگال)، مالاپورم (کیرالا) کے طرز پر قائم ہوجاتی اور اس کا سہرا بھی جناب وزیر اعلیٰ بہار کے نام ثبت ہوجاتا تو یہ بھی تاریخ کا سنہرا باب ہوتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اور اس کی جہد مسلسل کا ہی نتیجہ ہے کہ آج یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان کی یاد میں خراج تحسین دنیا کے ایک سو چوبیس ملکوں میں ایک ساتھ سرسید ڈے منا کر پیش کیا جاتا ہے۔

حضرات گرامی! تقریب کی مناسبت سے میں سب سے پہلے امریکہ کے اس ملعون پادری کی ذلیل حرکت کی شدید مذمت کرتا ہوں جس نے قرآن کریم کو نذر آتش کر کے چاند پر تھوکنے کی مذموم کوشش کی۔ امریکی پادری ٹیری جونز کا قرآن مقدس کو نذر آتش کرنے کا گستاخانہ عمل دراصل فساد فی الارض اور روئے زمین پر دہشت گردی کی بدترین مثال تھی، مگر دنیا سے دہشت گردی کو ختم کرنے کا جھوٹا دعویٰ کرنے والی امریکی سرکار اس پر خاموش رہی۔ حیرت ہے کہ اس عمل کو انجام دینے کیلئے اس پادری نے فلوریڈا کے ایک چرچ کا استعمال کیا ہے، مگر افسوس صد افسوس کہ امریکہ کے موجودہ صدر براک حسین اوبامہ اینڈ کمپنی اس کی اس دہشت گردی کو روکنے میں ناکام رہی اور بالآخر گزشتہ 21 مارچ

2011 کو اس نے قرآن کریم کا نسخہ نذر آتش کر دیا اور اس پر فخریہ یہ بولا کہ ''اس نے اپنا وہ حق استعمال کیا ہے جو امریکی آئین نے اسے دیا ہے''۔

میں آج کے اس اہم پروگرام میں پادری کی اس ذلیل حرکت کی شدید مذمت کرتا ہوں اور اسے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ چاند پر تھوکنے والا چاند کی خوبصورتی اور روشنی کیلئے کبھی خطرہ نہیں بن سکتا، بلکہ وہ گندگی خود اس کے وجود کو گندہ کر دے گی۔ انشاء اللہ۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حضرات! آپ لوگ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ قرآن مجید 'کلام اللہ' ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدائے پاک نے لے رکھی ہے۔ یہ کتاب لا ریب فیہ ہے اور قیامت تک آنے والے لوگوں کیلئے ذریعہ ہدایت اور راہ نجات ہے۔ سبھی آسمانی کتابوں میں یہ صرف قرآن کریم کا ہی اعجاز ہے جو آج بھی ہر طرح کی تحریف اور ردو بدل سے پاک ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں نے اپنی مقدس کتاب میں حالات اور زمانے کی مناسبت سے پھیر بدل کر دیا ہے۔ اپنی ضرورت اور خواہشات کی تکمیل کیلئے مذہبی کتابوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے، مگر قرآن پاک واحد ایسی کتاب ہے جو اپنے نزول کے وقت سے لیکر آج چودہ سو سال سے زائد گزر جانے کے باوجود اپنی اصل شکل وصورت میں موجود ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال گزر جانے کے باوجود اس کتاب میں ایک نقطے کی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، جو اس کی حقانیت اور منزل من اللہ ہونے کی کھلی دلیل ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

سامعین کرام! آیئے میں آپ کو بتاتا چلوں کہ دنیا کی جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عربی زبان میں جو فصاحت و بلاغت اور استعارات کی کثرت ہے اس نے قرآن

کو خوبصورت الفاظ کی روشنی سے معمور کر دیا اور اسے عربی زبان و ادب کا شاہکار بنا دیا ہے۔ یہ کتاب صرف ایک ادبی شاہکار ہی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کیلئے سرمایۂ ہدایت بھی ہے اور معجزہ بھی۔ معروف سائنس داں سلطان بشیر محمود نے قرآن کریم کی سائنسی تفسیر 'کتاب زندگی' میں لکھا ہے کہ ''قرآن پاک میں موجود بہت سے الفاظ میں حیران کن حد تک مماثلت پائی جاتی ہے''۔

مثلاً قرآن میں 'دنیا' کا لفظ 115 مرتبہ آیا ہے اور 'آخرت' کو بھی 115 مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ 'موت' کا ذکر 145 مرتبہ کیا گیا ہے اور 'حیات' کا ذکر بھی 145 مرتبہ کیا گیا ہے۔ 'کفر' کو 25 مرتبہ استعمال کیا گیا ہے تو 'ایمان' کا لفظ بھی 25 مرتبہ آیا ہے۔ 'شیاطین' کا لفظ 88 مرتبہ استعمال ہوا ہے تو 'ملائکہ' کا لفظ بھی 88 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی حقانیت پر لکھی گئی کتاب ''اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات'' میں 300 سے زائد صفحات میں قرآن کے سائنسی معجزوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

حضرات گرامی! ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ پورا قرآن 23 سالوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قرآن یاد کیا اور سیکڑوں صحابۂ کرامؓ کو بھی حفظ کرادیا۔ پھر حضرت زیدؓ بن ثابت اور دیگر کاتبان وحی نے مل کر قرآن پاک کو اسی ترتیب سے یکجا کیا جس ترتیب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلاوت فرمائی۔ قرآن پاک کی ''سورۃ المومنون'' میں ڈیڑھ ہزار سال قبل انسانی جنین کے ارتقا کے مراحل یوں بیان کئے گئے ہیں:

''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ، ثُمَّ جَعَلْنَهُ نُطْفَةً فِي

قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔" (سورۂ مومنون:۱۲۔تا۱۴)

(بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے ایک محفوظ قرار گاہ (رحم مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر ہم نے نطفہ کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر ہم نے پھٹکی کو لوتھڑے میں ڈھالا، پھر ہم نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت دے دی، چنانچہ بڑا بر کت والا ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے)۔

اسلام سے نفرت کرنے والوں کی لاکھ کوششوں کے باوجود جدید سائنس نے بھی قرآن کو حق ثابت کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے، قرآن کریم عہد صحابہؓ سے ہمارے زمانے تک ہر دور میں ہزاروں لاکھوں افراد سے منتقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے یہ محض لکھا ہوا صحیفہ نہیں ہے جس کے مٹنے یا ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو، یہ دلوں کے صفحات پر لکھی ہوئی ایک انمٹ کتاب ہے جسے نہ پانی سے دھویا جاسکتا ہے اور نہ آگ سے جلایا جاسکتا ہے۔ ایک حافظ قرآن دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کی جگہ دس حفاظ لے لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''میں نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جسے پانی سے مٹایا نہیں جاسکتا، آپ سوتے جاگتے پڑھا کریں''

محترم حضرات گرامی! آپ ذرا غور فرمایئے اس حدیث قدسی میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا ظہور مسلسل ہو رہا ہے، ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں تلاوت قرآن کریم

جن کی عادت ثانیہ بن گئی، وہ جاگنے کی حالت میں تو قرآن کریم پڑھتے ہی تھے، سونے کی حالت میں بھی ان کا دل و دماغ بیدار اور قرآنی آیات کے ساتھ ان کی زبان متحرک رہتی تھی، بہت سے حفاظ تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو بے ہوشی کی حالت میں بھی قرآن پڑھتے رہے، صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ساتھ بعد کے لوگوں میں قرآن کریم کے حفظ اور اس کی مسلسل تلاوت کا یہ شوق اس لئے پیدا ہوا کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تلاوت کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور اس کی تاکید بھی فرمایا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''**خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ**'' (تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھلائے) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ''جب قرآن والا جنت میں داخل ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ پڑھتے جاؤ، چنانچہ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت پر ایک درجہ اوپر چڑھتا جائے گا یہاں تک کہ وہ آخری آیت پڑھ کر فارغ ہوگا''۔

حضرت! قرآن کریم کی تلاوت کو افضل ترین عبادات میں شمار کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کریم میں مہارت رکھنے والا شخص مکرم اور نیک فرشتوں کے ساتھ ہوگا، جو شخص قرآن پڑھتے ہوئے ہکلاتا ہے اور اسے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے اس کے لئے دوہرا اجر ہے (صحیح البخاری)

قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے ایک ایک حرف کو دل و جان سے محفوظ رکھنے کیلئے ہر زمانے میں اہتمام کیا گیا، مسلمان اس کتاب ہدایت کو سینوں میں محفوظ کرتے ہیں، اپنی پنج وقتہ نمازوں میں بار بار دوہراتے ہیں اور سال میں ایک مرتبہ رمضان المبارک کے مہینے میں پوری دنیا کی مساجد اور لاکھوں گھروں میں قرآن کریم کی آیات ہی گونجتی رہتی ہیں، یہ صرف مسلمانوں کا امتیاز ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو عربوں کے مختلف لہجوں میں یاد کیا اور ان لہجوں کو بھی بہ طریق تواتر اگلی نسلوں تک منتقل کیا، یہاں تک کہ رسم الخط میں ادنیٰ

درجے کی کوئی تبدیلی نہیں کی، میں یہ بات مکمل اعتماد اور دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج روئے زمین پر کوئی ایسی آسمانی یا غیر آسمانی کتاب موجود نہیں ہے جس کو اس کی اتباع کرنے والوں نے اس قدر اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہو، اس کے ایک ایک حرف کو مخرج سے ادائیگی کے ساتھ، اس کے حروف، کلموں اور آیتوں اس کے رکوع، منزلوں اور سجدوں اور دوسری تمام تفصیلات کو جوں کا توں باقی رکھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے علماء و ماہرین اپنے شدید تعصب کے باوجود قرآن عظیم کے اس اعجاز کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر)

کی تفسیر کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کا محفوظ رہنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کو ہر خاص و عام سمجھ سکتا ہے، قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک ان پڑھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ (تفسیر بیان القرآن)

حضرات! میں اس جگہ ایک دلچسپ واقعہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں مسلمان کتنا حساس اور احتیاط پسند ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

امام قرطبیؒ نے سند متصل کے ساتھ خلیفہ مامون رشید کے دربار کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مامون کبھی کبھی اپنے دربار میں علمی مباحثے کرایا کرتا تھا، ان مذاکروں میں شرکت کے لئے تمام اہل علم کو شرکت کی عام اجازت تھی، ایسے ہی کسی مذاکرے میں ایک یہودی عالم بھی شریک ہوا، وہ صورت، شکل اور وضع قطع سے کسی ممتاز گھرانے کا فرد معلوم ہوتا تھا، جب اس نے گفتگو شروع کی تو اس کی گفتگو بھی نہایت فصیح و بلیغ تھی، مجلس

کے اختتام پر مامون نے اسے اپنے قریب بلاکر پوچھا: تم یہودی ہو؟ اس نے کہا: ہاں، مامون نے پیش کش کی کہ اگر تم مسلمان ہوجاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے، اس نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ میں اپنے آباء واجداد کے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بات ختم ہوگئی وہ شخص چلا گیا، اس کے ایک سال بعد وہ شخص ایک عام مسلمان کے حلئے میں آیا، مباحثے میں حصہ لیا اور نہایت مدلل طریقے سے زیر بحث موضوع پر اس نے اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا، مجلس کے اختتام پر مامون نے اس سے پوچھا کیا تم وہی شخص نہیں جو گزشتہ سال بھی آئے تھے اور تم نے میری پیش کش کے جواب میں یہ کہا تھا، اب تم اسلام قبول کرکے آئے ہو، کیا میں اس تبدیلی کی وجہ معلوم کرسکتا ہوں؟ یہودی نے جواب دیا کہ آپ کے دربار سے واپس جاکر میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق میں وقت صرف کیا اور اس کے لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ تینوں آسمانی مذاہب کی کتابوں کے نسخے تیار کرکے فروخت کروں، میں خوشنویس بھی ہوں اور کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں، میں نے سب سے پہلے تورات کے تین نسخے تیار کئے اور ہر نسخے میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ تبدیل کردیا، اس کے بعد میں یہ نسخے لے کر یہودیوں کے یہاں پہنچا، انہوں نے میری خطاطی کی بڑی تعریف کی اور خوشی خوشی یہ تینوں نسخے مجھ سے خرید لئے، اس کے بعد میں نے انجیل کی کتابت کی اور تین نسخے تیار کرکے عیسائیوں کے یہاں پہنچا۔ ان نسخوں میں بھی میں نے تبدیلیاں کردی تھیں، عیسائی پادری بھی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی بلاچوں وچرا وہ تینوں نسخے قیمت دے کر لے لئے۔ اب میں نے یہی کام قرآن کریم کے ساتھ کیا اور تین تبدیل شدہ نسخے لے کر میں مسلمان کے پاس گیا، جس نے بھی میرے یہ نسخے دیکھے اس نے سب سے پہلے یہی کہا کہ ہم دیکھیں گے کہ آپ کا لکھا نسخہ صحیح ہے یا نہیں، اس کے بعد انہوں نے یہ کہہ کر میرے نسخے واپس کردیئے کہ ان میں اغلاط بہت ہیں۔ اس واقعہ سے

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن کریم ہر طرح محفوظ ہے اور اللہ ہی نے اس کی حفاظت کا اس قدر پختہ انتظام کیا ہے کہ ہر مسلمان قرآن کے معاملے میں محتاط نظر آتا ہے۔

حضرت! آج امریکہ اور یورپ میں پادری جونز جیسے مٹھی بھر لوگ قرآن کریم کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں، مگر قرآن کریم کا صدیوں سے محفوظ رہ جانا بھی ان کے دلوں میں حسد و بغض کی چنگاری پیدا کر رہا ہے۔ اسلام کی بڑھتی مقبولیت سے بھی وہ لوگ پریشان ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

سامعین کرام! آج کی یہ مجلس بھی قرآن پاک سے منسوب ہے، عظیم صحافی ضمیر احمد صاحب نے ''ملٹی لنگویج ڈکشنری آف ہولی قرآن'' پر کام کر کے ایک عظیم خدمت انجام دی ہے۔ یہ بھی صرف قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ ہر زمانے میں اسلامی علوم وفنون کے ماہر علماء نے قرآن کریم کے ترجمے، تفاسیر اور لغات وانکشافات پر جامع اور محقق کام کیا ہے، یہ امتیاز کسی آسمانی کتاب کو حاصل نہیں۔

برصغیر ہند و پاک میں ہی علماء کی کثیر تعداد نے قرآن مقدس پر نمایاں خدمات انجام دی ہیں، حضرت تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن''، ترجمہ شیخ الہند، علامہ شبیر احمد عثمانی کی ''تفسیر عثمانی''، مولانا امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن''، مولانا حمید الدین فراہی کی ''تفسیر فراہی''، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن''، مولانا احمد رضا خان کی ''تفسیر کنز الایمان''، مولانا ابوالکلام آزاد کی ''تفسیر ترجمان القرآن''، سید حمید حسن بلگرامی کی ''فوز القرآن''، سید احمد شاہ کی ''تفسیر الحسنات''، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کی ''انوار القرآن''، مولانا مفتی محمد شفیع کی ''تفسیر معارف القرآن''، مولانا نعیم کی ''انوار البیان''، مولانا وحید الدین خان کی ''تذکیر القرآن''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''تفسیر ماجدی''، عبدالحکیم

ملک کی ''منشور قرآن''، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی ''قاموس القرآن''، مولانا عبدالصمد رحمانی کی ''تیسیر القرآن''، وغیرہ کو کافی شہرت حاصل ہے، انہی محققین اور جید علماء اور خوش نصیبوں کی فہرست میں آج جناب ضمیر احمد صاحب کا نام بھی شامل ہو گیا ہے، میں انہیں قرآن پاک کی اس علمی خدمت انجام دینے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔

حضرات! ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ اللہ کا فرمان ہے ''یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کیا ہے، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جو آدمی قرآن مجید پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا، جس کی روشنی سورج سے بھی زیادہ ہوگی، اگر وہ سورج تمہارے گھروں میں ہو! پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہو!''

حضرات! قرآن مجید کے مسلمانوں پر کئی حقوق ہیں اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کر کے اپنی بات ختم کروں گا۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لیں کہ ہم مسلمانوں پر قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں۔

(۱) قرآن پر ایمان لائیں

(۲) اس کی تلاوت کریں

(۳) اس کو سمجھیں اور غور وفکر کریں

(۴) اس پر عمل کریں

(۵) اسے دوسروں تک پہنچائیں

پہلا حق:

یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان قرآن پر ایمان لائیں، لیکن یہ بات آپ آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ اگر اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ ایمان کے دو حلئے ہوتے ہیں۔ ایک زبان سے اقرار کرنا اور دوسرا دل سے تصدیق کرنا اور ایمان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب زبانی اقرار کے ساتھ دل کا یقین بھی انسان کو حاصل ہوجائے۔ اس لئے کہ جس چیز پر ہمارا یقین ہو ہمارا عمل اس کے خلاف نہیں ہوتا۔ تلاش حق کی نیت سے اسے پڑھا اور اس میں غور وفکر کیا جائے تو سارے حجابات دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور انسان کا باطن نور ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے۔

دوسرا حق:

ہم لوگوں پر قرآن کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کریں، یہ مومن کی روح کی غذا، اس کے ایمان کو تروتازہ اور سرسبز وشاداب رکھنے کا اہم ترین ذریعہ اور مصائب ومشکلات کے مقابلے کے لئے اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ ہر شخص قرآن کے اس حصے کو جو اسے یاد ہو اپنا اصل اثاثہ اور سرمایہ سمجھے اور اس میں مسلسل اضافے کیلئے کوشش کرتا رہے تاکہ روح کو زیادہ سے زیادہ عمدہ صورت میں غذا فراہم کرسکے، نیز تلاوت کو باقاعدہ اپنے روزانہ کے معمولات میں شامل کیا جائے اور اچھی سے اچھی آواز میں پڑھا جائے۔

تیسرا حق:

قرآن مجید کا تیسرا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے، قرآن کتاب ہدایت ہے، قرآن اپنے آپ کو مجسم یاد دہانی اور نصیحت کہتا ہے، یاد دہانی ہمیشہ بھولی بسری بات کی کروائی جاتی ہے اور یاد دہانی کے لئے کوئی نشانی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر آپ کے کسی عزیز دوست نے چند سال قبل آپ کو تحفہ میں کوئی قلم دیا، قلم آپ کہیں رکھ کر بھول گئے، کافی عرصہ بعد وہ قلم کہیں نظر آنے پر اس دوست کی یاد بھی تازہ ہوجاتی ہے، بالکل اسی طرح قرآن کی آیات بھی نشانی کا کام کرتی ہیں، ہم اپنی غفلت کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں، لیکن جب تلاوت کرتے ہیں تو اس کا ہر جملہ نشانی کا کام کرتا ہے اور اس پر غور کرنے سے خدا تعالیٰ کی یاد دل میں تازہ ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے ہر جملے کو ''آیت'' کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے نشانی، یعنی قرآن کی آیات کو اگر سمجھ کر پڑھیں تو خدا پر ایمان اور اس کی بندگی کے عہد کی یاد دہانی ہوجاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے موزوں بنادیا ہے تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے''۔ (القمر:۵۴)

چوتھا حق:

قرآن کریم کا چوتھا حق ہر شخص پر یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کرے اور اسے اپنی زندگی کے لئے راہنما بنائے، قرآن کریم کو پڑھنا اور سمجھنا بھی زیادہ اسی وقت مفید ہوگا جب اس پر عمل بھی کیا جائے۔ آج پوری دنیا میں انسانیت کی ذلت اور رسوائی کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم قرآن کریم کے بعض احکامات پر تو عمل کرتے ہیں، لیکن اکثر قرآن کریم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر انسان جان بوجھ کر قرآن کے احکامات پر عمل نہ کرے تو یہ چیز عظیم ہے جس کی سب سے بڑی سزا توفیق سلب ہونے کی شکل میں ملتی ہے۔

پانچواں حق:

قرآن کریم کا آخری حق یہ ہے کہ اس کے پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے بلکہ یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک خدا کے ابدی پیغام کو پہنچائیں۔ اگر ہم مسلمان قرآن کو پوری دنیا تک نہیں پہنچائیں

گے تو کون پہنچائے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل 23 برس اسی قرآن کریم کی آفاقی پیغام کو کائنات انسانی تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ آج یہی ذمہ داری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتی ہے کہ آقاؐ کے اس پیغام کو دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

ہر مسلمان کیلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ استطاعت کی حدتک اپنے اہل و عیال، اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں اور قرب و جوار میں رہنے والوں کو قرآن مجید کا پیغام پہنچائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ ”جس آدمی کے دل میں قرآن کریم کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ ویران گھر کے مانند ہے“ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ”ملٹی لنگویج ڈکشنری آف ہولی قرآن“ کا یہ مجموعہ قرآن کریم کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو، نیز شوق کے ہاتھوں لیا جائے اور ہر پیاسے دل کی شادمانی کا باعث بنے۔ مؤلف، ان کے معاونین اور اس ڈکشنری سے استفادہ کرنے والوں کے لئے ذخیرۂ آخرت ہو آمین۔ صاحب لغت کی خدمت پر یہ شعر ان کی نذر ہے۔

ہنرمندان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں

فن تجوید وقرأت میں گجرات کے دینی مدارس کا کردار

زیر اہتمام : جامعۃ القرأت کفلیہ گجرات
بتاریخ : ۱۱/۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۴/۵/ اپریل ۲۰۱۲ء
بمقام : جامعۃ القرأت کفلیہ گجرات

الحمد للّٰہ رب العلمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد و علیٰ آلہ و صحبہ و علیٰ من تبعھم باحسان و دعا بدعوتھم الی یوم الدین، اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ،بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ،اوزد علیہ ورتل القرآن ترتیلا (سورۃ المزمل آیت ۴)أما بعد:

عالی وقار صدر مجلس، حضرات علماء کرام، معزز حاضرین!

اس اٹوٹ حقیقت سے کسی بھی عام وخاص کو انکار کی گنجائش نہیں کہ علومِ دینیہ کی تعلیم وتدریس اور ترویج واشاعت میں مدارسِ دینیہ کا کردار انتہائی نمایاں اور درخشاں رہا ہے۔ دینِ اسلام جس کی حفاظت کی ذمہ داری باری تعالیٰ نے خود اٹھائی ہے، اس کا ایک

جگہ سے دوسری جگہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک انتقال انہی مدارس کے وجود اور پیہم کوششوں سے ممکن ہوا۔ آج اگر اسلام کا چار سو پھیلاؤ ہے تو اس میں ان ہی دینی اداروں کا خاصا کردار شامل ہے۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی اور اس کے فروغ میں اہالیان مدارس اسلامیہ نے محدود وسائل اور بے سروسامانی کے باوجود کبھی تساہلی اور کوتاہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس سلسلہ میں ان کی مساعی ناقابل فراموش ہیں حالانکہ علماء کی اس جماعت کو ہر زمانے میں دشمنان اسلام کی سازشوں اور ان کی شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، صیہونی طاقتیں اسلام اور اس کے قلعے یعنی دینی مدارس کو نہ صرف بدنام کرنے بلکہ انہیں اس صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ناکام کوشش کرتی رہی ہیں اور آج بھی یہ قوتیں اپنے ان ناپاک عزائم کو منصوبہ بند طریقے سے انجام دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی ہیں مگر:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اگر مدارس اسلامیہ کا وجود نہیں ہوتا اور علماء کرام اپنی ذمہ داری میں کوتاہی سے کام لیتے تو مجھے یہ بات کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے کہ اسلام کے دشمن اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہوتے۔ مدارس کی ہی دین ہے کہ آج آپ کو تاریخ اسلام کی وہ تمام قد آور شخصیات، جن کے کارہائے نمایاں پر دنیا فخر محسوس کرتی ہے، اسی چشمہ کی فیض یافتہ ملیں گے۔

ان تمام تر خوبیوں اور درخشاں ماضی کے باوجود دینی مدارس میں کچھ ایسے تشنہ پہلو موجود ہیں جن کی سیرابی ابھی باقی ہے، مثلاً ہمارے اِن اداروں (خصوصاً برصغیر ہند و پاک) میں متنوع قرأتِ قرآنیہ کو بطور نصاب پڑھانے سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ بظاہر اس دیدہ دانستہ اغماض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ بہت سارے ایسے علوم ہیں جو متنوع قرأت کی بنیاد

پر تن آور درخت کی سی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ یہی قرأت قرآنیہ تفسیر قرآن میں مجمل معنیٰ کی وضاحت کر رہی ہوتی ہے، اسی قرأت کی بنیاد پر استنباطِ احکام میں ایک فقیہ کو راجح مسلک کا علم ہوتا ہے، یہی قرأت عقیدہ سلف کی توضیح اور نکھار میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہوتی ہے، اسی کی بنیاد پر قرآن کریم کو وہ امتیاز اور اعجاز ملتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں کفار کو چیلنج کی صورت میں کیا گیا کہ

”وَاِن کُنتُم فِی رَیبٍ مِّمَّا نَزَّلنَا عَلٰی عَبدِنَا فَاتُوا بِسُورَۃٍ مِّن مِّثلِهٖ وَادعُوا شُهَدَاءَ کُم مِّن دُونِ اللّٰهِ اِن کُنتُم صٰدِقِینَ فَاِن لَّم تَفعَلُوا وَلَن تَفعَلُوا ... الخ“ (البقرۃ: ۳۲)

(اور اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری نہیں، تو اس کی مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ، لیکن تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے) اور سب سے بڑھ کر قرآن کریم کا نطق اور کیفیت اَدائی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہؐ نے سکھائی تھی، سے آشنائی ملتی ہے، لیکن اَرباب مدارس، افسوس کہ اس سے بے اعتنائی برتتے رہے اور برت رہے ہیں۔

قابل استعجاب امر یہ ہے کہ ماضی قریب کی دو تین دہائیوں میں علوم و فنون کے تئیں جو بیداری آئی اس علمی بیداری سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اہالیان مدارس اور علماء کرام نے اپنے اداروں میں وقت کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے حسب استطاعت جدید علوم وفنون کو اپنے نصاب میں شامل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دینی مدارس میں عصری علوم سے متعلق کئی شعبے موجود ہیں اور اس پر اس لئے پوری توجہ دی جارہی ہے کہ اس سے طلبہ کا مستقبل وابستہ کر دیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے

کہ اسی صورت میں وہ آگے چل کر بآسانی مادیت پرست دنیا کا سامنا کرسکتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ہماری یہ سوچ مزید ڈیولپ ہورہی ہے اور ہم اس سمت میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔مدارس دینیہ کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے علاقائی ،ریاستی اور بین الاقوامی سطح پر سمینار اور مذاکروں کا باضابطہ انعقاد کیا جاتا ہے۔ان سمیناروں اور مذاکروں کو منعقد کرنے کا مقصد یہی باور کرانا ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اگر آپ جدید علوم سے بے خبر ہیں تو دنیا کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتے وغیرہ وغیرہ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی یہ فکر غلط اور نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے اور اس قسم کے پرگروام کے ذریعہ مدارس کو ان کے حقیقی مقاصد سے بے پروا کرنے کی کوئی سازش ہے۔ہمیں اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ مدارس کو ماڈرن کرنے کیلئے اتنا زور کیوں دیا جارہا ہے۔کیوں حکومتی سطح پر بھی یہ دباؤ بنایا جارہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں تبدیلی ناگزیر ہے،کیوں کہ گھسے پٹے فرسودہ نصاب کو پڑھ کر دینی مدارس کے طلباء اقتصادی طور پر کبھی مضبوط نہیں ہوسکتے۔اس لئے ان کے بہتر اور تابناک مستقبل کیلئے ضروری ہے کہ ان کو علوم جدیدہ سے آراستہ کیا جائے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ جس فن پر ہمارے مذہب کی بنیاد ہے اور جس کا براہ راست تعلق کلام اللہ سے ہے اس غیر معمولی فن سے ہمارے مدارس تہی دامن ہوتے جا رہے ہیں،اس پر مخلصانہ توجہ نہیں دی جارہی ہے اور اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیا جارہا ہے۔اس قیمتی فن پر مذاکرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی لوگوں میں بیداری کے لئے کوئی مہم چلائی جاتی ہے۔جس سے کہ اس اہم فن کی افادیت کا انہیں اندازہ ہو اور اس فن کو سیکھنے کیلئے بھی وہ اسی طرح جدوجہد کریں جس طرح جدید علوم کیلئے دن رات ایک کردیتے ہیں۔

لاکھ کوشش کے باوجود ہم ابھی تک یہ نہیں جان سکے ہیں کہ وہ کون سے پیمانے

ہیں جن کی بنیاد پر علم قرأت کو دیگر علوم کے مقابلے میں کم اہمیت کا حامل جانا گیا۔معلوم نہیں اہمیت وافادیت کس ثریا کا نام ہے، جہاں دیگر علوم تو یک جنبش چڑھ دوڑے،لیکن علم قرأت وہاں تک نہیں پہنچ پارہا ہے؟ حالانکہ ہماری دانست میں یہ علم دیگر علوم کے مقابلے میں کسی بھی طور پر کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

مبارکباد کے مستحق ہیں علماء گجرات اور یہاں کے دینی مدارس بالخصوص حضرت قاری اسماعیل بسم اللہ جامعۃ القرأت کفلیتہ کے بانی اورقاری احمد اللہ صاحب قاسمی صدر القراء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل جن کی سرپرستی میں جامعۃ القرأت کا قیام عمل میں آیا۔وقت کے نباض قاری اسماعیل صاحب نے ملت اسلامیہ کے بہی خواہان کو جمع کر کے زمانے کے تقاضا کو سمجھا اور اس سے لوگوں کو آگاہ کیا،ان کا یہ قدم گرچہ دیر سے اٹھایا گیا قدم ہے،مگر ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ان کی یہ کوشش آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ان کے علاوہ بھی گجرات میں ایسے علماء کی کثیر تعداد ہے جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فکر کی گہرائی اور نظر کی وسعت سے نوازا ہے،آج بھی تجوید وقرأت کے فروغ میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن پاک کو سیکھنے کیلئے جو قواعد بتائے گئے ہیں ان میں قاری نور محمد کی ترتیب کردہ 'نورانی قاعدہ' کو جو برتری حاصل ہے اس کی نظیر نہیں ملتی اسی طرح تلاوت قرآن کریم میں جو شہرت وعظمت قاری عبدالباسط (۱۹۲۷۔۱۹۸۸ء) کو ملی وہ بھی تاریخی حقیقت ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ علماء گجرات اور یہاں کے دینی مدارس اس معاملے میں دونوں کی اتباع کرتے ہیں اور اسی انداز میں طلباء کو درس دیتے ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔اس سے قبل کہ ان مدارس کا تذکرہ کروں،جن میں قرأت قرانیہ باضابطہ نصاب میں شامل ہے اس غیر معمولی فن کی اہمیت و افادیت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں۔

تلاوت قرآن اور تجوید کی اہمیت:

قرآن مقدس اور احادیث نبویؐ میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ ہم قرآن کو پوری قوت کے ساتھ پکڑیں، آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں، قرآن کو یاد کریں اور روزانہ اس کی تلاوت کا اہتمام کریں، جو شخص قرآن کو پڑھے گا، قرآن اس کے لیے سفارش کرے گا اور صاحب قرآن سے قیامت کے روز کہا جائے گا:

''قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا بس تیرا رتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے''۔

(ترمذی باب ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:

''جس شخص نے قرآن پڑھا، پھر اس کو حفظ کیا اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا، حق تعالیٰ شانہٗ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور اس کے خاندان کے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمائیں گے، جن کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہے''۔ (ترمذی باب ماجاء فی فضل قاری القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی جو شخص ترتیل کے ساتھ تلاوت کرتا ہے، اس کے لیے اس دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''من قرأ حرفا من كتاب الله فله به حسنة والحسنة بعشر امثالها لا اقول الم حرف الف حرف ولام حرف، وميم حرف''. (ترمذی باب ماجاء في من قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر)

(جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لیے اس حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے، میں نہیں کہتا ہوں کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ

الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔)

اسی طرح یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ اولاد کو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دی جائے، کیوں کہ قرآن کی تعلیم سے بہتر کوئی اور تعلیم نہیں ہے۔

''خيركم من تعلم القرآن وعلمه''. (ترمذی باب ما جاء فی تعليم القرآن)

(تم میں بہتر یا افضل وہ شخص ہے جو قرآن کو سیکھے اور اس کو سکھلائے)۔

ایک مرتبہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے، اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا، جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی، اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو، پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے بارے میں جو خود اس پر عمل کرتا ہو''۔ (ابوداؤد)

اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ خود قرآن سیکھے، اپنی اولاد کو سکھائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان الذى ليس فى جوفه شيئ من القرآن كالبيت الخرب''. (ترمذی)

(جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے)۔

مکاتب و مدارس جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر تلاوت کلام پاک اور اس کا دَور نہیں کرتی، مگر ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، ملائکۂ رحمت

ان کو گھیر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہٗ ان کا ذکر ملائکہ کی مجلس میں فرماتے ہیں۔ (مسلم فضل الاجتماع علیٰ تلاوۃ القرآن وعلی الذکر)

اس لیے اس سے بڑی کوئی نیکی نہیں کہ اللہ کے کلام کی تلاوت کی جائے، اس کو سمجھ کر عمل کیا جائے اور اس کی ہدایتوں کو عام کیا جائے، گھروں اور مساجد میں قرآن کو تجوید کے ساتھ سکھانے کا اہتمام کیا جائے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی ایک نایاب تحریر میں قرآن پاک سے متعلق چند کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے اس میں آپ نے بہت ہی قلق کے ساتھ اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں تجوید کا قطعی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے، حتیٰ کہ ایک صاحب سورۂ ناس میں ”**من الجنة و الناس**“ کو اس طرح پڑھتے ہیں: ”**من الجنات و النس**“ پھر بعضے اس میں مساجد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خواں ہوا تو اس کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے، اس لیے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی، پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے۔

دوسرے اس طور سے کہ یہ امام صاحب اگر زمرۂ اہل علم میں ہوئے تو علماء کی عوام میں سخت بے وقعتی ہوتی ہے جس کا اثر ایک گونہ علماء کے اتباع و اقتداء تک بھی سرایت کرسکتا ہے، ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام طویل و مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو

کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت وعدم مساعدت لسان متیقن نہ ہو جائے، جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا، اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہوسکتا ہے؟

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے، مثلاً لفظ ”پنکھا“ اور ”رنگ“ میں اخفا ہے۔ اگر نون میں اظہار کیا جاوے یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا، اور لفظ ”کھمبا“ اور ”دنبہ“ میں تلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہو جائے گا، مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ نعماء آخرت کی رغبت، نعماء دنیا کے برابر نہیں رہی، **انا للہ و انا الیہ راجعون**۔“

آگے آپ رقم طراز ہیں:

”اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی کو مسجد میں امام مقرر کریں۔ کسی ماہر کو اس کی متعدد مختلف سورتیں سنوادی جاویں۔ اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے تو کسی ماہر کو تلاش کریں۔ اگر ارزاں نہ ملے گراں لاویں۔

کیسی ظلم کی بات ہے کہ ہر دنیوی کام کے لیے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی ڈھونڈا جاتا ہے حتیٰ کہ لوہار، معمار، نجار بلکہ گانے بجانے والا تک بھی اور خدا کے روبرو جو سب کی طرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا رکھا جاتا ہے جس میں نہ کمال نہ جمال، تمام محلّہ میں جو ناکارہ، اندھا چندھا، فاتر الحواس، گنوار، بدتمیز، جاہل ہو۔ غرض جو کسی مصرف کا نہ رہے، اس کا امامت کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے۔“

اہل مدارس اور مشائخ کو اس جانب توجہ دلاتے ہوئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے:

"اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہیں امتحان داخلہ کا ایک جز اور اجزاء سے زیادہ نہیں تو برابر درجہ میں سہی صحت قرآن کو بھی قرار دیں اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح تو ضرور لے لیا جاوے، بدون اس کے داخل نہ کریں اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں اور نیز جن مدارس میں گنجائش ہے ان کو ایک مدرس تجوید کا مدرسہ میں بڑھانا ضرور ہے۔ اس طریق سے یہ فن عام ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مشائخ کو چاہئے کہ اپنے مریدوں کو، خصوصی خلفاء کو صحت قرآن پر مجبور کریں۔"

تجوید میں افراط وتفریط:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تجوید میں افراط اور تفریط سے بھی بچنے کی ہدایت کی ہے۔ ایک جگہ آپ نے اس حوالے سے کچھ اس انداز میں تنبیہ فرمائی ہے:

"بعضے تصحیح وتجوید کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر کاوش اور بحث ہی تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا اس وقت لوگ ض، ظ میں الجھنے والے دیکھے جاتے ہیں، مگر انشاء اللہ تعالیٰ ادا کے نام خاک بھی نہیں، بعضے عمل تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ یعنی صرف لہجہ کا نام قرأت سمجھ کر اسی کا اہتمام کرتے ہیں اور یا تو خود کوئی طبعی لہجہ اختراع کرتے ہیں اور یا کسی مشاق کی نقل اتار لیتے ہیں اور اتار چڑھاؤ صحت وزن میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ بعضے ضروریات یا مستحبات قرأت بھی فوت ہوجاتے ہیں، یعنی حرف گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ یا غنہ یا مد حذف کردیتے ہیں تاکہ وزن ٹھیک رہے۔"

سو اس کی نسبت سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

"اقرأ والقرآن بلحون العرب واصواتها واياكم ولحون اهل

العشق واهل الكتابين. (مشكوٰة شريف، ص ۱۹۱، عن حذيفة رضى الله تعالى عنه"، (بحواله بيهقى ۱۲ محمد على غفرله)

(تم قرآن شریف کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے طریقوں سے بچو)

یعنی ایسے لحن سے منع فرمایا ہے اور اس کو لحون عرب سمجھنا خطاء عظیم ہے۔ جیسا شراح حدیث نے تصریح کی ہے بلکہ یہ لحن اہل عشق واہل کتاب میں داخل ہے جس کو منع فرمایا ہے اور اگر یہ لحن عرب ہوگا تو لحن اہل عشق کون ہوگا؟ پس خود حدیث کے الفاظ تو اس زعم کا تخطیہ کررہے ہیں اور لہجہ کا اہتمام تجوید میں تفریط ہے اور بعضے حقیقت صحیح سمجھتے ہیں، مگر خوش لہجگی کے ایسے مخالف ہیں کہ اس کا اہتمام بلیغ کرتے ہیں کہ تحسین فوت نہ ہونے پائے اور کسی کو ذرا تحسین صوت کرتا دیکھتے ہیں تو اس پر گانے کا طعن کرتے ہیں اور یہ تجوید میں افراط ہے۔ مثل تفریط مذکور کے یہ بھی نصوص کے خلاف ہے۔

برصغیر ہندو پاک میں تجوید وقرأت:

مناظر ردعیسائیت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانہ میں ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں دیکھا کہ عربوں کی نظر میں ہندوستانی علماء کی کوئی وقعت نہیں، انہیں گری نظر سے دیکھتے ہیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ ہندی علماء قرآن کریم غلط پڑھتے ہیں اور مدارسِ عربیہ میں تجوید کا کوئی اہتمام نہیں، جبکہ تجوید کی فرضیت قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، مگر طلباء تجوید کو فضول سمجھتے ہیں، بعض بڑے اساتذہ بھی کہتے ہیں: "علم سیکھو، تجوید میں کیا رکھا ہے؟" اور وعظوں میں کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔

مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کا آغاز:

''حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ'' نے پہلا کام یہ کیا کہ حرمِ مکی میں مدرسہ قائم کیا اور ہندوستانی بچوں کو جمع کر کے پڑھانا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں ''قاری عبد القادر مدراسی، فاضل جامعہ ازہر'' مصر سے فراغت کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لائے، یہ علم وفن کے باکمال قاری تھے، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے انہیں اپنے یہاں مدرس رکھ لیا۔

مدرسہ صولتیہ کی تعمیر:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ترغیب پر مغربی بنگال کی ایک عظیم خاتون ''صولت النساء'' نے اپنا سارا سرمایہ اسی مدرسہ کی تعمیر پر لگا دیا، ''مدرسہ صولتیہ'' انہی کے نام پر ہے۔ ''قاری عبد القادر مدراسی'' کی ہر وقت کی محنت اور لگن نے مدرسہ کو چار چاند لگا دیئے۔ خلوص وللّٰہیت کے جذبہ نے بچوں کا تلفظ اور لہجہ ایسا قابل تعریف بنا دیا کہ عرب بھی شوق سے سنتے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی فکر سلیم نے حقارت ونفرت والے ماحول کو الفت ومودّت سے بدل دیا، جب مدرسہ کے جلسے میں ہندوستانی بچے تلاوت کر رہے تھے تو عرب بھی جھوم رہے تھے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ حجاز مقدس میں عرب ہندوستانی علماء کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، کیونکہ انہیں قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی فکر سلیم اور حضرت قاری عبد اللہ مکی کی محنت ولگن نے ہندوستانیوں کے سروں پر عزت ووقار کا تاج رکھ دیا۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے حضرت تھانویؒ کو ۱۶ر رجب ۱۳۱۰ھ کو خط لکھا کہ ہندوستانی علماء کو قرآن پڑھنا نہیں آتا، جس کی وجہ سے عرب حقارت ونفرت سے دیکھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اس لئے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے مدرسہ صولتیہ کے ابتدائی دور ہی میں تجوید کا اہتمام کیا۔ اس مدرسہ کی امتیازی شان تجوید وقرأت ہے اور دوسرے علوم ثانوی درجہ میں تھے، مگر لزوم کے درجہ میں حضرت قاری عبد اللہ مکی نے ''مدرسہ صولتیہ'' کو مرکز القراء بنا دیا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت قاری عبد اللہ مکی کے لگائے ہوئے باغ، یعنی تجوید وقرأت کے طلباء کی تلاوتوں نے اتنا متاثر کیا کہ آپ فنِ تجوید کے لئے ٹھہر گئے، چنانچہ آپ نے پڑھنے میں ایسا کمال حاصل کیا کہ جب مدرسہ کی بالائی منزل میں مشق کرتے تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ حضرت قاری عبد اللہ مکی پڑھ رہے ہیں یا حضرت تھانویؒ۔ آپ نے تجوید ہی پر بس نہیں کی، بلکہ قرأت سبعہ کی بھی تکمیل کی اور مبتدی طلباء کے لئے پاؤ پارہ میں قرات سبعہ کا اجراء لکھا، جس کا نام ''تنشیط الطبع'' ہے۔ حضرت تھانوی نے مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم سے متعلق تقریر کی، جس میں آپ نے شکایت کی کہ مدارس عربیہ میں تجوید وقرأت کا کوئی اہتمام نہیں ہے، جس کی وجہ سے عالم تو بن جاتے ہیں، مگر با تجوید قرآن پڑھنا نہیں آتا، حضرت کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ دار العلوم دیوبند میں ۱۳۳۱ھ میں شعبۂ تجوید کا اجراء اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی یہ شعبہ قائم ہوا۔

مدارس میں تدریس قرأت کی ضرورت کیوں؟:

تدریس قرأت کے تعلق سے اَرباب مدارس کی بے اعتنائی کا سلسلہ روز بروز دراز ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ علم دیگر علوم کے مقابلے میں کسی بھی طور پر کم تر نہیں ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر اسے کیوں مدارس دینیہ کے نصاب کا حصہ ہونا چاہئے؟ یہ جاننا انتہائی ضروری ہے۔ اس بات کو چند مثالوں سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

تفسیر کا معنیٰ ہے الفاظ قرآنیہ کا مفہوم اس طرح پوری وضاحت سے بیان کر دیا جائے کہ اس میں کوئی ابہام یا اجمال باقی نہ رہے۔ سو جہاں اس مقصد کے حصول کے لئے

دیگر علوم معاون ثابت ہوتے ہیں وہیں علم قرأت بھی مجمل الفاظ کی تفصیل اور ابہام کی توضیح کرتا نظر آتا ہے۔

پہلی مثال:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ’’وَاِن كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ‘‘ (النساء: ۱۲)

آیت مذکورہ میں لفظ ’اخ‘ اور ’اخت‘ میں اِبہام ہے کہ وراثت کی تقسیم میں ذکر کیا گیا حصہ کس بھائی اور بہن کا ہے؟ حقیقی (سگے) بھائی اور بہن مراد ہیں، علاتی (جو باپ کی طرف سے ہوں) یا اخیافی (جو ماں کی طرف سے ہوں)

تو دوسری قرأت میں اس کی وضاحت یوں موجود ہے: ’’وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنْ اُمٍّ‘‘.

یعنی (جو اخیافی بہن بھائی ہوں، ان کا وراثت میں یہ حصہ ہے)۔

دوسری مثال:

قسم کا کفارہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’فَكَفَّارَتُهٗ عَشَرَةُ مَسٰكِيْنَ الخ...

’’(ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کرو۔‘‘ آیت بالا میں بھی لفظ ’رَقَبَۃ‘ کی وضاحت موجود نہیں کہ قسم کا کفارہ دیتے ہوئے اگر غلام آزاد کرنا مقصود ہو تو کیا غلام میں کوئی تمیز موجود ہے کہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم؟ یا کسی بھی غلام کو آزاد کیا جا سکتا ہے؟

تو قرأت کا اختلاف ہمیں بتاتا ہے کہ اس ضمن میں غلام کا مسلمان ہونا ضروری

ہے، کیونکہ دوسری قرأت میں لفظ ’رَقَبَةٍ‘ کی صفت ’مُؤْمِنَةٍ‘ سے بیان ہوئی ہے۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے کی تفسیر میں ایک قرأت سے معنیٰ اس طرح واضح نہیں ہوتے جیسے متنوع قرأتیں مسئلہ کو کھول کر بیان کرتی ہیں، چنانچہ اس پہلو سے دینی مدارس میں متنوع قرأتوں کی تدریس کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عالم دین تفسیری مشکلات کو شاید اس طرح سے حل نہ کر سکے جس طرح قرأت سے واقف عالم دین کر سکتا ہے۔

نصوص کا ظاہری تعارض اور علم قرأت:

وہ مسائل جن میں بظاہر نصوص میں باہمی تعارض نظر آرہا ہوتا ہے اور رفع تعارض کے لئے تطبیق کی کوئی صورت نکالنا ہوتی ہے، وہاں بھی قراءت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، مثلاً اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ‘‘ (الجمعة: ۹)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔‘‘

مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہے کہ جب تمہیں جمعہ کے لئے ندا دی جائے تو اللہ کے ذکر کے لئے دوڑو، جبکہ دوسری طرف صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ:

(انَّ ابا هرير قال سمعتُ رسول الله يقول اذا اُقيمتِ الصلوٰةُ فلا تاتوها تسعون واتوها تمشون، عليكم السكينة فما ادركتم فصلُّوا وما فاتكم فاتمُّوا) (صحيح مسلم: ۷۵۸)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا،

آپ فرما رہے تھے کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑ کر اس کی طرف نہ آؤ، بلکہ چلتے ہوئے آؤ، تم پر اطمینان لازم ہے۔ جو پالو پڑھ لو اور جو رہ جائے اُسے مکمل کرلو۔''

اب بظاہر دو نصوص کے درمیان تعارض کی کیفیت نظر آ رہی ہے۔ آیت قرآنی کے مطابق نماز جمعہ کے لئے دوڑ کے آنا چاہئے، جبکہ حدیث نبویؐ نماز کے لئے دوڑ کر آنے سے منع کر رہی ہے، اب اگر دیگر قرأتوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ ظاہری تعارض بآسانی دور ہو رہا ہے، مثلاً ایک دوسری قرأت میں لفظ 'فاسعوا' جس کے معنیٰ دوڑنے کے ہیں، کی جگہ لفظ 'فَامضُوا' ہے جو اطمینان اور سکون سے چل کر آنے کا معنیٰ دیتا ہے، گویا دوسری قرأت نے اس ظاہری تعارض کو یوں رفع کیا کہ حدیث نبویؐ کا مفہوم اپنی جگہ ٹھیک ہے اور آیت قرآنی میں لفظ 'فَاسعَوا' کا مفہوم جمعہ کے لئے انتہائی کوشش اور جستجو سے آنے کا ہے، جو دوسری قرأت کو سامنے رکھتے ہوئے اخذ کیا گیا ہے۔

یہاں ضمناً اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کیا ہم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ بیمار اَفکار کے حامل، اِعتزالی روش کے عادی اور فتنہ پرور محققین کیسے اَحادیث کو قرآن کریم کے مقابل لاتے ہیں اور پھر قرآن کریم کی اتھارٹی کا بہانہ بنا کر ذخیرۂ اَحادیث سے ہاتھ صاف کرنے کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ فتنہ اِنکارِ حدیث ہمیں کیوں سبق نہیں دیتا کہ علم قرأت کو پس پشت ڈالنا گویا کہ مذکورہ محققین کو کھلی چھوٹ دینا ہے، تاکہ وہ قراءات کو 'فتنۂ عجم' کا نام دے کر اُسے مشکوک ٹھہرائیں اور پھر نصوص کے باہمی تعارض کو بہانہ بنا کر اَحادیث صحیحہ کا انکار کردیں؟۔

اَرباب مدارس کو قرآن اور سنت دونوں کے تحفظ کے لئے اس طرف توجہ دینا ہوگی، تاکہ نقب زنوں کی تمام راہیں مسدود کردی جائیں اور فتنہ باز دانشوروں کے فتنوں کو متعدی ہونے سے روکا جائے۔

مختلف فقہی اَحکام کا اِستنباط اور علم قرأت:

بسا اَوقات دو مختلف قرأتیں مختلف مسائل کے استنباط کا فائدہ بھی دیتی ہیں، مثلاً اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلَا تَقرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطهُرنَ'' (البقرة: ۲۲۲)

''اور تم ان کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک صاف ہو جائیں۔'' یعنی بیوی سے اس وقت تک جماع نہ کیا جائے جب تک اُسے حیض آنا بند نہ ہو جائے۔ قرأتِ حفص کے اعتبار سے بیوی سے جماع کے لئے حیض کے بند ہونے کے بعد غسل کی صورت میں طہارت ضروری نہیں، صرف حیض کا بند ہونا ہی کافی ہے جبکہ دوسری قرأت میں يَطهُرنَ ط کے سکون کے بجائے تشدید کے ساتھ يَطَّهَّرنَ ہے جس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ بیوی کے قریب جانے کے لئے حیض کا بند ہونا ہی کافی نہیں بلکہ غسل کرنا بھی ضروری ہے، چنانچہ دو مختلف قرأتوں سے الگ الگ مسائل کے استنباط سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ اس مسئلے میں تخفیف کا پہلو موجود ہے۔

جس طرح اہل مدارس جمود واِضمحلال سے تحقیق واجتہاد کی طرف، عصری علوم کی بیگانگی سے اس کے درس وتدریس کی طرف اور فقہ الواقع کی جہالت سے آشنائی کی طرف مثبت پیش رفت کر رہے ہیں اسی طرح ہم اپنی منتظمین مدارس سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ متنوع قرأتوں کی افادیت کے پیش نظر اس کی بطور نصاب تدریس کے مسئلے میں بھی اپنا کردار ادا کریں گے، تاکہ جہاں ہمارے نونہالان حفاظتِ قرآن کریم کی ایزدی ذمہ داری کی عملی تعبیر بن سکیں وہاں وہ قرآن کریم کے معنیٰ ومفہوم اور تشریح وتوضیح کو بھی منہج سلف کے مطابق بآسانی سمجھ سکیں اور اس طرح قرأت قرآنیہ کو 'فتنۂ عجم' کہنے والے دانش بازوں کے سامنے مضبوط چٹان کی صورت میں کھڑے ہو جائیں، تاکہ ہوائے نفس کی پیروی کرنے والے، جو خود فتنۂ عجم ہیں، اپنے فتنہ کو متعدی نہ کر سکیں۔ اسی طرح ان کے فکری اکابرین بھی

جوقرآن کریم کو بھی تورات وانجیل کی طرح بازیچۂ اطفال بنانے کا مذموم ارادہ رکھتے ہیں، ناکام ونامراد ہوجائیں اور جان لیں کہ قرآن کریم کی حفاظت کو عملی تعبیر دینے والے بیداری کے ساتھ روئے زمین پر موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

اختلافِ قرأت کے سلسلہ میں کسی اجنبیت کا شکار ہونے کے بجائے اس کے سلسلہ میں سادہ بصیرت کا استعمال بھی شافی اطمینان دے سکتا ہے۔ دیکھیے کہ ایک زبان جب مختلف علاقوں اور قبائل میں پھیلی ہو تو بسا اوقات اس کے بعض الفاظ کے استعمالات اور لہجوں میں اتنا فرق واقع ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ کے رہنے والوں کے لیے دوسری جگہ والوں کے لہجوں میں بات کرنا بڑا مشکل محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کا حال ہے۔ جب قرآن مجید دورِ نبوت کے مشہور قبائل قریش، ہذیل، تمیم، ربیعہ، ہوازن اور سعد بن بکر میں پھیلا تو ان کی عربی میں کئی فرق پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کو سات حروف (لغات ولہجات) میں اتارنے کی ایک اہم حکمت یہ بھی تھی کہ اس کے پہلے مخاطبین ایک ہی لہجے کے تکلف کا شکار نہ ہوں۔ البتہ جب بعد ازاں لوگوں کے مختلف انداز سے کلام حکیم کو پڑھنے سے مغالطے پیدا ہونے لگے، تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے تمام حروف کو یکجا جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا سرکاری سطح پر اہتمام فرمایا، اگرچہ رسم الخط میں قریش کے روے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی مطبوعہ قرآن میں کئی لفظوں کو اپنے حروف میں لکھ کر بعض حروف کے اوپر دوسرا حرف بھی ڈال دیا جاتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس حرف کی جگہ وہ بھی پڑھا جاسکتا ہے جیسے 'سورۂ غاشیہ کی آیت "لَستَ عَلَیهِم بِمُصَیطِرٍ" میں 'ص' کے اوپر 'س'... چونکہ اس زمانہ میں عربی کتابت نقاط وحرکات سے خالی ہوتی تھی، اس لیے ایک ہی نقش میں متنوع قرأتوں کے سمونے کی گنجائش موجود تھی، لیکن بعد میں جب لفظوں اور حرکتوں سے متنوع شکلوں کا فرق واضح ہونے لگا، تو قرآن

مجید بھی علیٰحدہ علیٰحدہ قرأتوں میں شائع ہونے لگے۔ اسی طرح دنیا کے مختلف خطوں میں مخصوص قرأتیں رائج ہوئیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق (برصغیر ہندوپاک، وسط ایشیا اور ایران وعراق سمیت شرق اوسط) میں جس طرح "قرأت امام عاصم کوفی... بروایت حفص" مروج ہے، اسی طرح قرون وسطیٰ کے مغرب (شمالی افریقہ تا اندلس) میں "قرأت امام نافع مدنی... بروایت ورش" عام ہے۔ دنیا بھر میں ان دو قرأتوں کے علاوہ دیگر قرأت میں بھی قرآن مجید مشہور نشریاتی اداروں کی طرف سے مسلمان حکومتوں کے اہتمام میں چھپتے آرہے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم میں کتابت کی بجائے اصل 'تلاوت' ہے، لہٰذا خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ماہرین قرأت کے ساتھ 'مصحف امام' کی نقول مختلف جہات میں روانہ فرمائی تھیں اور آج تک انہی قراء کے حوالہ سے متعدد قرأتوں کی متواتر روایت نبی کریمؐ تک نہ صرف محفوظ ومامون ہے، بلکہ ہر زمانہ میں لاکھوں قاری اپنی مخصوص قرأتوں میں ان کی تلاوت کرتے ہیں اور دوسروں کو حفظ کرانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں علمی اور تحقیقی کام بھی بہت وسیع وعریض ہے۔

مغرب کے سیاسی اور فکری غلبے کے نتیجے میں جب مسلمانوں کے دین وایمان سے متعلقہ علوم پر بھی مستشرقین نے یلغار کی، تو انہیں 'محمد عربیؐ' کی سنت وسیرت کا کمال اور قرآن کی حفاظت کا اعجاز بہت کھٹکا، کیونکہ دنیا بھر میں 'قرآن' کے علاوہ کسی الہامی کتاب کی اس طرح انتہائی حفاظت وتلاوت کا تو دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ بہت سوں نے سیرت رسولؐ کے بارے میں شبہات پھیلائے تو دوسروں نے قرآن کی قرأتوں کو 'فتنۂ عجم' بتا کر اشکالات پیدا کرنے کی کوشش کی، حالانکہ قرأت کا تنوع قرآن کے اعجاز ہی کا ایک پہلو ہے، اس میں اختلاف کا تضاد ممکن ہی نہیں۔

چونکہ دورِ حاضر مسلمانوں کے علمی انحطاط کے ساتھ ساتھ ایمان وعقیدہ کی کمزوری سے بھی دوچار ہے، لہٰذا بعض نام نہاد اہل علم ... مغرب کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے متاثر ہونے لگے اورانہوں نے ایک طرف جہاں آزادی تحقیق کے نام پر سنت وحدیث کا انکار کردیا یا سنت وحدیث کو الگ الگ کر کے استخفاف حدیث کا رویہ اپنایا،تو دوسری طرف قرآنی علوم کی وسعت سے ناواقفی کی بناء پر اپنے ملک میں رائج قرأت کے علاوہ دوسری متواتر قرأتوں کا انکار کردیا، حالانکہ کتنی بڑی بوالعجبی ہے کہ قرآن جیسی عالمگیر کتاب کو اپنے علاقہ تک مخصوص کرلیا جائے، تاہم ان سب کمزوریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے 'ذکر' کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے، چنانچہ ان فتنوں کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں کی طرف سے اس کی حفاظت کے لیے ادنیٰ سے اعلیٰ مساعی مسلسل ہوتی رہتی ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں تجوید وقرأت کے مدرسے کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر تو یہ کام کر رہی رہے ہیں، علاوہ ازیں سرکاری اہتمام میں جامعہ ازہر اور مدینہ یونیورسٹی کے 'تجوید وقرأت' کے شعبے خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

گجرات کے دینی مدارس اور فن تجوید قرأت:

بلاشبہ ریاست گجرات کا علاقہ کئی معنوں میں مبارک وفیض رساں ہے۔ دین و شریعت کے پاسبانوں نے گجرات کے مختلف حصوں میں جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی آج بھی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ علوم اسلامی کی خدمت مختلف عہد میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں ہوتی رہی ہے اور ایک طویل عرصہ تک علاقہ گجرات پر دوسرے علاقے فائق رہے تاہم فی زمانہ صوبہ گجرات کے علماء ومبلغین ملک و بیرون ملک جس طرح دینی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ قابل رشک ہی نہیں بلکہ قابل ستائش بھی ہے۔

گجرات کو علم ومعرفت اور تہذیب وتمدن کے علاوہ اور وجوہات سے بھی امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔تاریخ کے مطالعہ اور مؤرخین کے سفرناموں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی یہ وہ واحد ریاست ہے جہاں اصحاب رسول ﷺ کے قدم مبارک پڑے ہیں۔

چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق صدر اور معروف تاریخ داں پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں:

''گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گھوارہ، ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا ہے، روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں۔بعض اعتبار سے تو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ میں اسے پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا جس کے سرسبز پہاڑوں پر سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ پڑی تھی، ارض ہند سے عربوں کے تعلق کی ابتدا اسی خطۂ زمین سے ہوئی، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عربوں نے سواحل گجرات پر قدم رکھا، کوئی تعجب نہیں کہ کچھ صحابہؓ یہاں آئے ہوں اور اس سرزمین میں آسودۂ خواب ہوں''

(''یادِ ایام'' یعنی مختصر تاریخ گجرات ص:۱۱-۱۲)

ریاست گجرات کو دوسرا شرف یہ حاصل ہے کہ فن حدیث کا پہلا مصنف بھی اسی سرزمین کی آغوش میں پیوند خاک ہے۔ ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ المہدی باللہ نے عبدالملک بن الشہاب المسمعی کو جہاد کے لئے روانہ کیا تو اس کے ہمراہ ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے جنہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فن حدیث میں کتاب تصنیف کی تھی۔[''هُوَ أَوَّلُ مَن صَنَّفَ في الاسلام، دیکھئے ''کشف

الظنون'] عبدالملک نے عظیم فتح حاصل کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا اس لئے انہوں نے کچھ دنوں مزید قیام کرنا مناسب سمجھا، اسی دوران ہوا میں عفونت پیدا ہوئی اور تقریباً ایک ہزار افراد اس وبا کا شکار ہو گئے۔ ان شہداء میں ربیع بن صبیحؒ بھی شامل تھے اس لئے یہیں سپرد خاک ہو گئے۔ مؤرخین کے بقول یہ دوسرا شرف گجرات کو حاصل ہے کہ ایسا عظیم شخص اس کی آغوش میں خوابیدہ ہے جو فن حدیث کا پہلا مصنف ہے اور صاحب 'کشف الظنون' کی رائے میں مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے کتاب تصنیف کی ہے۔ ان کے حلقۂ تلامذہ میں امام سفیان ثوریؒ، امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام وکیع بن جراحؒ، امام علی بن عاصمؒ جیسے ائمۂ دین اور علماء عظام شامل ہیں۔

علاوہ ازیں ہندوستان میں بخاری شریف کی سب سے قدیم شرحیں 'مصابیح الجامع فی شرح صحیح البخاری' از بدرالدین محمد بن ابوبکر اور فیض الباری فی شرح صحیح البخاری مصنف سید عبدالاول بن علاء الحسینی گجرات میں ہی لکھی گئی تھیں۔ یہاں علامہ شمس الدین سخاوی، علامہ ابن حجر مکی وغیرہ کے تلامذہ کافی تعداد میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انہوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں اپنی پوری زندگی بسر کر دی تھی۔ یہاں کی درسگاہیں اور خانقاہیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ہند سے علم ومعرفت کے شیدائیوں کو کھینچتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گجرات دینی وثقافتی زندگی کا مرکز ہو گیا تھا اور شاید ہی کوئی دینی یا علمی شعبہ ایسا ہو جس کے متبحّر علماء یہاں موجود نہ تھے۔ بقول علامہ سید عبدالحئی حسنی کہ ''علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا، تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا''۔

گجرات میں مشاہیر علماء متقدمین نے علم ومعرفت کی جو قندیلیں روشن کی تھیں ان کی لَو آج بھی باقی ہے۔ ہر زمانے میں اس سرزمین پر علماء کی ایک جماعت ایسی رہی ہے

جس نے اپنے اکابر علماء ومشائخ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علوم وفنون کی حتی المقدور آبیاری کی۔ ان کے نقوش وباقیات کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ ان گراں قدر خدمات کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی اپنی دینی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ آج بھی اسلامی علوم کے اہم فن 'تجوید قرأت' کی بقا اور فروغ میں اسی ریاست کے علما اور مدارس پیش پیش ہیں اور اس فن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اس تعلق سے حضرت مولانا غلام محمد وستانوی (رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا مہاراشٹر) کی کاوش ناقابل فراموش ہے۔ ان کی سرپرستی میں ملک بھر میں 'مسابقۃ القرآن الکریم' کا انعقاد اس فن کی جانب علماء، طلباء اور اہل علم کی توجہ مبذول کرانے کا نایاب طریقہ ہے۔ اسی طرح میری جانکاری کے مطابق گجرات کے جن مدارس میں فن تجوید وقرأت باضابطہ نصاب میں شامل ہے اور جہاں ماہر فن علماء اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں ان میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ، جامعہ اشرفیہ راندیر، جامعۃ القرأت کفلیۃ، جامعہ علوم القرآن جمبوسر، جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، دارالعلوم زکریا جوگواڑ، جامعہ حسینیہ راندیر، دارالعلوم عربیہ اسلامیہ کنتھاریہ، دارالعلوم فلاح دارین، جامعہ قاسمیہ علمیہ کھڑود، دارالعلوم عربیہ آنند اور جامعہ اصلاح البنات سملک، دارالعلوم حبیبیہ پانولی اور بستان آمنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں اول الذکر (جامعۃ القرأت کفلیۃ) میں باضابطہ یہ فن نصاب میں شامل ہے۔ اور یہاں ماہر فن اساتذہ اس شعبہ سے منسلک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملکی سطح پر اس فن کی ترویج واشاعت کیلئے مدارس میں 'بیداری پروگرام اور مذاکرہ' کا انعقاد کیا جائے۔ جن مدارس میں ماہر فن علماء ہیں اس تعلق سے ان کی خدمات حاصل کی جائیں تا کہ خدا کے کلام اور مذہب کی سب سے مقدس کتاب کو پڑھنے کا ان میں سلیقہ آئے۔

نئی نسل کو بھی اس فن سے روشنی ملتی رہے۔ اس فن پر لکھی گئی کتابوں کو وسیع پیمانے

پر عام کیا جائے۔اس کو شائع کرنے کا معقول انتظام کیا جائے تا کہ اہل علم، علماء اور طلباء اس سے یکسر مستفید ہو سکیں۔

یہاں ایک امر توجہ طلب یہ ہے کہ علماء گجرات جو اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے دوسری ریاست کے علماء سے بڑی حد تک ممتاز رہے اور ان کی بعض خدمات تو اس پایہ کی ہیں کہ معاصر علماء سے بہت آگے نکل چکے ہیں اس فن کی ترویج وترقی میں بھی اہم رول نبھا کر تاریخ کا حصہ بن سکتے ہیں۔

ذَالِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَن یَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ

۞ ۞ ۞

ہندوستان میں حج کا انتظام وانصرام

زیر اہتمام	:	اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ اینڈ تبونگ حج، ملیشیا
بمقام	:	کنونشن ہال، اشوک، نئی دہلی
بتاریخ	:	۲۷؍رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۹؍جون ۲۰۱۲ء

نحمدہ' ونصلی علی رسوله الکریم اما بعد!

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اِنَّ اَوّلَ بَیۡتٍ وُضِعَ لِلنَّاس لَلَّذی بِبَکَّةَمُبٰرکاً وَّ هُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ."

(سورۂ آل عمران: ۹۶)

(بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو)۔

"اِنَّما الۡبَیعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا واَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَیعَ و حَرَّمَ الرِّبٰوا، فَمَنۡ جَآءَہٗ، مَوۡعِظَةٌ مِنۡ رَّبِّہٖ، فَانۡتَهٰی فَلَه' مَاسَلَفَ، وَاَمۡرُہٗ اِلَی اللّٰه، وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئکَ

اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ o.'' (سورۂ بقرہ: ۲۷۵-۲۷۶)

(سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو، پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے اور جو کوئی پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے)۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ. (سورۂ بقرہ: ۱۵۸)

(بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدردان ہے سب کچھ جاننے والا)۔

اسلام کے اہم ترین رکن حج کے تعلق سے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ جن حضرات پر حج فرض ہے وہ اس کی ادائیگی کے لیے سعی کریں، جہاں تک ہندوستان جیسے ملک میں اجتماعی حج کے انتظام وانصرام کی بات ہے تو یہ ہمیشہ سے سوالات کے دائرے میں رہے ہیں۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ اس حساس مسئلہ پر پہلی بار آج ایک سنجیدہ بحث ہو رہی ہے۔ فکرمندان ملت کے اس با مقصد اور معنی خیز اجلاس کے انعقاد کے لیے ملک وملت کے ہمدرد وبہی خواہ جناب کے رحمٰن خان صاحب وزیر حکومت ہند مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ کسی مسئلہ پر غور کرنا اس کا نصف حل ہے، اس لیے

مجھے یقین ہے کہ آج کے اجلاس سے کچھ مفید ودور رس نتائج ضرور برآمد ہوں گے۔ آج میں کہنا چاہتا ہوں کہ دراصل حج سے متعلق امور کو سرکاری عمل سمجھنا ہی بنیادی طور پر غلط ہے، حج کے انتظام وانصرام کو جب تک عبادت سمجھ کر نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس کے نظام میں اصلاح ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک ''تبونگ حاجی'' کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کے تناظر میں حج کے انتظام وانصرام کی اصلاح کی بات ہے تو یہ خوش فکری مفید ثمرات برآمد کرے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں اب تک حج کے انتظام وانصرام میں سرکاری افسران کو کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے اور خدمت کے جذبے سے کام کرنے والی ریاستی حج کمیٹیاں ہوں یا رضا کار تنظیمیں، ان کا رول ذیلی ہو کر رہ گیا ہے، جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ سرکاری حکام کا کردار ذیلی ہو اور رضا کار تنظیموں اور ریاستی حج کمیٹیوں کا کردار کلیدی ہو۔ اس بات کو بھی شدت سے محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ حج کے انتظام وانصرام میں علماء ودینی قائدین کی خدمات نہیں لی جاتیں، جب کہ علماء اس خدمت کو عقیدت ومحبت سے انجام دے سکتے ہیں۔ امید کہ میری معروضات پر غور کریں گے۔

بیت اللہ کی تاریخ اور فضائل ومناقب

تعمیر کعبہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے کچھ عرصہ قبل بیت اللہ سیمنٹ کے بغیر ایک دوسرے پر رکھے ہوئے سادہ پتھروں کی صورت میں تھا۔ اس کی اونچائی انسانی قد سے زائد تھی۔ کچھ لوگوں نے کعبہ کا خزانہ لوٹنے کا پروگرام بنایا جو کہ کعبہ کے اندر ایک کنویں میں تھا، اس لئے قریش نے ارادہ کیا کہ اسے مزید اونچا کر کے چھت ڈال دی جائے۔

اتفاقاً ان دنوں سمندر نے جدہ کے قریب ایک رومی تاجر کا جہاز ساحل کی طرف

پھینک دیا، وہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ قریش مکہ نے اس کی لکڑی کو چھت کے لئے منتخب کیا۔ جب سابقہ عمارت گرانے کا وقت آیا تو لوگ ڈرنے لگے، مگر ولید بن مغیرہ نے گرانا شروع کر دیا۔ جب اس سے کچھ نہ ہوا تو دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجرِ اسود نصب فرمانا:

تمام قریشی قبائل نے کعبہ کی تعمیر کے لئے اپنے اپنے طور پر الگ الگ پتھر جمع کئے پھر کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ جب عمارت ''حجر اسود'' والی جگہ تک اونچی ہوگئی تو ان میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ حجر اسود نصب کرنے کی سعادت ہمیں ہی حاصل ہو حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔

چار پانچ دن اسی طرح گزر گئے پھر وہ مسجد حرام میں جمع ہوئے اور باہمی مشورہ شروع کیا تاکہ حق وانصاف سے فیصلہ ہو سکے۔ بعض مؤرخین کے مطابق ابواُمیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم نے جو کہ اس وقت قریش میں سب سے بزرگ شخص تھے، یہ تجویز پیش کی کہ اس اختلاف کو طے کرنے کے لئے تم اس شخص کو فیصل مان لو جو کل صبح سب سے پہلے مسجد میں داخل ہو۔ ان کی اس تجویز کو وہ سب مان گئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اگلے دن سب سے پہلے داخل ہونے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چنانچہ آپ کو دیکھتے ہی وہ سب کہنے لگے: ''یہ امانت دار شخص ہیں ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں۔''

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے پوری صورت حال آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس ایک کپڑا لاؤ۔''

کپڑا لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود اس میں رکھ دیا پھر فرمایا: ''ہر قبیلہ اس کپڑے کا کوئی نہ کوئی کنارہ پکڑ لے پھر سب مل کر اٹھاؤ''۔

جب وہ اس طرح اٹھا کر اصل جگہ کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اصل جگہ پر نصب فرما دیا۔ سب لوگ اس تدبیر سے بہت خوش ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کعبہ:

جب سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت کی طرف سے خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے حرم مکہ میں پناہ لینے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اپنے دوست احباب جمع کئے، یزید کی خرابیوں کا تذکرہ کیا اور اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔

یزید کو پتہ چلا تو اس نے انہیں قید کرنے کیلئے اپنے لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی یزید لشکر کی تیاری ہی میں مصروف تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اہل مدینہ نے اس کے گورنر اور بنو امیہ کے افراد کو مدینہ منورہ سے نکال دیا ہے، البتہ سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے خاندان کو رہنے دیا ہے۔ تو اس نے پہلے اہل مدینہ کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجا۔

جب یہ لشکر فتح مند ہوا تو اس نے اسی لشکر کو حصین بن نمیر کی قیادت میں مکہ جانے کا حکم دیا۔ اس لشکر نے مکہ مکرمہ جا کر چند دن لڑائی کی، حضرت سیدنا ابن زبیرؓ نے اپنے ساتھیوں کو جمع فرمایا اور مسجد حرام میں پناہ گزیں ہو گئے۔

چونکہ کعبہ کے ارد گرد خیموں کی کثرت تھی۔ ایک خیمے میں جو آگ لگی تو دوسرے خیموں تک پھیل گئی۔ اس دن ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ اس وقت کعبہ لکڑی اور پتھر سے بنا ہوا تھا اور اوپر غلاف بھی تھا۔ ہوا کے شعلے اڑے تو غلاف کعبہ کو آگ لگی۔ آگ ایسی بڑھی کہ غلاف کے ساتھ لکڑی بھی جو کہ پتھروں کے درمیان تھی، سب جل گئی۔

اس طرح بیت اللہ کی دیواریں کمزور ہو گئیں حتیٰ کہ اوپر سے پتھر گرنے لگے۔ اگر کوئی کبوتر بھی کعبہ کی عمارت پر آ بیٹھتا تو پتھر گرنے لگتے۔ یہ دیکھ کر مکہ والے حتیٰ کہ یزیدی

لشکر والے (وہ لوگ جو شام سے لڑنے کی غرض سے یہاں پہنچے تھے) بھی گھبرا گئے۔ حصین بن نمیر نے سیدنا ابن زبیرؓ اور ان کے ساتھیوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ سیدنا ابن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ کے چند معتبر لوگوں کو اس کے پاس بھیجا، انہوں نے حصین سے کہا: ''جس نوجوان (یزید بن معاویہ) کی ابن زبیرؓ نے بیعت نہیں کی تھی، وہ فوت ہو چکا ہے، (اس کی وفات کعبہ کو آگ لگنے کے ستائیس دن بعد ہوئی تھی) تو اب تم ہم سے کس لئے لڑائی پر مصر ہو؟ تم واپس چلے جاؤ اور دیکھو تمہارے نئے حاکم (معاویہ بن یزید) کی رائے کا کیا انجام ہوتا ہے؟ لوگ اس پر متفق بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟''۔

وہ لوگ اس پر مسلسل زور دیتے رہے حتیٰ کہ وہ لشکر شام کی طرف لوٹ گیا۔ کعبہ کو آگ لگنے کا واقعہ بروز ہفتہ ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو پیش آیا اور حصین بن نمیر کی واپسی ۵ ربیع الثانی ۶۴ھ کو ہوئی۔ جب شامی لشکر واپس چلا گیا تو سیدنا ابن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ کے سرداروں اور معزز لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کعبہ کی جلی ہوئی عمارت کو گرانے کے بارے میں مشورہ لیا، بہت کم لوگوں نے اس بات کی تائید کی۔ اکثر لوگوں نے اس سے انکار کیا۔ سب سے زیادہ اس کے مخالف سیدنا عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ انہوں نے فرمایا: ''کعبہ کو اسی حالت پر رہنے دو جس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے تمہارے بعد آنے والے حکمران اسے گراتے بناتے رہیں گے جس سے اس کا احترام غارت ہو جائے گا، ہاں اسی کو مرمت وغیرہ کر دو۔''

حضرت ابن زبیرؓ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی بھی یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اپنے ماں باپ کے گھر کو صرف پیوند لگاتا رہے، تو میں کیسے بیت اللہ کو صرف پیوند لگانے پر اکتفا کر لوں؟ جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کی دیواریں اوپر سے نیچے تک ہل رہی ہیں اور کبوتر بیٹھنے سے بھی اس کے پتھر گرنے لگتے ہیں۔''

پھر کچھ دن تو حضرت ابن زبیرؓ انتظار اور مشورہ فرماتے رہے آخر انہوں نے کعبہ کی اس عمارت کو گرانے کا فیصلہ کر لیا۔ نیز وہ چاہتے تھے کہ بیت اللہ کو اصل ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کریں جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''عائشہؓ! تجھے علم نہیں کہ جب تیری قوم (قریش) نے کعبہ بنایا تھا تو وہ بیت اللہ کو مکمل ابراہیمی بنیادوں پر نہیں بنا سکے تھے، بلکہ انہوں نے کچھ حصہ کم کر دیا تھا۔''

میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! تو پھر آپ اسے دوبارہ ابراہیمی بنیادوں کے مطابق کیوں نہیں بنا دیتے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لولا حدثان قومک بالکفر لفعلت'

''ابھی تیری قوم (قریش) کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اگر ان کے مرتد ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ایسا کر گزرتا۔''

سیدنا ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: ''میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حطیم والی جانب کے دونوں کونوں کو (طواف کے دوران میں) اسی لئے ہاتھ نہیں لگایا تھا کہ وہ صحیح ابراہیمی بنیادوں پر نہیں۔''

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: ''میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''کیا وجہ ہے بیت اللہ کا دروازہ اونچا لگایا گیا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری قوم (قریش) کا مقصد یہ تھا کہ جسے چاہیں بیت اللہ میں داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں روک لیں۔''

ایک اور حدیث میں ہے: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قریش ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے ہیں تو میں کعبہ کو گرا کر دوبارہ بناتا اور اس میں دو دروازے لگا دیتا۔ ایک سے

لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر نکلتے'' چنانچہ سیدنا ابن زبیرؓ نے یہ کام انجام دیا۔

انہوں نے کعبہ کی جلی ہوئی عمارت گرا کر اسے اصل ابراہیمی بنیاد کے مطابق بنا دیا، جب کہ قریش نے (حلال مال کی کمی کی وجہ سے) کچھ کم کر دیا تھا۔ سیدنا ابن زبیرؓ نے حطیم کو بیت اللہ میں داخل کر دیا اور دو دروازے لگا دیے، ایک مشرقی جانب اور دوسرا مغربی جانب۔

جب عبداللہ بن زبیرؓ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کو نیچے سے اوپر تک اندر باہر خوشبو لگائی، قباطی کپڑے کا نیا غلاف چڑھایا اور فرمایا: ''جس شخص پر میری اطاعت ضروری ہے (جس نے میری بیعت کر رکھی ہے) وہ جائے اور تنعیم سے احرام باندھ کر بیت اللہ کا عمرہ کرے پھر جو شخص وسعت رکھتا ہو وہ اونٹ ذبح کرے اور جو اونٹ ذبح نہیں کر سکتا وہ بکری ذبح کرے۔

پھر آپ پیدل چلے، لوگ بھی آپ کے ساتھ پیدل چلے حتیٰ کہ سب نے تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کیا۔ مقصد، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا تھا۔ اس دن سے زیادہ کبھی غلام آزاد ہوئے نہ اونٹ اور بکرے ذبح ہوئے اور نہ اس دن سے بڑھ کر کبھی صدقہ کیا گیا۔ سیدنا ابن زبیرؓ نے خود سو اونٹ ذبح کیے۔ پھر جب طواف کیا تو چاروں کونوں کو ہاتھ لگایا اور فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو (شمالی وغربی) کونوں کو اس لئے ہاتھ نہیں لگایا تھا کہ اس وقت بیت اللہ مکمل نہیں تھا۔''

اس کے بعد بیت اللہ اسی حال پر رہا۔ جب کوئی شخص طواف کرتا تو چاروں کونوں کو ہاتھ لگاتا اور مشرقی دروازے سے بیت اللہ میں داخل ہو کر مغربی دروازے سے نکلتا۔ دروازے زمین پر تھے۔ حضرت سیدنا ابن زبیرؓ شہید کر دیئے گئے۔ حجاج، مکہ میں داخل ہوا، اس نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو ابن زبیرؓ کی تعمیر کا سارا واقعہ لکھ بھیجا۔ عبدالملک نے

جواب میں لکھا: ''مغربی دروازہ جسے ابن زبیرؓ نے بنایا ہے، بند کر دو اور جو بیت اللہ کی عمارت میں حجر کی جانب اضافہ کیا ہے وہ بھی گرا دو۔''

حجاج نے چھ ہاتھ اور ایک بالش (تقریباً دس فٹ) حجر کی طرف سے عمارت گرا دی اور پہلی طرح کا غلاف چڑھا دیا۔ باقی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بعد میں عبدالملک کو حضرت عائشہؓ کی حدیث پہنچی تو اسے اپنے حکم پر بہت افسوس ہوا لیکن اس نے بیت اللہ کو اسی طرح رہنے دیا، اس میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

جب ولید بن عبدالملک کی خلافت کا دور آیا، تو اس نے مکہ مکرمہ کے گورنر خالد قسری کو چھتیس ہزار دینار بھیجے۔ اس نے کعبہ کے دروازے، پرنالے اور اندرونی ستونوں وغیرہ پر سونے کے پترے چڑھا دیے۔ اسلامی تاریخ میں ولید بن عبدالملک وہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے بیت اللہ میں سونے کا کام کرایا۔

وما علینا الا البلاغ

علامہ اقبال کی شاعری میں فکر وفن کا امتزاج

زیر اہتمام	:	عالمی رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ
بمقام	:	جبرئیل انٹرنیشنل اسکول کلکتہ
بتاریخ	:	۲۹/محرم الحرام تا یکم/صفر المظفر ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۴/تا ۱۶/دسمبر ۲۰۱۲ء

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ افضل الانبياء و المرسلين. اما بعد!

صدر عالی قدر، مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی الندوی دامت الطافکم العالیہ صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی اور اسٹیج پر تشریف فرما معزز علماء کرام، ارباب دانش و بینش اور حضرات سامعین!

سب سے پہلے میں یہ عرض کروں کہ یہ میری خوش بختی ہے کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اس مؤقر ادبی، ثقافتی، فکری اور اسلامی سمینار میں مجھ جیسے طالب علم کو اپنی بے ربط تحریر پیش کرنے کا قیمتی موقع ملا۔

آج کا یہ تاریخی سمینار جس شہر میں منعقد ہوا ہے وہ نہ صرف اپنی عظیم الشان وروشن تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوا ہے بلکہ اس شہر کا علمی وثقافتی میدان میں جو کردار رہا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دریائے ہگلی کے کنارے بسا کلکتہ وہ شہر ہے جس نے سراج الدولہ کی شکست کے بعد برطانوی سامراج کی کوکھ سے جنم لیا، یہ وہ شہر ہے جو سامراجی عزائم کا آئینہ دار رہا ہے۔ اس شہر کو انگریز سامراجیت نے مسلم حکمرانی کی باقیات کے لیے ایک طرح سے زنداں خانے کے طور پر استعمال کیا۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ واجد علی شاہ ہوں یا ٹیپو سلطان کے خاندان کے بچے کھچے افراد، یہ کلکتہ ہی تھا، جہاں ان لوگوں کو بسانے کے نام پر دامِ اسیری میں رکھا گیا۔ کلکتہ ہی وہ شہر رہا جہاں پر غیر ملکی سامراج نے صرف ہندوستان کو غلام بنانے کی منصوبہ بندی ہی نہیں کی، بلکہ یہاں سے غریب ہندوستانیوں کے سیکڑوں نہیں ہزاروں افراد کو بندھوا مزدور کے طور پر اجنبی دنیاؤں میں اس طرح لے جایا گیا کہ پھر وہ کبھی اپنے وطن واپس ہی نہ آسکیں۔ ماریشس، فیجی، ترنیداد و ٹوبیکو، سوری نام، گیانا جیسے دور دراز علاقوں میں لے جا کر اپنی معاشی فراغت وثروت کے لئے ان کا استعمال کیا گیا۔

تمام منفی پہلوؤں کے باوجود کلکتہ کو اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ جدیدیت، عقلیت پسندی اور روشن خیالی کے تصورات نے سب سے پہلے یہیں جگہ پائی۔ مسلمانوں میں بھی فرائضی تحریک ہو یا دودو میاں کی تحریک، ان کا تعلق چاہے اندرون بنگال سے رہا ہو، لیکن ان کے اثرات وآثار سے یہ شہر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اردو زبان وادب کے باب میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کون ہے جو میر امّن کی ''باغ و بہار'' کو فراموش کرسکتا ہے؟ کون ہے جو یہ بھلا سکتا ہے کہ اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' اسی شہر سے نکلا تھا؟ کون ہے جو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی اس کرم بھومی کو سلام کرنے

پر مجبور نہ ہو؟ یہ وہی شہر ہے جہاں مولانا نے تحریک آزادی میں شرکت کی غرض سے غافلوں کو بیدار کرنے کے لئے ''الہلال'' جیسا صور پھونکا۔ چناں چہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے لفظوں میں: مولوی ابوالکلام آزادؒ نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ''البلاغ'' نے اردو صحافت کو ایک نیا رخ اور نیا اسلوب عطا کیا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں کی عدالت میں مولانا آزادؒ نے ''قول فیصل'' سنایا۔ جہاں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ نے اردو صحافت کو ایک نئی جہت عطا کی۔ یہی وہ شہر ہے جہاں سے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ نے ''کامریڈ'' نکالا اور ان سب سے اوپر اٹھ کر دیکھئے تو یہی وہ شہر ہے جس نے غالب کو بھی مغلوب کرلیا اور اس نے بے ساختہ کہا:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

حضرات! اس تمہید کے بعد میں اصل موضوع پر آتا ہوں۔ میرے مقالہ کا عنوان ہے ''علامہ اقبال کی شاعری میں فکر وفن کا امتزاج'' میں اپنے مقالے کی چند شکستہ و پراگندہ سطور حاضرین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اپنے مقالے میں اپنے موقف کو اجاگر کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوسکا ہوں اس کا فیصلہ سامعین ہی کریں گے اور یہ یقیناً میرے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔ میں اپنی بات شروع کرنے سے پہلے مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمہ کی روح کو ان ہی کی زبان میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال اپنے عہد کا سب سے بڑا اسلامی مفکر تھا، لیکن علامہ کے مداحوں کے خیال میں کافی شبہے کی گنجائش ہے کہ اس کا فکری ماخذ مشرق، مسلم شیوخ و اکابر یا قرآن وحدیث تھا، بقول مولانا محمد عبدالسلام خان ندوی:

''وہ مغربی فلسفہ کے طالب علم تھے اور استاد بھی، یورپ کے جن اساتذہ سے انہوں نے اپنے علم کی پیاس بجھائی وہ بھی مغربی فلسفے کے اکابر واساطین تھے۔ مشرقی فکر اور مسلم فلسفے، کلام، فقہ واصول سے ان کی دلچسپی وقتی اور بالوجہ تھی۔ ان کا علوم اسلامیہ کا ذاتی مطالعہ محدود تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے علمی تصورات اور اسلامی منصوصات کو اپنے افکار میں مدغم کیا، لیکن ان کا زاویۂ نظر اور ان کی فکر کے سوتے مغربی ہی رہے۔

وہ مغرب کی عینک سے چیزوں کو دیکھتے تھے اور اسی کے لحاظ سے ان کی تقویم کرتے تھے۔ کچھ کو قبول، کچھ کو مسترد اور کچھ کی اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تفسیر وتعبیر کرتے''۔ (افکار اقبال، محمد عبدالسلام خان:106)

خود علامہ اقبال کا اپنا بیان ہے:

''میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی فلسفے کے مطالعے میں صرف ہوا ہے اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر میں اسلامی حقائق اور صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں''

(اقبال اور مغربی مفکرین:17)

مگر مولانا عبدالسلام خاں ندوی نے علوم اقبال کے بارے میں جو اپنی رائے قائم کی ہے، اس میں علامہ کے تمام فکری اور فنی سرمایہ کو مغربی افکار ونظریات سے کشید کیا ہوا بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جو فکری، علمی، ادبی اور فنی سرمایہ چھوڑا ہے اس کا تفصیلی

مطالعہ اس نظریے کا ساتھ نہیں دیتا، راقم الحروف بھی اس تجزیہ سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ فاضل موصوف نے علامہ کے فکروفن کے تعلق سے یہ رائے قائم کرکے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو بیجا نہ ہوگا۔ موصوف کی طرح اور بھی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے یہ اور اس سے مشابہ باتیں کہی ہیں لیکن حقیقت میں یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظر میں اقبال اپنے تمام تر شاعرانہ کمالات اور ادبی قد آوری کے باوجود اپنی اسلامی فکر اور اپنی اس پیغامبری کی وجہ سے جو اس فکر سے عبارت ہے، مطلوبہ مقام عظمت حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اللہ کے رسول کی حدیث ہے: **اَلْکَلِمَةُ الْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا**" (ترمذی عن ابی ہریرہ، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ: ج۲ص:۹۸) حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے تو اسے یہ جہاں بھی ملے اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ دراصل اقبال کی مغرب سے خوشہ چینی کا معیار یہی تھا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا شمار صف اول کے اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ حضرت مولانا کو اقبال سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل رہی ہے، اسی کے ساتھ مولانا کی علمی وفکری شخصیت کا ایک اہم اور نسبتاً نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بھی اقبال کی طرح مغرب اور مغربی افکار کا نہایت دیدہ وری کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ان کی عالمی سطح پر شہرت یافتہ کتاب "**مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِيْن**" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس میں مغربی فکر وفلسفے پر کامل بصیرت کے ساتھ تنقید کے جلو میں اسلامی فکر وتہذیب کے خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس تعلق سے ان کی بات دوسرے بہت سے ادباء اور قلم کاروں کے مقابلے میں جو مغربی اور اسلامی فکر وتہذیب پر بیک وقت گہری نگاہ نہیں رکھتے، زیادہ وزن، وقار کی حامل ہے۔ اس پہلو پر ان کا متوازن نقطۂ نظر فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ "وہ نقوش اقبال" میں

لکھتے ہیں:

"اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی فلسفہ کا مطلق اثر نہیں قبول کیا اور ان کا دینی فہم، کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں۔

اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:

طِلسم علم حاضر را شِکَستم — رَبُودم دانہ ودامَش گُسَستم
خدا داند کہ مانند براہیم — بناراوچہ بے پروا نِشَستم"

(نقوش اقبال، ص:69)

اقبال کے مغرب سے خوشہ چینی کی بحث کے تعلق سے یہ ایک نپی تلی اور افراط وتفریط سے پاک رائے ہے۔

اقبال کی فکری مطمحِ نظر اور نصب العین اسلامی حقائق ہیں جن کو سامنے رکھ کر انہوں نے آزادانہ مغربی فکر کا جائزہ لیا ہے اور اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کی ہے۔

میں نے جو کچھ بھی علامہ اقبال کی شخصیت اور علوم وافکار کے سلسلہ میں پڑھا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اقبال بیسویں صدی کا ایک ایسا عظیم مفکر شاعر ہے جس نے جدید فلسفے کے گہرے مطالعے، انسانی غمخواری کے شدید جذبے اور غیر معمولی فنی بصیرت کی مدد سے مشرق ومغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ اردو فارسی شاعری پر اقبال

کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ انہوں نے لطافت شعری کو مجروح کئے بغیر اسے حکیمانہ لب ولہجہ عطا کیا۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ:

''اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا ہے، دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ و ایقان، دوش بدوش کارفرما ملتا ہے۔'' (گنج ہائے گراں مایہ، ص:182)

ولیم ورڈس ورتھ (William Wordsworth) نے لکھا ہے کہ میری خواہش ہے کہ مجھے ایک معلم سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ اقبال بھی ولیم ورڈس ورتھ (William Wordsworth) کی طرح ایک معلم تھے۔ دنیا کی بڑی شاعری کا راز تعلیم وتربیت اور تہذیب واخلاق میں پنہاں ہے۔ شاعری کا زندگی سے جو ناطہ ہے اس کا تقاضا ہے کہ شاعری سے زندگی کی اصلاح وتہذیب کا کام لیا جائے۔ اقبال نے شروع ہی سے شاعری کو زندگی کا خادم اور اس کا پرستار بنایا ہے۔ ان کے نزدیک شعر وہی شعر تھا جس سے تنقیدِ کائنات وتہذیبِ حیات کا کام لیا گیا ہو اور شاعر وہی شاعر ہے جو ملت کو پیغامِ سَروش سناتا ہو۔

شاعری کا یہ تصور اقبال کو اپنے معنوی استاد مولانا جلال الدین رومیؒ سے ملا جو ''شاعری جزوے ست از پیغمبری'' کہہ کر شعر کی پیغمبرانہ شان دکھا چکے تھے۔ اسی طرح علامہ الطاف حسین حالیؒ نے شعر کو کائنات کی اصلاح کا ذریعہ قرار دیا تھا اور اقبال سے پہلے مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھ کر بانگِ دَرا کا کام لیا اور قومی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا۔

پیامی شاعر، اقبال سے پہلے بھی ہوئے اور بعد کو بھی۔ فلسفیانہ اندازِ بیان اور شاعروں نے بھی اختیار کیا، لیکن جس شاعر نے مربوط ومنضبط فلسفے کو شعر کے سانچے میں کامیابی کے ساتھ ڈھال دیا وہ اقبال تھے۔ اقبال نے حکمائے مشرق ومغرب کا گہرائی سے

مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے ملت اسلامیہ کے حالات کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی زبوں حالی کے اسباب کا پتہ لگانا چاہا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں ذوق عمل سے محرومی سب سے بڑی بیماری ہے۔ مسلمان دنیا کو حقیر اور ناقابل التفات سمجھنے لگے تھے اور دنیوی ترقی کو گمراہی خیال کرتے تھے اور ان سب کی وجہ وحدۃ الوجود کا غیر اسلامی نظریہ تھا جو مسلمانوں میں مقبول ہو کر ان کا جزو ایمان بن گیا تھا۔ چونکہ اقبال فلسفہ کے طالب علم تھے، اس لئے انسان کی بے بضاعتی کے فلسفے سے ان کی تشفی نہ ہوسکی۔ انسان کیا ہے؟ اس کا کیا مقام ہے؟ اس کے دنیا میں بھیجے جانے کی غرض وغایت کیا ہے؟ اسے اشرف المخلوقات کیوں کہا گیا؟ یہ وہ سوالات تھے جن پر اقبال نے غور کیا اور یہ راز ان پر منکشف ہوا کہ انسان کا وجود حقیقی ہے۔ انسان کو جب تک یقین نہ ہو کہ اس کا وجود حقیقی ہے وہ خلاصۂ کائنات ہے۔ خدا نے اسے بہترین تقویم پر پیدا کیا ہے۔ زمین وآسمان ہر شے کو اس کا تابع بنایا ہے۔ وہ مجبورِ محض نہیں سعی وعمل کا اختیار رکھتا ہے اور اپنی محنت کا ثمر پاتا ہے۔ جب تک انسان میں ذوق عمل پیدا نہ ہو وہ ترقی کے مراحل طے نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ انسان کو اس کے اصل رتبے سے روشناس کرایا جائے۔ اقبال نے اس کا بیڑا اٹھایا اور اس احساس نفس اور عرفان ذات کو ''خودی'' کا نام دیا اور یہی خودی اقبال کی شاعری کی فکری اساس اور اثاثہ ہے۔

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ اقبال کی نگاہ میں زیادہ اہمیت کی حامل کون سی چیز ہے: فکر یا فن۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے قائل تھے، لیکن ان کی نظر میں فکر کی اہمیت سوا تھی۔ اس لیے بسا اوقات فن سے سمجھوتہ کر لیتے تھے، جس کی مختلف مثالیں موجود ہیں لیکن وہ اپنی فکر سے انحراف اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کو گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اسی بنا پر مثال کے طور پر ''ضرب کلیم'' کی بہت سی نظموں میں فکر پورے طور پر فن پر حاوی نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز اقبال کی شاعری کو حیات جاودانی عطا کرتی ہے۔ اس پہلو پر بعض ناقدین فن نے تنقیدیں کی ہیں جن میں ایک اہم نام کلیم الدین احمد کا ہے، لیکن وہ اپنے انتہا پسندانہ نظریات کی وجہ سے مَو ردِ طعن واعتراض بنے رہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' میں اس حیثیت سے اقبال کی شاعری پر کیے جانے والے اعتراضات کا شافی جواب دینے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے نظریے کے برعکس اس بات کو مدلل کیا ہے کہ اقبال کی شاعری کس طرح اور کن امتیازی اوصاف کی بنا پر عالمی ادب میں مقام بلند حاصل کرنے کی اہل ہے۔

اقبالیات کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دراصل اقبال اس ادب کے قائل تھے جو زندگی کو سنوارنے میں انسان کا مددگار ہو، اس لئے انہوں نے خود کو ایک پیغامبر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا اور بار بار کہا کہ: میں کہاں اور شعر و نغمہ کہاں، گویا اقبال فکر کو زیادہ اہم سمجھتے تھے اور آرٹ کو زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ شعر کے فنی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنے پیغام کو زیادہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال شعر گوئی کی صلاحیت کو خداداد مانتے ہیں، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

ہرچند کہ ایجاد معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر و تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کا تصورفن ''فن برائے زندگی'' اور ''فن برائے فن'' کی بنیادی صداقتوں کا جامع ہے، حالانکہ سچ یہ ہے کہ فن برائے فن اور برائے زندگی کی اصطلاحیں آج فرسودہ ہوچکی ہیں۔ صرف وہ شاعری زندہ رہتی ہے جس میں فکر فن بن جاتی

ہے اور فن فکر۔ سچے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں لفظ اور خیال دونوں موم ہوکر شعر کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ بڑے فنکار کو خام مواد اور وسیلۂ اظہار دونوں پر یکساں حاکمانہ قدرت حاصل ہوتی ہے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ فنکار ہمیشہ فن کی بلندیوں پر ہی رہے۔ کبھی فکر پوری کامیابی کے ساتھ فن میں ڈھل جاتی ہے، کبھی خام رہ جاتی ہے اور کبھی فنکار نا کام ہوجاتا ہے۔

زبان و ہیئت اور اسلوب کے بارے میں اقبال کا رویہ کلاسیکی فنکاروں کی روایت پرستی سے الگ ہے۔ اقبال جذبے کی شدت اور تخیل کی جولانی و بے باکی پر زیادہ زور دیتے ہیں، بلکہ بسا اوقات جذبہ وفکر کی لطافت پر فن کے لوازم وشرائط قربان کردیتے ہیں۔ اقبال جذبے اور فکر کو فن کی روح قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک خون جگر کے بغیر فنکار کوئی نقش مکمل نہیں کرسکتا۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دَین ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لئے پر اثر الفاظ کی تلاش کرے۔'' (اقبال نامہ حصہ اول:280) تاہم وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ شاعری کے اسلوب و ہیئت کا اصل معیار وہی ہے جو کلاسیکی شعراء کے یہاں معمول بہ رہا ہے۔ اسی لیے وہ فنی سطح پر عروض کی پابندیوں کے بغیر شعری تجربے کو پسند نہیں کرتے۔ (اقبال کامل، عبدالسلام ندوی ص:180) ان کی نظر میں جدید وقدیم کی بحث بالکل فرسودہ اور لایعنی ہے۔ جدت کی حقیقت انہوں نے ان لفظوں میں بیان کی ہے

کہ:''جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہوسکتا ہے''۔(ایضا بحوالہ اقبال نامہ)

اقبال کی شخصیت اور فکروفن کے ضمن میں یہاں پھر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی رائے کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اقبال کے شعر وشخصیت کو حیات جاودانی عطا کرنے میں، پانچ تخلیقی عناصر نے اہم کردار نبھایا جن میں پہلا عنصر ان کی نگاہ میں ان کا ایمان ویقین ہے اور دوسرا عنصر قرآن سے ان کی وابستگی۔(نقوش اقبال ص:48-46)

اقبال کے فکروفن کے مطالعے میں ان کے ان تخلیقی عناصر کو جب تک سامنے نہ رکھا جائے اس وقت تک اقبال کے فکروفن کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

اقبال کی شاعری کے ہر دور کا کلام ان کے دل کی آواز اور ان کے فکر کا مرقع ہے۔ مناسب فنی ترتیب اور مطالعہ ومشاہدہ کی وسعت کے ساتھ اگر جذبے کی قوت شامل ہوجائے تو شاعر کا تخیل آسمان کے تارے توڑلاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ جملہ شرائط جمع ہوگئی تھیں، اس لئے ان کی فکر کی کارفرمائی میں شعری اسلوب گوشے گوشے میں نمایاں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ادبی فن خلا میں معلق نہیں ہوتا۔ شاعر کے مزاج، ماحول اور تجربات سے اس کا بڑا ناگزیر رشتہ ہوتا ہے۔ تجربات اور کوشش اظہار کے باہمی تعلق سے وہ شے نمودار ہوتی ہے جسے فن کہتے ہیں۔ شاعرانہ فن میں ایک قابل غور سوال یہ ہے کہ شاعر نے اپنے مخصوص تجربات اور انفرادی احساسات کو ظاہری شکل دینے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے اور اس سلسلے میں کون کون سی اصناف استعمال کیں اور ان میں سب سے زیادہ کس صنف میں اس کی تخلیقی صلاحیت پھولی پھلی؟

دراصل اقبال نے فارسی اور اردو شاعری کی مروجہ اصناف کو استعمال کیا ہے، مگر

ان کے یہاں ان اصناف کو اصولی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ شعری پیکر کی تحریک وتشکیل تجربے کے تابع ہے۔ اس لئے ان کے یہاں مثنوی، غزل، قطعہ اور رباعی وغیرہ کی ظاہری شکلوں کی موجودگی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے ان خاص قسم کے مضامین کو بھی برقرار رکھا ہے جن کا قدیم زمانے میں ان اصناف سے خاص تعلق رہا ہے۔ مثلاً کسی نظم کا قصیدے کی شکل وصورت میں ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس میں قصیدے کے مضامین بھی ہوں ایسا نہیں ہے۔ چونکہ کسی فن پارے کی مجموعی ہیئت وتشکیل میں پیرایۂ بیان بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ غزل کا شعر مفرد یا ایک مختصر نظم میں محض ایک تشبیہ یا تمثیل، تضاد وتقابل کا کوئی پہلو یا شاعرانہ نکتہ سنجی کی کوئی صورت پیرایۂ اظہار کی بنیاد بن جاتی ہے۔ مثلاً نظم ''شاعر'' کی بنیاد ایک تشبیہ پر ہے:

شاعر رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

یا ایک اور نظم:

پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ

میں شاخ وشجر کی تمثیل سے فرد وقوم کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن اقبال کی طویل ترین نظموں میں ان کے تخیل کی نکتہ آفرینی اور جدت طرازی نے پیرایۂ اظہار کی نت نئی صورتیں نکالی ہیں۔ مثلاً مختلف نظموں کی فنکارانہ تشکیل میں مکالمہ نگاری کے ڈرامائی اسلوب سے کام لیا ہے۔ مکالمہ نگاری کی جتنی رنگارنگ صورتیں اقبال کے یہاں موجود ہیں شاید کسی اور کے یہاں ملے ''جاوید نامہ'' کا بیشتر حصہ مکالمات پر مشتمل ہے۔ اردو کی متعدد مشہور ومقبول نظموں میں بیان کی جدت وجاذبیت مکالموں کی رہین منت ہیں۔ صنعت گری کی شعوری کوشش اقبال کے کلام میں نہیں ملتی، غیر محسوس استعمال ضرور ملتا ہے۔

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک

شبنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہے چرچا ترا

البتہ پیکر تراشی سے اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے ان کے پیکر لمسی اور مشامی سے زیادہ سماعی اور بصری ہوتے ہیں۔

پتیاں پھول کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دست طفل خستہ سے رنگیں کھلونے جس طرح
چاند جو صورت گر ہستی کا ایک اعجاز ہے
پہنے سیمابی قبا محو خرام ناز ہے

رموز وعلائم کو شاعری میں ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، علامت، استعارہ اور کنایہ کا سہارا لے کر شاعر کم سے کم الفاظ میں اپنی بات اپنے مخاطب تک پہنچا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر زبان میں ایسے رموز وعلائم ہوتے ہیں جو کہنے اور سننے والے کے درمیان رابطے کی مختصر زبان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے اس کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، کعبہ و دَیر، شہباز و شاہین، ستارے اور جگنو اقبال کی خاص علامتیں ہیں جن سے انہوں نے مختلف مفاہیم ادا کئے ہیں۔

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافر شب! خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی

(ستارے کا پیغام)

تلمیحات سے بھی اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے۔ تلمیحات اقبال کا سرچشمہ قرآن واحادیث، تاریخ اسلام کے واقعات، پیغمبروں کی زندگی اور سبق آموز قصص

وحکایات ہیں۔

نظر تھی صورت سلماں ادا شناس تری
شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثل کلیم سودا تھا
اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لئے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

(بلال)

غرض اقبال نے مختلف فنی تدابیر کے ذریعے اپنے کلام کو دل نشیں اور پر اثر بنایا پھر اس سے اپنے فکر وخیالات کی اشاعت کا کام لیا۔

اقبال کی فکری اور فنی خوبیوں کو سمجھنے کے لئے ایک شاہ کار نظم ''مسجد قرطبہ'' پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ نظم ترکیب، بند کی ہیئت میں ہے۔ ہر بند میں اشعار کی تعداد مساوی ہے۔ ہر بند غیر مردف اشعار پر مشتمل ہے، لیکن ہر بند کی آخری بیت مردف ہے، اس التزام اور فنی اہتمام کے باوجود تلازمۂ خیال کی آزادرَو اور جذبہ وتخیل کے بہاؤ میں کہیں رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔

اس نظم میں شاعر نے اپنے لطیف جذبات اور پراسرار کیفیات کی ترجیحات میں رمزنگاری کا کمال دکھایا ہے۔ تغزّل میں تشبیہات واستعارات کے علاوہ ایک مرصع ساز فن کار تنہا ایک لفظ سے بھی رمزیت کا حق ادا کردیتا ہے، مثلاً اس شعر میں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

'دنوں کی تپش' اور 'شبوں کا گداز' جیسے سادہ الفاظ عرب مجاہدوں کے اسلوب زندگی اوران کے کردار کے جلال و جمال کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔اس طرح جہاں شاعر، یورپ کے انقلابات کا ذکر کرتا ہے اس کا ایک ایک شعر تاریخ کے ایک مکمل باب کا نچوڑ ہے۔مثلاً تحریک اصلاح دین اور پھراس کے نتیجے میں تحریک احیائے علوم کے فروغ کا بیان مندرجہ ذیل شعر میں کس اختصار و بلاغت سے ہوا ہے۔

حرف غلط بن گئی عصمتِ پیر کُنِشت
اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں

ایجاز واختصار کا یہ اعجاز جو تہذیب فن کا نتیجہ ہے صرف کلاسیکی فن کاروں کے کلام میں نظر آتا ہے اور اقبال کی یہ نظم اس اعجاز فن کا بہترین نمونہ ہے، اقبال کی یہ نظم قیمتی الفاظ و تراکیب کے موزوں انتخاب وترتیب سے شاعرانہ صناعی اور مرصع کاری کی بہترین مثال کے ساتھ ان کی فکر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

❁ ❁ ❁

ایڈس اور اسلامی تعلیمات

زیر اہتمام : ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ
بتاریخ : ۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۶؍فروری ۲۰۱۳ء
بمقام : جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

الحمد لله رب العٰلمين، والصلاة والسلام علٰى سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد و على آله و صحبه و علٰى من تبعهم باحسان و دعا بدعوتهم الٰى يوم الدين،اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ،بسم الله الرحمٰن الرحيم .

وَ قَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً ٥ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا

كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا○ (الإسراء: ۲۳-۲۴)

ایڈس ایک بھیانک مرض ہے۔ اس کی زد میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی آ رہے ہیں۔ یہ بذات خود مرض نہیں ہے، بلکہ یہ باب الامراض ہے۔ اس میں انسانی جسم کی قوت مدافعت، جو مختلف بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے اس کا اب تک کوئی کافی وشافی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ اس سے متاثرین کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ پوری دنیا میں اس مرض سے ۳۳ ملین/ تین کروڑ ۳۰ لاکھ سے زائد افراد متاثر ہیں۔ ہمارے ملک میں ۲۲ لاکھ مرد اور عورتیں ایڈس کی زد میں ہیں۔ بڑی تعداد میں بچے بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ جہالت اور لاعلمی کے سبب بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں، جن کی وجہ سے متاثرین کو سماج اور معاشرے میں طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خاص طور سے اس کا علاج دریافت نہ ہونے کی وجہ سے ایڈس زدہ افراد مایوسیوں کی دلدل میں گرتے جارہے ہیں۔ ان کے بارے میں نفرت اور تفریق کے جذبات جنم لیتے ہیں اور ان کو گھر، خاندان اور معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ڈاکٹر حضرات بھی غیر مناسب رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تعلق سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے اور لوگوں کو مرض کے بارے میں صحیح واقفیت فراہم کی جائے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایڈس زدہ افراد کے مسائل کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔

صبر کا نسخۂ کیمیا:

اسلام بتاتا ہے کہ موت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، جس کا سامنا ہر مخلوق کو کرنا ہے۔ دنیا میں بے شمار افراد ہیں، جو مختلف اسباب کی وجہ سے روزانہ موت کا شکار بن رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف ایڈس زدہ افراد کو موت آئے گی۔ لہٰذا ایسی صورت

میں جیسے دوسرے افراد حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور زندگی کے آخری لمحے تک جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اسی طرح ایڈس زدہ افراد کو بھی چاہیے کہ زندگی کا حوصلہ باقی رکھیں اور مایوسی میں مبتلا نہ ہوں۔ مصائب ومشکلات سے مقابلہ کرنے کے لیے اسلام نے ایک نسخۂ کیمیا پیش کیا ہے، جس کا نام ’صبر‘ ہے۔ خاص طور سے قرآن وحدیث میں پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جن کو ایک سنگین بیماری لاحق ہو گئی تھی اور ان کے جسم کے ٹکڑے سڑ سڑ کر گرتے چلے جارہے تھے۔ ایسے حالات میں بھی انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطا فرمائی اور ان کی زندگی کو تمام ایسے مریضوں کے لیے جو سنگین امراض میں مبتلا ہو جائیں نمونہ اور ماڈل بنایا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ (الانبیاء: ۸۳-۸۴)

(اور یاد کرو جب ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے، ہم نے اس کی پکار سنی اور اسے جو تکلیف تھی وہ دور کر دی۔ ہم نے اسے اس کے اہل وعیال دیے اور اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے، یہ رحمت ہے ہماری طرف سے اور عبادت گزاروں کے لیے نصیحت)

مرض چھوٹا ہو یا بڑا، قابل علاج ہو یا لاعلاج، ہر حال میں اسلام نے صبر کی تعلیم دی ہے، جو لوگ مذہبی اقدار کی اہمیت نہیں محسوس کرتے، ان کے نزدیک یہ ایک بے معنیٰ نصیحت ہے۔ اس سے ان کے مسائل حل نہیں ہوتے اور وہ ممکنہ تدابیر بھی اختیار نہیں کرتے، لیکن صبر کا یہ تصور غلط ہے۔ صبر اس بات کا نام ہے کہ آدمی مشکلات میں جزع فزع

اور گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرے۔شکوہ شکایت کی جگہ جم کر ان کا مقابلہ کرے۔جو تدبیریں اس کے بس میں ہوں ان کو پورے سکون کے ساتھ اختیار کرے اور نتیجے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے۔آدمی کی مضبوط قوت ارادی سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔صبر کے جذبے کو اسلام آخرت کے اجر وثواب کے ساتھ تقویت پہنچاتا ہے۔یہاں کی ہر مصیبت کو آخرت میں اجر کا باعث قرار دیتا ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ہریرةؓ عن النبی صلی اللہ علیه وسلم مایصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا الاذی ولا غم حتی الشرک الا کفر اللہ بها من خطایاہ (بخاری کتاب المرضیٰ باب ماجاء فی کفار المرض).

(حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان آدمی کو جو تکان یا مرض، فکر اور حزن، تکلیف اور غم لاحق ہوتا ہے، یہاں تک کہ کانٹا جو اسے چبھتا ہے اس کے ذریعے بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کردیتا ہے)

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مصیبت زدہ مریض کے ثواب کو دیکھ کر قیامت کے روز صحت مند انسان تمنا کرے گا کہ کاش وہ بھی بیمار رہا ہوتا اور اس اجر وثواب کا حق دار سمجھا جاتا۔

ہمدردی کی تعلیم:

ایڈس زدہ فرد کو سہارا دینے کا اسلام نے دوسرا طریقہ یہ بتایا ہے کہ اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور ہمدردی کی جتنی صورتیں ہیں، وہ سب اختیار کی جائیں۔مثال کے طور پر اس کی عیادت کرنا، خبر گیری کرنا، اس کی مالی مدد کرنا، خدمت کرنا، اس کے علاج کے لیے دوڑ دھوپ کرنا وغیرہ۔مریض کی تیمارداری کے سلسلے میں اسلام کی واضح تعلیم موجود ہے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مریضوں کی عیادت فرمائی اور عام مسلمانوں

کو حکم دیا کہ مریضوں کی عیادت کرو۔حدیث پاک ہے:

عن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اطعموا الجائع وعودوا المریض وفکوا المعانی (بخاری باب وجوب عیادة المریض).

(حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو اور غلام کو آزاد کرو یا قیدیوں کو چھڑاؤ)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جن لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھے گا، ان میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہیں، جو صحت مند تھے اور ان کے متعلقین میں کچھ لوگ بیمار رہے، مگر انھوں نے تیمارداری نہیں کی۔اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے پوچھے گا کہ میں بیمار ہوا، مگر تم نے میری عیادت نہیں کی، وہ کہے گا کہ اللہ رب العالمین تو سارے جہاں کا پالنہار ہے تو کیسے بیمار ہوسکتا ہے۔اللہ کہے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا، مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔اگر اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پاتا۔(مسلم کتاب البر والصلہ)

کسی بھی مریض کے ساتھ ہمدردی کا حق صرف اس کی عیادت سے ادا نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ اگر وہ دیکھ بھال اور مالی امداد کا محتاج ہے یا اسے جسمانی خدمت کی ضرورت ہے تو یہ ساری صورتیں اختیار کی جائیں گی۔اسلام نے الگ الگ دائروں میں ان تمام باتوں کی تعلیم دی ہے۔مثال کے طور پر مریض کے گھر والوں پر اس کی دیکھ بھال اور خدمت کرنا واجب ہے، اگر مریض کے والدین ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم قرآن نے جس اسلوب میں دیا ہے، اس کی تعبیر کسی اور زبان میں ممکن نہیں ہے۔ارشاد ربانی ہے:

وَ قَضیٰ رَبُّکَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ اَوْكِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً o وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً o (الإسراء: ۲۳–۲۴)

(والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ 'پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔)

اگر والدین یا ان میں سے کوئی ایک ایڈس میں مبتلا ہو جائے تو محض اس مرض کی وجہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کی یہ تاکید کالعدم قرار نہیں پاتی۔ بلکہ ایسی صورت میں اور زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی خدمت کرنا لازم ہوگا۔ اِسی طرح زوجین میں سے اگر کوئی ایڈس میں مبتلا ہو جائے تو اس کے حقوق جو شریعت نے متعین کیے ہیں، خاص طور پر ایک دوسرے کے ساتھ حسن معاشرت کی تعلیمات ساقط نہیں ہو جائیں گی بلکہ انسانی ہمدردی کے تقاضے کے تحت ان پر عمل کی تاکید اور زیادہ زور دے کر کی جائے گی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش و پرداخت والدین کا دینی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔ اگر بچوں میں سے کوئی ایڈس زدہ ہو جائے تو والدین کی رحمت و شفقت کا وہ اور زیادہ مستحق ہو جائے گا اور شریعت اسلامیہ نے کسی بھی صورت میں اولاد یا بچوں کے ساتھ رحمت و شفقت سے منع نہیں کیا ہے۔ اسلام میں صلہ رحمی کے مستقل احکام ہیں اور حدیث میں وارد ہے کہ صلہ رحمی کے معنیٰ صرف یہ نہیں ہیں کہ جو صلہ رحمی کرے اس کے ساتھ صلہ رحمی کیا جائے۔ بلکہ جو قطع رحمی

کرے اس کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرے۔

(بخاری، کتاب الآداب باب لیس الواصل بالمکافی)

ایڈس کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے مریض سے نفرت اور دوری کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ حدیث مذکور کے مطابق ایسے شخص سے قطع رحمی نہ کرنا فضیلت کا باعث ہے۔ ایک دوسری حدیث میں کہا گیا ہے کہ رحم رحمٰن سے مشتق ہے جو اس کو ملائے گا، اللہ اس کو ملائے گا اور جو اس کو کاٹے گا اللہ تعالیٰ اس کو کاٹے گا۔ (ترمذی)

عام حالات میں اگر شریعت اسلامیہ نے دوسروں کے ساتھ نرمی، حسن سلوک اور خیر خواہی کی تعلیم دی ہے تو ایسی صورت میں جب کوئی شخص زیادہ ہمدردی اور رحمت و شفقت کا مستحق ہو اس سے بیزاری اور دوری کو اسلامی شریعت کیوں کر گوارا کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دین اسلام کا مزاج یہ نہیں ہے، بلکہ یہ دین تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ قرار دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ خود رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے۔ اس نے رسول کو بھی رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ گویا رحم یا رحمت کی صفت غالب ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ انسان ایک دوسرے پر رحمت و شفقت ہی کا رویہ اختیار کرے۔ چونکہ بدقسمتی سے ایڈس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوسکا ہے، اس لیے اس مرض میں مبتلا اشخاص بھی رحم و کرم کے زیادہ مستحق ہیں۔

مرض کو روکنے کی تدابیر:

ایڈس زدہ افراد کے ساتھ ہمدردی کا تیسرا طریقہ اسلام یہ بتاتا ہے کہ اس مرض کے روکنے کی جملہ تدابیر اختیار کی جائیں اور اس کے بارے میں پوری سنجیدگی اختیار کی جائے۔ اس کے پیدا ہونے کے جو اسباب ہیں، ان کی گہرائی سے تحقیق کی جائے اور ان

سے کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔ شریعت اسلامیہ نے مرض پیدا ہونے کے بعد علاج کی ترغیب جتنے اہتمام سے دی ہے، اس سے زیادہ مرض کے لاحق ہونے کے اسباب سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے ثابت ہوتا ہے کہ علاج سے بہتر احتیاطی تدابیر ہیں اور اسلام نے ان کو اختیار کرنے کی پوری طرح سے تلقین کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

’جب رات ہوجائے تو کھانے پینے کے برتنوں کو ڈھانکنے، دروازوں کو بند کردینے اور چراغوں کو بجھادینے کا حکم دیا گیا ہے۔‘ (مسلم کتاب الاشربہ، باب استحباب تخمیر الانا نمبر ۶۴۲۵) اس طرح کی تمام ہدایات کا مقصد ممکنہ حادثے کا سدّ باب ہے۔

اسلام ایڈس کے معاملے میں بھی سدّ باب کی پوری تلقین کرتا ہے۔ ایچ آئی وی اور ایڈس (AIDS & HIV) کے بڑے اسباب میں ایک بڑا سبب جنسی بے راہ روی ہے۔ اس مرض کا آغاز اسی راستے سے ہوا۔ شریعت اسلامیہ میں نکاح سے باہر جنسی تعلقات کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں ہم جنسی اور جنسی بے راہ روی کی تمام شکلیں حرام ہیں۔ قرآن مجید میں ایک ایسی قوم کے بھیانک انجام کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جو جنسی بے راہ روی کا شکار تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے سخت ترین سزا سے دوچار کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلُوطاً إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ٥ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَآءِ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ٥ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّآ أَن قَالُوٓا أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ٥ فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ٥ وَأَمْطَرْنَا

عَلَيْهِم مَّطَراً فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ. (الاعراف: ۸۰-۸۴)

(اور لوطؑ کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا ’کیا تم ایسے بے حیا ہوگئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔‘ آخر کار اس قوم پر برسائی ایک بارش پتھروں کی پھر دیکھو ان مجرموں کا کیا انجام ہوا)

اسلام میں غیر پاکیزہ اشیاء مثلاً خنزیر کا گوشت، خون اور مردار حرام ہیں۔ مختلف طبی تحقیقات میں ان چیزوں کے ان گنت نقصانات ہیں، جب عام عقل کا تقاضا ہے کہ جراثیم زدہ کھانا نہ کھایا جائے تو جنسی تعلقات کے حوالے سے آخر اتنی آزادی کو کیوں روا رکھا جائے کہ آدمی جیسے چاہے اپنی جنسی تسکین کرے۔ ایڈس کا مرض ایک عام وبا کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت یہی ہے کہ نکاح کے اندر ہی جنسی تسکین کے اسلامی طریقے کو اختیار کیا جائے۔

ایڈس پھیلنے کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں، جیسے خون کی منتقلی، غیر محفوظ انجکشن، نشہ آور ادویہ کا ایک ہی سرنج سے استعمال وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ شریعت میں ممکنہ مرض سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے، لہٰذا اس مرض میں بھی وہ تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اسلام میں نشہ آور ادویہ کا استعمال حرام ہے، چاہے وہ سرنج کے ذریعے استعمال کی جائیں یا کسی اور ذریعے سے۔

بعض اوقات والدین سے یہ مرض بچوں میں منتقل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے مرض سے بچے کو بچانے کی بھرپور کوشش کریں اور تمام

ممکنہ علاج جاری رکھیں، جن سے ان کا آنے والا بچہ اس مرض سے محفوظ رہے، لیکن اگر اس کو مرض لاحق ہو جائے تو انتہائی ہمدردی کے ساتھ اس کے جملہ انسانی حقوق کی حفاظت ہونی چاہیے اور جب تک اس کی زندگی ہے اس کو جینے دینے کا پورا حق دینا چاہیے۔

بعض اوقات ایڈس زدہ افراد منفی نفسیاتی ردعمل کے طور پر اپنا مرض جان بوجھ کر دوسروں میں منتقل کر دینے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ یہ حرکت سراسر جرم ہے۔ انھیں صرف اور صرف صبر اور استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اِن شاء اللہ ان کے لیے یہ مرض کفارۂ سیئات کا باعث ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں شہادت کا درجہ حاصل ہو جائے۔ کیوں کہ بعض احادیث میں بعض امراض جیسے طاعون اور پیٹ کے مرض وغیرہ میں موت ہو جانے کو شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایڈس کے حوالے سے یہ بات بھی جاننی چاہیے کہ یہ مرض اس معنیٰ میں متعدی نہیں ہے کہ مرض زدہ آدمی کے ساتھ اٹھنے، بیٹھنے، ساتھ کھانے، ہاتھ ملانے، معانقہ کرنے یا ساتھ رہنے سے دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ مرض بعض مخصوص طریقوں سے دوسروں میں منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے ایڈس زدہ کو قابل نفرت سمجھنا اور اس کو گھر اور معاشرے میں الگ تھلگ کر دینا مناسب رویہ نہیں ہے۔ اس حرکت سے مریض کو بیماری کی تکلیف کے ساتھ ذہنی ونفسیاتی اذیت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

امارت شرعیہ کی تعمیر وترقی میں

حضرت مولانا سید نظام الدین کا کردار

بمقام	:	صابو صدیق ٹیکنیکل کالج، ممبئی
بتاریخ	:	۷؍ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۸؍جنوری ۲۰۱۶ء
زیر اہتمام	:	ادارہ دعوۃ السنہ، ممبئی
بہ اشتراک	:	جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار

1857ء کی جنگ کے مختلف پہلوؤں پر مؤرخین نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس جنگ میں ناکامی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے ملک جس افراتفری کا شکار ہو گیا تھا اس کی کوئی نظیر ہندوستان کے ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مذہبی، ملی، تہذیبی، تمدنی، اقتصادی اور اخلاقی تمام قدریں متزلزل ہو کر رہ گئی تھیں۔ گویا 1857ء کا عہد اس زوال پذیر دور کا نقطۂ عروج تھا۔

1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط

پوری طرح قائم ہوگیا تو ہندوستانی عوام پر گوروں کی ظلم وزیادتی بھی انتہا کو پہنچ گئی۔خاص طور پر مسلمانوں کو انہوں نے ٹارگیٹ کرنا شروع کردیا،ان کے مذہبی وملی تشخص کو ختم کرنے کیلئے طرح طرح کے حیلے،حربے استعمال کیے جانے لگے۔مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ان پر پرتشدد حملوں کی اہم وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں مسلمان اوران کے مذہبی وملی قائدین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور علماء کرام نے ان کے خلاف فتاویٰ صادر کر کے جہاد کا اعلان کردیا تھا، چنانچہ 1857ء سے چودہ برس پہلے ہی گورنر جنرل ہند نے یہ کہہ دیا تھا کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہیں۔اس جنگ میں دو لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا جن میں ساڑھے اکیاون ہزار علماء کرام تھے،انگریز علماء کے اتنے دشمن تھے کہ داڑھی اور لمبے کرتے والوں کو دیکھتے ہی پھانسیاں دے دیتے تھے،ایڈورڈ ٹامسن نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ صرف دہلی میں پانچ سو علماء کو پھانسی دی گئی۔

دہلی پر قبضہ کے بعد انگریز فوجوں نے شہری آبادی سے خوف ناک انتقام لیا، لوگوں کو بے دریغ قتل کیا گیا،سیکڑوں افراد کو پھانسیاں دی گئیں۔صرف ایک دن میں 24 مغل شہزادے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے،مسلمان چن چن کر قتل کیے گئے۔بہت سے مقتدر اور متمول مسلمانوں کی جائیدادیں تباہ ہوگئیں۔معمولی شک وشبہ کی بناء پر مسلمانوں کو ان کی جاگیروں سے بے دخل کردیا گیا جس کی وجہ سے وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے۔

اردوادب کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالب نے حالات کو بہت قریب سے دیکھا تھا،لہٰذا وہ اس درد کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

شہر دلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ایسے پرآشوب حالات میں بھی لٹی پٹی قوم کی علماء کرام نے جذبۂ صادق کے ساتھ رہنمائی کی۔بہت خاموشی اور دانشمندی کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیا اور اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی نبھائی۔آزادی کے بعد جو حالات سامنے آئے وہ کسی چیلنج سے کم نہیں تھے،ایسے نامساعد حالات میں علماء کرام کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ایک مزاحمت کا اور دوسرا خاموشی سے اپنے کام کو انجام دینے کا۔علماء کرام نے دونوں راستوں کا انتخاب کیا۔اگر ایک طرف ان کے سامنے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی مثال تھی جو 1831ء میں بالاکوٹ میں اپنی جان کی قربانی پیش کر چکے تھے تو دوسری طرف حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ تھے جنہوں نے دیوبند میں دینی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی۔جس طرح 1857ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں بالخصوص علماء کو توپوں کے سامنے باندھ کر اڑا دیا گیا تھا اس کے بعد سے ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان خاموشی کے ساتھ اپنی تحریک کو مضبوط ومستحکم کریں۔چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے جہاں بہت سے مدارس کا قیام عمل میں آیا،وہیں ملّی تحریکات نے بھی جنم لیا۔

یہ بات وثوق سے اسی لئے کہی جاتی ہے کہ ملک میں قائم مدارس صرف علم دین ہی کے محافظ نہیں، بلکہ انسانیت،اخلاق،تہذیب وشرافت،حب الوطنی اور وفاداری کے مضبوط قلعے ہیں،یہی ایثار وقربانی کے وہ مراکز ہیں جہاں سے جہاد آزادی کی تحریک کو اصل سرمایہ ملا۔

امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی،سید احمد شہید بریلوی،مولانا محمد اسماعیل شہید،مولانا عبدالحئی بڈھانوی،مولانا محمد جعفر تھانیسری،مولانا

سید نصیر الدین دہلوی، مولانا ولایت علی صادق پوری، مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا سرفراز علی گورکھپوری، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، مفتیٔ اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتوی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی، رئیس القلم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ عبدالرؤف داناپوری، حضرت شیخ شمس الحق عظیم آبادی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہم اللہ جیسے مجاہدین آزادی جن کی فہرست طویل ہے، انہی دینی مدارس کے ساختہ پرداختہ تھے، جنھوں نے نہ صرف انگریزوں سے مقابلہ کیا، بلکہ دوسروں کے اندر بھی اس کا جذبہ پیدا کیا، وطن عزیز کے لئے خود تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا، ملک کی عزت و آزادی کی خاطر ہر طرح کی قربانی دی اور دوسروں کو قربانی کا حوصلہ بخشا۔

یہ مدرسے اور ملی تحریکیں صدیوں سے قائم ہیں، حکومتیں آئیں اور چلی گئیں، بساط سیاست بچھی اور لپیٹ دی گئی، لیکن حق و صداقت اور انسانیت و شرافت کے یہ قلعے محفوظ رہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی محفوظ رہیں گے۔

امارت شرعیہ پھلواری شریف کا قیام:

ہندوستانی مسلمان حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے بعد اسلامی نظام زندگی سے دور جا پڑے تھے، انگریزوں کے جبر و استبداد نے مسلمانوں کے قابل ذکر طبقہ کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا، کچھ لوگ سیاسی اور نیم سیاسی تحریکات میں شریک تھے اور اس کی قیادت کر رہے تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی تحریکیں اٹھیں اور ان سے سیاسی فائدے حاصل بھی ہوئے، لیکن شرعی تنظیم کے نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں میں وہ روح بیدار نہ ہوئی جس سے دینی انقلاب برپا ہوتا ہے اور مسلمانوں کا ذہن اسلامی سانچے میں ڈھلتا ہے۔

کم و بیش 100 / سال تک جمود اور تعطل کی یہ فضا قائم رہی، پھر مفکر ملت حضرت ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ نے ملت کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور 26 جون 1921ء مطابق 1339ھ میں بہار میں 'امارت شرعیہ' کی بنیاد رکھی جس کے قیام نے مسلمانوں کو ان کا دینی فریضہ یاد دلایا اور انہوں نے محسوس کیا کہ جس نظام شرعی کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے اس کا صحیح نمونہ یہی ہے اور اس کے قیام کے بعد ہی ہم اپنی دینی و اجتماعی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کے مشاہیر علماء اور مشائخ نے اس خالص دینی تنظیم کو خوش آمدید کہا اور کوشش کی کہ یہ تنظیم پورے ملک میں قائم ہو اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجادؒ کی یہ فکر کہ امارت شرعیہ جیسا نظام پورے ملک میں قائم ہو، پروان نہیں چڑھ سکی، علماء نے اس دینی سوچ کی دل سے قدر تو کی، مگر اسے عملی شکل دینے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا، تاہم بہار اور اس کے پڑوس کی کچھ ریاستوں میں یہ تحریک نہ صرف کامیاب رہی، بلکہ اس کا والہانہ استقبال کرتے ہوئے مسلمانوں نے امارت شرعیہ کی قیادت میں چلنے اور اپنے عائلی معاملات کو حل کرانے کا عہد کیا، اس لئے یہ

ادارہ عہد بہ عہد ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔خیر سے یکے بعد دیگرے اس ادارہ کی باگ ڈور ایسی نابغۂ روزگار ہستیوں کے ہاتھوں میں رہی جو ہندوستان کے کوہ نور تسلیم کئے جاتے ہیں۔حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین قادری، حضرت مولانا سید شاہ محی الدین قادری،حضرت مولانا سید شاہ قمرالدین قادری، حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ،حضرت مولانا عبدالرحمٰن دربھنگوی،حضرت مولانا سید نظام الدین ،حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی اور نائب امیر شریعت قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمہم اللہ رحمۃ واسعہ وغیرہم کے خلوص وللّٰہیت ، جہد مسلسل اور انتھک کوششوں نے امارت شرعیہ کو نہ صرف بہار، بلکہ ہندوستان کا نمائندہ ملی ادارہ بنا دیا۔اسی طرح کئی ایک معاملوں میں تو امارت شرعیہ کے قضا و فیصلے کو آخری تسلیم کیا جانے لگا۔

امارت شرعیہ کے تین ستون:

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ،حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کو امارت شرعیہ پھلواری شریف کی توسیع وترقی میں غیر معمولی خدمات کے سبب انہیں 'امارت کے تین مضبوط پلر' بلکہ معمار ثانی سے تعبیر کرنا اس لئے بجا ہے کہ اگر ان حضرات کی خدمات جلیلہ کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو امارت شرعیہ بھی ہندوستان میں دینی مقاصد کیلئے قائم کیے گئے ان بہت سے دینی اداروں کی فہرست میں آجائے گا جن کا قیام نیک تھا،مگر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ گئے اور آج صرف ان کا نام باقی رہ گیا ہے۔گویا امارت شرعیہ کو ملک کا ممتاز اور باوقار ملی ادارہ بنانے میں حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ،حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور حضرت مولانا سید نظام الدینؒ نے جو کلیدی رول ادا کیا ہے اسے ہندوستان میں ملی تاریخ لکھنے والا کوئی بھی مؤرخ نظر انداز کر کے بقول حضرت علی میاںؒ ناانصافی کا الزام اپنے سر

نہیں لے سکتا۔

یہاں پر اول الذکر دو تاریخ ساز شخصیات کا سوانحی خاکہ پیش کرنا اس لئے ناگزیر ہے کہ اس سے آخر الذکر شخصیت (صاحب مقالہ) کی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔امارت شرعیہ کی توسیع اور ترقی میں ان تینوں حضرات کی بے لوث خدمات ناقابل فراموش ہیں۔انہوں نے امارت شرعیہ کو سینچنے ،سنوارنے اور اسے پروان چڑھانے میں جہاں تک ممکن تھا اپنا خون پسینہ،اپنے شب و روز،اپنی خوشیاں اور اپنے غم سب کچھ نچھاور کر دیا۔تب جا کر امارت شرعیہ پھلواری شریف ، پٹنہ ایک شجر سایہ دار کی شکل میں آج قوم و ملت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ

(1914-1991)

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی بیسویں صدی کے عالم اسلام کے ہمہ گیر سوچ رکھنے والے ممتاز علماء اور مذہبی رہنماؤں میں سے ایک تھے،آپ 1914ء مطابق 9 جمادی الثانی 1332ھ میں پیدا ہوئے۔آپ اولیں زمانہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیری،بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فرزند و جانشین تھے۔ابتدائی تعلیم کا سفر مونگیر سے ہی شروع ہوا، بعد میں ندوۃ العلماء لکھنؤ اور پھر دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کی۔

سلوک وتزکیہ کے میدان میں آپؒ کی تربیت قطب عالم حضرت مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری،دربھنگویؒ نے کی۔مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ درس وتدریس اور رشد و ہدایت میں بسر ہوا۔انھوں نے ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔چنانچہ 1936ء بہار کے سہرسہ و مدھے پورہ (جو اُس وقت بھاگل پور ضلع کا حصہ تھا)،سے بہار اسمبلی کا انتخاب بھی

لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اگرچہ علمی اور مذہبی مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا، مگر سیاست میں عملی حصہ لینے سے ان میں وہ غیر معمولی سیاسی بصیرت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی زیادہ بہتر خدمت کرسکے۔ بڑے بھائی مولانا سید شاہ لطف اللہ صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں ہوئے اور زندگی بھر اس سجادے پر رونق افروز رہ کر رشد و ہدایت کے کار خیر میں مصروف رہے۔ 24 مارچ 1957 میں امارت شرعیہ کے امیر منتخب ہوئے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے امارت شرعیہ کو اس طرح منظم فرمایا اور اسے ایسی وسعت دی کہ اس کی شہرت ملک بھر میں ہوگئی۔

1972ء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور آپ کے مساعیٔ جمیلہ کی بدولت ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کنونشن منعقد ہوا اور پھر 1973 میں حیدرآباد میں بورڈ کا اجلاس ہوا، جس میں آپ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ آپ نے آخری دم تک اس پلیٹ فارم سے ملی مسائل کو حل کرنے کی نہایت ہی جرأت مندانہ کوشش کی۔ خالق کائنات نے کام کا شعور روز اول سے ہی عطا فرمایا تھا، چنانچہ علماء دیوبند کی قیادت میں آزادیٔ ملک کی تحریک میں بھی دیگر علماء کے دوش بدوش چلتے رہے۔ یہاں تک کہ 1932ء میں تحریک آزادی کے سلسلہ میں گرفتاری دی اور جیل بھی گئے۔ 1955ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے حضرت مولانا نے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ ان میں مشہور زمانہ شاہ بانو کیس ایک ہے۔ اس کیس میں ایک غیر مسلم جج نے قرآن اور حدیث کی تعبیر غلط انداز سے کی اور یہ غلط تعبیر اس لئے پیش کی گئی کہ جج صاحب قرآن و حدیث اور اسلامی قوانین اور اس کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا نے جج صاحب کے فیصلے کی سخت

مخالفت کی، اس سلسلے میں پورے ملک کا دورہ کیا، سیکڑوں تقاریر کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اس طرح جاگ گئے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور حکومت نے اس انداز کا قانون وضع کیا کہ عام مسلمانوں کو شکایت باقی نہیں رہی۔ حکومت کے اس فیصلے کی وجہ سے بہت سے غیر مسلم وزیر اعظم راجیو گاندھی کے خلاف ہوگئے۔ مولانا نے ان علماء کی روایت کو برقرار رکھا جنھوں نے حکمرانوں کے ہر عتاب کو برداشت کیا اور اپنی جان قربان کردی، لیکن حق پرستی اور اظہار حق سے روگردانی نہیں کی۔

آپ کی علمی یادگاریں مکاتیب گیلانی، یونیفارم سول کوڈ، مسلم پرسنل لاء، قانون شریعت کے مقاصد، متبنّیٰ بل کی کہانی، فیملی پلاننگ، اڈاپشن آف چلڈرن بل اور دی پلان آف ریلیجز سکیورٹی قابل ذکر ہیں۔ 29 مارچ 1991ء کی شب نماز تراویح کے دوران علم و فضل کا یہ آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ حضرت مولانا سید نظام الدینؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے جوار میں بہار کے مردم خیز ضلع مونگیر میں جامعہ رحمانی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(1936-2002ء)

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ 9/ اکتوبر 1936ء میں جالے ضلع دربھنگہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد محترم مولانا عبدالاحد قاسمی سے حاصل کی جو اپنے وقت کے جید عالم دین اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کے شاگرد رشید تھے۔ متوسطات کی تعلیم مدرسہ محمود العلوم دملہ، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ نے 1951ء میں ازہر ہند دارالعلوم

دیوبند کا رخ کیا، جہاں سے 1955ء میں سند فضیلت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ نے جن صاحبِ علم وفضیلت اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا فخرالحسن مرادآبادی، حضرت مولانا محمد حسین بہاری اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی جیسی عبقری شخصیات شامل ہیں۔ دیوبند سے فراغت کے بعد 1955ء سے 1962ء تک مونگیر میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی نے اپنی کتاب 'قلمی خاکے' (مشہور شخصیات کا جامع تعارف) میں قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کا خاکہ یوں بیان کیا ہے:

''چہرہ گول، دل انمول، آنکھوں میں چمک، فضیلت کی دمک، ستواں ناک، زبان بے باک، بڑے بڑے کان، بڑے پَن کا نشان، سر پر بال، بلند اقبال، یہ ہیں مملکت علمیت کے تاجدار، مالکِ شخصیتِ باوقار، سلطانِ اقلیم فقہ اسلامی، پیکر ومظہر ومجسمہ نیک نامی، کاروانِ عدل وانصاف کے سالار، عالم دانش وبینش کا وقار، امت مسلمہ کا اعتبار واعتماد، وجہ افتخار وعظمت عظیم آباد، صاحبِ جہانِ علم وآگہی، علوم وفنونِ مشرقیہ کے منتہی علی میاں کے لائق وفائق جانشین، مسلم پرسنل لا بورڈ کا اعتبار ویقین مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی۔

قاضی صاحب کو امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ جیسے رفیق، بلکہ مربی وعہد ساز شخصیت کی رفاقت میسر ہوئی۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی جوہر شناس نگاہ نے آپ کی خداداد صلاحیت کو بھانپ کر ایک ایسے وقت میں امارت شرعیہ کے شعبۂ قضاء اور اس کا انتظام وانصرام آپ کے حوالے کیا جب امارت شرعیہ کا سارا نظام عملاً مفلوج ہو گیا تھا اور عرصہ سے دارالقضاء کسی ایسے صاحب نظر اور فقہ کی روح کے شناسا قاضی سے خالی تھا جو اس جلیل القدر عہدہ کی اہمیت کو پورا کرتا، چنانچہ 1961ء مطابق 1381ھ سے آخری

سانس تک بہار واڑیسہ کے قاضی القضاۃ رہے اور امارت شرعیہ کے نائب امیر شریعت کے ذمہ دارانہ عہدہ پر بھی فائز رہے۔ آپ بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے، ان کی آئیڈیل شخصیتوں میں سے نمایاں نام شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا بھی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی ملی وقومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ امارت شرعیہ میں آپ اس وقت آئے جب کام کرنے والوں کو بیٹھنے کے لئے باقاعدہ بوریہ بھی میسر نہیں تھا۔ اور امارت شرعیہ کا دائرۂ اثر پٹنہ اور صوبہ کے کچھ مخصوص علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، بیت المال خالی تھا، آپ کی کوششوں سے امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدینؒ تشریف لائے اور شروع میں انتظام وانصرام کا شعبہ ان سے متعلق ہوا، قضاء کے نظام کی توسیع اور زیادہ سے زیادہ مقامات پر دارالقضاء قائم کئے گئے، گاؤں گاؤں دورہ کر کے پورے بہار میں اسے متعارف کرایا گیا۔

جدید فقہی مسائل ومعاملات پر آپ کی گہری نظر تھی اور ان کے حل کے لیے آپ نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ نے کم وبیش چالیس سال امارت شرعیہ بہار اوراڑیسہ میں قاضی القضاۃ کے منصب پر رہ کر قضاء کے اہم فریضہ کو انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپ کی معتبر زریں یادگار ''اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا'' اور وہ ''آل انڈیا ملی کونسل'' ہے جن کے مؤسس وبانی ہیں، آپ ان دونوں اداروں کے جنرل سکریٹری اور ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کے صدر بھی تھے۔ آپ کی قیادت میں سبھی اداروں نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔

حضرت قاضی صاحب نے قضاء کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کا مشغلہ بھی اختیار کیا۔ ہندوستان میں اجتماعی اجتہاد کو فقہ اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے عہد جدید میں متعارف

کرانے میں آپ کا نام جلی حرفوں میں لکھا جائے گا، دارالقضاء امارت شرعیہ میں ہزاروں فیصلے کے علاوہ آپ کے تحریر کردہ فتاویٰ کی تعداد بھی تو بہت زیادہ ہے، لیکن جو فتاویٰ محفوظ ہیں وہ 120 ہیں۔ فتاویٰ قاضی، جدید فقہی تحقیقات، جدید فقہی مباحث، صنوان القضاء، الموسوعۃ الفقہیہ کا اردو ترجمہ، خطبات بنگلور، کلوننگ، اہم فقہی فیصلے، سہ ماہی رسالہ ''بحث ونظر''، جس میں مختلف جدید مسائل پر حضرت قاضی صاحب نے قلم اٹھایا، درجن بھر سے زیادہ فقہ اکیڈمی کے شائع ہونے والے جدید فقہی مجلّات آپ کے اہم علمی یادگار ہیں۔

20 محرم الحرام 1432ھ مطابق 4 اپریل 2002ء میں دہلی میں آپ کا انتقال ہوا اور اپنے آبائی وطن مہدولی ضلع در بھنگہ میں تدفین عمل میں آئی۔

امارت کا عہد زریں:

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کے 37 سالہ عہد رفاقت کو امارت شرعیہ کا عہد زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جس میں امارت نے نہ صرف ملکی سطح پر اپنی شناخت مستحکم کی، بلکہ توسیع وترقی کے شعبے میں بھی بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ حضرت مولانا سید نظام الدینؒ نے اپنے رفیق کار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ساتھ مل کر پورے صوبے کا دورہ کرکے امارت شرعیہ کو متعارف کرایا، امارت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا لوگوں میں احساس دلایا اور امارت کو اس مقام پر لے گئے جو اس کا اصل مقام تھا۔ ان دونوں بزرگوں کی بے نظیر قربانیوں کے سبب یہ ادارہ ایک کمرہ سے اٹھ کر ملک کا معتبر ترین ادارہ بن گیا، اس کی عالیشان عمارت تعمیر ہوئی۔ امارت شرعیہ کو تعلیمی اور رفاہی دونوں لحاظ سے آگے بڑھایا، امارت شرعیہ کی ''موجودہ عمارت''، ''مولانا سجاد ہاسپٹل''، المعہد العالی للتدریب فی القضاء''، ''مولانا رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ'' اور ''وفاق المدارس بہار'' وغیرہ یہ سب ان

ہی دونوں بزرگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی امارت کے ماتحت کئی ایک ادارے قائم ہوئے جنہوں نے بہار کے مسلمانوں کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ بہار اور اڑیسہ میں امارت کی آواز مسلمانوں کے مسائل کے لئے ایک ایسی آواز سمجھی گئی کہ حکومتیں بھی اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوئیں اور ارباب اقتدار کو بھی ان بوریہ نشینوں کی بارگاہ میں حاضری کے سوا چارہ نہ رہا۔

مولانا سید نظامؒ کے عہد کے کارنامے:

امارت شرعیہ سے وابستگی کے بعد امارت ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گئی، آپ اور آپ کے رفیق کار حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دونوں نے مل کر امارت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا لوگوں میں احساس دلایا، امارت شرعیہ جو ایک صوبہ میں سمٹی ہوئی تھی، ملک کے کونے کونے تک اس کی آواز پہنچائی۔ آپ نے ملک کے تمام اہم مسائل کو اٹھایا، امارت شرعیہ کے ناظم کے عہدے سے لے کر امیر شریعت تک کی مدت کار میں بے شمار ملی وفلاحی کام ہوئے، امارت شرعیہ کے تمام شعبہ جات کی ترقی واستحکام اور اس کو وسعت دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اس سلسلے میں آپ کی خدمات جلیلہ پر ''باتیں میر کارواں'' کے مصنف نوجوان صحافی عزیزم محمد عارف اقبال سلمہٗ نے جو معلومات یکجا کی ہیں انہیں حرف آخر کہا جا سکتا ہے۔ یہاں پر اسی کتاب کے چند اقتباسات نذر قارئین کرتے ہیں:

مولانا سید نظام الدینؒ نے امارت شرعیہ میں آنے کے بعد سب سے پہلے دفتر کی صفائی، اس کی تزئین وتہذیب اور دفتر کے نظام کو ٹھیک کیا۔

شروع میں دفتر امارت شرعیہ تنگ جگہ میں تھا، جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی بھی مشکل سے ہوتی تھی، تو آپ نے خانقاہ سلیمانیہ کے مکان کا ایک حصہ جو خلوت کے نام سے تھا، دس سالوں کے لئے کرایہ پر لیا، تاکہ اس میں امارت کے لوگ جماعت کے ساتھ

نماز کی ادائیگی کر سکیں، یہ مکان 1984ء تک امارت شرعیہ کے قبضہ میں رہا۔

داروغہ نظیر کے مکان میں امارت شرعیہ کا دارالقضاء قائم تھا جو کہ کرایہ پر تھا، آپ کی کوششوں سے اس مکان کو خرید کر امارت شرعیہ میں شامل کیا گیا۔

دارالامارت کے لئے زمین کے حصول کی کوشش شروع کی اور پھر حاصل ہو جانے کے بعد پیسے کی ادائیگی کے لئے آپ اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے فراہمی مالیات کے لئے مختلف علاقوں کا سفر کیا، پھر اپنی نگرانی میں اس کی باؤنڈری کرائی، جو کہ ایک مشکل کام تھا۔

امارت شرعیہ کے پاس چار کٹھہ زمین جسے اسپتال کے لئے لینا تھا، وہ زمین اس وقت 13/ ہزار روپے میں دستیاب تھی جو اس وقت نہیں خریدی جا سکی، وہی آپ نے کوشش کر کے 14/ لاکھ میں امارت کے لئے حاصل کی۔

1988ء میں مولانا سجاد میموریل ہاسپٹل کی تعمیر اور پھر آپ ہی کی نگرانی میں اس کی پہلی منزل کی تعمیر ہوئی، نیز آپ کی ہدایت پر کئی نئے شعبے کھولے گئے ہیں۔

آپ ہی کے عہد امارت میں 1992ء کو مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہوا اور پھر اس کی شاخیں کئی اضلاع میں کھولی گئیں۔ جس میں 1995ء میں امارت مجیبیہ ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ دربھنگہ، 1997ء میں امارت ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ پورنیہ، 2000ء میں ریاض ITI ساٹھی مغربی چمپارن، 2002ء میں امارت عمر ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ بسرا اور کیلا وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

1993ء میں امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا۔

امارت انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر اینڈ الیکٹرونکس قائم ہوا۔

اسی طرح پارہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ بھی آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

لڑکیوں کے لئے عثمان غنی کمپیوٹر سینٹر ہارون نگر میں چل رہا ہے۔

مرکزی دفتر امارت شرعیہ کے پیچھے اسٹاف روم اور ڈائننگ روم کی تعمیر عمل میں آئی۔

فرسٹ فلور پر مہمان خانہ امارت شرعیہ کی تعمیر کی گئی۔

امارت شرعیہ کمپلیکس میں تحفیظ القرآن کی عمارت تعمیر ہوئی۔

FCI روڈ پھلواری شریف میں 18/ کٹھہ زمین 14/ لاکھ میں خریدی گئی، پھر اس میں ہاسٹل اور لائبریری کی تعمیر ہوئی۔

پورنیہ، ارریہ، بہار شریف، سہرسہ، کشن گنج، کٹیہار، دملہ (مدھوبنی) چتر پور (رام گڑھ) اور سیوان میں دارالقضاء امارت شرعیہ اور دفتر کے لئے بلڈنگ کی تعمیر۔

راورکیلا میں شفاخانہ کی تعمیر بحسن وخوبی تعمیر ہوئی۔

دارالعلوم الاسلامیہ کے تحفیظ القرآن کی مسجد اور درسگاہ کی عمارت وغیرہ کی تعمیر کے علاوہ بے شمار کام ہوئے جو مستقل ایک روشن باب ہے۔

اس کے علاوہ جمشید پور میں اسپتال کی تعمیر، دربھنگہ مہدولی میں دفتر دارالقضاء امارت شرعیہ کی تعمیر، رانچی کے محلّہ نگری میں امارت شرعیہ ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر، بارسوئی، کٹیہار، بہار شریف، گریڈیہہ (جھارکھنڈ) میں ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ امارت شرعیہ کی عمارتوں کی تعمیر۔

امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ

امارت شرعیہ ہندوستان کا وہ واحد ادارہ ہے جس کو ہمارے اکابر نے شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کے لئے قائم فرمایا اور اس صنعتی وسائنسی دور میں مسلمانوں کی گرتی معاشی صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ، امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ، حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور حضرت امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ نے مسلم اقلیت کے

نوجوانوں کو اخلاقی اور دینی تربیت کے ساتھ عصری تعلیم سے آراستہ اور اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے ایک لائحۂ عمل تیار کیا اور 1993ء میں حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور موجودہ حضرت امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحب کی پرخلوص کاوشوں کے نتیجے میں امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا اور سارے ادارے بحسن وخوبی چل رہے ہیں، آپ ٹرسٹ کے چیئر مین بھی رہے۔ ٹرسٹ کے تحت تمام اداروں میں جاری کورسیز حکومت بہار اور (NCVT) مرکزی حکومت سے منظور شدہ ہیں۔ ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

مولانا منت اللہ رحمانیؒ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (ITI)

1992ء میں مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ایف سی آئی روڈ، پھلواری شریف پٹنہ (ITI) کا قیام عمل میں آیا اور 1994ء میں NCVT کے تحت منظور ہوا، اس ادارہ میں الیکٹریشن، الیکٹرونک، فیٹر، ریفریجریٹر (AC)، الیکٹرونکس، ڈرافٹ مین سول اور پلمبر کے شعبے قائم ہیں، اس ادارہ میں تقریباً 230 طلباء زیر تعلیم ہیں۔

امارت انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر الیکٹرونکس، پٹنہ

یہ ادارہ مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ سے ملحق ہے، یہاں BCA اور BBA کے تین سالہ ڈگری کورس کی تعلیم ہوتی ہے، دونوں کورس میں کل ملا کر 360 طلباء زیر تعلیم ہیں۔

ڈاکٹر عثمان غنی گرلس کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ پٹنہ

یہ ادارہ خالص لڑکیوں کا ہے، جو ہارون نگر سیکٹر 2 میں چلتا ہے، ادارہ مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی سے منظور شدہ ہے، یہاں BBA اور BCA کی تعلیم اسلامی ماحول میں دی جاتی ہے، جس میں 150 طالبات زیر تعلیم ہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی پارا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ

یہ شعبہ حکومت بہار کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ اور مگدھ یونیورسٹی سے 1997ء میں منظور ہوا، اس ادارے میں پیتھولوجی میں دو سال کا ڈپلومہ اور تین سالہ ڈگری کورس کی تعلیم دی جاتی ہے، اسی طرح فیزیوتھراپی میں تین سالہ ڈپلومہ اور ساڑھے چار سالہ ڈگری کورس چلایا جاتا ہے، دونوں شعبوں میں کل 400 طلباء زیر تعلیم ہیں۔

امارت مجیبیہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ دربھنگہ

یہ ادارہ شہر دربھنگہ کے محلّہ مہدولی میں واقع ہے، امارت مجیبیہ 1995ء سے منظور ہو کر چل رہا ہے، یہاں فیٹر، ڈرافٹ مین سول، الیکٹریشن، پلمبر اور ویلڈر کی تعلیم دی جاتی ہے، یہاں کل ملا کر 225-220 طلباء زیر تعلیم ہیں، اس کے پہلے صدر قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے۔

امارت ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ پورنیہ

اس ادارہ کا قیام 1997ء میں عمل میں آیا، جو پورنیہ کے گلاب باغ علاقہ میں واقع ہے، 2001ء میں مرکزی حکومت سے باضابطہ منظور ہو کر چل رہا ہے، اس میں الیکٹریشن، الیکٹرونکس، فیٹر، انسٹومیکانیک کی تعلیم دی جاتی ہے، یہاں کل ملا کر 300 طلباء زیر تعلیم ہیں۔

ریاض (ITI) ساٹھی، مغربی چمپارن

اس ادارہ کا قیام 2000ء میں عمل میں آیا، جو مشہور بزرگ حضرت مولانا ریاض احمد صاحبؒ کے نام سے منسوب ہے، ادارہ مرکزی حکومت سے منظور ہو کر چل رہا ہے، اس میں الیکٹریشن، الیکٹرونکس، ڈرافٹ مین سول اور پلمبر کی پڑھائی ہوتی ہے، اس ادارہ میں کل ملا کر 180 طلباء زیر تعلیم ہیں۔

امارت عمر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بسرا اور کیلا، اڑیسہ

یہ ادارہ 2002 میں قائم ہوا اور روز اول سے ہی مرکزی حکومت سے منظور ہو کر تعلیم میں منہمک ہے، یہاں بھی 260 رطلباء زیر تعلیم ہیں۔

ان مذکورہ اداروں سے سیکڑوں کی تعداد میں طلباء فارغ ہو کر ہندوستان کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں برسر روزگار ہیں، صرف 2004 تا 2005 کے درمیان فارغ شدہ لڑکوں میں 51 رلڑکے دہلی میٹرو ریلوے میں روزگار پانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اس ٹرسٹ کے تحت رانچی، گریڈیہہ، بارسوئی کٹیہار اور بہار شریف میں ٹیکنیکل ادارے قائم کئے گئے جن کا تعمیراتی کام جاری ہے، کوشش یہ ہے کہ جہاں جہاں اس طرح کے ادارے قائم ہو رہے ہیں وہاں مسجد اور اسپتال بھی قائم کیا جائے، علاوہ ازیں خدمت خلق کے لئے امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ پھلواری شریف میں مولانا سجاد میموریل اسپتال، پٹنہ سٹی، سبزی باغ جمشید پور جھارکھنڈ اور راور کیلا اڑیسہ میں امارت ہیلتھ سنٹر کا قیام عمل میں آیا ہے۔

مولانا سجاد میموریل اسپتال

اکابر امارت شرعیہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور مولانا سید نظام الدین موجودہ امیر شریعت (جو اس وقت ناظم امارت شرعیہ تھے) نے خصوصی توجہ فرمائی، اس کے لئے پھلواری شریف میں جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور اکثر مسلمان خط افلاس سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد علیہ الرحمہ کی یاد میں ''مولانا سجاد میموریل ہاسپٹل'' قائم کیا، جس کا افتتاح 22 رشعبان 1408ھ مطابق 10 راپریل 1988ء کو ہوا، یہ ہاسپٹل وقت کی اہم ضرورت اور خدمت خلق اور رفاہی کاموں کا بہترین ذریعہ ہے، جس سے بلا تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل اور ذات پات کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، روزانہ 150 سے

200 تک مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔

مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی خدمات کا یہ تو محض زمینی نمونہ تھا، ورنہ تو حضرت موصوف ایک بے مثال مدبر وقائد تھے، جنھوں نے زندگی کے ہر میدان میں ملت کی فکری، علمی اور عملی قیادت کی اور امت کو متحد رکھنے میں انھوں نے جو قربانیاں اور خدمات انجام دی ہیں وہ آنے والی نسلوں کے لئے چراغ راہ سے کم نہیں ہیں، ان کا ہر عمل اور طرز قیادت ملی کام کرنے والوں کو ہمیشہ روشنی فراہم کرتا رہے گا اور آج موصوف ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی خدمات کے نقوش ہمارے سامنے ضرور موجود ہیں اور یہی ہمارا عظیم ملی سرمایہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء گو ہیں کہ ہماری یہ کاوش اور آج کا یہ تاریخی سمینار حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کیلئے بہترین خراج عقیدت ثابت ہو۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆

کتابیات:

- باتیں میر کارواں کی: مصنف، عارف اقبال
- ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ: 4، جلد: 97، جمادی الثانی 1434ہجری مطابق اپریل 2013ء
- تذکرہ علماء بہار مرتب: مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی
- حضرت امیر شریعت: نقوش وتاثرات مرتب: مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی (ایم اے)
- تعمیر حیات لکھنؤ: مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا حادثہ وفات۔ از: امین الدین شجاع الدین
- جامعہ فاروقی کراچی: علماء دیوبند کے فتاویٰ۔ از: مفتی ساجد میمن

- قلمی خاکے (مشہور شخصیات کا جامع تعارف) مصنف: پروفیسر ظفر احمد نظامی مرتب: ڈاکٹر شمع افروز زیدی
- (مجلّہ فرہنگ وتمدن آسا: قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: زندگی و دستاورد ہ)
- ریشمی رومال ص:45
- ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی خصوصی شمارہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام حیات وخدمات، مصنف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔2002
- امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین کی خدمات وکارناموں کے تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھئے ''باتیں میر کارواں کی'' مصنف عارف اقبال۔

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور 'قبلہ نما'
ایک تحقیقی جائزہ

زیر اہتمام : حجۃ الاسلام اکیڈمی
بمقام : دارالعلوم وقف دیوبند

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد و علیٰ آلہ و صحبہ و علی من تبعھم باحسان و دعا بدعوتھم الی یوم الدین، أما بعد:

انیسویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری کی وہ عہد ساز شخصیات جنہوں نے اپنے علم وعمل، فکر واجتہاد اور فہم وتدبر سے برصغیر ہی نہیں عالم اسلام میں عظیم انقلاب

بر پا کر دیا ان میں ایک عظیم اور بہت ممتاز نام حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ العزیزؒ بانی دارالعلوم دیوبند کا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ دنیا میں بہت سی اسلامی تحریکات اور مہمات نے جنم لیا، معاشرے اور ماحول میں ان کے نمایاں چھاپ نظر آتے بھی ہیں۔ علمی اور تجزیاتی طور پر مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ان تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ کو نمایاں کامیابی ملی تو کچھ یکسر ناکام ثابت ہوئیں، جبکہ چند تحریکوں نے تغیرات و حوادث زمانہ کے سبب پھلنے پھولنے سے قبل ہی دم توڑ دیا۔ دوسری طرف بعض ایسی تحریکیں بھی وجود میں آئیں جنھوں نے نہ صرف آغاز سے ہی کامیابی کے علم بلند کیے اور معاشرتی، سماجی، تعلیمی اور اصلاحی ہر ایک شعبے میں بڑے بڑے انقلاب بر پا کیے، بلکہ اس کی کوکھ سے کئی اہم تحریکیں وجود میں آئیں اور انہیں اس قدر عظمت وشہرت حاصل ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا پر چھا گئیں۔ یہ وہ تحریک ہے جسے 'تحریک دیوبند' کہا جاتا ہے اور حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس تحریک کے قائد ومحرک ہیں۔

تحریک دیوبند کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بلاشبہ آج دنیائے اسلام میں اس ایک تحریک سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ افراد کی دھوم ہے اور ان کا ہر چہار سو چرچا ہے۔ دارالعلوم دیوبند، جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، تبلیغی جماعت بستی مرکز حضرت نظام الدین، جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسی دینی وملی اور سرگرم تحریکیں اور پوری کائنات میں پھیلے ہوئے مدارس اسلامیہ، مساجد، مکاتب، خانقاہیں، اسکول، کالجز وغیرہ 'دیوبند تحریک' کی ہی دین ہیں۔ یہ سب برصغیر کی وہ علمی و ملی، اصلاحی اور دعوتی جماعتیں ہیں جن کے فیض سے ایک دنیا آباد ہے۔ ڈیڑھ صدی سے

بلاواسطہ یا بالواسطہ اس سنہری کڑی کا سرا حضرت امام نانوتویؒ سے ملتا ہے اور ان کی گود میں پرورش پانے والے لوگ دنیا کے کونے کونے میں سرگرم عمل ہیں۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ قوم وملت کے یہ جیالے جہاں بھی پہنچے، وہاں انہوں نے اپنے علم کے چراغ سے ہزار ہا چراغ روشن کئے اور لاکھوں اہل علم و دانش پیدا کئے۔ یوں یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور آج کرۂ ارض پر شاید ہی کوئی ایسا خطہ بچا ہو، جہاں حجۃ الاسلامؒ کے روشن کیے ہوئے چراغ کی لو نہ پہنچ رہی ہو۔ یہ بات دعوے سے اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا کے کے تقریباً دو درجن سے زائد ممالک کا سفر کیا ہے اور ان ممالک کے شہروں، دیہاتوں اور جنگلات کی خاک چھانی ہے، مجھے اب تک ایسا کوئی ملک نہیں ملا جس کا دامن حضرت نانوتویؒ کے فیض سے خالی ہو۔ نہ صرف ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش، بلکہ ان کے جذبۂ خلوص کے چشمے ہر جگہ بہہ نکلے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کو 'تاریخ دارالعلوم' جلد دوم کے دیباچہ میں موجود مولانا سید محبوب رضویؒ کی گراں قدر تحریر سے بھی تقویت ملتی ہے:

''دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کے قابل فخر ماضی کو زندہ رکھنے، حال کو دینی توانائی بخشنے اور مستقبل کو اسلامی قدروں کے مطابق روشن اور تابناک بنانے کے لئے جو قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ اس کا ایسا سرمایۂ افتخار ہے جسے ملت اسلامیہ کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دارالعلوم دیوبند برصغیر میں اسلامی زندگی کا بے خوف علمبردار، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کا داعی، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کا مبلغ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے علم کا شارح اور امام حریت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے جذبات حریت کا سب سے بڑا امین رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند دینی علوم کی ایک مؤثر اور فعال تحریک ہے، اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد واعمال کے خس وخاشاک کو جدا کر کے انھیں دین خالص سے روشناس کرایا، شرک وبدعات، رسم ورواج اور باطل توہمات سے انھیں نجات دلائی اور اسی کے

ساتھ مسلمانوں کے دلوں سے برطانوی سامراج حکومت کا ڈر اور خوف و ہراس دور کر کے انھیں سیاسی اعتبار سے اس لائق بننے میں مدد دی، جس سے وہ آزادئ ملک کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر انسانیت کی عظمت اور مسلمانوں کے ملی وقار کو بلند کر سکیں، غرض کہ تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں تحریک دیوبند نے اپنی گرانقدر خدمات کا نقش نہ بٹھایا ہو، اسی کے ساتھ یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ اس تحریک کا دائرہ صرف برصغیر تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ دور دور تک اس کا حلقۂ اثر وسیع ہوگیا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند صرف برصغیر ہی کا نہیں بلکہ براعظم ایشیا کا علمی اور دینی مرکز بن گیا''۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۲ص:۱۴۰۔۱۳)

ولادت باسعادت وتعلیم:

حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ ہندوستان کے ایک باوقار صدیقی خاندان کے فرد، جلیل القدر عالم، دینی علوم وفنون کے ماہر، تصوف کے رمز شناس، اسرار شریعت کے راز داں اور میدان جنگ کے عظیم سپاہی و سالار تھے۔ آپؒ کی ولادت شوال 1248ھ مطابق مارچ 1833ء میں نانوتہ (ضلع سہارنپور یوپی) میں ہوئی۔ سوانح قاسمی کے مصنف رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ:

''اب کچھ بھی ہو اپنے بہن بھائیوں میں آپ بڑے ہوں یا چھوٹے اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ کے کسی مہینہ میں بمقام نانوتہ آپ کی ولادت باسعادت سے ظلمت کدہ ہند منور وروشن ہوا، مہینہ کے متعلق اتنے اختلافات ہیں کہ عیسوی حساب سے ہجری کا یہ سنہ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء دونوں میں واقع ہوسکتا ہے''۔

(سوانح قاسمی، ص:۱۴۷۔۱۴۶)

اس وقت خاندان میں جید علماء کرام موجود تھے اور ہر طرف علم وتعلیم کا چرچا رہتا تھا۔ تاریخی نام خورشید حسین تھا، والد کا نام شیخ اسد علی ولد غلام شاہ اور والدہ سہارنپور کے مشہور وکیل شیخ وجیہ الدین کی صاحبزادی تھیں۔ آپ نے کم عمری میں حفظ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی اور فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں مولانا مہتاب علی دیوبندی اور مولوی محمد نواز سہارنپوری سے پڑھیں۔ اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی سوانح قاسمی کے مصنف فرماتے ہیں کہ:

''بہرحال باوجود تلاش کے صحیح طور پر یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی سے علیحدہ ہوکر طلب علم کے سلسلے میں جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا جب دیوبند اور سہارنپور جانا پڑا، اس وقت آپ کی عمر کیا تھی، مگر ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ دیوبند اور سہارنپور کے بعد بالآخر جب آپ دہلی تشریف لے گئے، تو اس وقت بھی حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کل گیارہ سال تھی، اسی سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نانوتہ کے مکتب خانہ سے آپ کا تعلیمی تعلق جس وقت منقطع ہوا اس وقت شاید آٹھ نو سال سے زیادہ عمر غالباً آپ کی نہ ہوگی۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں صرف یہی نہیں کہ قرآن آپ نے ختم فرمالیا تھا اور حسن خط کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہوچکے تھے، بلکہ مصنف امامؒ کی چشم دید شہادتوں کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمر کی اسی قصیر مدت میں آپ گویا چھوٹے موٹے شاعر اور ننھے منے سے مصنف بھی بن چکے تھے، اسی عرصہ میں اپنی نظموں کو بھی مرتب کر کے لکھ چکے تھے اور دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو نقل کرنے کا کام بھی کر چکے تھے''۔

(سوانح قاسمی، ص:۱۶۵۔۱۶۶)

محرم الحرام 1260ھ مطابق 1844 کو استاذ الکل مولانا مملوک علیؒ نے آپ کو اور اپنے بیٹے محمد یعقوب نانوتوی کو عربک کالج دہلی میں داخل کروادیا، مگر آپ نے تمام علوم و

فنون کی کتابیں مولانا مملوک علیؒ سے ان کے گھر پر پڑھیں اور بالقصد کالج کے آخری سالانہ امتحان میں شریک نہ ہوئے ، دیگر اساتذہ میں مولانا مفتی صدر الدین تلمیذ خاص شاہ عبدالعزیز کا نام بھی آتا ہے۔

آپ نے ریاضی، فلسفہ وغیرہ میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ دہلی کالج کے تمام اساتذہ آپ کی ذہانت اور قابلیت کے مداح ہوگئے۔حدیث پاک کی تعلیم حضرت مولانا شاہ عبدالغنیؒ سے حاصل کی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چھوٹے صاحبزادہ ہیں۔اسی دوران آپ نے حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت سلوک کی۔حاجی صاحبؒ کی باطنی توجہ نے حضرت نانوتویؒ کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا کردیا، چنانچہ خود حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

’’ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے،اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔‘‘

ایک موقع پر حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ:

’’اللہ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتے ہیں۔چنانچہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا روم کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم عطا ہوئے ، جو میرے قلب میں آتا ہے بیان کردیتے ہیں۔‘‘

حضرت نانوتویؒ نے طالب علمی کے زمانے میں بہت سے خواب دیکھے تھے جو آنے والے دنوں میں ان کی خدمات اور رفع درجات کی طرف مشیر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشریٰ و خوشخبری تھے۔حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم وطن، رفیق درس اور ہم زلف بھائی تھے،فرماتے ہیں:

’’ایام طالب علمی میں مولوی (محمد قاسم) صاحب نے ایک خواب دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے ہزاروں نہریں جاری ہیں، جب یہ خواب جناب

والد صاحب (یعنی حضرت مولانا مملوک علیؒ) سے ذکر کیا،انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا‘‘

(سوانح مولانا قاسم ص۹)

حضرت نانوتویؒ کا عہد شورش زدہ اور ملک وملت کیلئے انتہائی تکلیف دہ اور ابتلا و آزمائش سے لبریز تھا۔اس وقت ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا،خاص کر مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑے جارہے تھے،اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے انہیں خطرہ بھی سب سے زیادہ مسلمانوں سے ہی تھا۔ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مولانا عتیق احمد بستوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

’’برصغیر ہندو پاک میں مغلیہ سلطنت کے بکھراؤ کے بعد ہندوستان کے اندلس بن جانے کا پورا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔اسلام دشمن طاقتوں نے پوری منصوبہ بندی کرلی تھی کہ برصغیر کے مسلمان اپنا دین وایمان،تہذیب وثقافت سب کچھ بھول کر یا تو عیسائیت کی گود میں چلے جائیں یا ہندو مذہب اختیار کرلیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت ہند کی سرگرم پشت پناہی میں پادریوں کی فوج یورپ کے مختلف ممالک سے آکر پورے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور پوری مشنری اسپرٹ کے ساتھ سرگرم عمل تھی، پادریوں کی کوششوں کا خاص نشانہ مسلمان تھے،مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے دباؤ اور لالچ کا ہر طریقہ اختیار کیا جارہا تھا، پادریوں نے مناظرے کا بازار گرم کرکے اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تشکیکی مہم چھیڑ رکھی تھی، تاکہ اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور ان پر تثلیث کا رنگ چڑھایا جاسکے۔دوسری طرف آریہ سماج تحریک اپنے شباب پر تھی اور آریہ سماجی مبلغین اسلام کے خلاف بیہودہ اعتراضات کا بازار گرم کیے

ہوئے تھے، اسلامی عقائد وتعلیمات کے خلاف اعتراضات پر مشتمل چھوٹی بڑی کتابیں لکھ کر مفت تقسیم کی جارہی تھیں، کوچہ وبازار میں مسلمانوں کو مناظروں کا چیلنج دیا جارہا تھا، مسلمانوں کو بہکانے اور بھڑکانے کی ہر کوشش کی جارہی تھی''۔

دارالعلوم کا قیام:

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹی تھی، عملی طور پر مسلمانوں پر اسلامی تعلیم کا دروازہ بند کردیا گیا تھا، لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔ ان حالات میں حضرت نانوتویؒ نے ایک دینی مدرسے کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا جو مسلمانوں کی دینی تعلیم کی ضرورت کو پورا اور درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرسکے، چنانچہ 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1867ء بروز جمعرات ہندوستان کی تاریخی بستی دیوبند میں مسلمانوں کی دینی وعلمی، ملی وتہذیبی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے سائے تلے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء کی گئی۔ سب سے پہلے استاد ملا محمود جو ماہر عالم و مدرس تھے، مقرر ہوئے۔ حسن اتفاق کہ پہلے طالب کا نام بھی محمود حسن ہی تھا۔ اخلاص، خدمت دین اور توکل علی اللہ کی جمع پونجی، ایک استاد اور ایک شاگرد سے شروع ہونے والے اس ادارے کا فیض پورے عالم میں پھیلا اور از ہر ہند کا لقب عطا کیا گیا۔ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو دارالعلوم کے لیے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتویؒ کو مقرر کیا گیا اور پہلے مہتمم حاجی حافظ سید عابد حسینؒ منتخب ہوئے، آپ کے سفر حج پر جانے کے بعد دوسرے مہتمم کیلئے حاجی مولانا شاہ رفیع الدینؒ کا انتخاب کیا گیا، جب کہ سب سے پہلی مجلس شوریٰ میں حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ، حاجی عابد حسینؒ، مولانا مہتاب علیؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمنؒ، شیخ

نہال احمدؒ اور منشی فضل حقؒ شامل تھے۔

دارالعلوم کی ابتداء کوئی عمارت نہ تھی، مدرسہ کبھی چھتہ کی مسجد میں، کبھی کرائے کے مکان میں، کبھی قاضی کی مسجد میں اور کچھ عرصہ تک جامع مسجد کے اطراف میں بنوائے گئے حجروں میں رہا۔ 2 ذوالحجہ 1292ھ بروز جمعہ مولانا قاسم نانوتویؒ کی تحریک پر دارالعلوم کے لیے الگ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، میاں جی منے شاہ، حاجی عابد حسین، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سنگ بنیاد رکھا۔ گویا آپ نے دارالعلوم کی مستقل بنیاد رکھ کر عملاً یہ اعلان کردیا کہ ہم ایسے نوجوان تیار کریں گے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں گے اور دل ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں گے۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی)

1857ء کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدان کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اسی لائحۂ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی عنصر تھا، وہ مشہور روایت یعنی شاملی کے میدان کے امیر جہاد سیدنا حاجی امداد اللہ المہاجر المکیؒ کہ اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظّمہ پہنچ چکے تھے اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوچکا تھا، عرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ ''ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لئے دعاء فرمائی جائے''۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سننے کے ساتھ شاملی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے''۔ اس اطلاع سے سرفراز فرمایا تھا کہ ''یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں، کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر'' اور اس کے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ ''یہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) ان ہی

سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے''۔

(ارواح ثلٰثہ علماء ہند کا شاندار ماضی بحوالہ: سوانح قاسمی، ج2،ص:223)

اس کے بعد سوانح قاسمی کے مصنف رقم طراز ہیں کہ:

''جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے، بلکہ ''بقاء اسلام اور تحفظ علم دین'' کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر ونظر تھے اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لولگائے ''غیبی لطیفہ'' کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ رئیس القلم آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

امامت اور قیادت (لیڈری) میں یہی اصولی فرق ہے کہ قیادت میں صرف دماغ کام کرتا ہے اور امامت میں دماغ کے ساتھ دل پر بھی زور دیا جاتا ہے بلکہ کامیابی کی ''حقیقی کلید'' دل ہی کے کاروبار کو یقین کیا جاتا ہے ''بدر'' کے میدان میں صف بندیاں بھی ہو رہی تھیں، ہر قسم کے ہتھیار کے استعمال کے مواقع اور مقامات بھی متعین کئے جارہے تھے، لیکن کون نہیں جانتا کہ اسی کے ساتھ خدا کے سب سے بڑے بندے کی پیشانی مبارک خاک پر بھی پڑی ہوئی تھی، سننے والے سن رہے تھے کہ السمٰوٰت والارض کی ملکوت و بادشاہت جس کے ہاتھ میں ہے جس کے حکم اور اذن کے بغیر اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز شریک ہی نہیں ہوسکتی تھی، اسی سے عرض کیا جارہا تھا۔ (**اللھم ان تھلک ھٰذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (صحاح)**.

''اے اللہ اہل اسلام کی ٹولی اگر تباہ ہوگئی تو زمین پر آپ پھر پوجے نہ جائیں گے''۔

مناظروں میں شرکت:

حجۃ الاسلام الامام النانوتویؒ کی خدمات کا اہم میدان علم کلام تھا، چنانچہ آپؒ نے

اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے علم کلام کی بساط بچھائی، آریہ سماجیوں اور عیسائی پادریوں کی تشکیکات اور دسیسہ کاریوں کا مقابلہ کیا، اسلام کی حقانیت عالم پر آشکارا کی، ان باطل قوتوں کا مقابلہ علم واستدلال، بحث ومناظرہ کی سطح پر بڑی مستعدی اور بے جگری کے ساتھ کیا اور اپنی تمام تر توانائیاں ان محاذوں پر صرف کیں۔ دہلی قیام کے زمانے ہی سے آپ مناظروں میں شرکت کرنے لگے تھے، اس وقت دہلی میں پادریوں کے وعظ کا خوب چرچا تھا اور مسلمانوں میں سے بعض اپنی بساط کے مطابق ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ ''سوانح قاسمی'' کے مطابق افسوس ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں پہلی دفعہ یہ صورت دلی میں پیش آئی تھی، جیسا کہ اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ مصنف امام کے بیان سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ بہر حال آپ پادری تاراچند سے گفتگو کرنے پر تو آمادہ ہوگئے، شرط صرف یہ رکھی گئی کہ نہ تاراچند ہی کو میرے نام اور میری شخصیت کا علم ہو اور نہ عام پبلک کو۔ ایک عام مسلمان کی حیثیت سے میں حاضر ہو جاؤں گا اور جو کچھ سمجھ میں آئے گا، عرض کروں گا۔ مصنف امام کی سوانح عمری میں اسی مناظرے کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں یعنی ''آخری مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) بے کسی صورت وشکل بنائے اور اپنا نام چھپائے جا موجود ہوئے''۔ ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، آگے وہی اسی پادری تاراچند کا ذکر ان الفاظ میں کر کے کہ ''ایک پادری تاراچند نام تھا'' وہی سامنے آیا اور رٹے رٹائے اعتراضوں کی فہرست جیسا کہ دستور تھا، اس کا آموختہ سنانے لگا۔ جواب دینے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا آدمی کھڑا ہوا، جو اپنی شکل وصورت سے مولوی بھی معلوم نہ ہوتا تھا اور نہ پادریوں سے بحث ومباحثہ کرتے ہوئے دلی والوں نے کبھی اس کو دیکھا تھا، خود تاراچند پادری کے لئے بھی اس کی شخصیت اجنبی تھی، جوابی تقریر جس وقت ختم ہوئی جیسا کہ چاہئے

تھا، مجلس پر سناٹا چھایا ہوا تھا مصنف امام کی خبر کے الفاظ ہیں کہ:

''اس سے (یعنی تارا چند پادری سے) گفتگو ہوئی، آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا''۔

(سوانح قاسمی: ج،2: ص:58-359)

اس کے بعد آپ نے 1293ھ میں میلہ خدا شناسی میں شرکت فرمائی، جس میں مختلف مذاہب کے مناظرین، مبلغین، نمائندے اور وکیل شریک تھے، حضرت نانوتویؒ نے بحیثیت وکیل اسلام دونوں کانفرنسوں میں شرکت کی اور مباحثہ، مناظرہ اور تقاریر کے ذریعہ نہ صرف اسلام اور اہل اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا، بلکہ پوری دنیا کے سامنے آپ کی خداداد صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں، اپنے اور بیگانے سب ہی آپ کی علمیت، خطابت، جرأت اور اعلیٰ اوصاف کے معترف نظر آئے، مشہور پادری اسکاٹ نے 1294ھ کے میلہ خداشناسی کے اختتام پر کہا کہ مولوی صاحب فقط مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں، اس قسم کا علم اب اہل اسلام کے پاس نہیں ہے، پادری نے یہ بھی اقرار کیا کہ الٰہیات میں کوئی اہل اسلام کے ہم پلہ نہیں ہے۔ (روداد میلہ خداشناسی) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ دونوں میلوں کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ:

اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی کہ روکنے کی تدبیروں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر رک نہ سکے اور ایک ہی میلے میں نہیں، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں بھی عملاً آپ شریک ہوئے، شریک ہوئے کیا معنی؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اول سے آخر تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، گویا سمجھنا چاہئے دونوں ہی میں آپ ہی آپ تھے، جو کچھ آپ نے کہا سنا وہ تو خیر بجائے خود ہے، خاص کر ہندوؤں کے دین اور دینی پیشواؤں کے ذکر کے جو مواقع پیش آئے، ان میں خود سوچنا چاہئے، اپنے اس کلی عقیدے کو پیش کرتے

ہوئے کہ:

''ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اور ادیان و مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں ہیں''۔

(سوانح قاسمی: ج،2،ص۔449)

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ اسی طرح دوسرے سال کے میلے کی روداد میں بھی آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ:

''ایسا زور وشور کا وعظ ہوا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا اور ہر شخص پر سکتہ کا عالم تھا''۔

(ایضاً ص۔460)

سوانح قاسمی کے اس صفحہ پر یہ بھی موجود ہے کہ: باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ آگے اسی کے بعد ہے کہ:

''مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی سو تھی، مگر ہندو بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی''۔ (ایضاً 461)

ارواح ثلثہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب کے حوالے سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ فرماتے تھے کہ:

''جب مباحثہ شاہ جہاں پور ہو چکا اور حضرت نانوتویؒ مظفر ومنصور ہو کر واپس تشریف لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا ہے''۔ (ایضاً 470)

اس مناظرے کے بعد بہت سے عیسائی اور ہندو بھی مسلمان ہونے لگے اور آپ کی قابلیت، ذہانت اور خلوص کی دھاک پورے ہندوستان میں بیٹھ گئی۔ آپ کو ''حجۃ الاسلام'' کا خطاب دیا گیا، جس کا مطلب ہے اسلام کی حجت یا دلیل۔

تصانیف ومکتوبات:

حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف ،تحقیقات وتحریرات اور خطابات کا دائرہ انتہائی وسیع اور مختلف موضوعات ومضامین پر مشتمل ہے،آپ کی تصانیف شمار میں بہت زیادہ نہیں ہیں،مگر جس قدر بھی ہیں ان میں سے ہرایک دریا بہ کوزہ کی عمدہ مثال ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو میں ہیں،لیکن چند فارسی میں بھی ہیں۔ انداز بیان سہل مگر فلسفیانہ و محققانہ ہے۔مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے ان پر پوری روشنی ڈالی ہوگی (ان شاءاللہ) یہاں پرصرف آپ کی تصانیف کا سرسری ذکر مقصود ہے،تاکہ ان سے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

تصحیح قرآن شریف

تصحیح حمائل شریف مع موضح قرآ ن

اسرار قرآنی

بخاری شریف، شرکت در تصحیح حواشی

حضرت مولانا احمد علی محدث، سهارنپوری

رساله تقریر حدیث:فضل العالم کفضلی علٰی أدناکم

احکام الجمعة

اسرار الطهارة

تحذیر الناس

حجة الاسلام

گفتگوئے مذهبی

مناظره عجیبه

الاجوبة الكاملة فی الأسولة الخاملة

الدليل المحكم علٰی قرأة الفاتحة للمؤتم

توثيق الكلام فی الانصات خلف الامام

حق الصريح فی اثبات التراويح

مصباح التراويح

اجوبهٔ اربعین

هدية الشيعة

انتباه المومنين

تقریر دل پذیر

مباحثه شاهجهاں پور

آب حیات

انتصار الاسلام

تحفه لحمیه

جواب ترکی به ترکی

قبله نما

قصائد قاسمی

تقریر ابطال جزو لا یتجزیٰ

تصفية العقائد

قاسم العلوم

لطائف قاسمیه

جمال قاسمی

فرائد قاسمیہ

فیوض قاسمیہ

حضرت نانوتویؒ نے عیسائی پادریوں اور ہندو پنڈتوں سے کئی کامیاب مناظرے کیے جن میں عیسائیوں سے مباحثہ شاہجہاں پوراور سوامی دیانند سرسوتی سے رڑکی میں ہوئی گفتگواور جوابات کو ملک بھر میں شہرت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ ہوئی، کہ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ انگریزوں کے مسلم مخالف نظریے کی وجہ سے حق بات کہنے سے لوگ مصلحتاً کتراتے تھے، مگر حجۃ الاسلامؒ کسی بھی انجام کی پروا کیے بغیر دشمنان اسلام کو جواب دینے کی خاطران کے سامنے سینہ سپر ہوگئے۔ نہ گوروں کی حکومت سے خوفزدہ ہوئے اور نہ ہی اپنی صحت کواس راہ میں حائل ہونے دیا۔ حالانکہ کئی بار آپ کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ دور دراز کا سفر کیا جائے، مگر غیرت ایمانی اور تحفظ ناموس سرور کائناتﷺ کے لئے آپ نے ساری صعوبتوں کو بخوشی برداشت کیا۔

’’کیا کیا نہ کیا عشق میں، کیا کیا نہ کریں گے‘‘

حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے ’قبلہ نما‘ کے ایک حاشیہ میں صفحہ 28 پر پنڈت دیانند سرسوتی کی رڑکی میں چالاکی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت کی بیماری کا بھی ذکر فرمایا ہے:

’یہاں رڑکی میں جب میدان خالی پا کر بر سر عام جلسے کر کے اعتراض کیے تو وہاں کے مسلمانوں کی دعوت پر حضرت ممدوحؒ اپنی بیماری کی پروا نہ کرتے ہوئے خلاف توقع وہاں جا پہنچے، اب پنڈت جی کے لئے مناظرے سے جان چرانے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ:

جس سے ہم جان چراتے تھے مقابل ہے وہی

اگر اپنی قوم میں آبرو بچانے کے لئے داؤ پیچ نہ کھیلتے تو اور کیا کرتے۔‘‘ (قبلہ نما صفحہ:28)

اسلام پر اعتراض کوئی نیا مسئلہ نہیں:

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں پر غیر قوموں کی جانب سے اعتراض کوئی نئی بات نہیں، اسلام کی اشاعت اور پوری دنیا میں اس کے فروغ سے خائف مذاہب اور اس کے پیروکاروں نے ہر عہد میں جھوٹے پروپیگنڈوں کے توسط سے اسلام کو بدنام اور عام لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے پہلا اعتراض تو یہی تھا کہ پیغمبر اسلام محسن انسانیت حضرت محمد رسول اللہﷺ سے لے کر بعد کے جتنے مسلمان حکمرانوں نے دنیا کے جن جن علاقوں میں حکمرانی کی ان میں بیشتر نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا ہے۔ اس تعلق سے جماعت اسلامی کے بانی و معروف اسلامی اسکالر و محقق مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا خوب تحریر فرمایا ہے:

’’دور جدید میں یورپ نے اپنے سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خوں خوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب کہ پیروان اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں، مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس

طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جب لوگ خود امن وامان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین وآرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا ان تمام مؤرخانہ تحقیق وتفتیش اور عالمانہ بحث واکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت وناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔''

ہندوستان کا حال:

ہندوستان میں عہد مغلیہ کا خاتمہ اور انگریزوں کے تسلط کے بعد کی صورتحال بھی مختلف نہیں تھی، عیسائیت کے فروغ میں ان کی مشنریاں بہت فعال تھیں اور حکومت کی جانب سے عیسائی دھرم قبول کرنے والوں کو انعام واعزاز سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اس سے زندگی بھر کے نان ونفقہ کا انتظام بھی حکومت کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ ''جس طرح سے ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے''

(تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمود منقول اور مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ص۔142۔بحوالہ سوانح قاسمی:ص۔334)

عہد حاضر کے مشہور اسکالر ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے اس پہلو پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو دو گروہ اور دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور ان کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں شروع کیں۔ اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں

ایک بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارحانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام، غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کے زیر اثر بعض ہندوؤں نے بھی اسلام کے خلاف مناظرانہ محاذ آرائی کی۔ ہندوؤں کے اعتراضات کا سلسلہ بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے اس میں اتنی شدت نہ تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں یا عہد حاضر میں پائی جاتی ہے۔ ایک خاص جماعت جو ہندوتو کی علم بردار ہے، اس میں پیش پیش ہے۔ کیوں کہ وہ ملک میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے۔ یہ لوگ باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے نہ تو مسلمانوں کو حلقہ بگوش کر سکے ہیں اور نہ ہی اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں برتر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں''۔

اسلام اور مسلمانوں پر انگریزوں کی طرف سے اعتراضات کے جواب میں ہندوستان کے مختلف علماء نے مختلف اداروں اور محاذوں سے آواز اٹھائی۔ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کیچڑ اچھالی گئی تو سر سید نے اس کا مدلل اور مکمل جواب دیا اور ان کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی۔ حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ تو پوری زندگی مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے پروپیگنڈہ کا پردہ فاش کرنے میں لگے رہے، قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلی نعمانیؒ نے اس پر پرزور تنقید کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم بتا دیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے انجیل نہیں بن سکتا۔'' اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا۔ پادری بروچلی نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کیے تو مولانا شبلی نعمانیؒ کا قلم حرکت میں آیا۔ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام مولانا شبلی نعمانیؒ نے ہی

انجام دیا۔ آرمینا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہو چکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے حقوق الزمین الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کر دیا۔ جب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے 1911-12ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔''

(سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین، ص22:63، ج:2، مطبع معارف، اعظم گڑھ، 1986ء)

عیسائیت کا تعاقب:

اسلام اور مسلمانوں کو مختلف زاویے سے بدنام و تنگ کرنے کیلئے ہندوستان میں کفار و مشرکین نے کم چالیں نہیں چلیں، دین اسلام پر حملے کرنے کیلئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وطن عزیز پر انگریزوں کے تسلط کے بعد غیر قوموں بالخصوص عیسائیوں کے حوصلے اس قدر بلند ہو گئے کہ وہ شر انگیزی کی سبھی حدوں کو پار کرتے ہوئے خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فوقیت دینے لگے، ان کی افضلیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ ان کی سرکوبی کے لئے میدان میں ڈٹ گئے۔ چنانچہ آپ نے عیسائیوں کو انہی کے انداز میں جواب دیے اور دو مرتبہ تو (1876 / اور 1877 / میں) عیسائیوں کا زبردست تعاقب کیا۔ اتر پردیش کے ضلع شاہجہاں پور میں عیسائیوں کی تحریض پر منشی پیارے لال نے ''میلہ خدا شناسی'' منعقد کیا۔ ان میلوں میں اصل نشانہ تو مسلمان تھے، مگر ہندوؤں کو بھی دعوت دی گئی تھی، تاکہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کی حقانیت کو دلائل سے ثابت کریں۔ پادریوں نے

اسلام کی مخالفت میں زبردست اعتراضات کی تیاری کر رکھی تھی، ان میں سے ایک کو حکومت نے منطق کی ایک کتاب لکھنے پر انعام سے بھی نواز رکھا تھا، مناظرے کے دوران ''شرح تہذیب'' کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ حضرت نانوتویؒ کو جب خبر ہوئی تو محض حقانیتِ اسلام کو واضح کرنے کے لیے اپنے چند شاگردوں اور دہلی کے چند مقتدر علماء کے ساتھ سفر کا ارادہ فرمایا اور کامیاب مناظرہ کر کے واپس لوٹے۔ عیسائیوں کے ایک ایک اعتراض کا دندان شکن جواب دیا۔ توحید، رسالت اور آخرت کی معقولیت ثابت کرنے کے ساتھ ہی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور تثلیث کے دعووں کی زوردار تردید فرمائی، رسول اللہ ﷺ کی افضلیت اور خاتمیت پر بے غبار تقریر فرمائی۔ جنت کے وجود، شیطان اور ملائکہ کے وجود کو بھی اچھی طرح ثابت کیا، اخیر میں نہایت سلیقہ سے عیسائیوں کو اسلام کی دعوت بھی دی۔ اس میلے کی دلچسپ روداد ''میلہ خدا شناسی'' کے نام سے الگ چھپ چکی ہے۔ بقول جسٹس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ کہ:

اس تقریر کو بلاشبہ ''دریا بہ کوزہ'' کہا جاسکتا ہے، اس میں حضرت نانوتویؒ نے تقریباً تمام اسلامی عقائد کو مختصر مگر دل نشین اور مستحکم دلائل کے ساتھ اس خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے کہ اس کا ایک ایک صفحہ عقل اور دل کو بیک وقت اپیل کرتا ہے، خدا کے وجود، توحید، اولاد سے بے نیازی، ابطالِ تثلیث، مسئلہ تقدیر، جبر و قدر، عبادات بدنی و مالی کے فلسفے، اثباتِ رسالت وعصمتِ انبیاء، شفاعت، ابطال کفارہ، مدارِ نبوت، معجزات، اعجازِ قرآن، تحقیقِ نسخ، معجزہ شقِ قمر، حلتِ گوشت، حرمتِ مردار، طریقہ ذبح اسلامی، ان میں سے ہر ایک مسئلے پر اس تقریر میں مدلل کلام موجود ہے، دلائل اتنے واضح کہ عقل مطمئن ہوتی چلی جائے اور اندازِ بیان اتنا دل نشین کہ براہ راست دل پر اثر انداز ہو، ایک ایک سطر سے مصنف کا یہ یقین اور اعتماد ٹپکتا ہے کہ اسلام ہی دینِ حق ہے۔ مصنف رحمہ اللہ کی خصوصیت

یہ ہے کہ وہ دقیق فلسفیانہ باتوں کو گردو پیش کی خارجی مثالوں سے اس طرح واضح فرماتے ہیں کہ وہ دِل میں اُترتی چلی جاتی ہیں، ''خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہوسکتا'' اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اپنے گھر اگر بندر یا سور کی شکل کا لڑکا پیدا ہوجائے تو کس قدر رنجیدہ ہوں کہ الٰہی پناہ! حالانکہ بندر اور سور اور آدمی، اور بھی کچھ نہیں تو مخلوق ہونے اور کھانے پینے اور بول و براز میں تو شریک ہیں، اور خدا کے لئے ایسی اولاد تجویز کریں جس کو کچھ مناسبت ہی نہ ہو۔ تم ہی فرماؤ کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو، بول و براز سے مجبور ہو، اس میں اور خدا میں کون سی بات کا اشتراک ہے جو خدا کا بیٹا یا خدا کہتے ہو؟''

(الغزالی ڈاٹ او آر جی)

قبلہ نما تعارف اور منہج واسلوب:

اسی طرح ہندوؤں کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں، ان میں (۱) آب حیات، مطبع مجتبائی، دہلی 1298ھ (۲) انتصار الاسلام، اکمل المطابع، دہلی 1298ھ (۳) تحفہ لحمیہ، مطبع صدیقی بریلی (۴) جواب ترکی بہ ترکی، مطبع ہاشمی، میرٹھ 1296ھ (۵) قبلہ نما اکمل المطابع، دہلی 1298ھ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یہاں پر صرف اپنے مقالہ کے عنوان 'قبلہ نما تعارف اور منہج واسلوب' پر قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ نے اسلام کی حقانیت کو عقلی، علمی اور فلسفیانہ انداز میں جس طرح پیش کیا ہے، اس کی مثال ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ کی قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کے ساتھ شریعت کے اصول پر مضبوط گرفت تھی، دفاعِ اسلام اور حفاظتِ شریعت کا عظیم ترین کارنامہ رہتی دنیا تک کے لیے یادگار رہے۔ خارجی فتنوں کی سرکوبی کے لیے بس

آپ کا نام کافی تھا، داخلی فتنوں کو دور کرنے کے لیے بھی آپ نے بڑی جتن فرمائی؛ یہود ونصاریٰ کے ساتھ آریہ سماجیوں کے بھی چھکّے چھڑادیے۔

قبلہ نما اور انتصار الاسلام یہ دونوں تصانیف اس بات کا بین ثبوت ہیں، مگر چونکہ حجۃ الاسلام کے ان علمی شہ پاروں پر توجہ تقریباً نہ کے برابر دی گئی، اس وجہ سے اس موضوع پر ریسرچ کرنے والوں نے دوسرے مصنفین کے مقابلے قبلہ نما اور انتصار الاسلام کا ذکر کم کیا ہے، البتہ ایک طبقہ کے علماء وصاحب قلم کے مضامین اور مقالوں میں ان دونوں کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

حالانکہ حجۃ الاسلام کی تصانیف علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ وغیرہ کی تصانیف سے بہت پہلے کی ہیں اور دونوں کتابوں میں کتاب و سنت کی روشنی میں مفصل اور شافی جواب دیا گیا ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی کے کل گیارہ اعتراضات وشبہات کے جوابات انتصار الاسلام اور قبلہ نما میں دیئے گئے ہیں۔ اول الذکر میں دس اور آخر الذکر میں صرف ایک اعتراض کا جواب ہے اور یہ ''استقبال قبلہ'' سے متعلق ہے۔

دیگر اعتراضات میں سے چند یہ ہیں: شیطان کو کس نے گمراہ کیا؟ اسلام میں چار شادیاں جائز کیوں ہیں؟ اسلام میں ذبیحہ کا طریقہ غلط ہے۔ دنیا کی شراب کیوں حرام ہے؟ جبکہ جنت کی شراب حلال ہے! مسلمانوں کے دفن کا طریقہ صحیح نہیں ہے وغیرہ۔ ہر اعتراض کا دو دو جواب دیا گیا ہے۔ ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی اور قبلہ نما میں ایک جواب تو مجمل ہے، جو 54 صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا جواب تفصیلی ہے، جو 156 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

قبلہ نما کا تعارف پیش کرتے ہوئے شارح حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

''آریہ سماج کے بانی وسرگروہ پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنے مشن کی تبلیغ و

اشاعت کے لئے یہ پروگرام بنایا کہ جس قدر مذاہب ہندوستان میں مروج ہیں خواہ ان کا بنیادی تعلق وید سے ہو یا اسلام سے، یا عیسائیت سے ہو، سب کے خلاف جارحانہ اقدام کریں اور عوام کے قلوب میں جو عقائد ونظریات جاگزیں ہیں ان کا استیصال کر کے اپنے خودساختہ نظریات وعقائد کی تخم ریزی کریں جن کا ماخذ ان کے دعوے کے مطابق وید ہیں جس کی خودساختہ تشریحات اور تفسیرات پر زور دینا شروع کر دیا جو علماء سنسکرت کے نزدیک بھی غلط تھیں، جیسے وید میں خدا کی صفت ''سرب شکتی مان'' جس کا صحیح ترجمہ قادر مطلق ہے، اس کا ترجمہ یہ کیا ''بغیر کسی کی مدد کے سب کام خود کر لینے کی طاقت والا'' اس قسم کی تحریفات کی بہت سی مثالیں سنسکرت کے عالموں نے ان کی تصنیفات میں سے نکال کر ان کے معتقدوں کو چیلنج دیئے کہ ان کو صحیح ثابت کریں مگر کوئی نہ کر سکا۔ بہر حال جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے انھوں نے اس میں اچھی اصلاحات پر بھی اپنی قوم کے سامنے زور دیا جیسے نکاح بیوگان (بدھوا بواہ) جس کو قدیم خیال کے ہندو بڑا پاپ سمجھتے تھے یا مورتی پوجا کا کھنڈن وغیرہ۔ اگر اپنے ویدک دھرم کے عقائد اور اعمال میں جو کچھ جائز یا ناجائز ترمیمات ان کو کرنا تھیں وہ اپنی قوم تک محدود رکھتے اور اسلام پر کیچڑ نہ اچھالتے تو علماء کو ان سے معترض ہونے کی ضرورت نہ محسوس ہوتی، لیکن شاید انھوں نے اس پروگرام کو اس لئے ضروری خیال کیا کہ قوم کے خیال میں یہ بات نہ آنے دیں کہ ان کی اصلاحات (مثل نکاح بیوگان وغیرہ) اسلامی نظام سے اخذ کی گئی ہیں جس کا نتیجہ اسلام کی عظمت کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے اس لئے اسلامی عقائد واعمال کے خلاف فلسفیانہ رنگ میں پروپیگنڈہ کرنا قوم کو اس خیال سے دور رکھ سکتا ہے، اس لئے اسلام پر کیچڑ اچھالنا مفید مقصد سمجھا۔

بہرکیف انھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق جب کہ رڑکی کی چھاؤنی میں برسر بازار اسلام پر حملے شروع کئے تو علمائے اسلام مقابل ہوئے جس کی کچھ اجمالی روئداد

اس کتاب میں خود حضرت شمس الاسلام نے تحریر فرمائی ہے اور انتصار الاسلام میں اس سے زیادہ مفصل بیان کی گئی ہے، جن کا حاصل یہ ہے کہ پنڈت جی کے طرز عمل سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ کبھی مقابلہ پر نہ آئیں گے اور جب بھی مناسب موقع دیکھیں گے، یعنی یہ کہ دندان شکن جواب دینے والوں سے جب میدان خالی پائیں گے تو پھر اسی طرح کیچڑ اچھالنے کا مشغلہ جاری کر دیں گے''

اس فتنہ کے سد باب کے لئے حجۃ الاسلامؒ، پنڈت سرسوتی کے سامنے سینہ سپر ہوگئے، حالانکہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت آپ کی صحت اس قابل قطعی نہیں تھی کہ سفر کیا جائے، چونکہ ابھی ابھی آپ حجاز کے طویل سفر سے لوٹ کر آئے تھے اور واپسی بھی طویل علالت کے بعد ہوئی تھی۔ سوانح قاسمی کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرض کا لگاؤ باقی تھا۔ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب مذہب منصور میں رڑکی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رڑکی کا یہ سفر بہلی میں کیا گیا تھا۔ بیل کی اس گاڑی کے ہچکولوں سے اچھے اچھے تندرستوں کے بھی انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پھر مرض اور مرض کی نقاہت کے ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے، خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو، قبلہ نما کے دیباچہ میں ''راہ کی خرابی کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ ''غیرت اسلام'' کے تقاضے نے ہر تقاضے کو سامنے سے ہٹا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی توہین کا خیال، ہر خیال پر غالب ہے، جس حال میں تھے، کھنچے ہوئے رڑکی پہنچ گئے اور عجیب شان کے ساتھ پہنچے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ رڑکی کے اس سفر میں یہی نہیں بلکہ ''بہت سے خادم ساتھ ہو لئے''

(سوانح قاسمی، ج2، ص:43)

بہر حال حضرت نانوتویؒ رڑکی پہنچ گئے اور وہاں نصف ماہ سے زائد قیام فرمایا، مگر پنڈت جی میدان سے غائب۔ خود حضرت نانوتویؒ نے قبلہ نما کے مقدمہ میں ارقام فرمایا کہ:

’’بعد حمد وصلوٰۃ بندہ ہیچمدانی سراپا گناہ محمد قاسم ناظرین اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ 1295ھ کے آخر رجب (مطابق آخر جولائی 1878ء وساون 1285 ف) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے حسب الطلب بعض احباب اور نیز بتقاضائے غیرت اسلام یہ ننگ اہل اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں پہنچا اور آرزوئے مناظرہ میں سولہ، سترہ روز وہاں ٹھہرا رہا، ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بعافیت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں، مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے جو میدان مناظرہ میں آتے۔ جان چرانے کے لئے وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں‘‘۔

(قبلہ نما۔ص:27)

حقیقت یہ ہے کہ پنڈت دیانند شاہجہاں پور کے دوسرے سال کے میلہ خدا شناسی میں موجود تھے اور حضرت نانوتویؒ کی دھواں دھار تقریر اور تبحر علمی کا انھیں اندازہ ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے مقابلہ میں نہ آنے میں ہی اپنی خیر سمجھی اور اپنے گھر سے ہی سوال وجواب کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ جس کا ایک ہی مقصد تھا کہ حجۃ الاسلامؒ کسی بھی طرح یہاں سے چلے جائیں تا کہ ان کی لاج بچ جائے۔ چنانچہ پنڈت جی نے کئی غیر معقول بہانے تلاش کئے جن میں ایک تو یہ تھا کہ حجۃ الاسلامؒ مجمع عام کے بجائے ان کے گھر پر تشریف لے جائیں، اس میں بھی 50 سے زائد آدمی نہ ہوں یہ شرط بھی رکھ دی اور جب کم تعداد کی وجہ پوچھی گئی تو فساد کا خدشہ ظاہر کیا، حالانکہ حضرت والا کی دلی خواہش تھی کہ جس

طرح پنڈت جی نے رڑکی میں سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر اعتراض کئے ہیں، اس کا جواب انہی کے انداز میں مجمع عام میں دیا جائے، مگر پنڈت جی اپنے مکان کے سوا کہیں راضی نہ ہوئے۔

سوانح قاسمی کے مصنف حضرت علامہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ’’بہر حال جہاں تک واقعات کا اقتضاء ہے، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر کا سامنا کرنے کے لئے درحقیقت کسی شرط پر آمادہ نہ تھے، لیکن اس کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو چاہتے تھے کہ دوبدو گفتگو کرنے کا موقع پنڈت جی سے مل جائے اس لئے جو شرط اور قید و بند کی جو صورتیں بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی رہیں سیدنا الامام الکبیر ہر ایک کو تسلیم کرتے چلے گئے‘‘۔

(سوانح قاسمی، ج2،ص:499)

آخر میں جب حضرت والا کو معلوم ہو گیا کہ پنڈت جی زبانی مکالمہ کے لئے تیار نہ ہوں گے تو آپ کی طرف سے پنڈت جی کے پاس یہ پیغام پہنچا کہ:

’’مرضی ہو تو آؤ، مناظرہ تحریری سہی، مگر جواب تو درکنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی۔ شکرم میں بیٹھ، یہ جا وہ جا‘‘۔

(قبلہ نما:ص۔29)

پنڈت دیانند سرسوتی جو دنیا بھر کو مناظرہ اور مباحثہ کا چیلنج دیا کرتے تھے کسی بھی صورت میں حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہ ہوئے تو بالآخر حضرت والا نے اپنی کتاب قبلہ نما مرتب فرمائی۔ جیسا کہ مقدمہ کے آخر میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

’’مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی کہ جوان کے اعتراض سننے والوں سے سنے ہیں ان کے

جواب مجمع عام میں سنادیں، مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی اور ہم کو دربارۂ توحید ورسالت وغیرہ ضروریات دین واسلام پر بھی کچھ عرض کرنا تھا اور بوجہ ہجوم بارش وخرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنائے جو سب میں مشکل تھے اور دو جلسوں میں توحید ورسالت کا ذکر کرکے شب بست 23 وسوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا اور ایک دن منگلور اور دو تین دن دیوبند ٹھہر کر ستائیسویں کو اس قصبہ ویرانہ میں پہنچا جس کو نانوتہ کہتے ہیں اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے۔ یہاں آکر یہ چاہا کہ بنام خدا دربارۂ اعتراض پنڈت صاحب اپنے ارادۂ مکنون کو پورا کروں یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں، تاکہ ان کو تو اس نامۂ سیاہ کے حق میں دعا کا ایک بہانہ ہاتھ آئے اور خدا تعالیٰ کی عنایت اور رحمت اور مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقع ملے، مگر الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا اور میری فہم نارسا کے اندازے کے موافق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو سجھائے۔

اب اول اعتراضات عرض کرتا ہوں اور ان کے ساتھ ان کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

''مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور آپ خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں جو جواب مسلمان دیتے ہیں بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں۔''

حضرت نے صرف اس اعتراض کا جواب قبلہ نما میں دیا، جس میں حقائق واسرار کے سربمہر گنجینوں کو وقف عام فرمادیا ہے۔ سوانح قاسمی کے مصنف نے لکھا ہے کہ مگر سچ یہ ہے کہ اسی ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ

رہے ہیں کل تین سطروں میں ختم ہوگیا، لیکن متوسط تقطیع کے 116 صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں کہ سطریں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں ورنہ عام کتاب کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم 300 صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہوسکتی تھی۔

(سوانح قاسمی، ج2،ص:503)

کتاب کے آخر میں تمہ کے عنوان سے ایسے جوابات قلم بند فرمائے ہیں جو اہل علم کو تقریرات مذکورہ کتاب کے دوران پیش آسکتے ہیں، چونکہ یہ جوابات طویل تھے اس لئے ان کو آخر میں ''تمہ'' کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا گیا۔ قبلہ نما کا جو تازہ ایڈیشن: 1434ھ مطابق 2013ء میں مکتبہ دارالعلوم دیوبند یوپی سے طبع ہوا ہے اس کی تشریح وتسہیل دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاد حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے فرمائی ہے اور مقالہ کی تیاری میں اسی ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے پیچیدہ عبارت کی اس انداز میں تشریح فرمائی ہے کہ قارئین کے لئے اسے سمجھنا بہت سہل ہوگیا ہے۔ شارحؒ نے اپنے طویل تجربات کی روشنی میں تصحیح کتاب میں سعی بلیغ، توضیحات وحل مضامین مشکلہ کا مکمل اہتمام، پھر کتابت میں سلیقہ کے ساتھ فواصل کی کماحقہٗ رعایت کی ہے اور مطالعہ کرنے والوں کو فہم مضامین میں اس سے پوری مدد ملتی ہے، اس بات کا کتاب میں خیال رکھا گیا ہے۔ مقالہ کے آخر میں ہم جوابات کے چند اقتباسات نذر قارئین کررہے ہیں تاکہ اس سے قبلہ نما کے اسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض:

''مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور آپ خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں جو جواب مسلمان دیتے ہیں بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں

اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں‘‘۔

حجۃ الاسلام الامام النانوتویؒ کے جوابات:

افسوس ہزار افسوس پنڈت دیانند صاحب کے کمالات کا کہ ہندوؤں میں ایک جاہل مہنت ہے، کیوں کہ اس پر پنڈت جی کا یہ حال ہے کہ آسمان کو خاک میں ملا دیتے ہیں استقبال کعبہ اور بت پرستی کو برابر کر دیا۔ اگر پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا تو یہ شہرہ کمال کس خیال پر مبنی ہے اور اگر دیدہ و دانستہ یہ حال ہے تو پھر اور کچھ احتمال ہے۔

ا: لفظ استقبال کعبہ اور بت پرستی ہی اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت پرستی کو توجہ الی الکعبہ کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں۔ اول کا مفہوم فقط اتنا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ ہو اور بت پرستی کا حاصل یہ ہے کہ بت معبود ہوں۔ ہاں اگر اہل اسلام بھی دعویٰ کعبہ پرستی کرتے تو پھر پنڈت جی کا اعتراض بجا تھا، مگر اہل اسلام میں جس سے چاہو پوچھ دیکھو، کوئی مفہوم کعبہ پرستی سے واقف ہی نہیں۔

چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

(ایضاً ص:31-30)

۲: اہل اسلام کے نزدیک کعبہ کی طرف منہ ہونا چاہئے نیت استقبال کی بھی ضرورت نہیں چہ جائیکہ ارادۂ عبادت، البتہ خدا کی عبادت کی نیت اور اس کا ارادہ ہونا ضروری ہے، اگر یہ نہ ہو پھر وہ نماز اہل اسلام کے نزدیک معتبر نہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل اسلام خدا کی عبادت کرتے ہیں کعبہ کی عبادت نہیں کرتے اور بت پرستی کیلئے ارادہ اور نیت عبادت و پرستش بت شرط ہے۔ اگر میری اس گزارش میں شک ہو تو پوچھ دیکھیں۔ ہندوستان ہنوز آباد ہے ہزارہا بت پرست موجود ہیں، مگر اہل عقل کو نہ پوچھنے کی ضرورت اور

نہ کسی بتلانے کی حاجت۔

(ایضاً ص:31)

۳: نماز کے شروع سے لے کر آخر تک کوئی لفظ مشعر تعظیم کعبہ نہیں آتا۔ ہر لفظ اور ہر فعل خدا کی تعظیم پر دلالت کرتا ہے اول تو دست بستہ کھڑے ہو کر ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں جس میں خدا کی بڑائی اور کبریائی کا بیان ہے پھر ''سبحانک اللھم'' میں خدا کی پاکیزگی اور ستودگی اور برکت اور علوشان اور توحید کا ذکر ہے پھر ''اعوذ باللہ'' میں خدا تعالیٰ سے اس بات کی استدعا ہوتی ہے کہ شیطان کے شر سے مجھ کو بچالے، پھر ''بسم اللہ'' میں اللہ تعالیٰ کے نام پاک سے مدد مانگی جاتی ہے اس کے بعد ''الحمد'' پڑھتے ہیں اس میں اول خدا تعالیٰ کی تعریف اور اس کی تربیت عام اور اس کی رحمت عامہ اور خاصہ اور اس کی مالکیت اور اختیار جزا و سزا کا ذکر کر کے خدا سے ہدایت کی دعا مانگی جاتی ہے، اس کے بعد قرأت قرآن کی جاتی ہے تا کہ اسی حکم نامہ خداوندی کی قرأت و سماعت سے جو امام و منفرد و بکمال ادب کرتے ہیں تا کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے کہ ہم خدا کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ نیز پورے ستر کو ڈھانپتے ہیں تا کہ خداوند قدوس کی تعظیم ہو بخلاف پنڈتوں کے کہ ان لوگوں کا یہ حال ہے اپنے ستر کو منکشف ہی نہیں کرتے بلکہ بعض حضرات ننگے بھی ہو جاتے ہیں اور دیگر غیر مسلم کہتے ہیں کہ اس کے بدن پر دیوی دیوتا سوار ہیں۔ بھلا بتائیے کہ کیا یہ تعظیم بھگوان ہے۔ ہرگز نہیں اگر تمہارے پاس ہمت ہے تو اس کا جواب دینا۔ اس کے بعد رکوع و سجدہ ادا کرتے ہیں تا کہ حضرت حق جل مجدہ کی رضامندی حاصل ہو جائے۔

اس وضاحت کے بعد فرماتے ہیں کہ غرض اس بیان اجمالی سے یہ تھی کہ نماز میں اول سے آخر تک خدا ہی کی بڑائی اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور اپنی ذلت و خواری کا اس کے سامنے اقرار، خانہ کعبہ کا نام تک نہیں آتا اور غیر اللہ کی پرستش میں اول سے آخر تک اس

میں غیر ہی کی بڑائی اور اس کی خوشامد ہوتی ہے اور انہی کے سامنے اپنی ذلت وخواری کا اظہار اور اقرار ہوتا ہے بت پرستی میں ان پتھروں اور مورتیوں کی تعظیم ہوتی ہے، جن کو اپنے آپ مہادیو اور شیو وغیرہ بنا لیتے ہیں اور گائتری میں آفتاب کی تعظیم ہوتی ہے اور انہی پتھروں وغیرہ کے سامنے اظہار عجز و نیاز ہوتا ہے۔ غرضیکہ بت پرستی کو نماز سے کیا نسبت (چہ نسبت خاک را با عالم پاک)، مگر پنڈت جی کی باریک بینی دیکھئے نماز اور بت پرستی کو برابر کئے دیتے ہیں۔

۴: اہل اسلام کے نزدیک وقتِ نماز دیوار ہائے کعبہ کا مقابل ہونا شرط نہیں۔

۵: خانہ کعبہ کو اہل اسلام ''بیت اللہ'' کہتے ہیں اللہ یا خدا نہیں کہتے۔

۶: اہل اسلام کے نزدیک مستحقِ عبادت وہ ہے جو بذاتِ خود موجود ہو اور سوا اس کے اور سب اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں اور سب کے نفع و ضرر کا اس کو اختیار ہو اور اس کا نفع وضرر کسی سے ممکن نہ ہو۔ اس کا کمال اور جمال وجلال ذاتی ہو اور سوا اس کے سب کا کمال اور جمال وجلال اس کی عطا ہو۔

مگر موصوف بایں وصف ان کے نزدیک بشہادت عقل ونقل سوا ایک ذاتِ خداوندی کے اور کوئی نہیں۔

(حجۃ الاسلام و براہین قاسمیہ میں اس کی تفصیل ملاحظہ کریں)

حاصل کلام:

غرض اہل اسلام کے طور پر (یعنی ان کے اصول مسلمات کے اعتبار سے بھی) خانہ کعبہ مستحق عبادت نہیں، اور اکثر ہنود کے خیال کے موافق بت مستحقِ عبادت ہیں، کیوں کہ بزعم خود ان کو مہادیو وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ کعبہ کو معبود و مسجود کہنا غلط ہوگا، بلکہ سمتِ سجدہ اور جہتِ سجدہ وعبادت کہنا پڑے گا اور بتوں کو خود معبود اور مسجود کہنا لازم ہوگا۔

قبلہ نما: ص ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۱)

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ نے اپنی دیگر تصنیفات کی طرح 'قبلہ نما' میں بھی قرآن پاک، احادیث، سنت وشریعت کی جو گرہ کشائی فرمائی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت کا ایک منفرد حصہ ہے۔ خصوصاً شریعت اور عقائد واعمال کی حکمتوں اور اسرار وحکم پر آپ کے افادات وتحریرات، ایک نئے اور مستقل علم کلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر جتنی تحریریں ہیں ان سب کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو کر امت محمدیہؐ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ہمارے عقلی کلامی ذخیرہ میں ایک وقیع اضافہ ہوگا، بلکہ اس کی اساس پر اور بھی کئی مشکل مباحث ومسائل حل کئے جا سکیں گے۔

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

مآخذ ومصادر:

تاریخ دارالعلوم دیو بند، ج ۲،ص:۱۴۔۱۳ — سید محبوب رضوی

احوال طیب مولانا محمد قاسم — مولانا محمد یعقوب نانوتوی

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی — تالیف: نورالحسن راشد کاندھلوی

الامام محمد قاسم النانوتوی، حیات وافکار، خدمات — مجموعہ مقالات سمینار حضرت مولانا محمد قاسم، دہلی

ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 12، جلد:94، محرم الحرام 1432ہجری مطابق دسمبر 2010ء

سید ابوالاعلیٰ مودودی الجہاد فی الاسلام، ص:۲، مکتبہ معارف اعظم گڑھ

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، حقائق اسلام: بعض اعتراضات کا جائزہ، ص:11، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، 2004ء

ارواح ثلثہ علماء ہند کا شاندار ماضی بحوالہ: سوانح قاسمی، ج2، ص:223

تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمود منقول اور مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ص۔142۔بحوالہ سوانح قاسمی:ص۔334

سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین، ص22:63، ج:2، مطبع معارف، اعظم گڑھ، 1986ء

سوانح قاسمی (اول، دوم، سوم) — مولانا مناظر احسن گیلانی

ایضاً، ج ۲، ص:43

ایضاً، ص:۴۷۔۱۴۶

ایضاً، ص:۶۵۔۱۶۶

ایضاً، ج،2:ص:359-58

ایضاً، ج،2، ص۔449

ایضاً ص۔460

ایضاً461

ایضاً470

ایضاً، ج2، ص:499

ایضاً، ج2، ص:503

قبلہ نما — حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

ایضاً، ص:28

ایضاً، ص:27

ایضاً، ص:29

ایضاً ص:31-30

ایضاً ص:31

ایضاً ص، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۱

الغزالی ڈاٹ او آرجی

باب دوم

352

مضامین

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک شخص سرزمین عرب میں عدنان نامی گزرا ہے، جس کی اولاد عدنان کہلاتی ہے، عدنان کے دولڑکے تھے عبک اور معد آئندہ نسل صرف معد کے لڑکے نزار سے پھیلی، معد بن عدنان کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں تک میرا شجرۂ نسب بالکل درست ہے، اس کے علاوہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں وہ نا قابل اعتبار ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو سب سے پہلے پیدا کیا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔

یہ نور نسلاً بعد نسلٍ امانت الٰہی کے طور پر معد بن عدنان تک منتقل ہوا، ان کے زمانے میں بابل اور نینوا کے علاقے میں جس بادشاہ کی حکمرانی تھی وہ نہایت ظالم وجابر تھا، جسے بخت نصر کے نام سے جانا جاتا ہے، اس نے سب سے پہلے شام پر حملہ آور ہو کر اس کی

354

سلطنت کو تاخت و تاراج کیا، ۵۸۶ ق م میں یہودیہ کے تمام شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ ان کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، ملک گیری کی ہوس بڑھتی رہی یہاں تک کہ عرب پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا، اس زمانے میں معد بن عدنان عرب کے سردار تھے، بخت نصر کے حملہ آور ہونے سے پہلے اللہ رب العزت نے حضرت حزقیل اور برخیا علیہما السلام کو باقاعدہ معد بن عدنان کی حفاظت کے لیے بھیجا، چوں کہ ان کی جبیں میں نور محمدی جلوہ گر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی آمد مبارکہ کا ذکر صدیوں قبل جاری تھا، اس کا باضابطہ ظہور اس وقت ہوا جب سرزمین مکہ پر بسنے والی قوم انسانیت سے عاری ہو رہی تھی، مظالم ڈھانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنا، عورتوں کو 'ستی' پر مجبور کرنا، باتوں بات پہ برسرپیکار ہوجانا، دوسروں کے اموال کو غصب کرنا، ان کے لیے عام بات تھی، ان اخلاقی و معاشرتی مفاسد کے سد باب اور انسانیت کا صحیح درس دینے کے لیے حق جلّ مجدہٗ نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا: خود نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **إنما بعثت معلما** (ابن ماجہ)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **بعثت لاتمم حسن الاخلاق** (موطا: باب حسن الخلق)

آپ ﷺ نے اخلاقیات و معاشرت کی ایسی تعلیم دی کہ ایک صحرانشیں بدوی کو شہنشاہیت کے مقام پر پہنچادیا، بھیڑیوں، بکریوں کے چرانے والے جن کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اللہ نے ان دنیا بھر کے لوگوں کے لئے قابل ذکر نمونہ بنادیا۔ **ذٰلک فضلُ اللّٰہِ یُؤتیہ مَن یَّشاء.**

دعوت اسلام کا مکی دور:

غار حرا میں تحنث کے بعد جب آپ وحی الٰہی: (اِقْرَأ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ) سے شرف یاب ہوئے تو سب سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو

دعوت دی اور یہی سب سے پہلی ہستی قرار پائیں، یہ دعوت خفیہ، دھیمی دھیمی رفتار سے چلتی رہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے ساتھی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما نے ایمان قبول کیا، آپ پر قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا ہی آپ کے اخلاص اور آپ کی صداقت کا بجا ثبوت ہے، آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں کار دعوت کو آگے بڑھاتے رہے، حتیٰ کہ ایک معتد بہ تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی، تو آپ ﷺ ساری ہمت و عزیمت سمیٹ کر نئے مرحلہ اور متوقع حالات کے لیے خود کو تیار کرکے ''اور آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو تنبیہ کردیں'' (الشعرا:۲۱۴) کے نفاذ کے لیے کوہ صفا پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور قریش عرب کو ''**انا النذیر العریان**'' کے ذریعہ مخاطب فرما کر یہ کہتے ہیں:

''اللہ پر ایمان لاؤ، ورنہ تم پر سخت عذاب آئے گا''

ان مختصر الفاظ کے ساتھ آپ نے برسرعام دعوت اسلام کا آغاز فرمایا، جسے سن کر آپ کے چچا ابولہب نے کہا: ''**تبالک**'' تیرا غارت ہو، کیا یہی بات تھی، جس کے لیے تو نے ہم سبھوں کو یہاں جمع کیا، اس کے ساتھ دیگر سامعین بھی خفا ہوکر چلے آئے، پھر دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ تمام خاندان عبدالمطلب کو دعوت طعام دی، جس میں حضرت حمزہؓ، ابوطالب اور حضرت عباسؓ جیسی سرکردہ ہستیوں کو کھانے سے فراغت کے بعد اپنی مختصر تقریر میں فرمایا: ''میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں وہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے، کون اس میں میرا ساتھ دے گا؟'' تھوڑی دیر مجلس پہ سکوت طاری رہا، پھر حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ کی مساعدت کے لیے اعلان فرمایا، جو آگے چل کر اساطین دعوت میں شمار ہوئے۔

اس کے بعد مخالفتوں کا نہ تھمنے والا سیلاب امنڈ آیا، معاندین اسلام کی طرف سے دعوت دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جانے لگیں، بھونڈے بھونڈے پروپیگنڈے کئے

جانے لگے اور آپ کو ساحر، مجنون، کاہن اور نہ جانے کس کس قسم کے خطاب ملے لیکن قدرت نے ہر ایک کا جواب دیا۔

ہجرت حبشہ:

جب مکہ میں کفار کے ظلم وستم حد برداشت سے گزر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ۸۰/افراد پر مشتمل جماعت کو حبشہ ہجرت کی اجازت دے دی، جب یہ لوگ نجاشی کے دربار میں پناہ گزیں ہوئے تو کفار نے ان کا تعاقب کیا اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، نجاشی نے وفد کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے مکالمہ کیا اور بعد میں دریافت کیا کہ جو شخص پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ سناؤ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جنہیں سن کر شاہ حبشہ نجاشی رو پڑے اور کہا کہ یہ کلام اور کلام عیسیٰ علیہ السلام دونوں ایک ہی چشمہ نور سے نکلے ہیں، اس واقعہ کے بعد کفار مکہ نے نجاشی پر حملہ کیا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے نجاشی کو فتح عطا کی۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام:

تاریخ اسلام کا وہ واقعہ بہت ہی یادگار ہے جو سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے سے متعلق ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ۲۷/سال کے تھے جب کہ گلشن محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم بلند ہوا تھا، فاروق اعظم کے بہنوئی حضرت سعید رضی اللہ عنہ ابتدا ہی میں اسلام لے آئے تھے، ان کی دعوت سے عمرؓ کی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ایمان لے آئیں۔ خاندان کی ایک اور بااثر شخصیت نعیم بن عبداللہؓ نے بھی دعوت حق پر لبیک کہا، جب حضرت عمرؓ کو ان کے اسلام لانے کی خبر ملی تو بہت برہم ہوئے حتیٰ کہ اسلام لانے والوں کے جان لینے کے درپے ہوگئے، بالآخر ایک دن تہیہ کرلیا کہ کیوں نہ اصل داعی کو ہی (**نعوذ باللہ من ذلک**) راستے سے ہٹا دیا جائے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ننگی تلوار لے کر چل پڑے، راستے میں نعیم بن عبداللہؓ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا ارادہ ہے، عمر بولے! (**العیاذ باللّٰہ**) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ نعیم بن عبداللہؓ بول پڑے پہلے اپنے گھر کی خبر لو اور اپنے بہن بہنوئی سے نمٹ لو، پھر کسی اور طرف جانا، فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچتے ہی دستک دی، وہ قرآن سیکھ رہے تھے آہٹ ہوئی تو خاموش ہوگئے اور قرآن کے اوراق چھپا لیے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا پڑھا جا رہا تھا، بہن نے ٹالا، کہنے لگے مجھے خبر مل چکی ہے کہ تم دونوں آبائی مذہب سے پھر چکے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی پر ٹوٹ پڑے، بہن بیچ بچاؤ کے لئے آئی تو ان کو مارا، ان کا جسم لہولہان کر دیا، لیکن آخر بہن بھی تو تھی فاروق اعظم کی ڈبڈباتی آنکھوں سے صبر واستقلال اور عزیمت مندانہ لہجہ میں بولیں ”عمر! جو کچھ تم کر سکتے ہو کرلو، اب دل سے اسلام نہیں نکال سکتے ہو“۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو تم پڑھ رہی تھی مجھے بھی لا کر دکھاؤ، یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ جو مکان کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے تھے، فوراً باہر نکل آئے بہن نے کہا: ”**انک رجس لا یمسه الا المتطهرون فقُم فتوضا** “تو ناپاک ہے، قرآن مجید کو پاک ہی لوگ چھو سکتے ہیں، جاؤ وضو کر کے آؤ، عمرؓ اٹھے وضو یا غسل کیا اور صحیفۂ مطہرہ کو ہاتھ میں لیا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے ”میں ہی معبود برحق ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔“ (طٰہٰ: ۱۴) بے ساختہ بول اٹھے ”**مَا أحسن هٰذا الكلام أكرمه** “کیا ہی اچھا اور بزرگ کلام ہے۔ حضرت خبابؓ نے یہ سن کر کہا اے عمرؓ! تم کو بشارت ہو میں امید کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی۔ عمرؓ نے کہا اے خبابؓ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے چلو، حضرت خبابؓ عمرؓ کو ساتھ لے کر

دارارقم کی طرف چل پڑے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ کے ساتھ فروکش تھے، دروازہ بند تھا دستک دی اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ یہ معلوم کر کے کہ عمر اندر آنا چاہتے ہیں کوئی شخص دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کرسکا، سید الشہداء امیر حمزہؓ نے فرمایا اگر خیر کے ارادے سے آرہا ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ خیر کا معاملہ کریں گے اور اگر شر کے ساتھ آرہا ہے تو اسی کی تلوار سے اس کی گردن اڑادیں گے۔

نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کھول دیا گیا اور دو شخصوں نے میرے دونوں بازوؤں پکڑ کر آپ کے سامنے لا کر کھڑا کیا، آقا علیہ السلام نے ان سے فرمایا چھوڑ دو اور میرا کرتا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ اے خطاب کے بیٹے ایمان لاؤ اور یہ دعا فرمائی ''**اللھم اھدِ، اللھم ھٰذا عمر بن الخطاب، اللھم اعز الدین بِعُمر بن الخطاب**'' اے اللہ اس سے اپنے دین کو عزت دے، تو سیدنا عمرؓ بے اختیار پکار اٹھے **اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ** اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی، اس واقعہ پر مسلمانوں نے مارے خوشی کے ایسا نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کا سارا ماحول گونج اٹھا اور دارارقم کی دیواروں کی چول ہل گئی، ان کی قوت بڑھ گئی۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لاتے ہی کعبۃ اللہ میں پہلی مرتبہ اعلانیہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

ظالموں کی چیرہ دستی اور آپؐ کی صلح پسندی:

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دعوت دین کی راہ میں جس قدر آپ کو اذیتیں دی گئیں، سب وشتم کیا گیا، رکاوٹیں ڈالی گئیں، مطعون و معذوب کیا گیا، اتنا کسی نبی اور ہادی کو نہیں ستایا گیا، خود آپ کا فرمان ہے: ''**لقد اوذیت فی سبیل اللّٰہ مالم یوذ احد**'' (ترمذی: کتاب القیامہ)

ظالموں نے ظلم وستم کے پہاڑ اپنے سر پر اٹھالیے؛ لیکن آقاء نامدار تاجدار مدینہ علیہ السلام نے انھیں اُف تک نہ کہا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبنیٰ زید بن حارثہؓ کو ساتھ لے کر طائف پہنچتے ہیں، وہاں عمرو بن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب سب بااثر تھے، آپ نے ان سبھوں کو اسلام کی دعوت دی اور جواب بھی طلب کیا، نہایت غیر متوقع طور پر انہوں نے آپ کا ساتھ دینے اور قریش کے بالمقابل کھڑا ہونے سے انکار کر دیا اور آپ کی تعلیم کا مذاق اڑایا، اس معاملے میں تینوں بھائیوں کی رائے ایک تھی، لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں مزید قیام ناپسند فرمایا اور واپسی کی راہ لی، ان ظالموں نے اپنے غلاموں اور لڑکوں کو ہدایت دی کہ اس شخص کا پیچھا کریں اور زک پہنچائیں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضورؐ اور زید بن حارثہؓ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا، نعلین خون سے بھر گئے، راستہ میں انگوروں کا باغ نظر آیا تو حضورؐ آرام کرنے کیلئے اس میں داخل ہوگئے اور بیلوں کی چھاؤں میں آرام فرمانے لگے، یہ باغ مکہ کے سردار عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اتفاق سے وہ دونوں اس میں موجود تھے، ان کی نظر آپ پر پڑی تو خاندانی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے ایک طشتری میں آپ کو انگور بھجوائے، ان کا نصرانی غلام عداس نے یہ تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے ''بسم اللہ'' پڑھ کر انگور کھانا شروع کیا تو غلام چونکا کہنے لگا کہ اس دیار کے لوگ تو کھاتے وقت یہ کلمات ادا نہیں کرتے۔ حضورؐ کو عداس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا تعارف چاہا اس نے بتایا کہ میں نینوا کا نصرانی ہوں، آپ نے فرمایا تمہارا علاقہ تو ایک صالح شخص یونس بن متیٰ علیہ السلام کا ہے وہ نبی تھے، میں بھی نبی ہوں، لہٰذا وہ میرے بھائی ہیں۔ یہ سن کر عداس نے حضورؐ کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا۔ (حیات رسول امیؐ: ۲۲۴)

دشمنوں نے بارہا ایسی حرکتیں کیں جو نہایت دل آزار، بڑی توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھیں مگر ان موقعوں پر تحمل و برداشت، عالی ظرفی اور کوہ ثباتی کا وہ بلند و بالا ثبوت

دیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر لرزہ براندام کافروں کے خوف اوراعترافِ تقصیرات کے جواب میں **لاتثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء** اپنی مثال آپ ہے اور یہ سب اسی لیے کہ آپ معلم اخلاق تھے۔ اسی کو مولانا الطاف حسین حالیؒ نے کیا اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

خطا کار سے در گزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا

لیکن تاریخ کی ستم ظریفی کہیے یا اعداء اسلام کی سازشوں کی کامیابی کہ آج ایسے شخص کی سیرت وتعلیمات کو دہشت گردی اور ظلم وزیادتی پر مبنی ٹھہرایا جارہا ہے اور آپ کے ماننے والوں کو خوں خوار اور بے رحم انسان دکھلانے کی ہمہ گیر کوششیں ہر سطح پہ جاری ہیں، حالانکہ اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ آشکارہ ہوجائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سراپا رحمت ہیں جن میں ہر ایک کو ان کا جائز حق وصول ہوتا ہے اور یہی مساوات اسلام کی امتیازی شان ہے۔

حضور کریمؐ کی یثرب روانگی:

دعوتِ حق کا پودا مکہ کی سرزمین میں اگا لیکن اس کے پھلوں سے دامن بھرنا مکہ والوں کے نصیب میں نہ تھا پھل مدینہ والوں کے حصے میں آیا، اہل مکہ کی چیرہ دستی سے پریشان ہوکر آپ نے ہجرت مدینہ کا فیصلہ لیا۔ پہلے آپ قبا پہنچے۔ ''قبا'' یثرب سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک آبادی تھی۔ وہاں انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ آپ کا قیام کلثوم بن ہدم کے یہاں تھا جو وہاں کے ممتاز خاندان عمرو بن عوف کا سردار تھا، قبا میں آمد کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ مسجد قبا کی تعمیر تھی۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے یہی مسجد تعمیر ہوئی جو ۸/تا ۱۱/ربیع الاول ۱ھ/ ۲۰ تا ۲۳/دسمبر ۶۲۲ء کے درمیان

تعمیر ہوئی، سورۂ توبہ کی آیت: ۱۰۸ میں اس کا ذکر ہے: **لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ.**

چودہ دن بعد آپ شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، لوگوں کو جب آپ کی تشریف آوری کی خبر ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لیے دوڑ پڑے، قبا سے مدینہ تک جاں نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر یہ عرض کرتا حضور یہ گھر ہے یہ مال ہے یہ جان ہے آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعاء خیر دیتے، شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ لڑکیاں چھتوں پر نکل آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر یہ اشعار پڑھنے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوِدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَى لِلّٰهِ دَاعٍ

معصوم لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں:

نحن جوار من بنی النجار یا حبذاً محمداً من جار

ہم بنی نجار کے پڑوسی ہیں، اے کاش محمد ہمارے پڑوسی ہوجاتے۔

جہاں اب مسجد نبویؐ ہے اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا جب آپ یہاں پہنچے تو سخت کش مکش تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو، بالآخر یہ شرف حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا اور آپ کی سواری القصواء ایسی جگہ بیٹھی جو دو یتیموں سہلؓ وسعدؓ کی ملکیت تھی۔ آپ نے اس زمین کو قیمتاً خریدا اور مسجد نبویؐ کی تعمیر کے ساتھ ہی ازواج مطہراتؓ کے حجرے بھی تعمیر ہوئے، تعمیر کی سرگرمی میں سبھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تمام لوگ ایک آواز ملا کر پڑھتے تھے۔

اللهم لا خير إلا خير الآخره

فاغفر الانصار والمهاجره

یہ مسجد ہر تکلفات سے بری اسلام کی سادگی کی تصویر تھی یعنی کچھ اینٹوں کی دیواریں، کھجور کی پتی کا چھپرا اور کھجور کے ستون تھے، مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقّف چبوترہ آپ نے ''صفہ'' کے نام سے بنوایا یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لائے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے ان کے لئے مستقل یہ جائے پناہ ہوتی آپ یہاں درس دیتے اور تمام حاضرین بغور سماعت فرماتے۔ مروجہ مدارس کا سلسلۃ الذہب اسی دار العلم سے جا کر ملتا ہے۔

ہجرت مدینہ:

جب نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا تو ارشاد ربانی کے مطابق آپ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم فرمایا، جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ جا کر طاقتور ہوتے جا رہے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جا رہا ہے تو انہیں بڑی تشویش ہوئی اور دار الندوہ میں مشورہ کیا جس میں ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے، قسم قسم کے مشورے سامنے آئے۔ بالآخر ابوجہل کے مشورے کو قبول کیا گیا جس نے یہ مشورہ دیا کہ ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب ہو اور پورا مجمع مل کر ایک ساتھ تلواروں سے العیاذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دیں۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبیلہ میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم کے لئے تمام قبائل سے نبرد آزما ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا، پھر کیا ہوا فوراً آستانۂ رسولؐ کا محاصرہ کر لیا گیا اور حضورؐ کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

آپ کو قریش کے اس ناپاک ارادے کی اطلاع بذریعہ وحی مل گئی تھی اس لئے حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا مجھ کو ہجرت کا حکم مل چکا ہے میں آج یثرت روانہ ہو جاؤں گا میرے ذمہ لوگوں کی جو بھی امانتیں ہیں وہ واپس کر دینا۔ یہ کہہ کر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی

معیت میں جانب یثرب چل پڑے۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات جاری ہوتے ہیں ''اے مکہ! تو کتنا پاکیزہ اور کتنا محبوب ہے اگر میری قوم نے مجھے یہاں سے نہ نکالا ہوتا تو میں تیرے سوا کسی دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا''

مذکورہ کلمات کہتے ہوئے یثرب کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، دشمن کا تعاقب ہوتا ہے خبر پا کر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ غار ثور میں چھپ جاتے ہیں، ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر غار تک ان کی رسائی ہو جاتی ہے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکر صدیقؓ گھبرا جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں: ''**لاتحزن إن الله معنا**''۔

مشہور ہے کہ جب غار ثور کے قریب آ پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دفعتاً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر غار کو ڈھانپ لیا ساتھ ہی دو کبوتری آئی اور انڈے سینے لگی، مکڑی نے جالا تان دیا، سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے غلام عامر بن فہیرہ تمام دن کفار کے ساتھ رہتے، شام کے وقت بکریاں چرانے کے لیے وہیں لے آتے اور کفار کی تلاش و مشورہ کی خبر رسانی کرتے رہتے، چوتھے دن آپ غار سے نکلے اور عبداللہ بن اریقط اللیثی جو کافر تھا؛ لیکن راستوں سے خوب واقف تھا، اجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک دن ورات برابر گزر گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ کی شدت عروج کو پہنچ گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آرام کی خواہش ظاہر کی، چہار سو نظر ڈالنے پر ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی پھر اپنی چادر بچھا دی، جس پر آپ ﷺ آرام فرمانے لگے، پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو حاضر خدمت کروں، پاس ہی میں ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے آپ نے کہا کہ ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دو، پھر اس کا دودھ دوہا اور لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے دودھ نوش فرمایا، آفتاب اب ڈھل چکا

تھا، آپ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

قریش نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص محمد (ﷺ) یا ان کے رفیق غار ابوبکر صدیقؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے سو اونٹ بقول بعض ستر اونٹ انعام میں دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم انعام پانے کے لیے تعاقب میں نکلا، اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا تو آپ نے دعا کی اور اس کے گھوڑے کا اگلا پاؤں زمین میں دھنس گیا اور وہ اپنے ناپاک عزم کی تکمیل سے قاصر رہا۔

آپ یثرب پہنچ کر باضابطہ اشاعت اسلام کا سلسلہ سرگرمی سے جاری فرماتے ہیں، انصار مدینہ کو مہاجرین سے الفت ومحبت کے لیے مواخات پر ابھارتے ہیں؛ تاکہ ان مہاجرین کو جنھوں نے بے سروسامانی کے عالم میں آپ کی آواز پر لبیک کہہ کر یثرب کا رخ کیا ہے، انھیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو، پھر رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قدموں کو مضبوطی عطا کی اور آپ اس قابل ہوگئے کہ اشاعت اسلام کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں سے نمٹ سکیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کریں۔

انقلابی پیغام کو عام کرنے والے جانشیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی دور میں کفار ومشرکین کے ساتھ غزوات کے ذریعہ اپنے اصحاب کو انقلابی ذہن عطا کیا اور ان کی مکمل تربیت وراہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کے عظیم دعوتی منصوبوں کو وسعت دینے کیلئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زریں خدمات انجام دیں اور جس شان سے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر قائدین صحابۂ کرامؓ نے اپنا بھرپور تعاون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشیں کو بہم پہنچایا اس کی مثالیں تاریخ میں نایاب ہیں۔ محسن انسانیت کے تیار کردہ افراد نے اپنی جفاکشی سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ بہترین نمونۂ انسانیت ہیں، وہ بے لوث

کردار سے مزین ہیں، ذہانت وفطانت میں اپنی مثال آپ ہیں، سخت ترین حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہونے والے نہیں ہیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ جماعت اور اس کی قیادت نے چند ہی برسوں میں اسلام کی شعاؤں کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا اور اسلامی نظام عدل کا سایۂ رحمت جس رفتار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کرۂ ارضی پر پھیلایا تھا اس میں قطعاً کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ہمارا وجود انہی کی جانفشانیوں کا ثمرہ ہے۔ آج اگر سچائی اور نیکی کی کچھ رمق موجود ہے تو انہی کی مرہون منت ہے، اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی کامیابی وکامرانی کے اٹل اصول ہاتھ آسکتے ہیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ہی سے ہاتھ آسکتے ہیں۔

سیرت طیبہ آج بھی کامیابی کی ضامن:

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات کو عملاً اپنایا اس وقت تک وہ دنیا کے امام ورہبر رہے اور اس شان و شوکت سے ان کی قیادت کی کہ تاریخ اسے بھلا نہیں سکتی، آج اگر وہ ان عظمتوں اور رفعتوں سے محروم ہیں تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انہوں نے اسوۂ نبوی ﷺ سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے آپ کو بربادی کے دہانے پر ڈال دیا ہے آج ان کا دعوئ محبت رسول صرف قرطاس وقلم میں سمٹ کر رہ گیا ہے، ان کی مجالس اور ان کی تحریریں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آباد ہیں؛ لیکن ان کا دل سیرت طیبہ کو عملاً اپنانے سے بے زار و ویران ہے، پھر کیسے انہیں کامیابی مل سکتی ہے۔ صالح معاشرہ کی تشکیل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار وہ مثالی کردار رہا ہے جسے غیروں نے بھی مانا ہے اور یہی آپ کا امتیاز ہے، آپ نے صدق ووفا، جود وسخا کی وہ فضا قائم کی جس سے سبھی اقوام متاثر ہوئیں، آج ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات سے کوسوں دور ہو چکے ہیں، ہمارے دلوں

میں ایمان وایقان کی وہ چنگاری باقی نہ رہی جو شعلۂ جوالہ بن کر ایوان باطل کو خاکستر کر سکے، ہم ان اوصاف سے متصف نہیں جن سے صحابۂ کرامؓ متصف تھے، نتیجتاً آج ہم چہار جانب سے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں، سازشوں کا جال وسیع پیمانے پر پھیلا جا رہا ہے اور انتھک کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کے قلوب سے تخم ایمان کو نکال دیا جائے، لیکن ہم مسلمان آج بھی دنیا کی رنگینیوں اور ظاہری چمک دمک سے اس طرح مسحور ہو گئے ہیں کہ فرمان نبی **الدنیا خضر حلو**، ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے، ہر سو دشمنوں کی یلغار ہے اور ہم میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، بزدلی ہمارے دلوں میں گھر کر گئی ہے، لیکن یقین مانئے قوموں کی تاریخ ہی عروج وزوال سے مرکب ہے، مصائب کا آنا کوئی نئی بات نہیں ان سے نبرد آزما ہونا اسلامی شناخت کو باقی رکھنا اصل سرمایۂ حیات ہے، اگر آج بھی ہم خود کو اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند بنالیں تو انشاء اللہ ضرور عظمت رفتہ کی بازیابی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ''**وَأَنْتُمُ الأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ**''۔

پھر ہو فاراں کی چوٹی سے صدا کوئی بلند
پھر سے آوازِ محمدؐ کو ابھارا دیدے

توہین رسالت ﷺ کی سزا

سرکار دو عالم خاتم النبیین ﷺ کی تعریف وتوصیف میں پوری کائنات رطب اللسان ہے، آپ کی تعریف وتوصیف کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے شعراء وادباء نے رسول اکرم محمد عربی ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کی مگر سب نے اس مصرعہ پر دم ختم کر دیا:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

پوری دنیا میں جس کی تکریم کی آواز بلند ہو رہی ہو، مساجد کے مینار جس کی نبوت و رسالت کی گواہی دے رہے ہوں، زمین جس کی تعظیم سے گونج رہی ہو، آسمان جس کی توقیر میں محو درود ہو، کون ومکاں جس کی ثناء خوانی کر رہے ہوں، سبحان اللہ کیا شان ہے! محبوب کبریا ﷺ کی، خالق کائنات خود رسول کی رفعت شان کا اعلان کر رہا ہے۔

اے محبوب ﷺ! ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا۔ (**سورۂ الانشراح**)

اسم محمد ﷺ کے حسن معنوی، کمال مخفی اور جمال لفظی، الفاظ وکلمات سے ممکن نہیں، اس عظیم وبابرکت نام کے تلفظ وادا سے جو حسین ودل کش آواز عطر بیز سماعت ہوتی ہے وہ حیات وکائنات کے لیے نقش دام بن جاتی ہے۔

جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے

جب ان کا نام آئے **مرحبا صل علیٰ** کہیے

آپؐ خاتم النبیین اور خاتم المرسلین ہیں، پیغام الٰہی اور وحی آسمانی کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہوگیا۔ قرآن مجید نے واشگاف الفاظ میں قیامت تک کے لیے اعلان کردیا۔ ''نہیں ہیں محمدﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن آپﷺ اللہ کے رسول اور تمام انبیاء کے (سلسلے کو) ختم کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ **(سورۂ الاحزاب)**

''اے محمدؐ! کہہ دیجئے کہ میں تم سب کی طرف سے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔''

(سورہ الاعراف)

معلوم ہوا کہ رسول اللہﷺ کی بعثت پوری انسانیت کیلئے ہے، آپﷺ ہی خاتم النبیین اور خاتم المرسلین ہیں اور آپؐ کی حیات مبارکہ پوری انسانیت کے لیے نمونۂ عمل ہے۔ آپ کا مقام حق تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولﷺ (کے حکم) سے پہلے تم سبقت نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ وہ سننے والا اور بخوبی جاننے والا ہے۔'' **(سورۂ الحجرات)**

دربار رسولﷺ میں عرض و نیاز پیش کرنے کے آداب کی تلقین کے ساتھ قرآن واضح کرتا ہے کہ محفل نبویؐ میں ''سرگوشی'' کان میں چپکے چپکے باتیں، باہم کھسر پھسر کرنا، دین حق کا مذاق اڑانا، خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر بجائے ہدیۂ سلام وتحیہ پیش کرنے کا لفظ ''سلام'' تبدیل کر کے معاذ اللہ یہود ومنافقین کی طرح گستاخانہ کلمات زبان سے نکالنا، اللہ کے نزدیک بدترین گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے، جس پر نار جہنم کی دائمی سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے محمدؐ، کیا آپؐ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی سے منع کیا گیا تھا،

پھر بھی وہی کام کرنے لگے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ وہ گناہ اور رسول اللہﷺ کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں اور (اے پیغمبرﷺ) جب وہ آپؐ کے دربار میں آتے ہیں تو آپ کو ایسے الفاظ سے (نعوذ باللہ) سلام کرتے ہیں، جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ (اگر واقعی یہ رسول ہیں تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں، اللہ ہمیں اس کی سزا کیوں نہیں دیتا (یقیناً) ان کے لیے دوزخ کافی ہے، جس میں یہ لوگ ضرور داخل ہوں گے اور (یہ بہت ہی) برا ٹھکانا ہے۔'' **(سورۂ المجادلہ)**

غرض بارگاہ سید الکونینؐ میں ادنیٰ سی ایذا رسانی، قہر الٰہی اور رسوا کن عذاب کا موجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے، ''بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولﷺ کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان پر دنیا وآخرت میں اللہ کی طرف سے پھٹکار ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا گیا ہے۔'' **(سورۂ الاحزاب)**

ختم نبوت کے منکرین اور شاتمین رسولﷺ پر حق تعالیٰ کے غیظ وغضب اور قہر و جلال کا اندازہ تو 'سورۂ القلم' کی ان دس آیات سے لگایا جا سکتا ہے، جن میں ولید بن مغیرہ کی صفات ذمیمہ کا تذکرہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ''عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔ تمہارا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہی انہیں بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں، لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ، یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ بھی مداہنت کریں، ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے، بے وقعت آدمی ہے۔ طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم وزیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفا کار ہے اور ان سے عیوب کے ساتھ بداصل (ولد الحرام) ہے۔ اس بناء پر کہ وہ بہت مال واولاد رکھتا ہے۔ ہماری آیات جب اسے سنائی جاتی ہیں تو کہتا

ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ہم عنقریب اس کو سونڈ پر داغ لگائیں گے (ناک کو سونڈ کہا گیا ہے اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل وتحقیر ہے) یعنی دنیا وآخرت میں اسے ایسا ذلیل وخوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔**(سورہ القلم)**

آیات مذکورہ سے واضح ہوا کہ ایک شاتم وگستاخ رسول ﷺ درج ذیل بدترین صفات کا حامل ہوتا ہے۔

مکذب انتہائی جھوٹا

حلّاف جھوٹی قسمیں کھانے والا

مُھین نہایت حقیر وذلیل شخص

لمّاز بہت زیادہ طعن کرنے والا، عیب گو

منّاع للخیر ہر نیک کام سے روکنے والا

معتد حد سے تجاوز کرنے والا، تعدی کرنے والا

الیم نہایت گناہگار، گناہ کرنے والا

عُتل جھگڑالو، بدخلق اور سفاک، ظالم

زنیم بداصل، بدنسل، ولد الحرام

شان رسالت مآب ﷺ میں کسی بھی نوع کی توہین، تضحیک، استہزاء اور گستاخی کی جو سزا آخرت میں ملنی ہے، وہ تو ضرور ملے گی لیکن اس دنیا میں بھی وہ بد بخت اور لعین رب ذوالجلال کے قہر وغضب سے ہر گز نہیں بچ سکیں گے کیوں کہ اس خدائے غیور کا اپنے محبوب مکرم ﷺ سے وعدہ ہے!

فضائل رمضان المبارک

اسلام کا نواں مہینہ رمضان المبارک ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ماہ رمضان 'رمض' سے ماخوذ ہے اور رمض کے معنیٰ جلانا ہے، چونکہ یہ مہینہ بھی مسلمانوں کے گناہوں کو جلا دیتا ہے اس لئے اس کا نام رمضان رکھا گیا ہے۔ یا اس لئے رکھا گیا ہے کہ رمض کا معنیٰ زمین سے پاؤں جلنا ہے۔ چونکہ ماہ رمضان بھی نفس جلنے اور تکلیف کا موجب ہے لہٰذا اس کا نام رمضان رکھا گیا۔

رمضان کی فضیلت:

امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ رمضان شریف کا مہینہ تمام مہینوں سے افضل ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ محبوب و پیارے تھے اسی طرح سال کے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک خدائے ذوالجلال کو زیادہ محبوب ہے اور جس طرح اللہ کریم نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے واسطے باقی گیارہ بھائیوں کی مغفرت فرمائی اسی طرح رمضان المبارک کی برکتوں سے گیارہ مہینوں کی خطائیں معاف فرمائے گا۔

(ترجمة المجالس ۱/۱۳۶)

معلوم ہوا کہ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس کی آمد پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''رمضان المبارک کی ہر رات میں ایک منادی آسمان سے طلوع صبح تک یہ ندا کرتا رہتا ہے کہ اے خیر کے طلب گار خوش ہو جا اور برائی کے چاہنے والے رک جاؤ اور عبرت حاصل کرلو۔ کیا کوئی بخشش مانگنے والا ہے کہ اس کی بخشش کی جائے۔ کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائے۔ کیا کوئی سوالی ہے کہ اس کا سوال پورا کیا جائے۔ اللہ بزرگ و برتر رمضان کی ہر رات میں افطار کے وقت ساٹھ ہزار گناہ گاروں دوزخ سے آزاد فرماتا ہے اور جب عید کا دن آتا ہے تو اتنے لوگوں کو آزاد فرماتا ہے جتنے تمام مہینے میں آزاد فرماتا ہے۔ تیس مرتبہ ساٹھ ساٹھ ہزار۔

ماہ رمضان کے مشہور واقعات:

۱۔ یکم رمضان المبارک کو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔

۲۔ تین رمضان المبارک میں سیدنا حضرت ابراہیمؑ پر صحائف نازل ہوئے۔

۳۔ چھ رمضان المبارک کو سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر توریت نازل ہوئی۔

۴۔ اٹھارہ رمضان المبارک کو سیدنا داؤد علیہ السلام پر زبور نازل ہوئی۔

۵۔ تیرہ رمضان المبارک کو سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی۔

۶۔ ستائیسویں رمضان المبارک کو حضرت امام الانبیاء والمرسلین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ

ﷺ پر قرآن مجید نازل ہوا۔ **(غنية الطالبين: ۲/۵)**

۷۔ رمضان المبارک میں مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

۸۔ ۱۷/رمضان المبارک کو جنگ بدر ہوئی اور نبی کریم ﷺ کی مدد کے لئے فرشتے نازل ہوئے۔

روزہ کی فرضیت:

رمضان کا روزہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔''

فمن شهد منكم الشهر فليصمه (جو اس مہینے کو پائے وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے۔) **(سورۂ بقرہ)**

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں سے ایک رمضان کا روزہ ہے (بخاری۔ کتاب الایمان) نیز آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: **يا ايها الناس صوموا لشهر كم:** اے لوگو! اپنے مہینہ کا روزہ رکھو۔

(ترمذی، ابواب السفر)

رمضان کے روزے کی فرضیت پر پوری امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ **(بدائع جلد ۲ ص ۲۱۰)**

روزہ کی حالت میں روزہ دار کا نفس حلال چیزوں کو کھانے سے رکا رہتا ہے۔ جائز خواہشات کو پورا کرنے سے باز رہتا ہے۔ باوجودیکہ کھانے کی طرف راغب ہوتا ہے اور خواہشات کو پورا کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

ایسا محض اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے روزہ

دار کرتا ہے، جب روزہ دار کا نفس حلال چیزوں کے بارے میں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے تو حرام کاریوں اور حرام چیزوں سے بچنے میں اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اس طرح روزہ اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچنے کا سبب ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچنا فرض ہے۔ (بدائع ص ۲۱۰) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **لعلکم تتقون**: عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

روزہ سے روزہ دار کی بہیمانہ قوت ٹوٹتی ہے۔ اس لئے کہ جب انسان شکم سیر ہوکر کھاتا ہے تو اس کی شہوانی قوت ابھرتی ہے اور جب بھوکا ہوتا ہے تو ماند پڑتی ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے نوجوانوں کی جماعت! جو تم میں سے عورت رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے نکاح کرنا چاہئے، کیونکہ یہ نظر کو جھکاتا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ روزہ رکھے، کیونکہ اس کے لئے کسر شہوت ہے۔ (بخاری، **کتاب النکاح**)

لہٰذا روزہ معاصی اور گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ثابت ہوا اور گناہوں سے بچنا فرض ہے۔ (**بدائع الصنائع جلد ۲ ص ۲۱۰**)

سحری کھائے بغیر روزہ کا حکم:

سحری کرنا مستقل عبادت ہے۔ ہمارے اور اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے روزے کے درمیان فرق کرنے والی چیز سحری ہی ہے کہ وہ سحری کھائے بغیر روزہ رہتے ہیں اور مسلمانوں کو سحری کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ سحری کرنے میں کئی اعتبار سے برکت ہے اور ثواب بھی جس طرح دوسرے نیک کام کرنے پر اجر وثواب ملتا ہے۔ (فتح الباری ص ۱۴۰)

چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مروی ہے: سحری کھایا

کرو اس میں برکت ہوتی ہے (ثواب ملتا ہے) (بخاری ومسلم)

حضرت عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزہ میں سحری کے لقمہ کا فرق ہے (مسلم)

سحری کھائے بغیر روزہ درست تو ہوجائے گا۔ البتہ سحری کی برکت اور اجر وثواب سے محرومی ہوگی اور اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو اہل کتاب کی مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے گناہ کا اندیشہ ہے۔

افطار میں تعجیل اور سحری میں تاخیر مسنون:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزہ کے افطار میں جلدی کرے (یعنی غروب آفتاب کے بعد بالکل دیر نہ کرے۔ (جامع ترمذی)

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک میری امت کے لوگ افطار جلدی کرتے رہیں گے تو اچھے حال میں رہیں گے (**بخاری ومسلم**)

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت برابر خیر پر قائم رہے گی جب تک افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرتی رہے گی۔ (**مسند احمد**)

حضرت انسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی پھر (جلدی) آپ نماز فجر کے لئے کھڑے ہوگئے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ: سحری کھانے اور اذان فجر کے درمیان کتنا وقفہ ہوگا انہوں نے فرمایا پچاس آیتوں کی تلاوت کے بقدر۔ (بخاری ومسلم)

اعتکاف میں بیٹھنا:

اعتکاف سے مراد اللہ تعالیٰ سے تعلق قلبی کی تقویت کے لئے مسجد کے کونے کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کر لینا۔ یہ امر مسلم ہے کہ رمضان المبارک میں رحمت خداوندی کی گھنگھور گھٹائیں موسلا دھار برس کر گناہوں کی سیاہی کو صاف اور قلوب واذہان کو عمل صالح سے مزین کر دیتی ہیں چنانچہ جب رحمت خداوندی بھرپور جوش میں ہو تو ایک گناہ گار دامن امید پھیلائے اللہ تعالیٰ کے گھر میں بیٹھا التجائیں اور دعائیں مانگ رہا ہو تو بھلا اپنے گھر میں بیٹھے عاجز و مسکین بندے کو اپنے بحر متلاطم کی نعمتوں سے کیوں نہ نوازے گا اور پھر اسی آخری عشرہ میں معتکف شب قدر سے متلذذ ہو کر ان انعامات ربانی کا مستحق ہوتا ہے جن کا ہر قلب مومن متلاشی ہے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا ثواب شمار و قطار سے ماوراء ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ لیلۃ القدر بھی اسی عشرہ کی کسی رات میں ہے۔

معتکف کا ہر لمحہ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ معتکف کے لئے جائز نہیں کہ بلا ضرورت شرعیہ مسجد سے ایک لمحہ کے لئے بھی باہر آئے۔

معتکف چاہے مرد ہو یا کوئی خاتون اسے چاہئے کہ ہر لمحہ و ہر گھڑی کو غنیمت جانے اور عبادت و ریاضت کے ساتھ دعاؤں میں انہماک رکھے اور اپنی دعاؤں کو اپنے لئے ہی مخصوص نہ رکھے بلکہ تمام مومنین و مومنات کو شامل رکھے۔ بہت خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اعتکاف کرتے ہیں۔

شب قدر:

شیطان لعین انسان کا ازلی وابدی دشمن ہے۔ تلبیس ابلیس سے بچنا بہت مشکل مگر ہمارا پروردگار بے حد رحیم و کریم ہے۔ انسان شیطانی چالوں میں پھنستا ہے تو گناہوں کی دلدل میں دھنس جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی توبہ و استغفار کے ذریعے کبھی پنجگانہ نماز

کے ذریعے گناہوں سے پاک و صاف اور منزہ و مطہر کر دیتا ہے، لیکن شیطانی حیلے بہت خطرناک ہیں۔ انسان کو نفسانی خواہشات میں جکڑ کر حرص و ہوس میں مبتلا کر کے اتباع ربانی سے دور کر دیتے ہیں، مگر رحمت ایزدی پھر جوش دکھلاتی ہے اور اپنے عاجز بندوں کو رمضان المبارک جیسا مقدس اور رحمتوں بھرا مہینہ عطا کرتی ہے۔ جس ماہ مقدس میں شیطان قید، دوزخ کے دروازے بند، جنت کے دروازے کھلے اور داخلہ کے لئے رحمت ربانی بھرپور، اسی ماہ مقدس میں لیلۃ القدر ہے کہ جس کی فضیلت ہزار ماہ سے بھی زیادہ ہے۔ گویا کہ انسان بھلے ہی ساری عمر شیطانی چکروں سے نہ نکل سکے لیکن صرف ایک مرتبہ شب قدر میں خلوص نیت سے توبہ کر کے اتباع ربانی میں مشغول ہو جائے تو انسان کامیاب اور اس کا دشمن شیطان ناکام ونامراد۔

شب قدر رمضان المبارک کی آخری راتوں میں آتی ہے۔ شاید تعین نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو رحمت ربانی کے گوہر تابدار سمیٹنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آسکیں۔ کیوں کہ

ہر شب شب قدر است گر قدر دانی:

حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت میں سے جو کوئی مرد یا عورت یہ خواہش کرے کہ اس کی قبر نور سے منور ہو تو اسے چاہئے کہ ماہ رمضان کی شب قدر (طاق راتوں) میں کثرت کے ساتھ عبادت الٰہی بجالائے۔ ان مبارک اور متبرک راتوں کی عبادت سے اللہ پاک اس کے نامۂ اعمال سے برائیاں مٹا کر نیکیوں کا ثواب عطا فرماتا ہے۔

شب قدر کی عبادت ستر ہزار راتوں سے افضل ہے۔

۲۱ ویں شب:

رمضان المبارک کی اکیسویں شب کو چار رکعت دو دو کر کے پڑھیں، ہر رکعت

میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص ایک مرتبہ پڑھیں۔

دو رکعت نفل پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھیں۔ سلام کے بعد ستر مرتبہ استغفار پڑھیں۔ ان نوافل اور شب قدر کی برکت سے اللہ تعالیٰ نمازی کی بخشش فرمائیں گے۔

اکیس مرتبہ سورۂ قدر پڑھنے کی بھی بہت فضیلت ہے۔

۲۳ویں شب:

تیئیسویں شب کو چار رکعت نوافل دو دو کر کے پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھیں۔ پھر سلام کے بعد ستر مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ گناہ سے مغفرت کے لیے یہ نوافل بہت افضل ہیں۔

آٹھ رکعت نوافل چار چار کر کے پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص ایک مرتبہ پڑھیں۔ سلام کے بعد ستر مرتبہ کلمۂ تمجید پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کریں۔

سورۂ یٰسین ایک مرتبہ اور سورۂ رحمٰن ایک مرتبہ پڑھیں۔ یہ بھی بہت افضل ہے۔

۲۵ویں شب:

پچیس تاریخ کی شب چار رکعت نفل دو دو کر کے پڑھیں۔ سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص پانچ مرتبہ پڑھیں، سلام کے بعد کلمۂ تمجید ایک سو مرتبہ پڑھنا ہے۔ درگاہ رب العزت سے ان شاء اللہ تعالیٰ بے شمار ثواب عطا ہوگا۔

دو رکعت نفل پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص پندرہ مرتبہ پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا اور اس کے سب گناہ بخش دے گا۔

۲۹ویں شب:

رمضان المبارک کی انتیسویں شب کو چار رکعت نفل دو دو کر کے پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھیں۔ بعد سلام کے سورۂ الم نشرح ستر مرتبہ پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ ان نوافل کے پڑھنے والے کو دنیا سے مکمل ایمان کے ساتھ اٹھائے گا۔

چار رکعت نفل دو دو کر کے پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص پانچ مرتبہ پڑھیں۔ بعد سلام درود پاک ایک سو مرتبہ پڑھیں۔ ان نوافل کے پڑھنے والے کو دربار خداوندی سے بخشش ومغفرت عطا کی جائے گی۔

جمعۃ الوداع:

رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو بعد نماز ظہر دو رکعت نفل پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ زلزال ایک مرتبہ، سورۂ اخلاص دس مرتبہ، دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورہ کافرون تین مرتبہ اور سورۂ اخلاص دس مرتبہ پڑھیں۔ بعد سلام دس مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ ان نوافل کے پڑھنے والے کو اللہ پاک قیامت تک بے انتہا عبادت کا ثواب عطا فرمائے گا۔

رمضان المبارک اوراس کی عبادتیں

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔اہلِ ایمان ہمیشہ ہی سے رمضان المبارک کی آمد کیلئے خود کو ماہِ شعبان المعظم ہی سے تیار کرتے آئے ہیں ۔ایمان والوں کو رمضان المبارک کے آنے سے خوشی اوراس کے جانے کا غم ہوتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ رمضان المبارک ایسا مہمان ہے جو خالی ہاتھ نہیں آتا بلکہ انعامات کے بادل بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔جس کی بارش میں نیکوکار ہی نہیں، گنہگار بھی نہاتے ہیں۔اس ماہ مبارک میں نیکیوں کی بارش ایسے تواتر کے ساتھ برستی ہے کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں یہ بارشِ انوار نہ برستی ہو۔ ہر دن کے اختتام پر دس لاکھ ایسے مجرموں کو جن پر عذاب لازم ہو چکا تھا وقتِ افطار آزادی کا پروانہ عطا کر دِیا جاتا ہے۔

حضور اقدس صلی االلہ علیہ وسلم کا فرمان ہے''جب ماہ رمضان کی پہلی شب آتی ہے تو جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پورے ماہ ایک بھی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور اللہ کریم ایک ندا دینے والے کو حکم دیتا ہے کہ یوں ندا دو۔اے بھلائی کے طلبگارو آگے بڑھو،اے برائی کے پرستارو پیچھے ہٹو۔

پھر فرماتا ہے، ہے کوئی بخشش کا طلبگار کہ اسے بَخش دِیا جائے؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ جو مانگے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا تاکہ اس کی توبہ قبول کی جائے صبح طلوع ہُونے تک اِسی طرح صدائیں دی جاتی ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی رحمتؐ نے شعبان المعظم کے آخری دن ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم پر ایک عظیم مہینہ سایہ کر رہا ہے، اس میں لیلتہ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے فرض کئے اور رات کا قیام نفلی (عبادت) ہے جس نے اس ماہ میں ایک نیکی کی گویا اس نے دوسرے مہینے میں فرض ادا کیا اور جس نے اس ماہ میں ایک فرض ادا کیا گویا اس نے دوسرے مہینے میں 70 فرض ادا کئے، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ مواسات کا مہینہ ہے، اس میں ایماندار کی روزی فراخ کر دِی جاتی ہے جس نے اِس ماہِ مبارک میں کسی کا روزہ اِفطار کروایا، اس کے لئے ایک غلام آزاد کرنے کا اجر ہے اور اس کے گناہوں کیلئے معافی ہے۔

یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں گنہگاروں کے دل اللہ کریم کی جانب مائل ہو جاتے ہیں اور ہزار ہا گنہگار اس موسم بہار کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گناہوں سے تائب ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جس کے سبب مسجدیں آباد ہو جاتی ہیں۔مومنین کو شیاطین سے نجات مل جاتی ہے۔گھروں سے قرآن مجید کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

لیکن آہ افسوس صد افسوس! بہت سے ایسے بدنصیب مسلمان بھی ہوتے ہیں کہ اس مہمان کا ادب نہیں کر پاتے اور فسق و فجور کی زندگی کو نہیں چھوڑ پاتے، اپنی زندگی میں فیضان رمضان سے استفادہ نہیں کر پاتے جن کے شب و روز میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ابتدائے رمضان میں تو خوب جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جوں جوں ماہ رمضان گزرتا ہے واپس نفسانی خواہشات کا شکار ہو جاتے ہیں جس

کی وجہ سے مسجدوں کی رونقیں معدوم ہونے لگتی ہیں، تراویح کی قطاروں میں کمی آنے لگتی ہے اور پھر وہی لہو ولعب کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

آیئے عہد کریں کہ اس سال ہم اس شان سے ماہ صیام کا استقبال کریں گے کہ انشاء اللہ ماہ شعبان سے ہی اپنے گناہوں سے آلودہ جسموں کو رمضان کے استقبال کیلئے نیکیوں کی جانب مائل کریں گے، ابھی سے عبادت پر کمر باندھیں گے، اللہ کریم سے مدد لیتے ہوئے اگر نماز نہیں پڑھتے تو نماز کی پابندی کریں گے، جھوٹ سے خود کو بچائیں گے، اپنی زبان، اپنی نگاہوں کی، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں گے تاکہ ہم رمضان شریف کا استقبال اس کے شایان شان طریقے سے کرسکیں۔

نیکیوں کا موسم بہار:

خالق کائنات کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمیں ماہ رمضان المبارک جیسی نعمت بے بہا سے سرفراز فرمایا، اس ماہ کا ہر لمحہ رحمت وعنایت سے لبریز ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت اور نیک کام کا اجر وثواب نہ صرف بڑھ جاتا ہے بلکہ نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا کر دیا جاتا ہے۔ رحمت خداوندی کا یہ عالم ہے کہ روزہ دار کا سونا، چلنا، اٹھنا بیٹھنا الغرض ہر فعل عبادت میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرش اٹھانے والے فرشتے روزہ دار کی دعاء پر آمین کہتے ہیں اور مچھلیاں روزہ دار کیلئے افطار تک دعاء مغفرت کرتی رہتی ہیں۔

عبادت کا دروازہ:

روزہ باطنی عبادت ہے کیوں کہ ہمارے بتائے بغیر کسی کو یہ علم نہیں ہوسکتا کہ ہمارا روزہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ باطنی عبادت کو زیادہ پسند فرماتا ہے۔ ایک حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ عبادت کا دروازہ ہے۔ (الجامع الصغیر:۱۴۶)

روزہ کی تعریف:

روزہ کو عربی زبان میں ''صیام'' کہتے ہیں، جس کا مادہ صوم ہے، جس کا معنیٰ باز رہنا، چھوڑنا اور سیدھا ہونا ہے، شریعت میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک عبادت کی نیت سے کھانا پینا اور شہوات نفس سے رک جانے کا نام صوم یعنی روزہ ہے۔ روزہ صرف بھوکے رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ روزہ ہر اس فعل کا نام ہے جو انسان کے نفس پر بوجھ ڈالے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو جھوٹی باتیں اور برے کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھوڑ دینے کی کوئی پروا نہیں''۔ (بخاری)

رمضان المبارک کے حروف اور اس کی خصوصیت:

رمضان المبارک میں پانچ حروف (ر-م-ض-الف-ن) میں ر۔ سے مراد رحمت الٰہی، م۔ سے مراد محبت الٰہی ہے، ض۔ سے مراد ضمان الٰہی، الف۔ سے مراد امان الٰہی اور ن۔ سے مراد نور الٰہی۔ یعنی روزہ، تراویح، تلاوت قرآن، اعتکاف اور شب قدر یہ رمضان المبارک کی مخصوص عبادتیں ہیں جو کوئی خلوص دل سے ان پانچ عبادات کی ادائیگی کرے گا وہ مذکورہ پانچوں انعامات کا مستحق ہوگا۔

20 رکعات تراویح:

دس سلاموں کے ساتھ ۲۰ر رکعات تراویح اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ائمۂ اربعہ اور جمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، اس کا حکم بھی حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ہے، رمضان المبارک میں بہت سے لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ جلد سے جلد آٹھ دس دن میں کلام مجید سنالیں، پھر چھٹی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ سنت ہیں۔ تمام کلام اللہ کا تراویح میں پڑھنا یا سنانا ایک اور پورے رمضان کی

تراویح مستقل ایک سنت ہے۔

مذکورہ صورت میں ایک سنت پر تو عمل ہوجاتا ہے مگر دوسری سنت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ البتہ رمضان المبارک میں سفر وغیرہ یا کسی وجہ سے ایک جگہ تراویح پڑھنی مشکل ہوتو مناسب ہے کہ قرآن شریف چندروز میں سن لیں، پھر جہاں موقع ملے تراویح پڑھ لی جائے۔

اعتکاف:

رمضان المبارک میں اعتکاف کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس کا اہتمام فرماتے تھے، معتکف کی مثال اس شخص کی ہے کہ کسی کے در پر جائے اور یہ کہے کہ جب تک میری درخواست قبول نہ ہو ٹلوں گا نہیں۔ ابن قیمؒ کے بقول ''اعتکاف کا مقصود اور اس کی روح دل کو اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کرلینا ہے''۔

صاحب مراقی الفلاح کہتے ہیں کہ اعتکاف اگر اخلاص کے ساتھ ہوتو افضل ترین اعمال میں سے ہے، اعتکاف کیلئے سب سے افضل جگہ مسجد حرام پھر مسجد نبویؐ، پھر بیت المقدس ان کے بعد مسجد جامع پھر اپنی مسجد۔

شب قدر:

رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات شب قدر کہلاتی ہے جو بہت خیر و برکت والی ہے، قرآن پاک میں اس رات کو ''**لیلۃ القدر خیر من الف شھر**'' (ہزار مہینوں سے افضل) بتایا گیا ہے، خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو اس رات کی عبادت نصیب ہوجائے، جو شخص یہ رات عبادت میں گزاردے گویا اس نے تراسی سال اور چار مہینے سے زیادہ کا عرصہ عبادت میں گزاردیا اور یہ بھی صحیح معلوم نہیں کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے سے کتنے مہینے زیادہ افضل ہے۔

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے قدر دانوں کیلئے یہ نعمت بے بہا مرحمت فرمائی ہے، جو پہلی امتوں کو نہیں ملی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کیلئے) کھڑا ہو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ (بخاری)

صدقۃ الفطر:

صدقۃ الفطر ہر اس آزاد مسلمان پر واجب ہے جو بنیادی ضروریات (مکان، لباس، سواری، ضروری ہتھیار وغیرہ) سے زائد نصاب کا مالک ہو اس میں عاقل و بالغ ہونا شرط نہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقۃ الفطر صرف اس شخص پر ہے جس کے ذمہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے، حالانکہ یہ درست نہیں زکوٰۃ صرف سونے، چاندی، مال تجارت اور نقدی میں فرض ہوتی ہے جبکہ صدقۃ الفطر کے نصاب میں زائد ضروریات اشیاء نصاب (۶۱۲ء۳۵ گرام چاندی یا ۸۷ء۴۷۹ گرام سونے کی قیمت) کی مقدار میں ہیں یا اموال زکوٰۃ مقدار نصاب سے کم مالیت کے ہیں لیکن زائد از ضرورت اشیاء کو ملانے سے ان کی مجموعی مالیت نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو ان دونوں صورتوں میں صدقۃ الفطر ادا کرنا واجب ہے۔

صدقۃ الفطر جب چاہیں دے سکتے ہیں، لہٰذا رمضان کے مہینے سے پہلے پہلے ادا کرنا بھی صحیح ہے بلکہ اگر کئی سالوں کا صدقۃ الفطر ایک ساتھ دے تو بھی جائز ہے۔

زکوٰۃ:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جو شخص مال کی زکوٰۃ ادا کردے تو اس کا مال شر اس سے جاتا رہتا ہے'' ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زکوٰۃ نہ دینے والا قیامت کے دن دوزخ میں جائے گا''۔

مال داروں کے مال میں حق:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسلمان مالداروں پر ان کے مال میں اتنا حق (یعنی زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے غریبوں کو کافی ہو جائے اور غریبوں کو بھوکے، ننگے ہونے کی جب کبھی تکلیف ہوتی ہے، مالداروں ہی کی (اس کرتوت کی) بدولت ہوتی ہے (کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان سے (اس پر) سخت حساب لینے والا اور ان کو دردناک عذاب دینے والا ہے۔ (طبرانی اوسط وصغیر)

مال کا طوق:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو پھر وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، قیامت کے روز وہ مال ایک گنجے سانپ کی شکل بنا دیا جائے گا جس کی آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں گے (ایسا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے) اور اس کے گلے میں طوق (یعنی ہار) کی طرح ڈال دیا جائے گا اور اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیری جمع ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی تصدیق میں) یہ آیت پڑھی (**ولا یحسبن الذین یبخلون الخ**) اس آیت میں مال کے طوق بنائے جانے کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی (مقبول) نہیں ہوتی۔

روزہ دار کے لئے دو خوشیاں:

ولتکملوا العدة ولتکبروا اللّٰہ علیٰ ماھدٰکم ولعلکم تشکرون (بقرہ:۱۸۵)

حق جل مجدہٗ کا اس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ رب کریم نے اپنے فضل سے ہمیں رمضان المبارک کا مہینہ عطا فرمایا اور اس مہینے کی برکتوں سے ہمیں نوازا اور اس

میں روزے رکھنے اور تراویح پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی، پھر اس مبارک مہینے کے اختتام پر اس مہینے کے انوار و برکات سے مستفید ہونے کی خوشی میں ''عید الفطر'' عطا فرمائی۔ حدیث شریف میں رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **للصائم فرحتان فرحة عند افطار و فرحة حین یلقی ربه۔** (نسائی، کتاب الصیام)

یعنی اللہ تعالیٰ نے روزہ دار کے لئے دو خوشیاں رکھی ہیں: ایک خوشی وہ ہے جو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے اور دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب وہ یوم قیامت میں اپنے پروردگار سے جا کر ملاقات کرے گا۔ اصل خوشی تو وہی ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہر مومن کو نصیب ہوگی۔ انشاء اللہ۔

افطار کے وقت کی خوشی:

جبکہ اس آخرت کی خوشی کی تھوڑی سی جھلک اللہ رب العزت نے اس دنیا میں بھی رکھ دی ہے، یہ وہ خوشی ہے جو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ افطار دو قسم کے ہیں: ایک افطار وہ ہے جو روزانہ رمضان المبارک میں روزہ افطار کے وقت ہوتا ہے، اس افطار کے وقت ہر روزہ دار کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دیکھئے! سارے سال کھانے پینے میں اتنا لطف اور اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی ہے جو لطف اور خوشی رمضان المبارک میں افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، ہر شخص اس کا تجربہ کرتا ہے۔ علماء کرام روزانہ کے اس افطار کو ''افطار اصغر'' کا نام دیتے ہیں اور دوسرا افطار وہ ہے جو رمضان المبارک کے ختم پر ہوتا ہے جس کے بعد عید الفطر کی خوشی ہوتی ہے اس کو ''افطار اکبر'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ پورے مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل پر روزے رکھنے اور اس کی بندگی اور عبادت کرنے کے بعد حق جل مجدہٗ عید کے دن خوشی اور شادمانی عطا فرماتے ہیں، یہ خوشی آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت حاصل ہونے والی خوشی کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے جو رب کریم نے

اپنے بندوں کو عید کی شکل میں عنایت فرمائی ہے۔

اسلامی تہوار دوسرے مذاہب کے تہواروں سے مختلف ہے:

یہ بھی اسلام کا نرالا انداز ہے کہ پورے سال میں صرف دو تہوار اور دو عیدیں مقرر کی گئی ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور مختلف الخیال لوگوں میں پورے سال کے دوران بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں، عیسائیوں کے تہوار الگ ہیں، یہودیوں کے اور ہندوؤں کے تہوار الگ الگ ہیں، جبکہ اسلام نے صرف دو ہی تہوار مقرر کئے ہیں، ایک عیدالفطر اور دوسرا عیدالاضحیٰ۔ ان دونوں تہواروں کو منانے کے لئے جن دنوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ پوری دنیا کے تہواروں سے الگ اور نرالے ہیں، اگر آپ دوسرے مذاہب کے تہواروں پر غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ لوگ ماضی میں پیش آنے والے کسی واقعہ کی یادگار میں تہوار مناتے ہیں۔ مثلاً عیسائی ۲۵ر دسمبر کو ''کرسمس ڈے'' کا تہوار مناتے ہیں۔ بقول عیسائیوں کے وہ یہ تہوار حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مناسبت سے مناتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل ہی غلط ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ۲۵ر دسمبر کو ہوئی، چنانچہ آپ کی پیدائش کی یاد میں انہوں نے ''کرسمس ڈے'' کو تہوار کے لئے مقرر کر لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون سے جس دن نجات ملی تھی اور فرعون غرق ہو گیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل کو عبور کر لیا تھا، اس دن کی یاد میں یہودیوں نے اپنا تہوار منانا شروع کر دیا۔ اسی طرح ہندوؤں کے یہاں بھی جو تہوار ہیں وہ بھی ماضی کے کسی نہ کسی واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اسلام کا کوئی بھی تہوار ماضی کے واقعہ سے وابستہ نہیں:

اسلام میں جو دو تہوار مقرر ہیں وہ ''عیدالفطر'' اور ''عیدالاضحیٰ'' ہیں۔ ماضی کا کوئی

واقعہ اس دونوں تہواروں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، یکم شوال کو عیدالفطر منائی جاتی ہے اور دس ذی الحجہ کو عیدالاضحیٰ منائی جاتی ہے، ان دونوں تہواروں کی تاریخوں میں کوئی تاریخی واقعہ پیش نہیں آیا، اسلام نے نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن کو عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے مقرر کیا، نہ ہی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکۃ المکرّمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کے اس تاریخی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار دیا اور نہ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے میدان میں فتح ونصرت سے ہمکنار ہونے پر ''عید'' کا دن قرار دیا، نہ ہی غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب اور اسی طرح سے بیسیوں غزوات کے دن کو ''عید'' کا دن قرار دیا، جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا کفر ہمیشہ کے لئے حرمین کی زمین میں دفن ہوا اور بیت اللہ کی چھت سے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اللہ اکبر کی صدا پہلی مرتبہ گونجی اس دن کو بھی ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا۔ اسلام کی پوری تاریخ اور خاص طور پر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھرپور ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا، یہ بھی اسلام کی حقانیت کی علامت ہے۔

''عیدالفطر'' روزوں کی تکمیل پر اللہ کا انعام:

جن ایام کو اسلام نے تہوار مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو ماضی میں ایک مرتبہ پیش آکر ختم ہو چکا ہو، بلکہ اس کے بجائے ایسے خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کی آمد کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ اللہ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمائی ہیں جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، چنانچہ عیدالفطر رمضان المبارک کے گزرنے کے بعد رکھی ہے کہ میرے بندے پورے مہینے میری بندگی کے اندر مشغول رہے اور پورے مہینے انہوں نے میری خاطر کھانا پینا چھوڑے رکھا، نفسانی خواہشات کو چھوڑے رکھا، جبکہ ان کے سامنے فریج کا

ٹھنڈا پانی، کھانے کے مواقع اور خواہشات نفس پوری کرنے کیلئے شریک حیات کی موجودگی کے باوجود صرف انہوں نے میری رضا کے لئے پورا مہینہ عبادت کے اندر گزارا، اس کی خوشی اور انعام میں یہ عیدالفطر مقرر فرمائی۔

''عیدالاضحیٰ'' حج کی تکمیل پر انعام ربانی:

عیدالاضحیٰ ایسے موقع پر مقرر فرمائی جب مسلمان ایک دوسری عظیم عبادت یعنی حج کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس لئے حج کا سب سے بڑا رکن وقوف عرفہ ۹/ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا ہے، اس تاریخ کو پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں بندگان خدا میدان عرفات میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عظیم عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، اس عبادت کی تکمیل کے اگلے دن یعنی دس ذی الحجہ کو اللہ رب العزت نے دوسری عید مقرر فرمائی۔ اس کے ذریعہ رب کریم نے یہ سبق دیا کہ ماضی کے وہ واقعات جو ایک مرتبہ پیش آئے اور ختم ہو گئے، وہ واقعات تمہارے لئے عید کی بنیاد نہیں، بیشک تمہاری تاریخ ان واقعات سے جگمگا رہی ہے اور تمہیں ان پر فخر کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے، تمہارے آباء واجداد نے یہ تاریخی کارنامے انجام دیئے تھے لیکن تمہارے لئے ان کا عمل کافی نہیں، تمہارے لئے تمہارا ہی عمل ضروری ہوگا۔ کوئی شخص آخرت میں صرف اس بنیاد پر نجات نہیں پائے گا کہ اس کے آباء واجداد نے اتنے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے بلکہ وہاں ہر آدمی کو اپنے کئے جواب دینا ہوگا۔ بقول شاعر

عمل کہ اپنی اساس کیا ہے
بجز ندامت کہ پاس کیا ہے
رہے سلامت تمہاری نسبت
میرا تو بس یہی آسرا ہے

محض ماضی کے واقعات پر خوشی و مسرت کا احیاء کرتے رہنا صاحب ایمان کے

لئے کافی نہیں بلکہ خود اس کو اپنے عمل کو دیکھنا ہے، اگر اس کے اپنے عمل کے اندر اچھائی ہے تو خوشی منائے اور اگر خرابی و برائی ہے تو سر دھونے اور ندامت و رنج کا اظہار کرتے رہنا بھی تقاضائے ایمان ہے۔

عید کا دن ''یوم الجائزۃ'' ہے

خیر! یہ عیدالفطر خوشی منانے کا اور اسلامی تہوار کا پہلا دن ہے، حدیث شریف میں اس کو ''یوم الجائزۃ'' بھی قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے مہینے کی عبادتوں پر انعام دیئے جانے کا دن ہے جو ''مغفرت'' کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ گزر جانے کے بعد عید کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اصحاب ایمان کی طرف اشارہ کر کے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں۔

انسانوں کی تخلیق پر فرشتوں کے سوال کا جواب:

اس لئے فخر فرماتے ہیں کہ جب سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جا رہا تھا ان فرشتوں نے اعتراض کیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ:

اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔ (بقرہ:۳۰)

آپ مٹی کے اس پتلے کو پیدا کر رہے ہیں جو زمین پر جا کر فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا اور ایک دوسرے کے گلے کاٹے گا اور ہم آپ کی تسبیح و تقدیس کے لئے کافی ہیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

انی اعلم ما لا تعلمون۔ (بقرہ:۳۰)

اس مخلوق کے بارے میں میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میں جانتا

ہوں کہ اس مخلوق کے اندر اگرچہ میں نے فساد کا مادہ بھی رکھا ہے، فساد پھیلانے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے، لیکن اس کے باوجود جب یہ مخلوق میرے حکم کی تعمیل کرے گی اور میری عبادت و بندگی بھی کرے گی تو یہ تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی۔ کیونکہ تمہارے اندر میں نے فساد کا مادہ ہی نہیں رکھا، چنانچہ اگر تم گناہ کرنا بھی چاہو تو گناہ نہیں کر سکتے، نہ تم کو بھوک و پیاس لگتی ہے، نہ تمہارے دل و دماغ میں جنسی اور نفسانی خواہشات پیدا ہوتی ہیں تمہیں تو صرف اسی لئے پیدا کیا ہے کہ بس ''اللہ اللہ'' کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے رہو، لیکن اس انسان کو بھوک و پیاس لگے گی، جنسی خواہشات بھی پیدا ہوں گی، جب میں اس مخلوق سے یہ کہہ دوں گا کہ کھانا پینا مت، تو میرے اس حکم کے نتیجے میں انسان سارا دن اس طرح گزار دے گا کہ اندر سے پیاس لگ رہی ہوگی، فریج میں ٹھنڈا پانی موجود ہوگا، کمرے میں کوئی دوسرا انسان دیکھنے والا بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود صرف میرے خوف اور میری عظمت کے خیال سے اور میرے حکم کی اطاعت میں یہ اپنے ہونٹوں کو خشک کئے ہوئے ہوگا۔ اس صفت کی وجہ سے یہ انسان تم سے بھی آگے بڑھ جائے گا۔

آج میں ان تمام کی مغفرت کر دوں گا:

خیر! عیدالفطر کے دن جب مسلمان عیدگاہ میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہی فرشتوں کے سامنے جنہوں نے اعتراض کیا تھا، فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے میرے فرشتو! یہ ہیں میرے بندے جو میری بندگی میں لگے ہوئے ہیں، اور بتاؤ کہ جو مزدور اپنا کام پورا کر لے اس کو کیا صلہ ملنا چاہئے؟ جواب میں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جو مزدور اپنا کام پورا کر لے اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کو اس کی پوری پوری مزدوری دے دی جائے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ اللہ رب العزت پھر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے ہیں، میں نے رمضان المبارک کے مہینے میں ان کے ذمے ایک کام لگایا تھا کہ روزہ رکھیں

اور میری خوشنودی کی خاطر کھانا پینا اور اپنی خواہشات کو چھوڑ دیں۔ آج انہوں نے یہ فریضہ پورا کر لیا اور اب اس میدان کے اندر اکٹھے ہوئے ہیں اور مجھ سے مغفرت چاہنے کے لئے آئے ہیں، اپنی مرادیں مانگ رہے ہیں، میں اپنی عزت وجلال کی قسم کھاتا ہوں، اپنے علو مکان کی قسم کھاتا ہوں کہ آج میں سب کی دعائیں قبول کروں گا اور ان کے گناہوں کی مغفرت کر دوں گا اور ان کی برائیوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دوں گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب روزہ دار عیدگاہ سے واپس جاتے ہیں تو اس حالت میں ہوتے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔

''عیدین'' کی نماز عیدگاہ میں ادا کی جائے:

یہ معمولی انعام نہیں ہے کہ رب کریم پورے مجمع کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی نماز کے لئے اس بات کو سنت قرار دیا کہ مسلمان بڑی سے بڑی تعداد میں کھلے میدان میں آسمان کے نیچے جمع ہوں اور مجمع کثیر ہو، کیونکہ مجمع جب بڑا ہوگا اس مجمع میں نہ جانے کس اللہ کے بندے کی برکت، بندگی کی برکت سے اللہ تعالیٰ پورے مجمع عام پر رحمت کی بارش فرما دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی وکریمی تو دیکھئے کہ اگرچہ انعام کے مستحق چند ہی افراد ہوتے ہیں جنہوں نے صحیح معنی میں اللہ کی بندگی کی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو مجھ جیسے ناکارہ اور گناہوں سے لت پت بھی اگر وہاں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ ان چند افراد کی تو مغفرت کر دوں اور باقی لوگوں کی نہ کروں، یہ میری رحمت سے بعید ہے، لہٰذا سب کی اپنے فضل وکرم سے مغفرت فرما دیتے ہیں۔

یہ چند اقتباسات ''اصلاحی خطبات'' (مصنف مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی) سے برائے استفادۂ عامۃ المسلمین لئے گئے ہیں۔

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل واحکام

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت کے سلسلہ میں متعدد آیات اوراحادیث وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''**وَالفَجرِوَلَیَالٍ عَشر**''(**الفجر**)''قسم ہے فجر کی اوردس راتوں کی''۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عشرۂ ذی الحجہ ہے۔''**وَ یَذکروا اسمَ اللّٰہِ فِی اَیَّامٍ مَّعلُوماتٍ**''(الحج)''اورمقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں''۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بقول یہ عشرۂ ذی الحجہ ہے۔ایک اورحدیث جس کوامام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''**ماالعمل فی ایام افضل من ھٰذہ الشھر " قالوا ولا الجھاد قال " ولا الجھاد ولا رجل خرج یخاطر بنفسه وماله فلم یرجع بشئ**''(رواہ البخاری)

''ان دس دنوں سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جن میں نیک عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہو، لوگوں نے دریافت کیا، کیا اللہ کے راستے میں جہاد بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد بھی نہیں مگر وہ شخص جو اپنی جان اور مال کے ساتھ نکلے اور کچھ واپس

لے کر نہ آئے۔ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**مامن أیام اعظم عند الله سبحانه وتعالیٰ ولا احب إلیه العمل فیهن من هٰذه الأیام العشر فاکثروا فیهن من التهلیل والتکبیر والتحمید**''**رواه الطبرانی فی المعجم الکبیر**۔(ان دس دنوں سے بڑھ کر اور کوئی دن نہیں جن میں نیک عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہو پس ان دنوں میں تکبیر وتحمید اور تہلیل کثرت سے کرو)۔

سعید بن جبیر جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی پہلی والی حدیث کے راوی ہیں ان کا عمل یہ تھا کہ جب عشرۂ ذی الحجہ شروع ہوتا تو عبادت میں اتنی مشقت اوراجتہاد سے کام لیتے کہ ان کی استطاعت سے باہر ہوجاتا۔(رواہ الدارمی باسناد حسن) اورسعید بن جبیر سے ہی مروی ہے:

" لا تطفؤا سراجکم لیالی عشر" کنایة عن القرأة و القیام "

(قرأت اور قیام سے کنایہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دس راتوں میں اپنے چراغوں کو مت گل کرو) ابن حجرؒ فتح الباری میں کہتے ہیں کہ عشرۂ ذی الحجہ کے امتیاز کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بڑی بڑی عبادات نماز، روزہ، صدقہ اور حج اکٹھا ہوجاتی ہیں اس کے علاوہ کسی اورعشرہ میں نہیں آتیں۔ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اللطائف میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے دلوں میں اپنے گھر کو دیکھنے کا اشتیاق رکھا ہے لیکن ہر کوئی ہر سال اسے دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔اہل استطاعت پر عمر میں ایک بار حج فرض کیا جبکہ پیچھے رہنے والوں کے لیے عشرۂ ذی الحجہ کا موسم مشترک بنادیا۔اسی طرح شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ عشرۂ ذی الحجہ اور رمضان کے آخری عشرہ دونوں میں سے کون افضل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: عشرۂ ذی الحجہ رمضان کے دس دنوں سے افضل اور رمضان کے آخری عشرہ کی راتیں عشرۂ ذی الحجہ سے افضل ہیں۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان گھڑیوں کو غنیمت جانیں اور اوقات کی محافظت پر جلدی کریں، کیونکہ عمر کا تو ثمن بھی باقی نہیں ہے اپنے ضائع کئے ہوئے وقت پر اپنے اللہ سے توبہ کریں اور یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ ان مبارک ایام میں عمل صالح کی حرص، خیر کی تلاش اور تقویٰ کی دلیل ہے۔ ”**ذٰلِکَ وَ مَن یُّعَظِّم شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِن تَقوَی القُلُوبِ**“ اللہ کی نشانیوں کی جو عزت وحرمت کرے یہ اس کے لیے دل کے تقویٰ کی وجہ سے ہے۔ ان ایام میں مستحب امور یہ ہیں کہ خیر کے عام موسموں کا سچی توبہ سے استقبال کرے۔ اس لیے کہ کوئی بھی دنیا وآخرت کی بھلائی سے محروم نہیں کیا جائے گا مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَمَا اَصَابَکُم مِّن مُّصِیبَةٍ فَبِمَا کَسَبَت اَیدِیکُم وَیَعفُو عَن کَثِیرٍ** (الشوریٰ)

(تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے اعمال کا بدلہ ہے اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر فرمالیتا ہے)

دلوں پر گناہوں کے بڑے خطرناک اثرات ہوتے ہیں جس طرح زہر جسموں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے نکالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، اسی طرح گناہ دلوں پر بہت برا اثر چھوڑتا ہے، کیونکہ گناہوں سے گناہ اور اس کے متعلقات ہی پیدا ہوتے ہیں یہاں تک کہ بندے کا گناہوں کو چھوڑنا اور اس وادی سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس لئے معاصی وذنوب سے دور رہ کر کثرت سے استغفار اور ذکر الٰہی کی مداومت کے ساتھ ان ایام کا استقبال انتہائی ضروری ہے، ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کب موت کا پروانہ آجائے اور ہم اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

”مامن أیام اعظم عند الله سبحانه ولا احب الیه العمل فیهن من

هذه ألايام العشر“

(ان دس دنوں سے بڑھ کر اور کوئی دن نہیں ہے جس سے نیک عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہو)

اور نیک اعمال جن سے بعض لوگ غافل ہیں تلاوت قرآن، کثرت صدقہ، مساکین پر خرچ کرنا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اسی طرح دوسرے اعمال۔ فرائض کی ادائیگی کے لیے علی الصباح بیدار ہونا، صفِ اول کے حصول کے لیے جلدی کرنا اور کثرت سے نوافل ادا کرنا مستحب عمل ہے اور قربت کے اعلیٰ طریقوں میں سے ہے۔

حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”کثرت سے سجدے کیا کر تو کوئی بھی ایسا سجدہ نہیں کرتا مگر اس سے اللہ تیرا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔“ اور یہ ہر وقت کے لیے عام ہے۔

اعمال صالحہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ہنیدہ بن خالدؓ اپنی شریک حیات سے اور وہ بعض امہات المومنین سے روایت کرتی ہیں ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نو ذی الحجہ، یوم عاشورہ اور ہر ماہ میں تین دن روزے رکھا کرتے تھے“ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ”چار کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں چھوڑے تھے دس محرم کا روزہ، عشرۂ ذی الحجہ کے روزے، ہر ماہ تین روزے اور فجر کی دو سنتیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**مامن عبد یصوم یوما فی سبیل الله إلا باعد الله بذالک الیوم وجهه عن النار سبعین خریفا**“ (متفق علیہ)

(کوئی بھی بندہ جب اللہ کے راستے میں ایک روزہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے چہرے کو آگ سے ستر سال دور کر دیتا ہے)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ عشرۂ ذی الحجہ کے روزے کے متعلق فرماتے ہیں ”یہ بہت

بڑا مستحب عمل ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرۂ ذی الحجہ کے دنوں میں یوم عرفہ کو اس کی اہمیت اور اس کے روزے کی فضیلت کی وجہ سے خاص کیا ہے۔

''صیام یوم عرفة احتسب علی الله ان یکفر السیئة التی قبله والتی بعده'' (رواہ مسلم)

(نو ذی الحجہ کا روزہ میں اللہ سے امید کرتا ہوں کہ یہ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے)

حج وعمرہ ادا کرنا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **''والحج المبرور لیس له جزاء إلا الجنة''** (رواہ مسلم)

(حج مبرور کی جزا صرف اور صرف جنت ہے)

دوسری جگہ آپ کا فرمان ہے: **''من حج البیت فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته أمه''** (رواہ البخاری)

(جس نے اس گھر کا حج کیا نہ فحش گوئی کی اور نہ فسق وفجور کیا ایسے لوٹتا ہے جیسے آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے)

تکبیر وتحمید وغیرہ:

جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی گزشتہ حدیث میں گزرا ہے: ''بس بکثرت ان دنوں میں اللہ کی تکبیر وتحمید اور تہلیل کرو''

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم ان دنوں بازار میں نکل جاتے یہ دونوں (بآواز بلند) تکبیرات کہتے اور لوگ بھی ان کے ساتھ تکبیرات کہتے

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں اپنے خیمہ کے اندر تکبیریں کہتے تو مسجد والے لوگ ان کی آواز سنتے جو وہ اور بازار والے لوگ مل کر تکبیرات کہتے یہاں تک کہ (میدان) منیٰ تکبیر کی آوازوں سے گونج اٹھتا تھا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ان دنوں میں نمازوں کے بعد، اپنے بستر پر، اپنے خیمے میں، اپنی مجلس میں اور پیدل چلتے وقت بھی تکبیرات کہا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن خطاب، ابن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے عمل کے مطابق مردوں کے لیے اونچی آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے اور عورتیں بھی تکبیر کہیں مگر آہستہ آواز سے جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے ''حتیٰ کہ ہم حیض والی عورتوں کو بھی نکالتیں وہ لوگوں کے پیچھے کھڑی ہوتیں ان کی تکبیر کے ساتھ تکبیر اور ان کی دعا کے ساتھ دعا کرتی تھیں۔''

لہٰذا مسلمانوں کیلئے فرض ہے کہ سنت کو زندہ کریں اس سے پہلے کہ اس کو بھلا دیا جائے حتیٰ کہ اہل خیر واصلاح بھی اس کو چھوڑے ہوئے ہیں جبکہ اسلاف اس پر عمل پیرا تھے۔

فتنۂ قادیانیت کو سمجھنے کی ضرورت

ہر عہد میں اسلام اور اسلامی عقیدے پر حملہ آور مختلف بھیس میں آتے رہے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ایمانی عقیدہ پر اکثر اسلامی نام سے ہی تیشہ چلایا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ جب اسلام کے نام پر ہی قادیانی فتنہ نے اسلام کے تار و پود کو اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد تیز کی تو اہل اسلام جلد ہی اس بات سے آگاہ ہوگئے کہ دراصل دنیا بھر میں مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کی جو مہمات چل رہی ہیں ان میں سے ہی ایک احمدیہ مسلمان نامی گروہ بھی ہے جسے دنیا قادیانی فتنہ کے نام سے جانتی ہے، تحقیق سے پتہ چلا کہ قادیانی فتنہ کے پیچھے بھی وہی اسرائیلی اور صہیونی قوت سرگرم ہے جس نے دنیا بھر میں مسلمانوں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ قادیانیوں اور ان کے سرپرستوں نے ہندوستان جیسے جمہوری ملک کو اپنے لیے سرسبز وشاداب علاقہ تصور کرلیا ہے، اس لیے بھی کہ یہی وہ ملک ہے جہاں انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان کے جمہوری مزاج کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قادیانی رہ رہ کر مختلف عنوانات سے سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں شمالی بہار میں ضلع سپول کے ضلع

مجسٹریٹ شریف عالم جو بہار، جھارکھنڈ اور نیپال کا امیر ہے، شمالی بہار کے سیکڑوں مسلمانوں کو مادی فائدہ پہنچا کر یا اپنے عہدہ کے اثر ورسوخ کی بنیاد پر قادیانی فتنہ کا شکار بنا چکا تھا یہاں تک کہ کئی تقریبات بھی منعقد کر چکا تھا اور قادیانیوں کے عالمی امیر مرزا مسرور قادیانی کے استقبال کا بھی ایک پروگرام طے کیا جا چکا تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب راقم الحروف کو ملی تو پھر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے مشورے وتائید سے ناچیز کی سربراہی میں تحریک تحفظ ختم نبوت بہار کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت قادیانیوں کی بیخ کنی کے لیے کئی محاذ پر سرگرمیاں تیز کردی گئیں۔ تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر بہار کے مختلف اضلاع میں دو درجن اجلاس منعقد کیے گئے اور پانچ درجن تربیتی کیمپ کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے علاوہ قادیانیت سے متاثرہ علاقوں میں مبلغین بھیجے گئے تاکہ بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو تائب کرایا جاسکے۔ دوسری طرف قادیانی ڈی ایم شریف عالم کے خلاف میڈیائی سرگرمی کے ساتھ ساتھ حکومتی سطح پر بھی اس کی کارستانی پر روک لگانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ان تمام مہمات کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف سیکڑوں افراد جو اپنا ایمان گنوا چکے تھے، ان کو تائب کرا کر دوبارہ دائرۂ اسلام میں شامل کیا گیا اور قادیانی ڈی ایم کا بھی تبادلہ ہوگیا۔

فکر وتشویش کی بات یہ ہے کہ قادیانیوں نے اپنے بال وپر پھیلانے شروع کردیے ہیں جس کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے قومی راجدھانی دہلی میں پارلیمنٹ کے قریب کانسٹی ٹیوشن کلب میں 23 تا 25 ستمبر 2011 سہ روزہ تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ قرآن ایگزیبیشن کے نام پر منعقد ہونے والی اس تقریب میں کون کون لوگ شریک ہوں گے انہیں خفیہ رکھا گیا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جس جماعت کے خلاف پوری امت کے مذہبی قائدین نے فیصلہ دیا ہے کہ وہ باطل اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، پھر اس کی تقریب منعقد ہونے کے پیچھے کون سی طاقت کارفرما ہے؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ

بعض مسلم دانشوران بھی قادیانی فتنہ کے مضر اثرات کو نہیں سمجھتے اور اسے پھلنے پھولنے کو ان کا جمہوری حق تصور کرتے ہیں۔ بلاشبہ جمہوریت میں سب کو حق ہے کہ وہ اپنے مسلک ومشرب کی تبلیغ کرے لیکن اسلام کے نام پر اسلام مخالف کسی بھی سرگرمی کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور اس کے لیے اہل اسلام اپنی ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ آئیے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر قادیانی فتنہ ہے کیا اور کیوں اس کو رد کرنے کی ضرورت ہے؟

عقیدۂ ختم نبوت:

اسلام کی بنیاد توحید اور آخرت کے علاوہ جس اساسی عقیدے پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیؐ پر نبوت اور رسالت کے مقدس سلسلے کی تکمیل ہوگئی اور آپ کے بعد کوئی بھی شخص نبی نہیں بن سکتا اور نہ ہی آپؐ کے بعد کسی پر وحی کا نزول ممکن ہے۔ اس طرح نہ ایسا الہام جو دین میں حجت ہو۔ یہی عقیدۂ ختم نبوت کے نام سے مشہور ہے۔ پوری امت کا اتفاق ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے ادنیٰ اختلاف بھی رکھتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ رسول اکرم محمد عربیؐ نے عقیدہ ختم نبوت کی سیکڑوں مرتبہ توضیح کے ساتھ یہ پیشگی خبریں بھی دی تھیں کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تیس کے لگ بھگ دجال اور کذّاب پیدا نہ ہوں جن میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے'' یعنی ''قریب ہے کہ میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا''۔

مذکورہ احادیث میں رسول اکرمؐ نے اپنے بعد پیدا ہونے والے مدعیان نبوت کے لئے ''دجال'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ''شدید دھوکہ باز'' اس لفظ کے ذریعہ سرکار دو عالمؐ نے پوری امت کو خبردار فرمایا کہ جو بھی میرے بعد نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا اور کذاب ہوگا۔ تاریخ میں آپؐ کے بعد جتنے مدعیان نبوت پیدا ہوئے

انہوں نے ہمیشہ اسی دجل وتلبیس سے کام لیا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے اپنے دعویٰ نبوت کو چمکانے کی کوشش کی، لیکن چونکہ امت محمدیہ قرآن کریم اور نبی رحمتؐ کی طرف سے اس بارے میں مکمل روشنی پاچکی تھی، اس لئے تاریخ میں جب کبھی کسی شخص نے اس عقیدہ میں رخنہ اندازی کرکے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے بالاجماع ہمیشہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ قرون اولیٰ سے جس کسی اسلامی حکومت یا اسلامی عدالت کے سامنے کسی مدعیٔ نبوت کا قضیہ پیش ہوا تو حکومت یا عدالت نے کبھی اس تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ اپنی نبوت پر کیا دلائل وشواہد پیش کرتا ہے؟ اس کے اس دعویٰ پر ہی اسے کافر وزندیق قرار دے کر کافروں جیسا معاملہ کیا۔ وہ مسیلمہ کذاب ہو یا اسود عنسی یا سجاح یا طلیحہ یا حارث یا پھر دوسرے مدعیان نبوت، صحابۂ کرامؓ نے ان کے کفر کا فیصلہ کرنے سے پہلے کبھی یہ تحقیق نہیں فرمائی کہ وہ عقیدۂ ختم نبوت میں کیا تاویلات کرتے ہیں، بلکہ جب ان کا دعویٰ نبوت ثابت ہوگیا تو انہیں بالاتفاق کافر قرار دیا۔ اس لئے کہ ختم نبوت کا عقیدہ اس قدر واضح، غیر مبہم، ناقابلِ تاویل اور اجمالی طور پر مسلم اور طے شدہ ہے کہ اس کے خلاف ہر تاویل اسی دجل وفریب میں داخل ہے، جس سے نبی کریمؐ نے خبردار کیا تھا۔

ختم نبوت میں کوئی تفریق نہیں:

عقیدۂ ختم نبوت میں یہ تفریق کرنا کہ فلاں قسم کی نبوت ختم ہوگئی ہے اور فلاں قسم کی باقی ہے اسی دجل وتلبیس کا ایک جز ہے جس سے اللہ کے رسولؐ نے خبردار فرمایا تھا۔ آیات قرآنی، احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہؓ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ ہر قسم کی نبوت بالکل منقطع ہوچکی اور اب کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس تعلق سے مندرجہ ذیل احادیث بطور خاص ملاحظہ فرمائیں۔

''بیشک رسالت اور نبوت منقطع ہوچکی، نہ میرے بعد کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی''۔

یہاں اول تو نبی اور رسول کے ساتھ نبوت اور رسالت کے وصف کو بالکلیہ منقطع قرار دیا گیا، دوسرے رسول اور نبی دونوں لفظ کا استعمال کر کے دونوں کی علیحدہ علیحدہ نفی کی گئی اور یہ بات طے شدہ ہے کہ جہاں یہ دونوں لفظ ساتھ ہوں وہاں رسول سے مراد نئی شریعت لانے والا اور نبی سے مراد پرانی شریعت ہی کا متبع ہوتا ہے۔ اس حدیث نے تشریعی اور غیر تشریعی دونوں قسم کی نبوت کو صراحتاً ہمیشہ کے لئے منقطع قرار دے دیا۔ آخری اوقات میں رحمۃ للعالمین محمد عربی ﷺ نے جو بات بطور وصیت ارشاد فرمائی اس میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ الفاظ بھی تھے کہ ''اے لوگو! مبشرات نبوت میں سے سوائے اچھے خوابوں کے کچھ باقی نہیں رہا ہے''۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام کرتے تھے، جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا خلفاء کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا کہ یکے بعد دیگرے ان کی بیعت کا حق ادا کرو''۔

احادیث مذکورہ میں جن انبیاء بنی اسرائیل کا ذکر ہے وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے، بلکہ حضرت موسیٰؑ ہی کی شریعت کا اتباع کرتے تھے، لہٰذا غیر تشریعی نبی تھے، مگر حدیث میں رسول اللہؐ نے بتا دیا کہ میری امت میں ایسے غیر تشریعی نبی بھی نہیں ہوں گے۔ نیز ''لانبی بعدی'' کہنے کے ساتھ آپؐ نے اپنے بعد آنے والے خلفاء تک کا ذکر کر دیا، لیکن کسی غیر تشریعی یا ظلی بروزی نبی کا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا۔ امت مسلمہ قرآن وسنت کے متواتر ارشادات کے مطابق اپنے سرکاری احکام، عدالتی فیصلوں اور اجتماعی فتاویٰ میں اسی اصول پر عمل کرتی آئی ہے کہ نبی کریمؐ کے بعد جس کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا خواہ وہ مسیلمہ کذاب کی طرح کلمہ گو ہو، اسے اور اس کے متبعین کو بلا تامل کافر اور

دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے، وہ عقیدۂ ختم نبوت کا کھلم کھلا منکر ہو، یا مسیلمہ کی طرح یہ کہتا ہو کہ آپؐ کے بعد چھوٹے چھوٹے نبی آ سکتے ہیں۔ یا سجاح کی طرح یہ کہتا ہو کہ مردوں کی نبوت ختم ہو گئی اور عورتیں اب بھی نبی بن سکتی ہیں یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح اس بات کا مدعی ہو کہ غیر تشریعی ظلی اور بُروزی اور امتی نبی ہو سکتے ہیں۔ امت مسلمہ کے اس اصول کی روشنی میں جو قرآن وسنت اور اجماع امت کی رو سے قطعی طے شدہ اور ناقابلِ بحث وتاویل ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کے مندرجہ ذیل دعوؤں کو ملاحظہ فرمائیے:

''سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا''۔

''میں رسول اور نبی ہوں یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے میں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے''۔

''میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے''۔

''میں جب کہ اس مدت تک ڈیڑھ سو پیشگوئی کے قریب خدا کی طرف سے پا کر بچشم خود دیکھ چکا ہوں کہ صاف طور پر پوری ہو گئیں تو اپنی نسبت نبی یا رسول کے نام سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں اور جب کہ خود خدا تعالیٰ نے یہ نام میرے رکھے ہیں تو میں کیونکہ رد کروں یا اس کے سوا کسی دوسرے سے ڈروں''۔

''خدا تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء علیہم السلام کا مظہر ٹھہرایا ہے اور تمام نبیوں کے نام میری طرف منسوب کئے ہیں۔ میں آدم ہوں، میں شیث ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحٰق ہوں، میں اسمٰعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، میں یوسف ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ہوں اور آنحضرت کے نام کا میں مظہر اتم ہوں یعنی ظلی طور پر محمد اور احمد ہوں''۔

قادیانیت کے بنیادی عقائد:

۱۔ صرف احمدیت ہی سچا اسلام ہے ۔مرزا غلام احمد کے بغیر اسلام ایک بے جان وجود ہے۔

۲۔ مرزا غلام احمد، مجدد، مہدی، مسیح موعود، ظلی نبی اور رسول، کرشن اوتار اور تمام مذاہب کے آنے والے موعود ہیں۔

۳۔ مرزا غلام احمد حقیقی (غیر تشریعی) نبی اور رسول ہیں، انسانیت کی ہدایت کے لئے ابراہیمؑ ،نوحؑ ،موسیٰؑ وغیرہ کی مانند نبی اور رسول ہیں۔انسانیت کی ہدایت کے لئے ابراہیمؑ ،نوحؑ ،موسیٰؑ وغیرہ کی مانند اور رسول آتے رہیں گے۔خدا نے اپنی وحی میں مرزا کو بغیر کسی ظلی یا بروزی لقب کے نبی کہا، وہ حضرت عیسیٰؑ سے ہر لحاظ سے افضل ہیں۔

۴۔ مسلمانانِ عالم جو مرزا کے دعوؤں پر یقین نہیں رکھتے بلاشبہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

۵۔ خدا نے غیر احمدی امام کے پیچھے نماز، احمدی لڑکی کی غیر احمدی لڑکے سے شادی حتیٰ کہ غیر احمدی مسلمان بچے کی نماز جنازہ سے بھی منع فرمایا ہے۔

۶۔ مرزا غلام احمد کی بیوی ام المؤمنین اور ان کے ساتھی صحابۂ کرام ہیں۔
قادیان مدینۃ المسیح اور اس کے رسول اور حقیقی نبی کا پایۂ تخت ہے۔

۷۔ جہاد ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔

۸۔ حضرت عیسیٰؑ کی طبعی موت واقع ہوئی اور وہ سری نگر میں مدفون ہیں۔

۹۔ خلافت احمدیت کا ایک مستقل ادارہ ہے، خدا بذاتِ خود خلیفہ کی تقرری اور رہنمائی کرتا ہے۔

۱۰۔ وحی اور الہام کے دروازے کھلے ہیں۔مرزا کی وحی پر تمام انسانوں کو ایمان لانا لازم ہے۔

قادیانیوں کے بنیادی عقائد سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ کیسی باطل جماعت ہے جو ہر آن مومنین کے عقیدۂ برحق پر ڈاکہ زنی کے درپے ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام نے باتفاق رائے اس جماعت کو باطل اور فتنۂ قادیانیت سے وابستہ لوگوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ قادیانیوں کو رابطہ عالم اسلامی، علمائے عرب، علمائے مصر، علمائے دیوبند، علمائے مظاہر علوم، علمائے ندوۃ العلما، علمائے جماعت اسلامی، علمائے بریلوی، علمائے اہل حدیث اور شیعہ مسلک کے علماء و مجتہدین نے بھی اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ دیا ہے جس کی تفصیل مختلف کتابوں میں موجود ہے۔اس لیے امت کے سربرآوردہ لوگوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس جماعت سے اظہار بیزاری کریں، اس لیے بھی کہ معلوم ہوا ہے کہ نئی دہلی میں ہونے والی قادیانی تقریب میں نائب صدر جمہوریہ اور کئی ممبران پارلیمنٹ کی شرکت متوقع سمجھی جارہی ہے۔جو دانشور یا سیاسی قائدین قادیانیوں سے اظہار یگانگت کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں انہیں علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کا وہ معرکۃ الآرا جملہ یاد رکھنا چاہیے کہ ’’قادیانیوں کو اگر محض تلخ گھونٹ سمجھ کر آج گلے سے اتار لیا گیا تو آئندہ زہر کا پیالہ پینے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔‘‘

۞ ۞ ۞

بابری مسجد کی شہادت
وطن عزیز کی پیشانی پر بدنما داغ

6 ردسمبر 1992 کی تاریخ ہندوستان کی وہ سیاہ تاریخ ہے جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وطن عزیز کی پیشانی پر نہ صرف بدنما داغ ثبت کر دیا، بلکہ پوری دنیا میں سرزمین ہند کا سر شرم سے جھکا دیا۔ ہندوستان کی شان، تاریخی بابری مسجد کو چند انتہا پسند ہندوؤں کی شہ پر جمع ہوئے لاکھوں کارسیوکوں نے پل بھر میں شہید کر دیا۔ یہ تاریخ اس لئے بھی سیاہ ہے کہ اس دن ہندوستان کی جمہوریت کو ہر طرح سے روندا گیا۔ جس گنگا جمنی تہذیب کے لئے یہ ملک مشہور و معروف ہے، اس کی عظمت کو سر عام پامال کیا گیا۔ قانون وانصرام، پولیس، حکومت اور عدالت سب کو ٹھینگا دکھاتے ہوئے شرپسندوں نے وہ گھناؤنا کھیل انجام دیا جس کو تاریخ کے اوراق کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بابری مسجد انہدام کی تحریک چلانے والے وہی سیاسی بازی گر تھے، آج بدقسمتی سے جن کے ہاتھوں میں ہندوستان کی باگ ڈور ہے۔ اس لئے یہ لوگ ایک بار پھر سے ماہ دسمبر کے آتے ہی بلبلا پڑے ہیں۔ گزشتہ ایک سال قبل آر ایس

ایس کی سرپرستی اور وزیراعظم نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی کی مرکز میں حکومت قائم ہونے کے بعد سے یہ فسطائی طاقتیں جو سابقہ حکومتوں کے دور اقتدار میں اپنے مجرمانہ فعل کے ارتکاب کی وجہ سے کھل کر بولنے سے یکسر کترا رہی تھیں، مودی حکومت میں ان کی باچھیں کھل گئی ہیں اور اب وہ پھر سے رام مندر کے نام پر لوگوں کو ورغلانے کی ہمہ جہت کوشش میں مصروف ہوگئی ہیں۔ اس کی تازہ مثال خود آر ایس ایس کے سربراہ اعلیٰ موہن بھاگوت کا وہ بیان ہے جو انہوں نے 2ردسمبر 2015ء کو کولکاتہ میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران کہی، اس موقع پر انھوں نے کہا کہ وہ رام مندر ضرور بنائیں گے اور اپنی زندگی میں ہی یہ ہدف پورا کرنے کی ان کی خواہش ہے۔ کچھ اسی طرح کا حلف وی ایچ پی کے سینئر لیڈر اشوک سنگھل کی موت پر منعقد ہونے والے پروگرام میں بھی بی جے پی اور سنگھ کے لیڈروں نے لیا تھا۔ اچھی بات یہ ہے کہ آر ایس ایس چیف کے اس بیان پر سیاسی پارٹیوں نے برملا اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور انھوں نے اسے ایک سیاسی ہتھکنڈا قرار دیا۔ بہار کے وزیراعلیٰ نتیش کمار نے بھاگوت کے بیان پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک عرصہ سے رام مندر کے ایشو پر سیاسی فائدہ اٹھا رہی ہے، لیکن اب اس سلسلے میں مزید فائدہ اٹھانے کی اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بی جے پی کو بھگوان رام میں عقیدت نہیں ہے وہ تو صرف اس نام پر سیاست کرتی آرہی ہے اور عوام کے جذبات سے کھلواڑ کر کے اس معاملے کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ اسی طرح موہن بھاگوت کے بیان پر بابری مسجد کے اہم فریق ہاشم انصاری نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''بھاگوت میں دم ہے تو وہ اجودھیا آئیں اور مندر بنا کر دکھائیں''۔ انھوں نے اپنے اس عزم اور حوصلے سے یہ ثابت کر دیا کہ آج بھی ان کی بوڑھی ہڈیوں میں وہی طاقت ہے اور خون میں روانی بھی، اس لئے سنگھی طاقتیں انھیں ہرگز کمزور نہ سمجھیں۔ انھوں نے

یہ بھی کہا کہ 6 ردسمبر کو وہ موہن بھاگوت کے نام پر ماتم کریں گے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس تاریخی عبادت گاہ کی شہادت کی برسی پر ملک بھر کے مسلمانوں کو انتہائی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کی برسی ہر سال منائی جاتی ہے، اس بار بھی مسلمان اس عظیم سانحہ کے خلاف احتجاج اور اجلاس کا اہتمام کریں گے، لیکن ایسے موقع پر جب کہ ملک بھر میں فرقہ واریت کے ماحول کو گرم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی ایسے میں مسلمانوں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کیلئے اولاً شر پسند عناصر پر کڑی نگاہ رکھیں اور دوئم ان کی نقض امن کی ہر کوشش کو ناکام بنائیں۔ چونکہ اتر پردیش میں ملائم سنگھ یادو کی پارٹی ایس پی کے قیام کے بعد سے ہی شر پسندی عروج پر ہے اور فرقہ پرست جماعتیں مسلسل سرگرم ہیں کہ کس طرح کشت وخون اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا جائے، تاکہ اس کی بنیاد پر آئندہ سال ریاست میں ہونے والے اسمبلی کے انتخابات میں اس کا بھرپور فائدہ حاصل کیا سکے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یوپی میں سماج وادی پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد سے شر پسندی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے، اس پر بہت سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اب یہ بات جگ ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک بڑی وجہ پولیس اور خود سیاست دانوں میں پائی جانے والی فرقہ وارانہ ذہنیت ہے، ان کے دلوں میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے، وہ مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرتے ہیں اور پھر ان کے ہی خلاف مقدمے بھی درج کر لیتے ہیں۔ چنانچہ 6 ردسمبر 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد سے جتنے بھی پرتشدد واقعات پیش آئے ان میں یہی طریقہ اپنایا گیا ہے۔ حالانکہ

حکومت اگر چاہے تو ملک میں کہیں بھی، کسی بھی حالت میں اور کسی طرح کا ہنگامہ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ بابری مسجد سے متعلق عدالت کے متنازع فیصلہ کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔

یہ بھی تاریخ کا زریں باب ہے کہ برصغیر پر مسلمانوں نے ساڑھے آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ اپنے دور حکومت میں مسلمان حکمرانوں نے انتہائی میانہ روی سے کام لیتے ہوئے اپنے زیر انتظام علاقوں میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کو مکمل مذہبی آزادی دی تاکہ وہ اپنی مذہبی روایات کو جیسے چاہیں پروان چڑھا سکیں۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں تمام مذاہب کے پیروکاروں اور ان کے مذہبی مقامات کو تحفظ حاصل تھا۔ گوکہ ہندو انتہا پسند تاریخ دانوں نے مسلمانوں کو ظالم اور جنگجو قوم ظاہر کرنے کی کوشش کی اور اسلام کو تلوار کے زور پر پھیلنے والا مذہب قرار دیا۔ اگر مسلمان حکمراں ظالم ہوتے اور اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا ہوتا تو پھر اس وقت ہندوستان میں ایک بھی ہندو موجود نہ ہوتا، جیسا کہ جنوبی افریقہ میں انگریز قوم نے سیاہ فام انسانوں کے ساتھ کیا، کیونکہ ساڑھے آٹھ سو سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس صرف چند دہائیوں میں برادر وطن نے 6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں واقع تقریباً ساڑھے چار سو سالہ قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا۔

مقام استعجاب ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے موقع پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینئر رہنما لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، ونے کٹیار، کلیان سنگھ، صدر وشو ہندو پریشد اشوک سنگھل، سادھوی رتیمبرہ اور مرکزی وزیر اوما بھارتی سمیت متعدد ہندو لیڈران بھی موجود تھے اور یہ سب ان کے اشارے پر ہو رہا تھا مگر آج تک عدالت میں ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکی۔ اس واقعہ کے دس دن بعد جسٹس لبراہن کمیشن کا قیام عمل میں آیا تھا اور اسے تین ماہ کے اندر یعنی 16 مارچ 1993 تک اس بات کا پتہ لگا کر اپنی رپورٹ دینی تھی کہ کن حالات کے نتیجے میں بابری مسجد شہید کی گئی، لیکن یہ ہندوستان کی تاریخ کا

سب سے طویل انکوائری کمیشن ثابت ہوا اور اس کی مدت کار میں ریکارڈ توسیع ہوتی چلی گئی۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کے کئی حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے جس میں بڑی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے تھے۔ بابری مسجد کی شہادت اگر ایک جانب ہندوستانی مسلمانوں کیلئے ایک المیہ تھا تو دوسری جانب ہندوستانی حکومتوں کے لئے امتحان بھی، مگر ساتھ ہی بابری مسجد کی شہادت نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں ہی نہیں بلکہ دل ودماغ کو چھونے کا کام کیا، شہید بابری مسجد کی آواز بازگشت کر رہی ہے، اے خواب غفلت میں سونے والو جاگو! اگر اب بھی نہیں جاگے تو تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں۔

وقت آ گیا ہے کہ بلا تفریق مسلک کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور قوم وملت کے جملہ مسائل و پریشانیوں کا حل تلاش کر کے دنیا کو امن وآشتی کا پیغام دیں تاکہ اس کی روشنی میں ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی روایت کی آبیاری ہو سکے اور بابری مسجد جیسا سانحہ پھر کبھی نہ پیش آ سکے۔

تحریک دیوبند اور اس کے عالمی اثرات

ع: اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا

ہندوستان کی تاریخ کا سب سے المناک اور افسوناک دور 1857ء کا ہے جب مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہوگیا۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے براہ راست ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم ہوگئی اور برادران وطن سمیت یہاں کے مسلمانوں کی زندگی غلامی کی زنجیر میں جکڑ گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ ہر طرف قتل وغارت گری اور خوں ریزی کا بازار گرم ہوگیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ 1857ء کے بعد تقریباً پانچ لاکھ سے زائد ہندوستانی عوام کا قتل کیا گیا۔ ہر بڑے شہر میں سولی خانہ بنایا گیا۔ تھا ہر چلتے پھرتے ہندوستانی کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے ان مظالم کے شکار سب سے زیادہ مسلمان تھے۔ کیونکہ انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ وطن کی محبت میں جان دینے کا جذبہ اگر کسی قوم میں ہے تو وہ مسلمان ہے۔ اگر کسی میں ہم سے ٹکرانے کی جرأت اور ہمت ہو سکتی ہے تو وہ مسلمان ہی ہے، اس لئے انہوں نے براہ راست مسلمانوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ چوطرفہ محاذ کھول دیا۔ ان میں سے ایک محاذ یہ تھا

کہ بے دریغ ہندوستانی علماء کے قتل عام کا دروازہ کھول دیا۔ ہر طرف علماء کرام اور آزادی کے جذبہ سے سرشار مسلمانوں کی گرفتاری اوران کے قتل کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ ”ستائیس ہزار سے زائد اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام ہوتا رہا، اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموری کو نہ رکھا، مٹادیا، بچوں تک کو مارڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔“ (قیصر التواریخ، جلد دوم، ص:۴۵۴)

ایک اور مؤرخ نے لکھا ہے کہ ہر ایک انگریز کا یہ مزاج ہوگیا تھا کہ وہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا تھا ہندو ہو یا مسلمان؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی ماردیتا تھا۔ مختصر یہ کہ انتہائی بے دردی سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹایا گیا۔ چاندنی چوک سے لاہور تک حتیٰ کہ جی ٹی روڈ کے کنارے ہر درخت پر علماء کی لاشیں ہی لٹکی ہوئی تھیں۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں خون میں تربتر تھیں۔

دوسری طرف عیسائیت کی تبلیغ انتہائی زور وشور سے شروع کی گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے جسمانی قتل کے ساتھ ان کے روحانی قتل کا منصوبہ بھی تشکیل دیا گیا۔ انگریزوں کے اس خطرناک منصوبہ کا اندازہ برطانوی پارلیمنٹ کی اس تقریر سے لگا جاسکتا ہے: ”خداوند تعالیٰ نے یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں ہے، تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں کرنا چاہئے۔“

ہندوستان کو عیسائیت میں تبدیل کرنے کا ناپاک منصوبہ تھا جس کی پلاننگ انگلینڈ میں کی گئی اور پوری مستعدی کے ساتھ ہندوستان میں اس کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ علاقائی

پادریوں کے علاوہ تقریباً ایک ہزار کے قریب ولایتی پادری عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف عمل تھے جو کھلے عام عیسیٰ مسیح کے مذہب کی تبلیغ کررہے تھے۔ ہندوستان کے غریب عوام کو پیسہ اور مفت رہائش وتعلیم کا لالچ دے کر ان کے سابق مذہب سے عیسائیت میں لارہے تھے۔ فروغ عیسائیت مشن کے لئے ایک مکتی فوج بھی قائم کی گئی تھی جس کے اسی دستے ہمہ وقت ان کی امداد پر مامور رہتے تھے۔

انگریزوں کا تیسرا منصوبہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں تبدیلی کا تھا جو بقیہ دو سے زیادہ خطرناک اور منظّم تھا۔ انگریزوں کا یہ منصوبہ نظام تعلیم میں تبدیلی کرکے ہندوستانی عوام بشمول مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانا نہیں، بلکہ ان کے ذہن ودماغ میں ہندوستانیوں کے سابقہ مذاہب سے نفرت ودوری اور عیسائیت کو سمونا تھا۔ چنانچہ انگریز ماہر تعلیم میکالے کی رپورٹ کا یہ جملہ انگریز کے پورے ناپاک منصوبہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہے ”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رجحان، رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو“ 12 اکتوبر 1836ء میں میکالے اپنی والدہ کے نام ہندوستان سے لندن لکھے گئے خط میں اپنے منصوبہ کے بارے میں کچھ یوں وضاحت کرتا ہے ”اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد ایک بھی بت پرست غیر عیسائی نہیں رہے گا۔“

انگریز ہندوستان پر اپنی پائیدار حکومت اور اقتدار کی بقاء کے لئے تمام میدانوں میں کام کررہے تھے۔ وہ کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑنا چاہ رہے تھے جو کبھی آئندہ ان کی راہ میں حائل ہوجائے اور ہندوستان کو چھوڑنا پڑے، اس درمیان ان کی سب سے زیادہ توجہ مغربی کلچر کو فروغ اور فحاشیت وعریانیت کو بڑھاوا دینے پر تھی۔ انگریزی مشنری مسلمانوں اور ہندوؤں کے دل ودماغ سے حب الوطنی کے جذبہ کو ختم کرنے پر سب سے زیادہ توجہ مبذول

کئے ہوئے تھی۔ ان کی واضح حکمت عملی یہی تھی کہ جب تک مسلمانوں کی فکر میں تبدیلی پیدا نہیں ہوگی، جب تک ان کا مزاج نہیں بدلے گا، جب تک ان کے ذہن و دماغ میں اسلامی کلچر، قرآن کریم کی تعلیمات، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور صحابۂ کرامؓ کی عملی زندگی گردش کرتی رہے گی اس وقت تک یہ ہمارے خلاف اپنی جنگ لڑتے رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے شہ رگ پر سب سے زیادہ زوردار حملہ کیا اور تعلیم کے بہانے اسلامی افکار کی جگہ عیسائی افکار کو فروغ دینے پر پوری توجہ مبذول کردی جس کا اظہار خود میکالے کی زبان میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ تاریخ بھی گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں پر زوال آیا تو اس کی بنیادی وجہ فکری زوال ثابت ہوئی۔

لیکن انگریزوں کے اس منصوبہ کو مسلمانوں نے ناکام بنانے کی کوشش اولین دن سے ہی شروع کردی تھی۔ انگریزوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے اور وطن عزیز میں اسلامی روایات کے تحفظ کی خاطر اور شاملی کے میدان میں مردان خدا کی پسپائی، جس میں خود حضرت نانوتویؒ شریک تھے، کے بعد اسلامی جہاد کا نعرہ لگایا گیا، چنانچہ ایک عظیم تحریک وجود میں آئی جو آگے چل کر کئی تحریکوں کا سرچشمہ بنی۔ 1526ء میں سلطان ظہیر الدین بابر نے پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی جس سے دنیا بھر میں ہندوستان کو منفرد شناخت ملی اور 1857ء تک بلا شرکت غیرے یہ سلطنت قائم رہی لیکن اسی سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمراں حضرت اورنگزیب عالم گیر رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ہی گھن لگ گیا اور بہادر شاہ ظفر پر جاکر مغلیہ سلطنت کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اس المناک سانحہ کے بعد مفکر انسانیت حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک نئی تحریک وجود میں آئی جسے دنیا تحریک دیوبند کے نام سے جانتی ہے۔

حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف دو محاذ پر جنگ لڑی گئی، مگر بعض ظاہری اسباب کی وجہ سے کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکی، لیکن مسلمانان ہند ان حالات سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حالات سے مایوس ہونے کے بجائے انگریزوں کے خلاف اپنی لڑائی جاری رکھی اور دو محاذ پر سب سے زیادہ توجہ دی، پہلا محاذ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا اور اس کے لئے تدابیر اختیار کرنا تھا۔ چنانچہ حضرت امام نانوتویؒ کی وہ تحریک کامیاب ہوئی اور 15 اگست 1947ء کی وہ تاریخ آئی جب 90 سال کے بعد انگریزوں کو یہ ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ دوسرا محاذ جس پر حضرت امام نانوتویؒ نے سب سے زیادہ توجہ مبذول کی وہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے اسلامی شعار اور مذہب وثقافت کو جوں کا توں برقرار رکھنا تھا چنانچہ میکالے کے جواب میں حضرت امام نانوتویؒ نے اپنا یہ تاریخی جملہ فرمایا کہ ’’ہم ایسے افراد تیار کرنا چاہتے ہیں جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر ذہن وفکر کے اعتبار سے اسلامی ہو‘‘۔ اس فکر کو پروان چڑھانے کے لئے حضرت امام نانوتویؒ نے سب سے پہلے 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1866ء میں ازہر الہند دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور اس تحریک کا پہلا سبق مسجد چھتہ کے کھلے صحن اور انار کے درخت کے نیچے پڑھا گیا، جس سبق کا استاذ بھی محمود اور شاگرد بھی محمود دیوبند میں شیخ الہند کے مبارک لقب سے ملقب ہوئے۔ تحریک دیوبند خیر امت کا یہی وہ تجدیدی عمل ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شورش کاشمیری نے کہا تھا:

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمین پر حجۃ الاسلام تھا

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ اور جماعت دیوبند کے مربی و مرشد سید

الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو اس مدرسہ کے قیام کی جب اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا ''آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دعاؤں کا اثر ہے'' حاجی صاحب نے یہ دعاء بھی فرمائی ''اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا''۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد صرف دینی تعلیم دینا نہیں تھا بلکہ اس ادارے کے قیام کا مقصد برصغیر میں ایک نئی تحریک کو جنم دینا تھا۔ اہل وطن اور بالخصوص مسلمانوں کے درمیان حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا، مسلمانوں کو اپنے اسلامی شعار پر برقرار رکھنا، اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت، مذہبی علوم کی اشاعت اور پھر انگریزوں کے استبدادی نظام سے نجات پانے کی راہ اپنانا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا دارالعلوم دیوبند کو اپنے مقصد میں کامیابی ملنی شروع ہوگئی۔ اس تحریک کے بعد کئی ایک تحریکیں وجود پذیر ہوئیں۔ یہ تاریخی حقیقت آشکارا کرتا چلوں کہ تحریک جامعہ علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، خلافت، امارت شرعیہ، جمعیۃ علماء، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور دیگر تحریکات تحریک دیوبند سے ہی حوصلہ پا کر وجود پذیر ہوئی ہیں، بادی النظر میں اگر باریکی سے آپ دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ہر ایک تحریک کا پس منظر تحریک دیوبند سے ہی وابستہ ہے اور ان سب نے تقریباً اسی چشمۂ نور سے روشنی حاصل کی ہے جو حضرت امام نانوتویؒ نے تحریک دیوبند کے آغاز میں کہا تھا کہ ہمارا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی اور ذہن ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔

ان تمام جدوجہد میں ہندوستان میں دوبارہ مسلمانوں کا اقتدار تو بحال نہ ہوسکا،

لیکن تحریک دیوبند نے اپنی کوششوں سے انگریزوں کے ناپاک منصوبہ اور طویل اقتدار کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی ہندوستان کو اندلس بنانے کا ان کا منصوبہ کامیاب ہوسکا۔ دارالعلوم دیوبند نے ایسے رجال کار تیار کئے جنہوں نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کا دینی شعار اور اسلامی کلچر بھی برقرار رہا۔ آج اگر ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن نظر آتا ہے، مساجد کے میناروں سے اذان کی آوازیں آتی ہیں، مدارس سے قال اللہ وقال الرسول کی صدا سنائی دے رہی ہے، خانقاہوں سے بھی تزکیۂ نفس کا عمل جاری ہے اور مسلمان آزادی کے ساتھ اپنے دین ومذہب پر عمل پیرا ہیں تو یہ اسی تحریک دیوبند کا نتیجہ ہے (اللہ تعالیٰ اس تحریک کو تا قیامت باقی رکھے آمین۔)

حضرت امام نانوتویؒ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے، لیکن ۴۹ رسال کی قلیل مدت میں انہوں نے ان محاذوں پر کام کرنے کے ساتھ کچھ ایسے افراد ضرور تیار کردیئے جنہوں نے آگے چل کر تحریک دیوبند کو عالمی تحریک میں تبدیل کردیا اور ہندوستان سے آگے قدم بڑھا کر خلافت عثمانیہ کی بقا تک کے لئے تحریک دیوبند نے کام کرنا شروع کردیا۔ تحریک دیوبند کو جن بزرگوں نے آگے بڑھایا ان میں سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور، مولانا مظہر نانوتوی، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا احسن نانوتوی، حافظ ضامن شہید، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، محدث عصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی اول مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مجاہد فی سبیل مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ سید سلیمان ندوی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی،

مفتئ اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، رئیس التبلیغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی، حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلوی، علامہ ظفر احمد عثمانی، شیخ محمد محدث تھانوی، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی، قاضی القضاۃ قاضی مجاہدالاسلام قاسمی، امیر شریعت مولانا سید نظام الدین رحمہم اللہ وغیرہم کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

آزادی کے بعد جب مسلمانوں پر مذہبی یلغار ہونے لگی تو اسی تحریک سے فیض پاکر مسلک ومشرب سے بالاتر ہوکر ہندوستانی مسلمانوں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ 1972ء میں وجود میں آیا جس کی تشکیل میں بھی فضلاء دارالعلوم بالخصوص حکیم الاسلام قاری محمد طیب، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی، مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی اور امیر شریعت مولانا سید نظام الدین رحمہم اللہ نے خصوصی کردار ادا کیا، اس عظیم کام کیلئے ان بزرگوں کو تاریخ ہمیشہ خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔

آج شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک تحریک دیوبند مختلف شکلوں میں سرگرم ہے۔ دنیا کی سیر کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ہم جہاں بھی گئے وہاں دینی اور ملی کام کرنے والوں میں مصروف افراد سے ان کے تعلقات کا پتہ لگایا تو یہی معلوم ہوا کہ یہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تحریک دیوبند سے وابستہ ہیں اور فکر دیوبند کی تحریک کے زیر سایہ اسلامی دینی اور نبوی اقدار کو دنیا بھر میں عام کررہے ہیں۔ الحمدللہ خود مجھے اب تک دنیا کے 66 ملکوں میں جانے کا موقع ملا ہے، ان ملکوں میں جن دینی شخصیات سے میری ملاقات ہوئی ان کے افکار وخیالات، طرز زندگی اور کام کرنے کے طور طریق کو دیکھا تو اس سے میں

نے بھی یہی محسوس کیا کہ ان جگہوں پر دینی ومذہبی فکر کو فروغ دینے والے حضرات تحریک دیوبند سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ ہیں اور مختلف انداز میں ملت کے جیالے اسی ولی اللٰہی فکر کو عام کررہے ہیں جس کی تجدید حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریک دیوبند کی شکل میں کی، امام حرم مکی شیخ سعود ابراہیم الشریم حفظہ اللہ نے بھی دارالعلوم دیوبند میں تشریف آوری کے موقع پر اس حقیقت کا مجمع عام میں اعتراف کیا تھا ''ہندوستان میں اسلامی اقدار کا فروغ دارالعلوم دیوبند کی مرہون منت ہے''۔ شاید علامہ ڈاکٹر اقبالؒ نے دارالعلوم دیوبندی کی انہی خدمات جلیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہرطرف بکھری ہوئی داستاں میری

مدارس اسلامیہ دین کی حفاظت اور بقا کے قلعے

سابقہ یو پی اے حکومت کی مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کا منصوبہ ہو کہ موجودہ بی جے پی حکومت کا مدرسہ ماڈرنائزیشن کا پلان، دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ مدارس کے تعلق سے نہ تو یو پی اے حکومت سنجیدہ تھی اور نہ ہی موجودہ مودی حکومت کے اعلانات سے کسی ٹھوس نتیجے کی امید کی جاسکتی ہے۔ اصل مسئلہ دینی مدارس کے وجود اور بقا کا ہے اور یہ لڑائی خالص دینی حمیت کے ساتھ علماء کرام، ملی رہنما جو دینی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ، یا پھر اہل مدارس ہی لڑ سکتے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے مدارس کے تعلق سے کہا تھا کہ ان مدارس و مساجد کو مضبوط و مستحکم کرو یہ دین کی حفاظت و بقا کے قلعے ہیں۔ اگر یہ کمزور ہوجائیں تو دین کی ساری عمارت ہل جائے گی۔ مدارس اسلامیہ، مساجد اور درگاہیں مسلمانوں کی شناخت ہیں، اس لیے ان کا تحفظ ہر مومن کا فریضہ ہے۔

مدرسوں کے تئیں علامہ اقبالؒ کی فکر اور وہ خدشات و احساسات ملاحظہ ہوں جو انہوں نے ایک مستشرق کی بات سن کر درد بھری آواز میں کہی تھی۔

''جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔

میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا، جو تم چاہتے ہو، انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے، لیکن یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی، ان مکتبوں کو اسی حال میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروان اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کے سِوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا''

یہی وہ خدشات ہیں جو ہمارے ذہن و دماغ پر کچوکے لگاتے رہتے ہیں اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر حکومت ہند کو مدارس کی ہی فکر کیوں ستا رہی ہے۔ اقلیتی اداروں کے سلسلے میں وہ یہ لچک کیوں نہیں دکھاتی؟ اقلیتوں کے جو بڑے تعلیمی ادارے ہیں ان کا حق دینے میں یہ حکومتیں کبھی مخلص نظر نہیں آتیں، اگر ایسا ہوتا تو آج ہندوستانی مسلمانوں کی شان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کا اقلیتی حق مل گیا ہوتا، مگر آج تک یہ ادارہ اپنے اقلیتی کردار کی بحالی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ سوال کافی اہم ہے کہ حکومت کو مسلمانوں کے ان بچوں کی تو فکر نہیں ہے جو عصری تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھنا چاہتے ہیں لیکن مدارس میں پڑھنے والے نہایت قلیل تعداد میں زیر تعلیم بچوں کی فکر محل غور ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومتیں مدارس کی قوت اور تاثیر کی وجہ سے ان کی طرف توجہ تو دینا چاہتی ہیں لیکن اس میں بھی مدارس کے مفادات پر سیاسی مفادات زیادہ وزنی معلوم پڑتے

ہیں۔ مدارس کے ماڈرنائزیشن کا خاکہ مودی حکومت نے پیش کیا ہے، تقریباً اسی قسم کا خاکہ یوپی اے حکومت نے بھی پیش کیا تھا لیکن اس کے بہتر نتائج تو مرتب نہیں ہوئے البتہ کئی قسم کی منفی روش مدارس میں رائج ہوگئی۔ دراصل جو حکومت بنتی ہے سب سے پہلے مدارس کو ٹارگیٹ کرتی ہے اور اسے ماڈرن بنانے کا پلان بنانے لگتی ہے۔ ماڈرنائزیشن کا لفظ روشن خیال مسلمانوں کو اچھا لگتا ہے لیکن خود اس کا کوئی عملی نمونہ کسی بھی حکومت نے اب تک پیش نہیں کیا ہے، اس لیے اہل مدارس کا شکوک وشبہات میں مبتلا ہونا اور اندیشہ ہائے دور دراز میں پڑنا یقینی ہے۔ نئی حکومت نے مدرسہ ماڈرنائزیشن کا جو خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ دراصل محض ایک سیاسی اعلان ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس لیے اہل مدارس کو حکومت کی کسی قسم کی اسکیم سے نہ متاثر ہونا چاہیے اور نہ دینی خدمت کے اپنے مشن کو ترک کر کے حکومتوں کے سامنے کشکول دراز کرنا چاہیے۔

اس کے پس پردہ حکومت کے مقاصد کیا ہیں؟ مستقبل میں اس سے حکومت کیا چاہتی ہے؟ صرف مدرسوں کے ہی فارغین کو ''روشن خیال'' بنانے کے پیچھے اتنی ہمدردیاں کیوں دکھائی جارہی ہیں؟ اس ملک میں اعداد وشمار کے مطابق لاکھوں کروڑوں بچے بغیر ایڈمیشن کے مارے مارے پھر رہے ہیں ان کی فکر کیوں نہیں ہے؟ ملک میں بے روزگاری عروج پر ہے اس کے خاتمہ کی تدبیر کیوں نہیں؟ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم بچوں کی محرومی کا کوئی احساس کیوں نہیں؟ یہ اور ان جیسے بہت سے سوالات ہیں جو راقم الحروف کے ذہن میں ہر آن کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔ اس لیے میری تمام اہل مدارس اور دینی حمیت کے عام مسلمانوں سے بھی گزارش ہے کہ ان سوالات کے پیچھے کے مقاصد وعوامل کو سمجھیں اور سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قیام مدارس کے اپنے مقاصد ہیں جنہیں دنیا جانتی

ہے، مسلمانوں کو اپنے دین وایمان پر باقی رکھنے کی جدوجہد کرنا، معاشرے کو اسلامی خطوط پر باقی رکھنا اور اسلامی شعار کو زندہ کرنا نیز علم ودعوت کے لیے سرگرم رہنا۔ مدارس کے قیام کا مقصد ہرگز معیار زندگی بلند کرنا اور ان کی ڈگریوں کے ذریعہ عصری دانشگاہوں تک پہنچنا اور سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا نہیں ہے، اہل مدارس کا مقصد اگر اپنی ڈگریوں کو سرکاری تعلیم گاہوں سے ہم آہنگ کرنا ہوتا تو علماء اتنے نادان نہیں تھے اور ایسا نہیں ہے کہ وہ حالات کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے یا سرکاری ضوابط سے ناواقف ہیں، اس کا انتظام وہ خود کر لیتے، مدارس کو اپنے مشن پر باقی رہتے ہوئے اگر سرکار یہ محسوس کرتی ہے کہ اہل مدارس بھی ہمارا حصہ ہیں اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا جانا بھی اس ملک کی ضرورت ہے اور اہل مدارس بھی سرکاری خزانے سے مستفید ہونے کے اپنے حال پر باقی رہتے ہوئے بھی مستحق ہیں اور ان کو حقوق ملنا چاہئے تو حکومتوں کو مدارس کے نظام ونصاب میں مداخلت کے بغیر ان کی فلاح وبہبود کی بات سوچنی چاہیے اور کوئی اسکیم پیش کرنی چاہیے، نہ کہ مدرسہ ماڈرنائزیشن کے ذریعے مدارس کے جوہری وبنیادی مقاصد پر ہی تیشہ چلانے کی سازش کی جانی چاہیے۔

البتہ موجودہ سائنسی انقلاب اور تہذیبی وثقافتی تغیر کی وجہ سے اسلام کے غلبہ اور دعوت وتبلیغ کی ضرورت کے پیش نظر کچھ چیزوں کے اضافہ کی یقیناً ضرورت محسوس ہورہی ہے، اس کے لئے اہل مدارس کو خود غور کرنا چاہئے، تاکہ مدارس کے ذریعہ اسلامی تہذیب وثقافت کے باقی رکھنے کا سامان بھی کیا جاسکے اور وقت کی ضرورت بھی پوری ہوتی رہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں بہت سے مدارس ضرورت کے مطابق عصری علوم اور تکنیکی تعلیم کو اپنا رہے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ

اس ملک کے مسلمان نہایت پسماندہ ہیں تو یو پی اے حکومت کا بھی زور اس پر تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھایا جائے اور موجودہ این ڈی اے حکومت نے بھی مسلمانوں کو یکساں مواقع دیے جانے کے اشارے دیے ہیں تو ہمارے وزیر اعظم نریندر مودی جی مسلمانوں کی عمومی پسماندگی دور کیے جانے کی جانب پیش قدمی کیوں نہیں کرتے، مدارس تو مسلمانوں کی زندگی کا ایک حصہ ہیں ،ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی مجموعی ترقی کے لیے کوئی ٹھوس عملی اقدام کیا جائے۔اس کے بعد مدارس کے تحفظ وترقی پر غور کیا جائے۔عصری تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد کو ہی ان کا حق مل گیا ہوتا تو کیا پسماندگی کی یہی صورت حال ہوتی، کیا ترقی کا یہی تناسب ہوتا؟ اگر مدرسہ والے ہی غریب ونادار ہوتے اور عصری تعلیم یافتہ سارے خوش حال ہوتے جن کے پاس ڈگریاں ہیں، تب اگر یہ بات کہی جاتی تو مناسب بات ہوتی، پھر مدرسہ ماڈرنائزیشن کی جلدی کیوں؟

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دینی مدارس کی شناخت مٹانے کی ناپاک کوشش دشمنان دین ومذہب ہر زمانے میں کرتے رہے ہیں۔یہ بات وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ امت محمدیہ کو صراط مستقیم سے ہٹانے اور ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے دینی مدارس جو مذہب اسلام کے قلعے ہیں ان کا خاتمہ کئے بغیر دشمنوں کا غلیظ اور خطرناک مشن کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔یہی وہ خاص وجہ ہے کہ معاندین امت محمدیہ، دنیا بھر کے دینی اداروں کو اپنی بے جا تنقید کا نشانہ بنا کر دنیا کے سامنے دہشت گردی کا اڈہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔گزشتہ چند سالوں سے ان کی یہ تحریک ہندوستان میں بھی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت چل رہی ہے۔بدقسمتی سے ملک عزیز کی کئی شدت پسند تنظیمیں ان کو بھرپور تعاون دے رہی ہیں، جس کی وجہ سے ملک کے خاص وروشن خیال طبقہ

کے ذہن کو مدارس کے تعلق سے تبدیل کرنے میں یہ کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ایسی منفی سوچ کے حامل افراد میں سرکاری افسران کے ساتھ اعلیٰ رہنما بھی شامل ہیں۔بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت بھی چند میر جعفر کی حمایت انہیں حاصل ہے جس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی ڈگر پر لانے کے لئے ان کی نظر میں مدارس میں تبدیلی سب سے اہم ہے جس کے بغیر مسلم بچوں کی تعلیمی پسماندگی دور نہیں ہوسکتی۔اس کوشش کے پیچھے کی سچائی یہی ہے کہ مدارس کی روح کو کسی بھی طرح سے ختم کر دیا جائے تاکہ یہاں کے دینی مدارس کا بھی وہی حشر ہو جو ان ممالک میں ہوا جہاں حکومت کی مداخلت یا سرکاری بورڈ قائم ہیں۔

ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس اہم ترین موضوع پر علماء، اہل علم اور دانشوران قوم کو سر جوڑ کر بیٹھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور اس کا حل نکالتے ہوئے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنائیں۔مدرسہ کی جدید کاری کا مسئلہ خاصا اہم ہے، اس سلسلے میں اہل مدارس کو ضروری تبدیلی کی بھی ضرورت ہے لیکن مدرسہ ماڈرنائزیشن کے پیچھے کی سچائی سے پردہ ہٹانا ضروری ہے۔

آخر میں صرف اتنا عرض ہے کہ ملت کو اپنی ملی اور دینی شناخت پر باقی رہنے دیا جائے اور نہایت کم تعداد میں دین کے جو داعی دین وملت اور منبر ومحراب کی خدمت انجام دے رہے ہیں انہیں مس گائڈ نہ کیا جائے۔عام مسلمانوں کی فکر کی جائے اور مدارس کے خدام کو تحفظ دین وملت کے لئے وقف رہنے دیا جائے۔انہیں گمراہ کر کے اور ڈگریوں کا لالچ اور اچھی کمائی کا جھانسہ دے کر صراط مستقیم سے نہ بہکایا جائے، اس جمہوری ملک میں ملت کو ان کی سخت ضرورت اور مسجد ومحراب اور دین اسلام کو باقی رکھنے کے لئے ان کا وجود ناگزیر ہے، اس ملک میں ملی اور دینی شناخت انہی مدارس اور اہل مدارس سے قائم ہے، ورنہ

آزادی کے بعد جو لادینیت اور دہریت کا سیلاب سوویت یونین کی لادینی یلغار کی شکل میں آیا تھا، اگر یہ مدارس کی نعمت اس ملت کو نہ ملی ہوتی اور یہ فاقہ مست کلاہ بردار اور بوریہ نشیں نہ ہوتے تو سب کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتا، جیسا کہ ایک طبقہ کمیونزم کا شکار ہو کر دین ومذہب سے آزاد ہو گیا۔ بہی خواہان ملت سے بھی امید کرتا ہوں کہ وہ بھی ان مصالح کو سمجھیں اور دینی مدارس کو خطرناک سازشوں کا شکار ہونے سے بچائیں۔

آہ: شہید بابری مسجد

آہ شہید بابری مسجد!!! بابری مسجد کی شہادت کی 20 ویں برسی سے محض چند روز قبل مرکزی وزارت داخلہ کی جانب سے لوک سبھا میں ملک کے جرائم سے متعلق جو رپورٹ پیش کی گئی ہے اس کے مطابق اتر پردیش میں 2012 (یعنی ایک سال) میں فرقہ وارانہ تشدد کے کل 104 معاملے سامنے آئے، جن میں 34 بے گناہوں کی جانیں تلف ہوئی ہیں، اسی طرح ان فسادات میں زخمی افراد کی تعداد بھی سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس تعداد کے ساتھ اتر پردیش پہلے، مہاراشٹر دوسرے، مدھیہ پردیش تیسرے اور کرناٹک چوتھے نمبر پر ہے۔

بابری مسجد اتر پردیش کے ایودھیا (فیض آباد) میں واقع ہے، اس لئے تاریخی عبادت گاہ کی شہادت کی برسی پر ملک بھر، بالخصوص صوبے کے مسلمانوں کو انتہائی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کی برسی ہر سال منائی جاتی ہے، ظاہر ہے اس بار بھی مسلمان اس عظیم سانحہ کے خلاف احتجاج اور اجلاس کا اہتمام کریں گے، لیکن ایسے موقع پر جب کہ ریاست میں فرقہ واریت کا ماحول گرم ہے مسلمانوں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی

ہے کہ وہ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کیلئے اولاً شر پسند عناصر پر کڑی نگاہ رکھیں اور دوئم
ان کی نقض امن کی ہر کوشش کو ناکام بنائیں، چونکہ اس وقت اتر پردیش میں فرقہ پرست
طاقتیں سرگرم ہوگئی ہیں اور وہ اس تاک میں ہیں کہ انہیں کسی طرح سے مسلمانوں کی جان
ومال کے نقصان کا موقع ہاتھ آجائے۔آخر کیا وجہ ہے کہ یوپی میں ملائم سنگھ یادو کی سماج
وادی پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد سے فرقہ وارانہ تشدد کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تھمنے کا
نام نہیں لے رہا ہے۔اس انتخاب میں ہندو انتہا پسند جماعت بی جے پی اپنے مضبوط گڑھ
اور اہم حلقوں میں چناؤ ہار گئی، تاریخی شہر ایودھیا میں جہاں ہندو جنونیوں کے حملے میں بابری
مسجد کی شہادت اور رام مندر کی تعمیر کے بعد 1991ء سے بی جے پی کے امیدوار للو سنگھ
مسلسل جیتتے چلے آرہے تھے، انہیں 21 سال بعد شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یوپی میں
فسادات کا یہ سلسلہ متھرا کے نزدیک کوسی کلاں نامی ایک قصبے سے شروع ہوا جہاں مبینہ طور
پر چار افراد کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔اس واقعے کے بعد سے پرتاپ گڑھ، بریلی، میرٹھ، بلند شہر
اور دھام پور سمیت مختلف شہروں اور قصبات میں فسادات ہو چکے ہیں، ان مسلم مخالف
واقعات کے پیش نظر اس جانب سنجیدگی سے غور وفکر کی ضرورت ہے، چونکہ اب یہ بات جگ
ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک بڑی وجہ پولیس فورس میں پائی
جانے والی فرقہ وارانہ ذہنیت ہے، پولیس فورس کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت
ہے۔وہ مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرتی ہے اور پھر ان کے ہی خلاف مقدمے بھی درج
کرلیتی ہے۔

6/دسمبر 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں ہوئے فرقہ
وارانہ فسادات کے بعد سے جتنے بھی پر تشدد واقعات پیش آئے ان میں یہی طریقہ اپنایا
گیا ہے۔حالانکہ حکومت اگر چاہے تو ملک میں کہیں بھی، کسی بھی حالت میں اور کسی طرح

کا ہنگامہ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ بابری مسجد سے متعلق عدالت کے متنازع فیصلہ کے وقت
دیکھنے میں آیا تھا۔اسی طرح حکومت نے 1992 میں بھی مستعدی دکھائی ہوتی تو شاید
بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ نہیں پیش آتا لیکن جو احتیاط حکومت کو اس وقت برتنی چاہیے تھی
وہ نہیں کرسکی جس کی وجہ سے نہ صرف بابری مسجد کو متشدد ہندوؤں نے شہید کردیا بلکہ اس کے
نتیجہ میں ملک بھر میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات نے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو موت
کے گھاٹ اتار دیا۔

بابری مسجد کی شہادت کی 20ویں برسی کے موقع پر اس حقیقت کا ذکر ناگزیر ہے
کہ اس عظیم سانحہ کی سازش کس نے رچی۔ یہ وہ سچائی ہے جس نے دنیا میں امن وآشتی اور
بھائی چارہ کا درس دینے والے امریکہ کا دنیا کے سامنے ایک سازشی اور مکروہ چہرہ بے نقاب
کردیا۔ ایودھیا کے مہنت یوگل کشور شاستری جو سینٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن کے
16ویں گواہ بھی ہیں، نے یہ انکشاف کیا تھا کہ بابری مسجد کی شہادت کے پس پشت امریکی
خفیہ ایجنسی سی آئی اے اور ایک امریکی کمپنی تھی جس نے اِس مقصد کے لئے بہت کثیر رقم
ایک انتہا پسند ہندو تنظیم کو دی تھی، یعنی مسلمانوں کی تاریخی اور قدیم بابری مسجد کو شہید کرنے کا
ٹھیکہ وشو ہندو پریشد کو دیا گیا تھا۔مہنت شاستری کا یہ انکشاف نہ صرف ملک میں بسنے والے
کروڑوں مسلمانوں کے لئے بلکہ کے عالم اسلام کے لئے بھی یقیناً حیرانگی کا باعث ہے کہ
امریکہ نے دنیا کے سیکولر ملک ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کرانے کے لئے ایک
انتہا پسند تنظیم وشو ہندو پریشد کو استعمال کیا جس کے لئے اِس نے کروڑوں ڈالر دے کر بابری
مسجد شہید کرنے کے لئے ٹھیکہ دیا اور اِس گھناؤنے کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امریکہ
نے وشو ہندو پریشد سے 6دسمبر 1992 کا دن اور تاریخ اور وقت بھی اپنی مرضی سے طے کیا
تھا، جس پر ملک کی انتہا پسند تنظیم سے وابستہ کارسیوکوں نے اِس روز صبح ہی سے اپنی مشکوک

سرگرمیاں شروع کردی تھیں اور جیسے ہی امریکہ کا اشارہ ہوا، اِنہوں نے ملک کی قدیم اور تاریخی بابری مسجد کو شہید کرنے کا اپنا گھناؤنا عمل زور وشور سے شروع کردیا اور بالآخر اسے شہید کرنے کے بعد پورے ملک میں مسلمانوں کو شہید اور اِن کے املاک کو بھی نقصان پہنچا کر خوشی کا جشن منایا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مہنت یوگل کشور شاستری نے بابری مسجد شہادت کیس کی سماعت کے دوران اسپیشل جج وریندر کمار کی عدالت کے سامنے اِس بات کا بھی برملا انکشاف کیا کہ وزیراعظم پی وی نرسمہاراؤ خود بھی یہ چاہتے تھے کہ وی ایچ پی اور رام جنم بھوی مومنٹ کے ذریعہ اِس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ پھیلائی جائے تاکہ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں جس سے گریٹ امریکہ اور اسرائیل کا خواب پورا ہوجائے گا تو مہنت شاستری نے وشو ہندو پریشد سے اپنا تعلق ختم کرلیا۔

اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ برصغیر میں بسنے والے انسانوں نے اسلام، مسلمان تاجروں، حکمرانوں کے حسن سلوک اور صوفیاء، وعلماء کرام کی تبلیغ سے متاثر ہوکر اپنی بشاشت سے اسلام قبول کیا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں پر ظلم واستبداد ہی کا نہیں، بلکہ زوال کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں پہلے انگریزوں اور آزادی کے بعد ہندو انتہا پسندوں کے ذریعہ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے جانے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تھمنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ درانحالیکہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ حکومت چاہے جس پارٹی کی بنے ملک کے مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عبادت گاہوں کے تحفظ میں تساہل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں نقصان پہنچا کر ان کی اسلامی تہذیب و ثقافت اور تشخص کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ 1992 میں بابری مسجد کی شہادت

اور 2002 میں گجرات کے مسلمانوں کا قتل عام اور اس کے بعد ملک کی مختلف ریاستوں میں مدارس اسلامیہ اور مساجد پر حملے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔

آج دنیائے انسانیت حیران وششدر ہے کہ امن وانسانیت کے علمبردار گوتم و مہاویر مولانا آزاد، گاندھی کے ملک میں نریندر مودی جیسا ظالم وقاتل بھی کہتا ہے خدا کوئی انسان پیدا کر جو مودی جیسے لوگوں کو لگام ونکیل ڈال سکے تاکہ ہندوستان کی جمہوریت دنیا کے ممالک کے لئے آئیڈیل ہو۔

6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں واقع تقریباً ساڑھے چارسوسالہ قدیم تاریخی بابری مسجد کو متشدد ہندوؤں نے شہید کردیا۔ اس کے بعد ملک کے کئی حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جس میں بڑی تعداد میں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ بابری مسجد کی شہادت اگر ایک جانب ہندوستانی مسلمانوں کیلئے ایک المیہ تھا تو دوسری جانب ہندوستانی حکومتوں کے لئے امتحان بھی، مگر ساتھ ہی بابری مسجد کی شہادت نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں ہی نہیں بلکہ دل ودماغ کو چھونے کا کام کیا۔

مسلم قائدین وتنظیمیں اس موقع پر سر جوڑ کر بیٹھیں اور دانشمندی، اتفاق ودوراندیشی کا ملی ثبوت فراہم کرتے ہوئے مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ غور وفکر ہی نہیں بلکہ باعزت قوم آج ذلت وپستی اور ظلم وجبر، انحطاط کی شکار ہے اس کو قعر مذلت سے نکال کر امن وعفت کی شاہراہ پر گامزن کرنے کا لائحۂ عمل طے کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بلاتفریق مسلک کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور قوم وملت کے جملہ مسائل و پریشانیوں کا حل تلاش کر کے امن وآشتی کا پیغام دیں تاکہ اس کی روشنی میں ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی روایت کی آبیاری ہوسکے اور بابری مسجد جیسا سانحہ پھر کبھی نہ پیش آئے۔

تعلیم وتدریس: چند اہم معروضات

الحمدللّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علٰی رسوله الکریم.

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ”اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْأَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ“ ”مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب: ۴۰)“ ”اَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (ابوداؤد: ۲/۲۲۴)“ امابعد!

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پیدائش 1833ء وفات: 1880ء
سنہ قیام دارالعلوم دیوبند 30/مئی 1866ء مطابق 15/محرم الحرام 1283ھ
عبقری الدہر مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ سنہ وفات: 1286ھ
سنہ قیام مظاہر علوم سہارنپور یکم رجب المرجب 1283ھ مطابق 9/نومبر 1866ء

سنہ قیام: ندوۃ العلماء لکھنؤ 1311ھ مطابق 1892ء
مولانا محمد علی جوہر کی تاریخ پیدائش 10/دسمبر 1878ء، تاریخ وفات: 4/جنوری 1931ء
سنہ قیام: جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی 1920ء
سرسید احمد خان کی تاریخ پیدائش: 17/اکتوبر 1817ء
سنہ قیام: مدرسۃ العلوم (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) 1875ء
دہلی کی علمی تاریخ کا سنہری باب
امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تاریخ ولادت ۴/شوال 1114ھ- وفات: 29/محرم الحرام 1176ھ

ہندوستان کا دارالخلافت شہر دہلی اس زمانہ میں معدن علم وکمال تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ حضرت شیخ الشیوخ شاہ ولی اللہ قدس سرّہٗ کے لگائے ہوئے شاداب وبارآور درخت اپنی بہار پر تھے، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کے سچے جانشین اور نواسے، یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولوی محمد اسحٰق صاحب مرجع خلائق بنے ہوئے تھے کہ یکا یک دونوں حضرات نے 1257 ہجری میں ہجرت کا عزم فرمایا اور غالباً ماہ ذی قعدہ میں روانہ ہوگئے۔ دہلی میں اندھیرا چھا گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا۔

اب اس دہلوی خانقاہ کی یادگار میں شاہ عبدالغنی صاحب وشاہ احمد سعید صاحب کے علاوہ صرف ایک شخص یعنی جناب مولانا مملوک العلیٰ صاحب کا دم رہ گیا جو اجمیری دروازہ عربک ہائی اسکول کے مدرس اول تھے۔ مولانا مملوک العلیٰ صاحب کو ان مہاجرین کا ساتھ چھوڑنا نہایت شاق تھا چنانچہ خفیہ تدبیر اور کوشش سے ایک سال کی رخصت حاصل کی

مگر معیت نہ ہوسکی۔ آخر رجب 1258 ہجری میں وطن سے روانہ ہوئے اور یکم ذی الحجہ کو مکہ میں داخل ہوئے زیارت حرمین شریفین سے فارغ ہوکر برس دن میں پھر دہلی پہنچے۔ اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب سمجھا گیا۔ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ رخصت یکساں بوضع نصف تنخواہ حاصل ہوئی اور تازیست اسی مدرسہ میں درس دیا۔

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلیٰ صاحب کی حجاز سے واپسی ایسے وقت پر ہوئی کہ رخصت کے دن پورے ہوچکے تھے اس لئے وطن نہ آسکے سیدھے دہلی پہنچے جب سالانہ چھٹی ماہ ذی الحجہ میں ہوئی تو وطن یعنی نانوتہ ضلع سہارنپور میں تشریف لائے اور ایام تعطیل ختم ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو پڑھانے کے لئے اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مشہور استاد یہی استاد الکل حضرت مولانا مملوک العلیٰ صاحب ہیں جن کی خدمت میں ہر دو شمس وقمر کو ایک زمانہ میں مدت تک حاضر رہنے اور نخلستان علم کی خوشہ چینی کا اتفاق رہا۔ حجۃ الاسلام الامام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی تو 1260 ہجری ہی میں استاد الکل رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ دہلی آئے تھے، مگر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ، کو 1261 ہجری میں دہلی پہنچنے کا اتفاق پیش آیا۔ آپ اول ادھر ادھر چند علماء کے درس میں جاتے اور طبیعت کا اطمینان فرماتے رہے کہ کہاں تسکین بخش جواب ملتے ہیں اور کس جگہ دل کو تسلی واطمینان حاصل ہوتا ہے، مگر چونکہ قدرت کو یک جان دو قالب بزرگوں کو عمر بھر کا زندگی میں اور غیر متناہی زمانہ کا آخرت میں رفیق بنانا منظور تھا، اس لئے کہیں آپ کا دل نہ لگا۔ کسی استاد کی تقریر میں اختصار مخل پایا اور کہیں تطویل ممل۔ کسی جگہ شہادت کے جوابات کافی نہ ملے اور کہیں اپنا ہی دل نہ لگا اور خود بخود طبیعت اچاٹ ہوئی آخر اسی ردوبدل اور دیکھ بھال میں آپ کو استاذ الکل مولانا مملوک

العلیٰ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور آپ سبق میں شریک ہوئے۔ یہاں پہنچنا تھا اور دل کا لگنا، اس لئے کہ آپ کی تیز طبیعت اور خداداد سمجھ جس درجہ کے قابل استاد کی متمنی تھی وہ آپ کے ہاتھ لگ گئے۔ قابل استاد کا قاعدہ ہے کہ ذکی طالب علم کو ڈھونڈتا ہے اور سمجھدار طالب علم کا دستور ہے کہ قابل استاد کی ٹوہ لگاتا ہے، اس لئے ہر دو جانب سے دلی راحت کے سامان پیدا ہوگئے اور حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی وامام ربانی رشید احمد گنگوہی رحمہما اللہ چند روز کے بعد ایسے ہم سبق بنے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہ چھوٹا۔

دینی مدارس ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان:

جس وقت ہندوستان کے تخت پر ۹۶۴ھ میں جلال الدین اکبر بیٹھا ہے، اسلام کی آمد کو ایک ہزار سال ہورہے تھے، ایرانیوں کی ایک جماعت نے ایک گہری سازش کی کہ پوری دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام اور دین محمدی کا دور ختم ہوگیا، اس جماعت نے یہ اصول اکبر کے ذہن نشین کرادیا کہ ہر مذہب کی عمر ایک ہزار سال ہوتی ہے، یہودیت ہزار سال رہی پھر ختم ہوگئی، عیسائیت ختم ہوگئی، پھر اسلام آیا، اب اس کو ایک ہزار سال ہورہے ہیں۔

اس جماعت نے اپنی ذہانت سے سمجھا کہ اس بات کو قبول کرنے اور اس کو پوری طاقت سے نافذ کرنے والا وہ ہوسکتا ہے جو زیادہ پڑھا لکھا اور متشرع نہ ہو، اس جماعت نے اکبر کا انتخاب کیا جس کی سمجھ میں ان کی یہ بات آگئی اور وہ الحاد کے راستہ پر پڑ گیا، وہ برہمنوں، پنڈتوں اور علماء کو جمع کرا کے بحث کرواتا تھا، پھر لادینیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایسے نازک وقت میں مجدد صاحبؒ اور ان کا خاندان سامنے آتا ہے، اس خاندان نے اس ملک کو اس خطرہ سے محفوظ کردیا کہ یہاں لادینیت کا دور دورہ ہوجائے، اسلام کا رشتہ اس ملک سے کٹ جائے اور دینی حس ختم ہوجائے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانیؒ نے تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ لوگ اس تاریخی حقیقت پر غور نہیں کرتے، سرسری انداز میں گزر جاتے ہیں کہ عام طور پر جب بادشاہ جاہل ہو، مخالف دین ہو، اس میں کوئی خرابی ہو تو اس کے بعد اس کا جو جانشین آتا ہے، وہ اس سے بدتر ہوتا ہے، وہ اس میں اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ اپنے والد اور سابق بادشاہ کے طریقہ پر قائم رہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اکبر کے بعد جب جہانگیر ہوا تو وہ اس سے بہتر ہوا، دین پر قائم رہا اور بعد میں حضرت مجدد صاحب کا معتقد بھی ہوگیا تھا، پھر جہانگیر کے بعد شاہجہاں ہوا تو اس سے بہتر تھا، وہ جب تخت طاؤس پر بیٹھا جو بڑے فخر کی بات تھی تو وہ اتر گیا، نماز پڑھی اور سجدہ کیا اور کہا کہ فرعون بڑا کم عقل اور کم ظرف تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھا اور خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر سجدہ کرتا ہوں، شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر ہوا (جن کو ہمارے فاضل دوست و ادیب شیخ علی الطنطاوی چھٹے خلیفہ راشد سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد پورے عالم اسلام میں عالمگیر جیسا متبع سنت، صاحب حمیت اور اسلامی قانون اور اسلامی شریعت کا جاری کرنے والا پیدا نہیں ہوا) اس میں جو راز ہے وہ یہ کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کا خاندان اندر اندر کام کر رہا تھا اور متاثر کر رہا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ جو حضرت مجدد صاحبؒ کے ممتاز ترین فرزند تھے اور جن سے ان کا سلسلہ پھیلا ہے وہ عالمگیر کو شہزادگی کے دور میں جب خط لکھتے تو انھیں ''شہزادہ دین پناہ'' سے خطاب کرتے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور صحیح الفکر و حامل دعوت مدارس و مراکز باقی رہیں گے اور اگر خدا کو ان کی حفاظت مطلوب اور محبوب ہے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر رہیں گے، اگر یہ دارالعلوم دونوں

کے راستے سے ہٹا تو یہ دارالعلوم، دارالعلوم نہیں ہوگا جس کی بنیاد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا سید عبدالحئی رائے بریلویؒ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، منشی اطہر علی کاکورویؒ اور مولانا شبلی نعمانیؒ نے ڈالی تھی، یہ بات یاد رکھئے کہ یہ دارالعلوم حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ کے راستے پر ہے۔

تمہاری رگوں میں نوع انسانی کے موحد اعظم (سیدنا ابراہیمؑ) کا خون ہے

یہ کن کی اولادیں ہیں، ان کی رگوں میں کن کا خون ہے، اس خون کے کیا خصائص ہیں اور اس خاندان کی کیا تاریخ ہے، اس کا تاریخ عالم میں کیا کردار رہا ہے؟ یہ ان کے بیٹے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيفاً'' (سورۃ النحل: ۱۲۰) (ابراہیم خود ایک امت تھے) اور فرمایا ''مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ'' (سورۃ الحج: ۷۸) (وہ خدا کا پہلا گھر بنانے والا ابراہیم، وہ توحید کا پہلا اعلان کرنے والا ابراہیم، وہ جس نے توحید کے عقیدہ کے لئے ہجرت کی جس نے خطرات مول لئے جس نے اپنے باپ سے پہلی لڑائی مول لی، اس کا باپ صرف یہ نہیں کہ وہاں کا ایک معزز آدمی تھا، وہاں کے سب سے بڑے معبد (عبادت گاہ) کا سب سے بڑا آدمی تھا، ان کی جو پہلی گفتگو ہوئی اور پہلے جو مسلک کا اظہار و اعلان ہوا وہ باپ کے سامنے ہوا۔ پھر اس زمانے کے غالباً سب سے بڑی نہیں تو ایک بڑی متمدن سلطنت کے فرماں روا سے ان کا مقابلہ ہوا، ابراہیم کی اولاد کو ابراہیم ہی کا جانشین (حضرت یعقوب علیہ السلام) اپنے بیٹوں، پوتوں کو جمع کرکے کہتا ہے:

''پیارے بیٹو، پوتو، نواسو! اب میں تم سے رخصت ہونے والا ہوں، لیکن میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی، جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ تم خدائے واحد ہی کی عبادت کروگے؟ یا لوگوں کو جیسا کرتے دیکھو گے تم بھی کرنے لگو گے اور انہی کی بولیاں بولنے لگو

گے، تم ایک نہیں تین تین پیغمبروں کی اولاد ہو۔ تمہاری رگوں میں نوعِ انسانی کے موحد اعظم (سیدنا ابراہیمؑ) کا خون ہے، جس نے توحید خالص کی اس وقت صدا لگائی، جب دنیا میں وہ بالکل نامانوس ہو چکی تھی، اس نے اللہ کے نام پر اس وقت گھر تعمیر کیا جب دنیا میں اس کے نام کا کوئی گھر رہ گیا تھا، اس نے اس کے لئے اپنے باپ اور گھر والوں سے ناطہ توڑا، آگ میں ڈال دیا جانا گوارا کیا، اس کے لئے گھر بار اور محبوب وعزیز وطن چھوڑا اور ملک ملک کے سفر کئے، لیکن میں اتنا کافی نہیں سمجھتا۔ (میں نے بڑے بڑے خدا پرستوں اور بت شکنوں کے خاندانوں کا حشر دیکھا ہے کہ وہ کس قدر جلد صحیح راستہ چھوڑ کر بھٹک گئے)۔

آج کے اس پُر آشوب اور تیز ترین دور میں تعلیم کی ضرورت بہت اہمیت کا حامل ہے چاہے زمانہ کتنا ہی ترقی کر لے۔ حالانکہ آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے۔ ایٹمی ترقی کا دور ہے، سائنس اور صنعتی ترقی کا دور ہے مگر اسکولوں میں بنیادی عصری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، انجینئرنگ، وکالت، ڈاکٹری اور مختلف جدید علوم حاصل کرنا آج کے دور کا لازمی تقاضا ہے۔ جدید علوم تو ضروری ہیں ہی اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی بھی اہمیت اپنی جگہ مصمم ہے، اس کے ساتھ ساتھ انسان کو انسانیت سے دوستی کے لئے اخلاقی تعلیم بھی بے حد ضروری ہے۔ اسی تعلیم کی وجہ سے زندگی میں خدا پرستی، عبادت، محبت، خلوص، ایثار، خدمتِ خلق، وفاداری اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم کی وجہ سے صالح اور نیک معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

تعلیم کے حصول کے لئے قابل اساتذہ بھی بے حد ضروری ہیں جو بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جن اساتذہ نے اپنی اس ذمہ داری کو بہتر طریقے سے پورا کیا ان کے شاگرد آخری سانس تک ان کے احسان مند رہتے ہیں۔ بدقسمتی

اس بات کی بھی ہے کہ کچھ ایسے عناصر بھی تعلیم کے دشمن ہوئے ہیں جو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہمارے تعلیمی نظم کے درمیان ایسی کشمکش کا آغاز کر رکھا ہے جس نے رسوائی کے علاوہ شاید ہی کچھ عنایت کی ہو۔ مگر پھر بھی جس طرح بیرونی دنیا کے لوگ تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی کبھی جدید تعلیم سے دور نہیں رہے بلکہ جدید زمانے کے جتنے بھی علوم ہیں زیادہ تر کے بانی مسلمان ہی ہیں۔ موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آج یورپ تک کی جامعات میں مسلمانوں کی تصنیف کردہ کتابیں نصاب میں شامل ہیں۔

ہمارے بچے ہنستے کھیلتے اور خوش ہوتے ہی اچھے لگتے ہیں اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہی سب کچھ کرتے ہوئے یہ بچے مؤثر طریقے سے سیکھتے بھی ہیں۔ وہی باتیں جو کھیل کھیل میں سمجھتے ہیں ان کے علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اکثر و بیشتر گھرانوں میں چار یا پانچ سال کی عمر میں بچے علم کے سفر پر گامزن ہوتے ہیں۔ یہ سفر ان کے لئے نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور کبھی کبھی کٹھن بھی۔ دل لگائے بغیر سیکھنا علم پر بوجھ ہوتا ہے پھر ایسے افسوسناک حالات و واقعات جو آج ہمارے تعلیمی نظام میں پائے جانے لگے ہیں۔

ان ننھے دماغوں کو زنگ آلود ہونے سے بچانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اس وقت ہمارے مروجہ اور روایتی طریقہ تدریس میں بچوں کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے بچے اسکولوں، کالجوں، جامعات میں جانے سے کتراتے ہیں۔

لگ بھگ ستر فیصد بچے اسکول جاتے ہیں مگر ان میں سے بھی کچھ فیصد بچے پرائمری سطح کی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی کوئی ٹھوس وجہ سوائے اس کے کہ روایتی طریقۂ تعلیم میں تبدیلی نہیں کی گئی اور دوسری وجہ مہنگائی کی شرح میں اضافہ ہے جس کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو چائلڈ لیبر کے طور پر کام میں مشغول

کروا دیتے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی دلچسپی کے لئے دیگر پروگراموں کو بھی ترتیب دیکر ان میں دلچسپی کا ساماں پیدا کیا جائے۔

اس دور میں صبح وشام کی شفٹ میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ زوروں پر ہے ہر جگہ اور ہر مقام پر تعلیم کو فروغ دینے کی بات کی جارہی ہوتی ہے۔جگہ جگہ کوچنگ سینٹر بھی اپنے فرائض کی انجام دہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ کوچنگ سینٹر کا ٹرینڈ اس لئے چل پڑا ہے کہ تعلیمی اداروں میں تعلیم دینے کا فقدان ہے۔

حصول تعلیم کے فرض کئے جانے پر کوئی اختلاف نہیں ہے قرآنِ مجید میں لگ بھگ پانچ سو مقامات پر بالواسطہ یا بلاواسطہ حصولِ تعلیم کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی۔علم کی فرضیت کا براہ راست بیان بے شمار احادیث میں بھی آیا ہے۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:’’حصول علم تمام مسلمانوں پر (بلا تفریق مرد وعورت) فرض ہے۔بے شک علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ عیلہ وآلہ وسلم نے فرمایا:’’جو شخص طلبِ علم کے لئے کسی راستے پر چلا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردیا۔‘‘اور یہ بات واضح کردی گئی کہ قرآنِ مجید سے حصول علم خواتین کے لئے بھی اسی طرح فرض ہے جیسے مردوں کے لئے ہے اس لئے تعلیم ہر صورت حاصل کرنا چاہیے۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم وتربیت میں معراج پاکر دین ودنیا میں سر بلندی اور ترقی حاصل کی لیکن جب بھی مسلمان علم اور تعلیم سے دور ہوئے وہ غلام بنا لئے گئے یا پھر جب بھی انہوں نے تعلیم کے موقعوں سے خود کو محروم کیا وہ بحیثیت قوم اپنی شناخت کھو بیٹھے۔آج برصغیر میں تعلیمی ادارے دہشت گردی کے نشانہ پر ہے،دشمن طاقتیں

تعلیم کی طرف سے بدگمان کر کے ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہیں، کچھ ایسے عناصر بھی ملک میں موجود ہیں جو اپنی سرداری، چودھراہٹ، جاگیرداری کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مفادات کی وجہ سے اپنے اثر ورسوخ والے علاقوں میں بچوں کی تعلیم میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں یہ بھی ایک قسم کی تعلیم دشمنی ہے جس کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کے مقاصد کو واضح کریں اور اصل مرض کی طرف توجہ دیں۔لارڈ میکالے کے مادہ پرستانہ اور سیکولر نظامِ تعلیم کے بجائے ہندوستان کی نظریاتی بنیادوں کو سامنے رکھ کر ہمیں ایسا تعلیمی نظام وضع کرنا چاہیے جو ہمارے افراد اور معاشرے کے درمیان پل کا کام انجام دے سکیں۔اس کے بعد ہی ہم اس نتیجے پر پہنچ سکیں گے کہ ہم نے اس ملک اور قوم کی خدمت کی ہے۔

علم کی ضرورت کے تعلق سے بلا تمہید یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انسان پیدائشی طور پر اسکی ضرورت کو محسوس کرنے والا ہوتا ہے، چونکہ تخلیق انسانی پر غور کرنے سے جو صورت ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابن آدم فطرتاً سننے والا، دیکھنے والا اور سمجھنے والا واقع ہوتا ہے۔اس بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس کلام سے ہوتی ہے:’’اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، واقعہ یہ ہے کہ تم اس کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو‘‘۔

علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علم کی ضرورت غذا ہی نہیں، بلکہ سانس لینے سے بھی زیادہ اہم ہے، چونکہ غذا اور سانس کے نہ ہونے سے زیادہ سے زیادہ جو چیز گم ہوسکتی ہے وہ جسم کی زندگی ہے، مگر علم کے فقدان سے تو قلب اور روح کا فقدان لازم آتا ہے اور ایسا انسان گدھے اور چوپایوں سے زیادہ بدتر ہے۔

کسی چیز کی فضیلت اور اسکی شرافت کبھی اس کی عام نفع رسانی کی وجہ سے ظاہر

ہوتی ہے اور کبھی اسکی شدید ضرورت کی وجہ سے اس سے بے نیاز نہیں ہوا جاسکتا، چنانچہ انسان کے لئے پیدائش کے معاً بعد سب سے پہلے علم کی ہی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور علم ہی کی عنایت کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہیں علم عطا کیا گیا اللہ ان کے درجات کو بلند کرے گا"۔ پھر اللہ کے نزدیک علم ہی تقویٰ کا معیار بھی ہے۔

اس بارے میں دانشوران ومفکرین کے مختلف نظریات وخیالات ہیں۔ اشتراکی نظریۂ تعلیم کے ماہرین کا دعویٰ یہ ہے کہ ''تعلیم وتربیت کے ذریعہ ہم افراد کو 'سماج کا بے نفس خادم' بنانا چاہتے ہیں''۔ جمہوریت کے علم برداروں کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کو 'مملکت کا اچھا شہری' بنانا ہے''۔ مذکورہ دونوں نظریۂ تعلیم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل مقصد تعلیم کی روح کا گلا گھونٹنا، طلبہ کو مادہ پرست، مذہب دشمن اور باغی بنانا ہے۔ اگر بات کریں اسلامی نظریۂ تعلیم کی تو اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ صالح معاشرہ کی تشکیل اور سماج میں امن وسلامتی پیدا ہو۔ چنانچہ ماہر فن تعلیم وتربیت افضل حسین (ایم اے ایل ٹی) اپنی کتاب 'فن تعلیم وتربیت' میں لکھتے ہیں: ''تعلیم کا صحیح مقصد 'اللہ کا صالح بندہ بنانا ہے'۔ یعنی: ''طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی، جسمانی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں۔ کائنات میں اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کی مرضی کے مطابق تصرف کریں''۔

ماہرین فن تعلیم وتربیت نے اصولی طور پر اس کے تین بنیادی قوانین وضع کئے ہیں۔

(1) قانونی آمادگی (2) قانونی تاثیر (3) قانونی مشق۔

(1) قانونی آمادگی: چونکہ سیکھنے کا کام اسی وقت انجام پاسکتا ہے، جب سیکھنے والا اس

کیلئے آمادہ ہو اور اس کے اندر جذبہ اور لگن اس کام کیلئے اسے حوصلہ دے رہا ہو۔

(2) قانون تاثیر: کوئی کام دلچسپی سے اسی وقت انجام دیا جاسکتا ہے، جب اس سے بہتر نتائج کی امید کی جاسکے، اور اس کام کے کرنے والوں کو معلوم ہو کہ اس کا بہتر بدلہ ملنے والا ہے۔

(3) قانونی مشق: یہ بدیہی بات ہے کہ کسی کام کو بار بار کرنے سے اس میں مہارت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ عمل بحسن وخوبی آسانی کے ساتھ انجام پانے لگتا ہے۔ اس ضمن میں بہت ہی مشہور اور سچا واقعہ ہے کہ کسی نے امام المحدثین امام بخاری سے ان کی قوت حافظہ کے بارے میں پوچھا، تو امام موصوف نے جواب میں جو جملہ کہا وہ طالب علم کیلئے کسی نسخۂ کیمیا سے کم نہیں۔

دنیاوی اعزاز وافتخار تو اس کے ضمنی فوائد ہیں، اس کا اصل فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی تخلیق کا مقصد حقیقی معلوم ہوجاتا ہے۔ رب کریم کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے، شرط ہے کہ اس نے حق جاننے کی کوشش کی ہو، جس کی واضح دلیل بڑے بڑے غیر مسلم اسکالرز اور دانشوران کا اسلام لانا ہے، اگر وہ جاہل ہوتے تو کیوں کر رب کی معرفت حاصل کر پاتے۔ پھر ایسا شخص دنیا میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کیلئے بلند درجات ہیں۔ اللہ ہمارے سینوں کو علم کے نور سے بھر دے اور نیکی کی راہ پر لگائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

مسلم دورحکمرانی اور عظمت پارینہ کی لازوال نشانی
شاہ جہانی جامع مسجد دہلی تاریخ کے آئینہ میں

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ من رِجَالِكُمْ وَلكن رسول الله وخاتم النَّبِيّنَ وكان اللّٰه بِكُلِّ شيْءٍ عَلِيمًا". (احزاب:۴۰)

يٰا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ. آیت نمبر ۱۳). (سورۂ حجرات)

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انا خاتم النبین لانبی بعدی!

امابعد!

چارسوسالہ قدیم وتاریخی جامع مسجد میں موجودہ عہد کے ممتاز علماء ودانشوروں کے اس مبارک اجتماع کو میں سلام کرتا ہوں۔

حضرات گرامی!

جامع مسجد صرف مسجد ہی نہیں بلکہ ہر عہد میں دین ودعوت اور جملہ تحریکات کا مرکز رہی ہے اور آج بھی یہ حق گوئی کا مرکز بن کر ملت کی رہنمائی کر رہی ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ مسلم مخالف طاقتوں کے ساتھ کچھ اپنے بھی یہاں کی قیادت کو سبوتاژ کرنے پر آمادہ ہیں۔

اس کے باوجود کسی انجام کی پرواکئے بغیر جامع مسجد کے شاہی امام حضرت مولانا سید احمد بخاری حق گوئی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ہمیں کہنے دیجئے کہ آج ہمارے کچھ مؤقر بزرگ چاہتے ہیں کہ مولانا سید احمد بخاری سچ بات کو بھی مصلحت کی چادر میں لپیٹ کر پیش کریں۔

میرا سوال ہے کہ کیوں؟

اس ملک میں پروین توگڑیا مسلمانوں کو گالیاں دیتا ہے تو اسے کوئی نہیں روکتا، پرمود متالک اسلام کو برا کہتا ہے تو کسی کو غصہ نہیں آتا، یوگی آدتیہ ناتھ کو مدرسے پسند نہیں تو لوگوں کا خون کیوں نہیں کھولتا؟ اس ملک میں اگر اسدالدین اویسی بے لاگ و لپیٹ سچائی اُگلے تو کیوں اعتراض ہے اور مسلمانوں کے حق وانصاف کے لئے مولانا سید احمد بخاری دنیا کو للکاریں تو کسی کو اعتراض کیوں؟

ہمیں اپنے حق لینے اور چھیننے کا حق ہمارے دستور نے دیا ہے۔

میرا یہ بھی کہنا ہے کہ اشوک سنگھل کہتے ہیں کہ پرتھوی راج چوہان حکومت کے 8 سوسال بعد اس ملک میں ہندو سرکار بنی ہے، اُن سے کوئی سوال کیوں نہیں کرتا کہ کیا یہ ہندو اسٹیٹ ہے؟۔

یہ موقع اس کی تفصیل بیان کرنے کا نہیں ہے، میں اس باوقار تقریب میں صرف

اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ دہلی کی یہ جامع مسجد مسلمانانِ ہند کی دھڑکن ہے، آواز ہے، ظلم و ناانصافی، مسلمانوں پر ہونے والی ہر بربریت اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف ایک مضبوط آواز۔ یہاں سے باطل طاقتوں کے خلاف آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی جو آواز بلند ہوتی رہی ہے اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مگر مجھے کہنے دیجئے، اس وقت کچھ طاقتیں ہیں جو ایک منظّم سازش کے تحت اس آواز کو دبانا چاہتی ہیں تا کہ ہمارا ملک شاہی امام جیسے مخلص، بے باک، نڈر اور دوراندیش شخصیت سے محروم ہو جائے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حضرات گرامی! شاہجہانی جامع مسجد جس کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ شاندار تاریخ کا گواہ ہے اور جس کی تاریخ مختلف تحریکات و اصلاحات اور دیگر حوالوں سے بےنظیر اور بے مثال ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس سازش میں سفید لباس میں کچھ کالی بھیڑیں بھی شامل ہیں جن کو بےنقاب کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

حضرات گرامی! آپ کو بتا دیں کہ جہاد کے تعلق سے آزادی کے آغاز پر ہی ایک منظّم سازش کے تحت اختلاف کا ماحول پیدا کیا گیا۔ آپ حضرات واقف ہوں گے کہ شاہی دربار سے وابستہ بعض علماء کو سلطنت مغلیہ کی موجودگی میں پرائیویٹ جہاد کے جواز پر اشکال تھا، جبکہ کچھ علماء کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمانوں کے پاس انگریزوں کی مزاحمت کی قوت ہی نہیں ہے، اس لیے یہ جہاد جائز نہیں ہے۔ انگریز فوج ان دونوں دلیلوں سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ تاہم ولی اللّٰہی فکر کے اکثر علماء نے اس موقع پر اس موقف کو رد کر دیا اور یہی وہ مسجد ہے جہاں آج ہم اور آپ بیٹھے ہیں اسی تاریخی مسجد میں مئی 1857ء میں ایک بڑے

اجتماع میں انگریز فوج کے خلاف جہاد کو فرض عین قرار دے دیا گیا۔

بقول مولانا جعفر تھانیسریؒ!

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملی
کیا بتاؤں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

سنگ بنیاد بدست
ابوالمظفر شہاب الدین محمد خرّم (معروف بہ شاہ جہاں):

بتاریخ: ۱۰رشوال المکرّم ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶راکتوبر ۱۶۵۰ء بروز جمعہ ایک پہاڑی کی مضبوط چٹانوں پر خود اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ دنیا بھر کے اعلیٰ ترین ماہرین تعمیرات، بہترین نقاش، سنگ تراش، انجینئر اور بہترین خطاطوں، ممتاز فنکاروں کے علاوہ 6 ہزار مزدوروں نے اس عظیم الشان جامع مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا اور چھ سال تک اس کی تعمیر میں مسلسل لگے رہے۔ یہ جامع مسجد 1066ھ مطابق 1656ء میں تیار ہوئی۔ جامع مسجد اور اس کے اماموں کی تاریخ دونوں ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ شاہ جہاں بادشاہ کی خواہش تھی کہ اس بے مثال جامع مسجد کے لئے ایسا ہی بے مثال امام ہونا چاہئے جو اعلیٰ خوبیوں کا مالک ہو، چنانچہ اس تعلق سے شاہ جہاں بادشاہ کی دوررس نگاہ بخارا (ازبکستان) پر پڑی۔ اس زمانہ میں شہر بخارا علوم وفنون کا مرکز تھا، اس لئے شاہ جہاں بادشاہ نے شاہ بخارا کو لکھا کہ جامع مسجد کی امامت کے لئے ایک صحیح النسب نجیب الطرفین سید کو جو علم و فضل میں کمال رکھنے کے علاوہ اپنے زمانے کی نہایت برگزیدہ شخصیت ہو، بھیجا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے حسب طلب شاہ بخارا نے اپنے داماد حضرت مولانا سید عبدالغفور شاہ بخاری کو پایۂ تخت شاہ جہاں آباد (دہلی) بھیجنے کا فیصلہ کیا اور شاہ بخارا کی مدد سے حضرت مولانا سید عبدالغفور شاہ بخاری اور ان کے خاندان کو انتہائی عزت واکرام کے ساتھ دہلی بلایا۔

حضرت مولانا سید عبدالغفور شاہ بخاری کی آمد پر شاہ جہاں بادشاہ کی طرف سے ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ جامع مسجد کی تعمیر اس وقت مکمل ہو چکی تھی، چنانچہ یکم شوال 1066ھ مطابق 24 جولائی 1656ء بروز پیر شاہ جہاں بادشاہ تمام وزراء اور ارکان دولت دہلی کی رعایا کے ساتھ ادائیگی نماز کے لئے جمع ہوگئے اور حضرت مولانا سید عبدالغفور شاہ بخاری کی اقتدا میں عیدالفطر کی پہلی نماز جامع مسجد میں ادا کی گئی۔

شجرۂ نسب حضرات ائمۂ کرام (جامع مسجد دہلی):

۱۔ حضرت سید عبدالغفور شاہ بخاریؒ شاہی امام

۲۔ حضرت سید عبدالشکور شاہ بخاریؒ شاہی امام

۳۔ حضرت سید عبدالرحیم شاہ بخاریؒ شاہی امام

۴۔ حضرت سید عبدالغفور شاہ بخاریؒ ثانی شاہی امام

۵۔ حضرت سید عبدالرحمٰن شاہ بخاریؒ شاہی امام

۶۔ حضرت سید عبدالکریم شاہ بخاریؒ شاہی امام

۷۔ حضرت سید میر جیون شاہ بخاریؒ شاہی امام

۸۔ حضرت سید میر احمد علی شاہ بخاریؒ شاہی امام

۹۔ حضرت سید محمد شاہ بخاریؒ شاہی امام (1857)

۱۰۔ حضرت مولانا سید احمد بخاریؒ شاہی امام (1892-1942)

۱۱۔ حضرت مولانا سید حمید بخاریؒ شاہی امام (1942-1973)

۱۲۔ حضرت مولانا سید عبداللہ بخاریؒ شاہی امام (1973-2000)

۱۳۔ حضرت مولانا سید احمد بخاری شاہی امام اکتوبر 2000ء بروز ہفتہ شاہی امام مقرر ہوئے۔

۱۴۔ حضرت مولانا سید اسامہ شعبان بخاری نائب شاہی امام

۲۷ رمحرم الحرام ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۲ رنومبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ نائب شاہی امام مقرر ہوئے۔

جامع مسجد سے اٹھنے والی تحریکیں:

- اکبر کے برپا کئے ہوئے فتنۂ دین الٰہی جس سے ہندوستانی مسلم معاشرہ برسوں متأثر رہا اس کی سرکوبی کے لئے اٹھنے والی تحریک کی گواہ بنی۔
- 1803ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا جاری کیا ہوا فتویٰ جو انگریزوں سے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، ان کا یہ ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا، یہ خطروں کو مول لینے کی کھلی دعوت تھی، اسی فتویٰ سے ملت اسلامیہ ہند میں بالخصوص اور پورے ملک کے عوام میں بالعموم حرارت عمل پیدا ہوئی اور اسی نے آزادی کے متوالوں اور مسلمانوں کو دعوت فکر و عمل کا شرعی جواز فراہم کیا تھا۔
- اور مئی 1857ء میں انگریزوں کے خلاف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتویٰ جہاد کی بنیاد پر جامع مسجد دہلی میں ہونے والے ایک بڑے اجتماع میں انگریز فوج کے خلاف جہاد کو فرض عین قرار دیا گیا تھا اور جس کی بدولت ہمارا وطن غلامی کی لعنت سے آزاد ہوا اور ولی اللٰہی فکر سے وابستہ اکثر علماء نے جدوجہد آزادی کا یہیں سے آغاز کیا۔ اس کی گواہ بھی جامع مسجد دہلی ہے۔
- راجہ رنجیت سنگھ کے جور وظلم سے ٹکرانے والی تحریک بالاکوٹ کے سربراہان سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید، مولانا یحییٰ علی، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی میزبان بھی یہی مسجد بنی۔
- یہ وہ جامع مسجد ہے جس کی سیڑھیوں اور منبر ومحراب سے آج بھی امام الہند

مولانا ابوالکلام آزاد کی درد بھری آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کی للکار پر ترک وطن کرنے والوں کے قدم تھم گئے تھے اور اجڑتا ہوا بھارت ویرانی سے محفوظ ہو گیا۔

❁ جامع مسجد سے ہی شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ نے بابری مسجد کی بازیابی کی آواز بلند کی تھی۔

❁ جامع مسجد کے شاہی امام مولانا سید احمد بخاری بھی مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

❁ مسلمانوں کی آبرو تاریخی شاہ جہانی جامع مسجد آج بھی دینی، ملی، سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

❁ ❁ ❁

حج اسلام کا ایک اہم اور مقدس فریضہ

حج احکامات خداوندی میں سے ایک اہم ترین رکن ہے جو مالی اور جانی دونوں عبادتوں کا حسین سنگم ہے۔ یہاں بندہ کو خدائے پاک کا قرب بھی نصیب ہوتا ہے اور دنیا کی محبتیں دلوں سے ختم ہو جاتی ہیں۔ دینی عنصر غالب آنا شروع ہو جاتا ہے اور فریضۂ حج کی ادائیگی کا شرف حاصل کرنے والا ایک عجیب وغریب لطف حاصل کرتا ہے۔ حج کے لئے جس طرح ظاہری سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح باطنی سرمایہ کی بھی سخت ضرورت پڑتی ہے اور ریا وتکبر اور دکھلاوا سے مکمل طور پر دور رہنا پڑتا ہے اور وہ سرمایہ خدائے پاک، رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور احکامات الٰہی سے عشق ومحبت ہے۔ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ "**واتموا الحج والعمرة لله**"۔ ترجمہ: حج وعمرہ کو اللہ عزوجل کے لئے پورا کرو۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ جس نے حج کیا اور رفث (یعنی فحش کلام) اور فسق نہ کیا تو گناہوں سے پاک ہو کر ایسا واپس لوٹا جیسا کہ اس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ (بخاری شریف) حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ سرکار مدینہؐ کا فرمان جنت نشان ہے۔ حج وعمرہ محتاجی اور گناہوں کو ایسے دور کرتے ہیں جیسا کہ بھٹی لوہے،

چاندی اور سونے کے میل کو دور کرتی ہے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ و ابن حبان) حضرت سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کا فرمان ہے: رمضان میں عمرہ میرے ساتھ حج کے برابر ہے۔ (ابوداؤد) حضرت سیدنا ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رحمت عالم نور مجسمؐ کا فرمان معظم ہے: حاجی اپنے گھر والوں میں سے چار سو کی شفاعت کرلے گا اور گناہوں سے ایسے نکل جائے گا جیسے اسی دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ (بزار) حضرت سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کا فرمان ہے: جو مکہ مکرمہ سے پیدل حج کو جائے یہاں تک کہ مکہ پاک آئے، اس کے لئے ہر قدم پر سات سو نیکیاں حرم کی نیکیوں کی مثل لکھی جائیں گی۔ عرض کیا گیا، حرم کی نیکیوں کی کیا مقدار ہے؟ ارشاد فرمایا کہ ہر نیکی ایک ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔ اس حساب سے ہر قدم پر سات کروڑ نیکیاں ہوئیں۔ (بیہقی)۔ حضرت سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ تاجدار رسالت، شفیع امتؐ کا ارشاد گرامی ہے: حاجی کی مغفرت ہوجاتی ہے اور وہ جس کے لئے استغفار کرے، اس کے لئے بھی مغفرت ہے۔ (بزار، طبرانی) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کا فرمان مبارک ہے: جو حج یا عمرہ کے لئے نکلا، اس سے کہا جائے گا تو جنت میں داخل ہوجا۔ حضرت سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کا ارشاد مبارک ہے: جو حج کے ارادہ سے چلا اور راہ میں فوت ہوگیا تو اب قیامت تک اس کے لئے حج کا ثواب لکھا جاتا رہے گا اور عمرہ کی نیت سے نکلا اور راہ میں موت سے ہمکنار ہوا تو اس کے لئے تا قیامت عمرہ کا ثواب لکھا جاتا رہے گا۔ (بیہقی) کفر پر موت کا اندیشہ، سرکار دو جہاںؐ کا فرمان ہے: جسے حج کرنے سے نہ ظاہری حاجت کی رکاوٹ ہو نہ بادشاہ ظالم کی۔ نہ کوئی مرض جو روک دے تو پھر بغیر حج کے مرگیا تو چاہے یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر۔ (دارمی)۔

حج ایک خالص عبادت اور دینی فریضہ ہے اس لئے حاجیوں کے لئے اخلاص کا پیکر ہونا اور ریاکاری سے دور رہنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ذیل میں اسی سلسلے میں راقم الحروف دو واقعہ سپرد قرطاس کررہا ہے۔

حضرت سیدنا فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: میدان عرفات میں لوگ جمع ہوکر مشغول دعا تھے۔ میری نظر ایک نوجوان پر پڑی جو سر جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔ میں نے کہا، اے نوجوان! تم بھی دعا کرو۔ وہ بولا مجھے تو اس بات کا ڈر لگ رہا ہے کہ جو وقت مجھے حاصل ہوا تھا شاید وہ جاتا رہا۔ اب کس منہ سے دعا کروں؟ میں نے کہا تو بھی دعا کرتا کہ اللہ تجھے بھی ان دعا مانگنے والوں کی برکت سے کامیاب فرمائے۔ حضرت سیدنا فضیلؒ فرماتے ہیں کہ اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی کہ ایک دم اس پر رقت طاری ہوگئی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی، تڑپ کر گرا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ (کشف المحجوب) حضرت سیدنا ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: میں نے منیٰ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ آرام سے بیٹھا ہوا ہے جب کہ لوگ قربانیوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں اس نے پکارا: اے میرے پیارے اللہ عزوجل! تیرے سارے بندے قربانیوں میں مشغول ہیں میں بھی تیری بارگاہ میں اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہوں۔ میرے مالک عزوجل! مجھے قبول فرما۔ یہ کہہ کر اپنی انگلی گلے پر پھیری اور تڑپ کر گرا۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو وہ جان دے چکا تھا۔ (کشف المحجوب) یاد رکھئے ہر عبادت کے لئے اخلاص شرط ہے۔ جتنا اخلاص زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔ اب علم دین اور اچھی صحبت سے دوری کی بنا پر ہماری اکثر عبادات ریاکاری کی نذر ہوکر برباد ہوجاتی ہیں۔ ہمارے ہر کام میں نمود و نمائش کا عمل دخل ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ اسی طرح اب حج جیسی عظیم سعادت بھی دکھاوے کی بھینٹ چڑھتی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر بے شمار بھائی حج ادا

کرنے کے بعد خود اپنے منہ سے حاجی کہتے اور اپنے قلم سے نام کے ساتھ حاجی لکھتے ہیں۔ آپ شاید چونک پڑے ہوں گے کہ اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ اس صورت میں کوئی مسئلہ بھی نہیں کہ لوگ آپ کو اپنی مرضی سے حاجی صاحب کہہ کر پکاریں مگر پیارے حاجیو! اپنی زبان سے اپنے آپ کو حاجی کہنا اپنی عبادات کا خود اعلان کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کو اس مثال سے سمجھیں۔ ٹرین چھک چھک کرتی اپنی منزل کی جانب بڑھتی چلی جارہی تھی۔ دو اشخاص قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا: جناب کا اسم شریف؟۔ جواب: ملا حاجی شفیق اور آپ کا مبارک نام؟ اب دوسرے نے سوال کیا۔ نمازی رفیق، پہلے نے جواب دیا۔ حاجی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، پوچھ ڈالا، اجی نمازی رفیق! یہ تو بڑا عجیب سا نام لگتا ہے۔ نمازی صاحب نے پوچھا: بتائیے! آپ نے کتنی بار حج کا شرف حاصل کیا ہے؟ حاجی صاحب نے کہا: الحمدللہ عزوجل! پچھلے سال ہی حج پر گیا تھا۔ نمازی صاحب کہنے لگے۔ آپ نے زندگی میں صرف ایک بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی تو بانگ دہل اپنے آپ کو حاجی کہنے اور کہلوانے لگے اور یوں اپنے حج کا سرعام اعلان فرمانے لگے اور بندہ تو بلاناغہ روزانہ پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ تو پھر اپنے آپ کو نمازی کہلوائے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ سمجھ گئے نا! آج تو نمود ونمائش کی انتہا ہوگئی عجیب تماشہ ہے۔ حاجی صاحب جب حج کو آتے جاتے ہیں تو پوری عمارت کو برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے اور گھر پر حج مبارک کا بورڈ لگایا جاتا ہے بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ ریکارڈنگ بھی کی جاتی ہے، خوب تصاویر اتاری جاتی ہیں۔ آخر یہ کیا ہے؟ کیا بھاگے ہوئے مجرم کا اپنے آقاؐ کی بارگاہ میں اس طرح دھوم دھام سے جانا مناسب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ روتے ہوئے اور آہیں بھرتے ہوئے لرزتے کانپتے ہوئے جانا چاہیے۔ حضرت سیدنا مالک بن دینارؒ حج کے لئے بصرہ سے پیدل نکلے۔ کسی نے عرض کی

آپؒ سوار کیوں نہیں ہوتے؟ آپؒ نے فرمایا، بھاگا ہوا غلام جب اپنے مولیٰ کے دربار میں صلح کے لئے حاضر ہو تو کیا اسے سوار کر آنا چاہیے؟۔ خدا عزوجل کی قسم! اگر میں مکہ معظّمہ انگاروں پر چلتا ہوا پہنچوں تو یہ بھی کم ہے۔

خلاصہ یہ کہ حج ایک مقدس اور اہم فریضہ ہے۔ اس کی ادائیگی مکمل خلوص اور سادگی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ذرہ برابر نام ونمود نہیں ہونی چاہیے۔ حاجی کہلانے اور لوگوں کے درمیان حاجی کہہ کر اپنا قد بڑھانے کی کوشش کرنا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ حج عشق خداوندی کا عظیم مظہر ہے اور ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اپنے رب کے سامنے اپنی غلامی کا اظہار کرنا چاہیے۔ شہرت ونا موری سے مکمل طور پر احتراز کرنا چاہیے۔

مدارس اسلامیہ اسلام وانسانیت کی بقا کا ضامن

مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت سے اب انکار کی گنجائش نہیں رہی ہے تاہم دشمنانِ اسلام نے بھی اس کی قوت کو پوری طرح بھانپ لیا ہے اس لیے آئے دن مدارس اسلامیہ کے تعلق سے طرح طرح کے منفی شگوفے ہوا میں چھوڑے جاتے ہیں اور مدارس واہل مدارس کے تئیں مسلمانوں خاص طور پر محسنین مدارس کو گمراہ اور بدگمان کیا جاتا ہے۔کبھی مدارس اسلامیہ کے وجود کو زمانے کے ساتھ نہ چلنے والا فرسودہ نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کبھی علما واہل مدارس پر بے ہنر طلبہ کی کھیپ کو دھرتی کا بوجھ بنانے کا الزام لگایا جاتا ہے،لیکن جب معاندین اسلام اوران کے غلط پروپیگنڈے کے شکار کچھ مسلمان بھائیوں نے بھی جب یہ دیکھ لیا کہ مدارس سے متعلق علماء اور طلبہ کی شکل میں یہ دیوانے اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تو اب مدارس اور اس کی انتظامیہ پر ہی سوالات کھڑے کیے جارہے ہیں اور چند برسوں سے اس میں کافی تیزی آگئی ہے۔ مدارس مخالف قوتوں نے اب مدارس چلانے والوں اور علماء پر بداخلاقی اور مالی بددیانتی کے الزامات لگانے کو بہترین ہتھیار تصور کرلیا ہے۔ان حالات میں علماء اہل مدارس کو منفی پروپیگنڈے سے بچنے کی سعی

کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری ہے کہ مخلصین ومعاونین مدارس معاندین اسلام کی بدنیتی کو سمجھیں اور علماء کے تعلق سے ہراڑی اڑائی بات پر ہرگز دھیان نہ دیں۔

اس بات کو اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب جب شمع حق کی لو تیز ہوئی ہے باطل کے خیمے میں بے چینی پیدا ہوئی ہے اور حق بات کو دبانے کی ہر ممکنہ کوشش ہوئی ہے۔ چنانچہ طرح طرح کی رکاوٹوں اور منفی پروپیگنڈوں کے باوجود مدارس اسلامیہ پوری قوت وجوش عمل کے ساتھ دین حق کی تعلیم اور اسلام کی اشاعت میں مصروف ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ چند دہائیوں سے مدارس نے علمی وباطنی سطح پر بھی ترقی کی ہے اور ظاہری طور پر بھی اسے وقار وترقی حاصل ہوئی ہے اس لیے اسلام ومدارس مخالف قوتوں کا بے چین ہوجانا فطری ہے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی کلمہ گو بھائی بھی ایسی طاقتوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اوران ہی کی زبان بولنے لگ جاتے ہیں۔ جب کہ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہی مدارس ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور اسلامی تعلیم زندہ ہے اور اسلامی تشخص باقی ہے۔ ہمارے بھائیوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو توکل علی اللہ پر بڑے بڑے پروجیکٹ کی بنیاد رکھتے ہوں،کوئی تنظیم ایسی نہیں جو بے سروسامانی کی حالت میں کسی کام کا عزم رکھتی ہو اور کائنات میں کوئی ادارہ نہیں جو چندہ بشکل بھیک اکٹھا کر کے نونہالان قوم کو تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کی مکمل کفالت بھی کرتا ہو۔تصور کیجیے کہ علماء کے علاوہ کوئی قوم ایسی دنیا میں ہے جو فرائض منصبی بھی ادا کرتی ہو اور ایک ایک روپیہ چندہ اکٹھا کرکے مدارس کا نظام بھی چلاتی ہو اور اپنا وظیفہ بشکل تنخواہ بھی لیتی ہو؟ یاد رکھیے علماء اور ذمہ داران مدارس کے سامنے محض اسلام کی خدمت اور اشاعت دین ہے اور وہ اس کے لیے مرمٹنے کے لیے تیار ہیں ورنہ امت کی جو بے رخی ہے مدارس پر کب کے تالے لگ چکے ہوتے۔

ایک طرف اہل مدارس کو معاندین اسلام کا سامنا ہے تو دوسری طرف ان روشن خیال برادران اسلام سے سابقہ ہے جن کے نزدیک مدارس اور اس سے وابستہ جملہ سرگرمیاں کارعبث ہے، چونکہ ان کے نزدیک انسانیت کی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے اور ایسے مدرسوں کو وہ لاحاصل سمجھتے ہیں جہاں صرف مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، ایسے لوگوں کی خواہش ہے کہ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کو برابر شامل کیا جانا چاہیے تاکہ دنیا میں ترقی یافتہ قوم کہلاسکیں، یعنی وہ ایسا مدرسہ چاہتے ہیں جہاں دینی تعلیم کی حیثیت اتنی ہی ہو جتنی کھانے میں چٹنی کی ہوتی ہے۔اس سوچ کے افراد خالص اسلامی مدرسوں کے لیے نہ دست تعاون بڑھاتے اور نہ کسی کو اس کام کے لیے آمادہ کرتے ہیں ، بلکہ بعض وقت تو وہ مدارس کے تعاون کرنے والوں کو روکتے ہیں۔صورتحال یہ ہے کہ ہندوستان میں صاحب نصاب افراد میں سے دس فیصد لوگ بھی اپنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالتے اور جو نکالتے ہیں انھوں نے زکوٰۃ کی رقم کو کھپانے کے لیے نام نہاد قسم کے ٹرسٹ کھول رکھے ہیں، ظاہر ہے ایسے میں اہل مدارس کہاں سے یہ امید لگائیں کہ ان کی مالی مشکلات دور ہونگی اور وہ پوری تندہی کے ساتھ اشاعت دین میں منہمک رہیں گے۔اتنی رکاوٹوں اور مسائل ومشکلات کے باوجود اہل مدارس اگر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں تو یہ کسی جہاد سے کم نہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اہل اسلام اور صاحب ثروت لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے رہیں کہ وہ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرنے کی کوشش کریں اور مدارس کی اہمیت سے بھی انھیں آگاہ کرتے رہیں دوسری طرف صاحب ثروت کو چاہیے کہ وہ اسلامی مدارس کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہیں کیوں کہ یہی وہ مدارس ہیں جن کے دم سے آج ہندوستان کے جنگلوں میں بھی اذان واقامت ہورہی

ہے۔روشن خیال طبقے کو بھی چاہیے کہ وہ مدارس کے مقاصد کو سمجھیں اور ان کے نشانہ کو پہچانیں، اگر وہ اس پر غور کریں گے تو ان پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ مدارس اسلامیہ کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔

علماء واہل مدارس کو ایسے حالات سے نہ گھبرانا چاہیے اور نہ کسی طرح کی مایوسی کا شکار ہونا چاہیے کیوں کہ جس قرآن کریم کی تعلیم میں وہ مصروف ہیں اس کے بقا کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے دوسری طرف علماء کو اپنے اسلاف کی خدمات کو دیکھنا چاہیے کہ کن کن مسائل ومشکلات کو جھیل کر انھوں نے دینی تعلیم اور اشاعت دین کی شمع کو جلائے رکھا ۔بوریہ نشیں علما نے مدارس اور خانقاہوں میں بیٹھ کر جس طرح مدارس کے نظام کو رائج وعام کیا تھا وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے، انشاء اللہ علوم اسلامیہ کا چراغ یونہی جلتا رہے گا۔

حرف اول:

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں جب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا، انگریزی سیاست ہندوستان پر پوری طرح حاوی تھی، اسلامی روایات ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں، اسلامی تہذیب اور علوم وفنون کے زوال کا وقت آ گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اسلامی تعلیمات خود مسلمانوں کے لیے ’’لاشئ‘‘ بن کر رہ جائیں گی، انگریزی حکومت انتہائی شدت سے زندگی کے اس ’’لطیف جوہر‘‘ کو اہل اسلام کے ذہن و دماغ سے محو کرنے کی سعی پیہم میں مصروف تھی، مسلمانوں کی تعلیمی اور اجتماعی نظامِ حیات کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، انقلاب کے بعد، قوم مسلم انھیں مصائب سے دوچار ہوگئی تھی، جن سے عموماً مفتوح قومیں دوچار ہوتی ہیں اور ذہنی اضمحلال وپراگندگی ایسے نامساعد وقت میں رونما ہو رہی تھی، ان عام مشکلات سے صدیوں حکومت کرنے والی قوم اپنے آپ کو غیر مامون پا رہی تھی، ایسے ظلمت آگیں دور میں، مردانِ حق کیش اٹھے اور انھوں نے جہل کی

تاریکی کو علوم وفنون کی روشنی سے تابناک بنانے کے لیے، اسلامی قندیلیں مدارس کی صورت میں روشن کرنے کا باعزم فیصلہ کیا۔

قیامِ مدارس کا مقصد:

قرآن وحدیث کی تعلیمات کے بغیر کسی اسلامی معاشرہ کی تعمیر اوراس کے قیام کا تصور ممکن نہیں، اسلامی تعلیمات ہی پر صالح معاشرہ کی بنیاد اور داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے، قرآن وحدیث اسلامی تعلیمات کا منبع ومصدر ہیں اور دینی مدارس کا مقصد، اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کے ماہرین، قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والے علماء اور علوم اسلامی میں دسترس رکھنے والے رجال کار پیدا کیے جائیں، جو آنے والی نسل کا اسلام سے ناطہ جوڑیں، مسلمانوں میں اسلام کی بنیادی اور ضروری تعلیم کو عام کرنے اور اسلامی تہذیب وتمدن کی ابدی صداقت کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دیں اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ مدارس اپنے اس بلند مقصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی ہمہ گیر افادیت: مدارس اسلامیہ نے اگر ایک طرف ملت اسلامیہ کی ہر میدان میں رہنمائی کی اور کروڑوں انسانوں کو شاہراہِ مستقیم پر گامزن کیا، تو دوسری طرف انہوں نے ایسے بے شمار بلند پایہ علماء پیدا کئے، جن میں سے ہر ایک علم وفن کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا اور جن کی جامعیت، اخلاص وللّٰہیت، علمی رسوخ اور قوتِ عمل نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کردی، مدارس اسلامیہ نے آزادی کے بعد اٹھاون سال کی مختصر مدت میں لاتعداد علماء وصلحاء پیدا کر کے افراد سازی کا ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا کہ تاریخ کا ہر معلم اپنے سنہرے حرفوں سے مدارس اسلامیہ کی اس عظیم الشان خدمت کو رقم کرے گا، یہ بے مثال معنویت اس وقت اور دوچند ہوجاتی ہے جب اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ ان فضلاء میں اکثر نے مدارس اسلامیہ سے حاصل کردہ امانت دوسروں تک پہونچانے اور دنیا بھر میں علم کی

شمع جلانے کا اہم فریضہ ہر دور میں انجام دیا ہے اور آج بھی ہمہ تن مصروف ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی علمی خدمات:

مدارس اسلامیہ کے فرزندوں کی علمی خدمات ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں، تفسیر قرآن، حدیث نبوی، فقہ اسلامی، علم کلام، عربی ادب، تجوید و قرأت، تاریخ وسیر اور تحریر وصحافت میں ان کی خدمات نہایت وقیع ہیں، اس پر مستزاد اردو زبان کی خدمت بھی مدارس نے جس قدر انجام دیا ہے دیگر یونیورسٹی اور کالجز دینے سے قاصر ہیں، چنانچہ صرف ہندوستان میں دینی مدارس جو بغیر کسی سرکاری سرپرستی وامداد کے چل رہے ہیں، ان سے وابستہ بوریانشیں علماء نے پچاس سال کے عرصے میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں تحریر کی ہیں۔

فضلاءِ مدارس کے تصنیفی کارنامے:

مدارس اسلامیہ کی تعلیمی اور تدریسی خدمات کے علاوہ تصنیفی کارنامہ ایک معروف حقیقت ہے اور دنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے، خصوصاً ازہر ہند دارالعلوم دیوبند اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر مدارس اسلامیہ کے فارغین نے درس وتدریس اور دوسرے دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے حوالے سے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے، بلکہ دنیائے اسلام کے لیے بھی ایک سرمایۂ افتخار ہے۔ علوم دینیہ سے متعلق کوئی علم وفن ایسا نہیں، جس میں ان کی تصنیفات وتالیفات موجود نہ ہوں، ان میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی ہیں، یہ کتابیں زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں، ان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔

درحقیقت مدارس اسلامیہ کی خدمت کے دورخ ہیں، ایک اندرونی، جس کا تعلق

طلباء کی تعلیم وتدریس سے ہے، اس کا دوسرا رخ بیرونی ہے جو عام مسلمانوں اور ملک سے متعلق ہے۔ عوام سے رابطہ، وعظ وتبلیغ، دینی وملکی معاملات میں قوم کی شرعی رہنمائی، تزکیرو تذکیہ اور تصنیف وتالیف اس کے اہم عنوانات ہیں۔ سید محبوب رضویؒ رقم طراز ہیں ”مدارس اسلامیہ سے جو قابل قدر خدمات انجام پائیں، وہ برصغیر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں، صرف تصنیف وتالیف کے میدان میں تنہا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام نامی سے کون ناواقف ہوگا، جنھوں نے اگر ایک طرف اپنی گراں قدر تصنیفات سے لوگوں کو علم وتحقیق سے روشناس کرایا تو دوسری طرف افراد سازی کا ایسا بے مثال کارنامہ انجام دیا کہ ان کی ذاتِ اقدس پر ”مجددیت“ کا لفظ صادق آنے لگا۔ دینی اصلاحی نقطۂ نظر سے ملت کے ہر گوشے کو بدعت وخرافات سے دور کر کے سنت وشریعت پر گامزن کرنے کی سعی پیہم کی اور اس میں بہت حد تک کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ حضرت تھانویؒ کو تو ہم نے ایک آئیڈیل بنا کر پیش کیا، ورنہ اس طرح کے بے شمار بزرگان دین نے ملت اسلامیہ کو رو بہ ساحل کرنے میں اپنی عمر عزیز کو فنا کر دی۔

بیرونِ ہند مدارس کی خدمات:

افادۂ ملت کے لیے فضلاء مدارس نے جو گراں قدر تالیفی خدمات انجام دیں اس کا دائرہ صرف برصغیر تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کی افادیت عالم اسلام تک عام ہوئی۔ سید محبوب رضویؒ ارقام فرماتے ہیں ”علماء دیوبند کے اس تحریری سرمایے کا مدار، شام کے ایک جلیل القدر عالم شیخ ابوغدہ کے الفاظ میں، گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ و صلاح، روحانیت اور استغراق فی العلم ہے، چنانچہ عبد الفتاح ابوغدہ نے علماء دیوبند کی تصانیف کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ، اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں جو کتابیں اردو اور فارسی زبانوں میں ہیں، ان کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ ”عرب دنیا“

کو بھی ان سے استفادہ کا موقع مل سکے“۔

چنانچہ خود شیخ نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ (متوفی: ۱۹۳۶ء) کی تصنیف ”التصریح بما تواتر فی نزول المسیح“ کو نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع کیا، نیز انھوں نے مولانا عبدالحئ لکھنوی (متوفی: ۱۸۸۶) کی کچھ کتابوں کو بھی ایڈٹ کر کے طبع سے آراستہ کر کے امت مسلمہ کی زبردست خدمت کی۔

فضلاء مدارس اور تفسیر قرآن:

قرآن کریم، شریعت اسلامی کا محور ومصدر ہے، لہٰذا اس کی تفہیم واشاعت کسی بھی اسلامی ادارے کا بنیادی فریضہ ہے۔ علماء ربانیین نے اس سلسلے میں اپنے فرضِ منصبی کو خوب سمجھا اور اس میدان میں نہایت وقیع خدمات انجام دیں، تفسیر اور اس کے مختلف گوشوں اور ذیلی فنون پر فرزندان مدارس کی عظیم الشان اور معیاری تصانیف ہیں، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے مثلاً: ترجمہ شیخ الہند اور اس کے حاشیہ پر تفسیر عثمانی، ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری، بیان القرآن، مشکلات القرآن، معارف القرآن اور احکام القرآن جیسی بلند پایہ کتب پیش کی جاسکتی ہیں، اسی طرح تفسیر کی سربرآوردہ شخصیات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا احمد حسن محدث امروہوی، حکیم الامت حضرت تھانوی، فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی، مولانا ادریس کاندھلوی اور عظیم انشاء پرداز، محقق عالم حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفاسیر مشتے از خروارے کے طور پر پیش کی گئیں ورنہ یہ عنوان سیکڑوں تصانیف اور شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔

فضلاء مدارس اور ترویج حدیث:

سرزمین ہند سے ایسی قدآور ہستیاں نمودار ہوئیں اور علم حدیث کی ترویج و

اشاعت میں ایسی نمایاں خدمات انجام دیں، جنھیں دیکھ کر ابن حجر اور عینی وطیبی کی یادیں تازہ ہوگئیں، جن کے چند اسماء قابل قدر ہیں: شیخ الاسلام حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی، فخر المحدثین سید فخر الدین احمد مرادآبادی، حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی، صاحب بذل المجہول حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، رئیس القلم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا ادریس کاندھلوی، محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہم اللہ اجمعین۔ ان حضرات کے حوالے سے یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس فن میں امت کی امامت کا شرف انھیں حاصل رہا ہے، جن کی جدوجہد کے نتیجے میں لامع الدراری، فیض الباری، اعلاء السنن، فتح الملہم، اوجز المسالک، معارف السنن، تحفۃ الاحوذی جیسی بلند پایہ کتب اور دیگر بے شمار تصانیف معرضِ وجود میں آئیں۔

مدارس اسلامیہ فقہ اسلامی کا مرکز:

فقہ اسلامی درحقیقت کتاب وسنت کا عطر ہے، خصوصاً فقہ حنفی جو اپنی گہرائی وگیرائی کی بنیاد پر شریعت اسلامیہ کی روح ومزاج کا آئینہ دار ہے۔ مدارس اسلامیہ سے فقہ کے حوالے سے عظیم خدمات انجام دینے والے بے شمار افراد تیار ہوئے، جنھوں نے فقہی بصیرت اور تعمق نظری سے مستند کتابیں تالیف فرما کر امت کی تشنگی کو بجھایا، مزید آئے دن پیش آنے والے مشکل ترین مسائل کو حل کر کے امت مسلمہ کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا جس کی شہادت فتاوی دار العلوم، امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی، احسن الفتاویٰ، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ نظامیہ، فتاویٰ امارت شرعیہ، صنوان القضاء جیسی کتابیں دے رہی ہیں۔

تاریخ وسیر میں علماء کا اہم کردار:

تاریخ وسیر نگاری میں بھی مدارس اسلامیہ کے سپوتوں نے پہلی صف میں مقام حاصل کیا ہے، چنانچہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مجاہد فی سبیل مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا زاہد الراشدی، مفتی تقی عثمانی اور دیگر علماء کی سیکڑوں تالیفات سے ایک ذخیرہ معرضِ وجود میں آکر قبولیت عامہ حاصل کیا۔

تحریر وصحافت میں فضلاء مدارس کی سرگرمیاں:

تحریری صلاحیت کا ایک مظہر تو تصنیفات وتالیفات ہیں، جن کا جائزہ اوپر گذرا اور دوسرا تحریری کام صحافت سے متعلق ہوتا ہے، اس میدان میں بھی فضلاء مدارس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ شاید بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو کہ فضلاء مدارس نے مختلف ادوار میں جو ماہانہ یا پندرہ روزہ رسائل وجرائد اور ہفت روزہ، سہ روزہ یا یومیہ اخبارات نکالے ہیں یا ان کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں، مولانا سلمان احمد بجنوری کے مطابق ان کی تعداد دو سو سے زائد ہے، ان میں بعض پرچے ایک عرصے تک آسمانِ صحافت پر درخشاں رہے اور ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی سرگرم ہے۔

شرح خواندگی بڑھانے میں مدارس کا کردار:

برصغیر میں شرح خواندگی کا تناسب افسوسناک حد تک کم یعنی مردوں میں پچاس اور عورتوں میں چوبیس فیصد ہے، اس تناسب کی بنا پر ہندوپاک کا شمار میدان تعلیم کے لحاظ سے دنیا کے پس ماندہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ اتنی کم شرح خواندگی والے خطے کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے، جو نہ صرف شرح خواندگی کی اس کمی کو کافی حد تک کنٹرول کرنے میں معاون ہیں، بلکہ یہ ان بچوں کو تعلیم

سے آراستہ کرنے کا بھی واحد ذریعہ ہیں، جن کے والدین عصری درسگاہوں میں ان کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اس طرح مدارس نے حکومت کے ایک ثقیل بوجھ کو بھی ہلکا کر دیا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ مدارس کا نصب العین:

ہر مدرسہ میں یقینی طور پر ایک شعبہ ''اصلاح معاشرہ'' کے لیے ہوتا ہے، چوں کہ مدارس کی بنیاد ہی صلاح وتقویٰ پر ہوتی ہے اور اس کے بانیان کی سرشت میں اس طرح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اس لیے مدارس نے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کا یہ حق اپنے تئیں خود لازم کرلیا ہے، جس کے ذریعہ معاشرہ کی برائیاں، فضول رسومات اور غیر انسانی اقدار وافکار کے ازالہ کے لیے تحریری وتقریری مساعی جاری وساری رہتی ہے، نیز وقتاً فوقتاً خدارسیدہ علماء ربانین کے باعظمت اثر انگیز خطاب سے عوام وخواص کے دلوں میں ایمانی حمیت و جلا پیدا کی جاتی ہے۔ مدارس میں تعلیم دینے والے علماء صلحاء کی تعلیمات کے نتیجہ خیز ہونے کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں مدرسہ کی چہار دیواری میں اقامت پذیر طالبان علوم نبویہ، نازیبا حرکات، اخلاق سوز جرائم اور خودکشی جیسے دل سوز واقعات عدم کی حد تک، بلکہ اگر ناممکنات میں شمار کیا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی، اس کے برخلاف عصری علوم میں منہمک طلبہ جو بزعم خود مہذب ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں اس طرح کی حرکات سے ان کی تاریخ داغدار رہی ہے۔

مغربی تہذیب کی یلغار اور مدارس کا کردار:

کسی بھی قوم کے مذہبی تشخص کو ختم کرنے کے لیے اس پر دو سمتوں سے یلغار ہوتی ہے، ایک فکری، اعتقادی اور نظریاتی سمت سے، دوسری عملی اور تحریکی زندگی کی جہت سے، ان دونوں محاذوں سے حملہ آور ہو کر اگر کسی قوم کی نظریاتی واعتقادی تعمیر گرادی جائے

اور عملی زندگی کو مذہبی قیود سے آزاد کر دیا جائے تو سمجھیے کہ اس قوم کا مذہب کے حوالے سے تشخص بالکل مٹ جائے گا اور کچھ عرصہ بعد اس کی حیثیت تاریخ کے ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ ''مغرب'' عالم اسلام پر اس وقت دونوں جہتوں سے حملہ آور ہے، اسلامی تہذیب کے خرمن کو نذر آتش کرنے کے درپے ہے چنانچہ اعتقادی فتنوں کے ساتھ ساتھ اباحیت پسندی، جنسی بے راہ روی، فحاشی وعریانی اور مادیت کی یورش، عالم اسلام میں اپنے عروج پر ہے، برصغیر میں دینی مدارس ہی مسلمانوں کی تہذیبی روایات وعقائد کی حفاظت کے امین وقلعہ ہیں، جہاں سے طوفانِ مغرب کی سرکش موجیں ٹکرا ٹکرا کر واپس ہو جاتی ہیں اور بحمد اللہ اس خطے میں مسلمانوں کا دینی تشخص پورے آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔

مدارس ہر نئی ظلمت میں امید کی کرن:

آج ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور سے گذر رہے ہیں، ان کی زیست سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرہ ان کے دین وایمان اور اسلامی تشخص کو ہے، ان حالات میں امید کا سہارا پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے دینی وعربی مدارس ہیں، مدارس ہر نئی ظلمت میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور بیابان کی تاریک شب میں قندیلِ رہنمائی روشن کرتے ہیں۔ ڈاکٹر یونس بلگرامی لکھتے ہیں کہ ''یہ اسلامی مدارس جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں اور جہاں نبوت محمدی کی ابدیت پر یقین اور زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا کا کون سا متحرک ومصروف ادارہ ہے جس کا سرا نبوت سے ملا ہوا ہے اور جو نبوت کے چشمہ سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے، مدرسہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کی کھیتیاں سوکھی رہ جائیں''۔ مدرسہ ہی ہر قدم پر جائزہ لیتا ہے، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرتا ہے، بھٹکے ہوئے قدموں کو جماتا ہے

اورملت کی دکھتی رگوں پہ ہاتھ رکھتا ہے۔

مدارس اسلامیہ اسلام کی بقا کا ضامن:

اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس وقت سرزمینِ ہند میں مدارس اسلامیہ مسلمانوں کے دین وتہذیب کے وجود وبقا کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں، اس وقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں اگر اسلام کے باقی رہنے کی بظاہر کوئی صورت نظر آرہی ہے تو وہ مدارس اسلامیہ ہی ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کے تشخص کا سوال ہے تو مسلم قوم کو اپنا ہر طرح کا تشخص برقرار رکھنے کے لیے اپنے دین ومذہب سے کلی طور پر جڑے رہنا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اسلامی طرزفکر کی دانش گاہوں اور تربیت گاہوں سے وابستہ رہنا ہوگا کیوں کہ مسلمانوں کا تشخص مدارس اسلامیہ کے ساتھ ربط پیہم رکھنے پر ہی منحصر ہے۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

مدارس اسلامیہ غیروں کی نظر میں:

ہر منصف مزاج نے مدارس کو ملک کی سالمیت، امن پسندی اور عدم تشدد کا پیغامبر ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کی عالم گیر خدمات بہ نظرتحسین دیکھ کر اپنے منصفانہ و غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرساد سابق صدر جمہوریہ ہند سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جسٹس جناب جگدیش سہائے، ویر بہادر سنگھ سابق وزیر اعلیٰ یوپی، رام نریش نائب وزیر اعلیٰ یوپی یہ سب وہ حضرات ہیں جنھوں نے بچشم خود دیکھ کر مدارس کی خدمات کو سراہا ہے اور یہ آشکارا کیا ہے کہ ”مدارس اسلامیہ امن پسندی کے داعی ومحافظ ہیں، جہاں اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ صرف مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں، بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے، اسی

طرح پندرہ بیس لاکھ انسانوں کے عظیم الشان اجتماع میں مسز اندرا گاندھی نے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا، ان کی تقریر بہت صاف اور شستہ اردو میں تھی، انھوں نے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی اسلامی تہذیبی اور قومی وملکی خدمات کا بھرپور الفاظ میں تذکرہ کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں خراج تحسین پیش فرمایا۔

لیکن بدقسمتی سے آج انھیں مدارس کے خلاف ناپاک منصوبے اور پروپیگنڈے کیے جارہے ہیں، بے تحقیق الزام تراشی کے ذریعے ان کو دہشت گردی کا ٹھکانہ قرار دیا جارہا ہے اور ان کی کردارکشی اور اصل شبیہ بگاڑنے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔

مدارس اسلامیہ اور حکومت ہند کا رویہ:

دینی مدارس نے ایسا صالح معاشرہ ہمیشہ سے قوم وملک کو دیا ہے، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، ان سب کے باوجود آج دینی مدارس کو ”دہشت گردی“ کا اڈہ گردانا جاتا ہے، دینی مدارس کے خلاف مغربی لابیوں اور حکومت کی موجودہ مہم کے پس منظر میں انسانی حقوق کے تحفظ یا ملک وقوم کے مفادات کا جذبہ کارفرما نہیں، عالمی حالات کے تناظر میں مدارس کے خلاف نئی مہم کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینے والا ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ یہ تمام کوششیں دینی مدارس کے اسلامی معاشرے میں مؤثر کردار کی وجہ سے ان کی اہمیت وافادیت پر ضرب کاری لگانے اور دینی تعلیم کی طرف لوگوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کو کم کرنے کا ایک مغربی حربہ ہے۔ کمیونزم کی ناکامی کے بعد مغرب اب عالم اسلام سے مقابلہ کے لیے پر تول رہا ہے، اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی مستحکم تعلیمات، اپنی شاندار روایات، صحت مند رجحانات اور اپنی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی وجہ سے ”مغرب“ کے لیے اس وقت سب سے بڑا چیلنج اور خطرہ بنا ہوا ہے، مغرب کی پالیسی ساز سوچ اسلامی تعلیمات کی حفاظت کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچی کہ مسلم

معاشرہ کے خشک کھیتوں کو سیراب کرنے والے چشمے ان مدارس سے ہی پھوٹتے ہیں، اسلامی تحریکوں کو ایندھن یہیں سے فراہم ہوتا ہے، اسلامی بنیاد پرستی بھی ان مدارس کی آغوش میں بڑھتی ترقی کرتی اور پروان چڑھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مدارس اسلامیہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہیں، کاروبار اور سیاست سے دور ملک کو اچھے با اخلاق شہری مہیا کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ روڈ جام نہیں کرتے وہ قومی املاک کو نقصان نہیں پہونچاتے، توڑ پھوڑ نہیں کرتے، ان اداروں میں گولیاں نہیں چلتیں، بم نہیں پھٹتے یہاں انسانیت سکھائی جاتی ہے اور اعلیٰ کیرکٹر کے انسان تیار کیے جاتے ہیں۔

ہندوستانی عوام اس سے اچھی طرح باخبر ہیں اگر کوئی گروہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مذکورہ حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے تو یہ اس کی کوئی سیاسی ضرورت تو ہوسکتی ہے مگر اسے قوم وملک کی خدمت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ حد تو یہ ہے کہ بعض مسلم دانشوران بھی مدارس کے خلاف حکومت کے معاندانہ رویے میں دوش بدوش ہیں، ان کی کاسہ لیسی میں لگ کر خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سُر میں سُر ملا رہے ہیں۔

روشن خیال دانشوران سے علامہ اقبال کی فریاد:

آج انگلی پر شمار میں لائے جانے والے بعض مسلم روشن خیال دانشوران، مدارس کی خدمات کو نظر انداز کر کے ان کے نظامِ تعلیم کو نشانہ بناتے رہتے ہیں جب کہ علامہ اقبال جیسے روشن خیال کی تحریر ان سے فریاد کررہی ہے کہ ’’ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کہ کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدارس کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے باوجود آج ’’غرناطہ اور قرطبہ‘‘ کے کھنڈرات اور ’’

الحمراء‘‘ کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے ’’تاج محل‘‘ اور دلی کے ’’لال قلعہ‘‘ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

مدارس اسلامیہ امن کا پرزور داعی اور محافظ:

دینی تعلیم کے مدارس جو ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے قیام کا بنیادی مقصد علم دین کی تعلیم، اس کی ترویج واشاعت اور تزکیہ نفس وتربیتِ اخلاق ہے اس کے ساتھ ان مدارس میں احترام آدمیت، اکرام انسانیت، مثالی اخلاق، حق نوازی، رواداری اور حب الوطنی کا درس دیا جاتا ہے۔ ان مدارس کے نصاب میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جس سے نفرت وعداوت کی بو آتی ہو یا دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہو بلکہ اس نصاب تعلیم کو پڑھ کر جو علماء تیار ہوتے ہیں وہ علوم شریعت کے ماہر، امور شریعت کے واقف کار، امن وانسان دوستی کے علمبردار، حب الوطنی کے جذبات سے سرشار اور ملکی ووطنی عظمت کے پاسدار ہوتے ہیں، اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آزاد ہندوستان کے موجودہ ماحول میں اگر ملک کو کوئی تعلیمی ادارہ اچھا انسان فراہم کرتا ہے تو وہ ہمارے ملک کے مدارس ہیں کیونکہ ان مدارس کے فارغین میں اتحاد واتفاق، انسانیت نوازی، باہمی تعاون اور بقاء باہم کا ذوق ومزاج راسخ کردیا جاتا ہے اس کے نتیجے میں ان میں ایثار و ہمدردی، اخوت ومحبت اور شجاعت جیسے مکارم اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ ایک ایسی معتدل نفسیاتی کیفیت سے آشنا ہوجاتے ہیں جو نہ کمتری کے احساس سے بوجھل ہوتے ہیں اور نہ برتری کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ جس میں خود اعتمادی اور منکسر المزاجی، بہادری وخوش اخلاقی، شفقت وترحم اور عزم واستقلال دونوں قسم کی کیفیتوں کا متناسب امتزاج ہوتا ہے اس لیے

ان مدارس پر حملوں سے، اس کی کردار کشی سے صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ ملک کے مفاد کو زبردست نقصان پہونچے گا۔

حرف آخر:

یہ تھی مدارس اسلامیہ کی اجمالی خدمات کا مختصر جائزہ اوران کی سرگرمیوں کی ادنیٰ جھلک جو موجودہ حالات کے پیش نظر سنجیدہ و سلیم الطبع اور حق پسند ہم وطنوں کے لیے لکھی گئی اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ باتیں ایک غیر جانبدار آدمی کو مطمئن کرنے، غلط فہمیاں دور کرنے اور شبِ دیجور اور صبح پرنور کے درمیان فرق کرنے کے لیے کافی ہیں ورنہ ”نہ بیند ہنر، دیدۂ عیب جوئے“ کے مطابق، عیب کی متلاشی نظروں کو خوبی بھی عیب ہی دکھائی دیتی ہے بقول شیخ سعدیؒ

گر نہ بیند بہ روز شپرۂ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گنا

ضد اور عناد جن کا شیوہ اور بدگمانی ہی جن کا عقیدہ ہو ایسے دائم المرض روگیوں کے لیے آج تک کوئی دوا شافی تلاش نہ ہوسکی، ان کے لیے تو ہم باری تعالیٰ سے دعاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحیح سمجھ عطا کرے تاکہ وہ مدارس اسلامیہ کی ناقابل فراموش خدمات کو فراموش نہ کرکے اپنی سلامت روی کا ثبوت دیں۔ واللہ هو الموفق۔

عیدالفطر: روزوں کی تکمیل پر اللہ کا انعام

اسلام میں پورے سال میں صرف دو تہوار اور دو عیدیں مقرر ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور مختلف الخیال لوگوں میں پورے سال کے دوران بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے تہوار الگ ہیں، یہودیوں کے اور ہندوؤں کے تہوار الگ الگ ہیں، جبکہ اسلام نے صرف دو ہی تہوار مقرر کئے ہیں۔ ایک ”عید الفطر“ اور دوسری ”عیدالاضحیٰ“، اِن دونوں تہواروں کو منانے کے لئے جن دنوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ پوری دنیا کے تہواروں سے الگ اور نرالے ہیں، اگر آپ دوسرے مذاہب کے تہواروں پر غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ لوگ ماضی میں پیش آنے والے کسی واقعہ کی یادگار میں تہوار مناتے ہیں۔ مثلاً عیسائی 25/ دسمبر کو ”کرسمس ڈے“ کا تہوار مناتے ہیں۔ بقول عیسائیوں کے ان کا یہ تہوار حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مناسبت سے مناتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل ہی غلط ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش 25/ دسمبر کو ہوئی، چنانچہ آپ کی پیدائش کی یاد میں انھوں نے ”کرسمس ڈے“ کو تہوار کے

لئے مقرر کرلیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون سے جس دن نجات ملی تھی اور فرعون غرق ہوگیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل کو عبور کرلیا تھا، اس دن کی یاد میں یہودیوں نے اپنا تہوار منانا شروع کردیا۔ اسی طرح ہندوؤں کے یہاں بھی جو تہوار ہیں وہ بھی ماضی کے کسی نہ کسی واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اسلام کا کوئی بھی تہوار ماضی کے واقعہ سے وابستہ نہیں:

اسلام میں جو دو تہوار مقرر ہیں وہ ''عیدالفطر'' اور ''عیدالاضحیٰ'' ہیں۔ ماضی کا کوئی واقعہ ان دونوں تہواروں کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں، یکم شوال کو عیدالفطر منائی جاتی ہے اور 10 ذی الحجہ کو عیدالاضحیٰ منائی جاتی ہے، ان دونوں تہواروں کی تاریخوں میں کوئی تاریخی واقعہ پیش نہیں آیا، اسلام نے نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن کو عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے مقرر کیا، نہ ہی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکۃ المکرّمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کے اس تاریخی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار دیا اور نہ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے میدان میں فتح ونصرت سے ہمکنار ہونے پر ''عید'' کا دن قرار دیا، نہ ہی غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب اور اسی طرح سے بیسیوں غزوات کے دن کو ''عید'' کا دن قرار دیا، جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا کفر ہمیشہ کیلئے حرمین کی زمین میں دفن ہوا اور بیت اللہ کی چھت سے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اللہ اکبر کی صدا پہلی مرتبہ گونجی اس دن کو بھی ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا۔ اسلام کی پوری تاریخ اور خاص طور پر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھرپور ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا، یہ بھی اسلام کی حقانیت کی علامت ہے۔

''عیدالفطر'' روزوں کی تکمیل پر اللہ کا انعام:

جن ایام کو اسلام نے تہوار مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو

ماضی میں ایک مرتبہ پیش آکر ختم ہوچکا ہو، بلکہ اس کے بجائے ایسی خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کی آمد کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ اللہ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمائی ہیں جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، چنانچہ عیدالفطر رمضان المبارک کے گزرنے کے بعد رکھی ہے کہ میرے بندے پورے مہینے میری بندگی کے اندر مشغول رہے، اور پورے مہینے انہوں نے میرے خاطر کھانا پینا چھوڑے رکھا، نفسانی خواہشات کو چھوڑے رکھا، جبکہ ان کے سامنے فریج کا ٹھنڈا پانی، کھانے کے مواقع اور خواہشات نفس پوری کرنے کے لئے شریک حیات کی موجودگی کے باوجود صرف انھوں نے میری رضا کے لئے پورا مہینہ عبادت کے اندر گزارا، اس کی خوشی اور انعام میں یہ عیدالفطر مقرر فرمائی۔

عید کا دن ''یوم الجائزۃ'':

خیر! یہ عیدالفطر خوشی منانے کا اور اسلامی تہوار کا پہلا دن ہے، حدیث شریف میں اس کو ''یوم الجائزۃ'' بھی قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے مہینے کی عبادتوں پر انعام دیئے جانے کا دن ہے جو ''مغفرت'' کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ گزرجانے کے بعد عید کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اصحاب ایمان کی طرف اشارہ کرکے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں۔

انسانوں کی تخلیق پر فرشتوں کے سوال کا جواب:

اس لئے فخر فرماتے ہیں کہ جب سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جارہا تھا ان فرشتوں نے اعتراض کیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ:

اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء و نحن نسبح

بحمدک نقدس لک. (سورہ بقرہ:30)

آپ مٹی کے اس پتلے کو پیدا کر رہے ہیں جو زمین پر جا کر فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ایک دوسرے کے گلے کاٹے گا اور ہم آپ کی تسبیح وتقدس کے لئے کافی ہیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

انی اعلم مالا تعلمون. (سورہ بقرہ:30)

اس مخلوق کے بارے میں، میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں کہ اس مخلوق کے اندر اگرچہ میں نے فساد کا مادہ بھی رکھا، فساد پھیلانے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے، لیکن اس کے باوجود جب یہ مخلوق میرے حکم کی تعمیل کرے گی اور میری عبادت و بندگی بھی کرے گی، تو یہ تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی، کیونکہ تمہارے اندر میں نے فساد کا مادہ ہی نہیں رکھا، چنانچہ اگر تم گناہ کرنا بھی چاہو تو گناہ نہیں کر سکتے، نہ تم کو بھوک و پیاس لگتی ہے، نہ تمہارے دل و دماغ میں جنسی اور نفسانی خواہشات پیدا ہوتے ہیں تمہیں تو صرف اسی لئے پیدا کیا ہے کہ بس ''اللہ اللہ'' کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے رہو، لیکن اس انسان کو بھوک و پیاس لگے گی، جنسی خواہشات بھی پیدا ہوں گے، جب میں اس مخلوق سے یہ کہہ دوں گا کہ کھانا پینا مت، تو میرے اس حکم کے نتیجے میں انسان سارا دن اس طرح گزار دے گا کہ اندر سے پیاس لگ رہی ہوگی، فرج میں ٹھنڈا پانی موجود ہوگا، کمرے میں کوئی دوسرا انسان دیکھنے والا بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود صرف میرے خوف اور میری عظمت کے خیال سے اور میرے حکم کی اطاعت میں یہ اپنے ہونٹوں کو خشک کئے ہوئے ہوگا۔ اس صفت کی وجہ سے یہ انسان تم سے بھی آگے بڑھ جائے گا۔

آج میں ان سب کی مغفرت کر دوں گا:

خیر! عیدالفطر کے دن جب مسلمان عیدگاہ میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہی

فرشتوں کے سامنے جنھوں نے اعتراض کیا تھا، فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے میرے فرشتو! یہ ہے میرے بندے جو میری بندگی میں لگے ہوئے ہیں اور بتاؤ کہ جو مزدور اپنا کام پورا کرلے اس کو کیا صلہ ملنا چاہئے؟ جواب میں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جو مزدور اپنا کام پورا کرلے اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کو اس کی پوری پوری مزدوری دے دی جائے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ اللہ رب العزت پھر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے ہیں، میں نے رمضان المبارک کے مہینے میں ان کے ذمہ ایک کام لگایا تھا کہ روزہ رکھیں اور میری خوشنودی کی خاطر کھانا پینا اور اپنی خواہشات کو چھوڑ دیں۔ آج انھوں نے یہ فریضہ پورا کرلیا اور اب اس میدان کے اندر اکٹھے ہوئے ہیں اور مجھ سے مغفرت چاہنے کے لئے آئے ہیں، اپنی مرادیں مانگ رہے ہیں، میں اپنی عزت وجلال کی قسم کھاتا ہوں، اپنے علو مکان کی قسم کھاتا ہوں کہ آج میں سب کی دعائیں قبول کروں گا اور ان کے گناہوں کی مغفرت کر دوں گا اور ان کی برائیوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دوں گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب روزہ دار عیدگاہ سے واپس جاتے ہیں تو اس حالت میں ہوتے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔

''عیدین'' کی نماز عیدگاہ میں ادا کی جائے:

یہ معمولی انعام نہیں ہے کہ رب کریم پورے مجمع کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی نماز کے لئے اس بات کو سنت قرار دیا کہ مسلمان بڑی سے بڑی تعداد میں کھلے میدان میں آسمان کے نیچے جمع ہوں اور مجمع کثیر ہو، کیونکہ مجمع جب بڑا ہوگا اس مجمع میں نہ جانے کس اللہ کے بندے کی برکت بندگی سے اللہ تعالیٰ پورے مجمع عام پر رحمت کی بارش فرمادے۔ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی و کریمی تو دیکھئے کہ اگرچہ انعام کے مستحق چند ہی افراد ہوتے ہیں جنھوں نے صحیح معنی میں اللہ کی بندگی کی تھی،

لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو مجھ جیسے ناکارہ اور گناہوں سے لت پت بھی اگر وہاں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ ان چند افراد کی تو مغفرت کر دوں اور باقی لوگوں کی نہ کروں، یہ میری رحمت سے بعید ہے، لہٰذا سب کو اپنے فضل وکرم سے مغفرت فرما دیتے ہیں۔

یہ چند اقتباسات ''اصلاحی خطبات'' (مصنف مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی) سے برائے استفادہ عامۃ المسلمین سے لئے گئے ہیں۔

۞ ۞ ۞

باب سوم

اداریے

مسلم پرسنل لاء بورڈ: دین متین کا نگہبان

ہندوستان کے جمہوری نظام میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس بات کی دستوری اجازت حاصل ہے کہ وہ شرعی قوانین پر عمل پیرا ہوں اور اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ عائلی مسائل کے تعلق سے مسلمان جملہ حقوق کی بازیابی بھی شرعی اصولوں کی روشنی میں کریں، لیکن کبھی عدالتوں میں اور کبھی ایوانوں میں مسلم پرسنل لاء پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ شرعی قوانین پر تیشہ زنی کبھی اسلامی قوانین سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوتی ہے اور کبھی محض بغض وعناد کی بنیاد پر۔ ہر دو حالت میں ہونے والے فیصلوں سے مسلمانوں کو شدید اذیت پہنچتی ہے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قوانین کو نہ کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بدلا جاسکتا ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ شرعی اصول وکلیہ کی روشنی میں اجتہادی موشگافیوں کا بھی اختیار علماء محققین کو ہی ہے نہ کہ شریعت سے ناواقف عدالتوں کے ججوں کو۔

مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی تحریک کو 1972 میں ہندوستان کے علماء وقائدین نے تیز کیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا، اس

کے بعد سے اب تک مسلم پرسنل لاء بورڈ تحفظ دین متین کے نگہبان کے طور پر سرگرم عمل ہے، بدقسمتی کی بات ہے کہ وطن عزیز میں آئے دن شرعی اصولوں پر سوالات کھڑے کیے جانے کا سلسلہ جاری ہے اور ان عناصر کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی ہے کہ قوانین اسلامیہ میں نقص نکالا جائے اور اسے موجودہ عہد کے لیے ناقابل عمل قرار دیا جائے، لیکن علماء اسلام جس طرح ماضی میں اسلام کو مٹانے والی ہر طاقت سے ٹکراتے رہے ہیں اسی طرح وہ آج بھی کسی ایسی کوشش کو سبوتاژ کردینے کے لیے تیار ہیں جو شریعت کے خلاف ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اولین صدر اور علمائے امت کے سرخیل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے فرمایا تھا کہ:

''اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی، وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے، بلکہ روایت ودرایت کے لحاظ سے اس کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔ مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں، اگر ہیں تو وقت کی دھارے سے ادلتی بدلتی رہتی ہیں، لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں، زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں۔''

حضرت حکیم الاسلامؒ ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے، بلکہ دوربین سے دیکھیے یا خوردبین سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھیے۔''

مسلم پرسنل لاء پر حملے ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں، لیکن امت نے اجتماعیت واتحاد سے ایسی سبھی کوششوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا ہے، تاہم ملک کے طول وعرض میں قائم مختلف سطح کی عدالتوں میں آئے دن ایسے فیصلے ہوتے رہتے ہیں جو شرعی اصولوں سے متصادم ہوں۔ دوسری طرف کچھ اسلام مخالف طاقتیں عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی یہ مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ اسلامی اصولوں میں سختی ہے، عدم رواداری ہے، بنیاد پرستی ہے، عورتوں پر طرح طرح کی پابندی ہے، اس لیے اس میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں علماء امت کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ثابت کریں کہ اسلامی قوانین ہر عہد اور حالات کے لیے یکساں مفید اور عملی بنیادوں پر ہیں۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ سے وابستہ علماء نے اسلامی قوانین سے بھی لوگوں کو واقف کرایا ہے اور معترضین کو بھی خاموش کیا ہے، لیکن قابل توجہ امر یہ ہے کہ ہر روز معاندین ومخالفین نئے نئے جال لے کر آتے ہیں اور اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ اس کے لیے مسلم پرسنل لاء بورڈ کو بھی چوکس وچوکنا رہنا ہوگا خاص طور پر روشن خیال عوام کو وہ کہیں ان کے جال میں نہ پھنس جائیں۔

یہ ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کو خطرہ ان روشن خیال مسلم دانشوروں سے بھی ہے جو شریعت کا گہرا علم تو نہیں رکھتے، لیکن معاندین کے اعتراضات کی رو میں بہہ کر شرعی اصولوں پر ہی تنقید کرنے لگتے ہیں اور شریعت میں غیر ضروری اجتہاد کو ناگزیر قرار دیتے ہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو ہر زمانہ میں علماء پر تنقید کرتا رہا ہے اور شرعی اصولوں کو فرسودہ ثابت کرتا رہا ہے۔ ایسے حالات میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی جدوجہد کرنا ضروری ہے۔

معارف قاسم جدید کا خصوصی شمارہ ''مسلم پرسنل لاء نمبر'' قارئین کی خدمت میں

پیش ہے۔اس میں مسلم پرسنل لاء کی حقیقت پر وقیع مضامین اور مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی مختلف تجاویز پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس شمارہ میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے وہ دراصل آج کے ہندوستان کا جلتے ہوئے موضوعات ہے۔افسوس کی بات ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی ضمانت تو دستوری طور پر حاصل ہے لیکن جب عائلی مسائل کے حل کے لئے دارالقضاء کو تسلیم کرنے کی بات آتی ہے تو اس بات پر واویلا مچ جاتا ہے کہ متوازی عدالتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حکومت کاغذی طور پر حقوق تو دینا چاہتی ہے، لیکن جب اس کی عملی شکل پیش کی جاتی ہے تو اسے نامنظور کردیا جاتا ہے۔معارف قاسم کے خصوصی شمارے میں ان موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہم نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بہت وسیع اور نہایت ہی ہمہ گیر ہے، ظاہر ہے ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہم نے موضوع کا مکمل احاطہ کرلیا ہے، تاہم اس موضوع کو علماء اور دانشوروں کے غور وفکر کا ایجنڈا بنانے کی سمت میں یہ ایک چھوٹی سی مگر مستحکم کوشش ضرور ہے۔

مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام: اصل کھیل کیا ہے؟

حج بیت اللہ کی سعادت جسے نصیب ہوجائے اسے دنیا میں بھلا اور کس چیز کی تمنا ہوسکتی ہے۔ایک حقیر انسان کیلئے عزت وشرف کی بات ہے کہ خالق کائنات اس کو جائز اور شرعی طریقے سے اپنی چوکھٹ پر بلائے، بلدامین اس کی میزبانی کرے۔بندہ تو اپنے رب کا ہر لمحہ محتاج ہے۔پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک رب کریم اس کی کفالت کرتا ہے، مگر اپنے گھر بلاکر جو ضیافت فرماتا ہے اس کا کوئی بدل ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ گناہوں کا بوجھ لے کر جانے والے عازمین مغفرت کی بیش بہا سوغات لے کر واپس ہوتے ہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے: ”جس نے حج کیا اور فحش کلامی نہیں کی اور بدعملی سے بچا تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جیسے پیدائش والے دن بچہ“۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

”میرے فرشتو! میرے ان بندوں کو دیکھو پراگندہ بال، غبار آلود اور دھوپ میں آئے ہیں میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ انہیں بخش دیا“۔اللہ تبارک وتعالیٰ تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کے حج کو شرف قبولیت سے نوازے (آمین)

معزز قارئین! دینی مدارس کی شناخت مٹانے کی ناپاک کوشش دشمنان دین و اسلام ہر زمانے میں کرتے رہے ہیں۔ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ امت محمدیہ کو صراط مستقیم سے ہٹانے اور اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ان کا غلیظ اور خطرناک مشن دینی مدارس جو مذہب اسلام کے قلعے ہیں کا خاتمہ کیے بغیر کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے معاندین اسلام، دینی اداروں بالخصوص مدارس کو اپنی بیجا تنقید کا نشانہ بنا کر دنیا کے سامنے انہیں دہشت گردی کا اڈہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کی یہ تحریک بھارت میں بھی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت چل رہی ہے۔ بدقسمتی سے ملک عزیز کی کئی شدت پسند تنظیمیں انہیں بھرپور تعاون دے رہی ہیں، جس کی وجہ سے ملک کے خاص طبقہ کے ذہن کو مدارس کے تعلق سے تبدیل کرنے میں یہ کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ ایسی منفی سوچ کے حامل افراد میں سرکاری افسران کے ساتھ اعلیٰ رہنما بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ مرکزی وزیر قانون ویرپا موئلی نے اپنی ایک رپورٹ میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کو نشانہ بنایا تھا۔ اس طرح کے خیالات بہت سے رہنماؤں کے ہیں کہ مدارس میں امن و شانتی نہیں تشدد کی تعلیم دی جاتی ہے اس لئے ان کے بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس خاص سوچ اور سازش کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ملک کے لیڈران ایک مرکزی مدرسہ بورڈ بنانا چاہتے ہیں تا کہ ان کا یہ مشن بہر صورت کامیاب ہو جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت بھی چند میر جعفر کی حمایت انہیں حاصل ہے جن کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ ایک تیر سے دو نشانہ سادھنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی ڈگر پر لانے کے لئے ان کی نظر میں مدارس میں تبدیلی وقت کا سب سے اہم ترین تقاضا ہے جس کے بغیر مسلم بچوں کی تعلیمی پسماندگی دور نہیں ہوسکتی۔ اس کوشش کے پیچھے کی سچائی یہی ہے کہ مدارس کی روح کو کسی بھی طرح سے ختم کر دیا جائے

تا کہ یہاں کے دینی مدارس کا بھی وہی حشر ہو جو ان ممالک میں ہوا جہاں حکومت کی مداخلت یا سرکاری بورڈ قائم ہیں۔

ماہنامہ معارف قاسم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ملک کے حساس ترین مسائل اور موضوعات پر علماء، اہل علم اور دانشوران قوم کے جو خیالات ہیں ان سے پوری قوم کو واقف کرایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اب تک متعدد خصوصی شمارے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ یہ شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت مدرسہ بورڈ کے قیام کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ اس کے پیچھے کی سچائی کیا ہے؟ اس سے پردہ ہٹانے کیلئے یہ خصوصی شمارہ ترتیب دیا گیا ہے۔ چونکہ موقع حج بیت اللہ کا ہے اس لئے اس اہم دینی فریضہ کے تعلق سے بھی کئی معیاری مضامین کو شامل کیا گیا ہے تا کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس طرح یہ شمارہ حج اور مدارس نمبر پر مشتمل ہے۔ ہمیں اس کام میں کس حد تک کامیابی ملی ہے اس کا فیصلہ آپ حضرات پر چھوڑتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری اس حقیری کوشش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

قادیانیوں کو ایک اور بڑی ناکامی

سال گزشتہ کے اختتام سے چند دنوں قبل (مؤرخہ ۲۶؍دسمبر ۲۰۰۹ء) قادیانیوں کی سالانہ تقریب میں ہندوستان کے وزیر خزانہ جناب پرنب مکھرجی کی شرکت کی خبر کا قادیانیوں نے بڑے زوروشور سے پرچار کیا۔ ظاہر ہے اگر اس تقریب میں وزیر موصوف شریک ہوتے تو یہ ان کی بڑی کامیابی ہوتی۔ یہ لوگ فخریہ بطور سند کے اپنے حواریوں میں ڈھنڈورہ پیٹتے کہ اب ہندوستان میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر مسلمانوں نے متحد ہو کر قادیانیت کی پول کھول دی اور مختلف ذرائع سے پرنب مکھرجی تک یہ بات پہنچائی کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔ صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کی نظر میں قادیانی کافر اور غیر مسلم ہیں، اس لیے وہ قادیانیوں کی سالانہ تقریب میں شرکت کرنے سے گریز کریں۔ اگر انہوں نے قادیان جانے کی حماقت کی تو ان کے اس اقدام سے ملک کے تقریباً 30 کروڑ مسلمانوں کی دلآزاری ہوگی۔ اس دوران مسلمانوں نے شدید مخالفت کی اور بڑے پیانے پر احتجاج و مظاہرہ کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر خزانہ نے مسلمانوں کی شدید مخالفت کے پیش نظر قادیان جانے کا اپنا ارادہ ترک کر دیا اور

گستاخ رسول ملعون قادیانیوں کو اس طرح سے ایک اور ناکامی ہاتھ آئی۔ مسلمانوں کیلئے یہ اطلاع انتہائی خوش کن تھی اس لئے انہوں نے وزیر خزانہ کے اقدام کا خیر مقدم اور کانگریس رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ در پردہ مسلمان اور اسلام دشمن افراد قادیانیوں کی حمایت کر رہے ہیں جیسا کہ پنجاب سے شائع ہونے والا اخبار ''ہند سماچار'' مسلمانوں کے ذریعہ احتجاج اور مظاہرہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے قادیانیوں کی حمایت پر آمادہ تھا۔ مذکورہ اخبار نے جب انتہا کر دی تو مقامی مسلمانوں نے اسے مذہب اسلام میں مداخلت قرار دیا اور اس کی کاپی نذر آتش کی۔ اس دوران جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ کے اساتذہ و اراکین جو بہار میں (تحریک تحفظ ختم نبوت کی مسلسل مہم چلا رہے ہیں اور بے خوف وخطر قادیانیوں کا تعاقب کر رہے ہیں) نے بھی وزیر موصوف کو قادیان جانے سے روکنے کیلئے کانگریس صدر محترمہ سونیا گاندھی اور جنرل سکریٹری راہل گاندھی سے درخواست کی کہ وہ وزیر موصوف کے اقدام پر سخت نوٹس لیں اور انہیں قادیان جانے سے منع کریں۔ انہوں نے ان لیڈران کو باخبر کرایا کہ قادیانی فتنہ کا بانی مرزا غلام احمد ناموس رسالت کا بدترین دشمن ہے اور قادیانی اسلام کے نام پر ان عقائد کی ترویج واشاعت کرتے ہیں جن کا اسلام سے دور تک کا واسطہ نہیں۔ وہ لوگ ہمیشہ اپنے قول وعمل کے اعتبار سے اہل اسلام کی نظر میں غیر مسلم رہے اور اپنے سیاہ کارناموں کے ذریعہ مذہب اسلام کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ ایسے میں ملک کے ایک باوقار رہنما کا غدار وطن کی تقریب میں شرکت کرنا سراسر غیر مناسب ہے۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ پوری دنیا کے مسلمان تحفظ ختم نبوت کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کر سکتے ہیں مگر ختم نبوتؐ پر غلط نظر رکھنے والے لوگوں کو کبھی نہیں معاف کر سکتے۔ امت محمدیہؐ کیلئے ناموس رسالت کا تحفظ جذبۂ ایمانی کا حصہ ہی نہیں بلکہ اہم دینی فریضہ بھی ہے۔ اس ذمہ داری سے خلاصی کسی بھی

قیمت پر ممکن نہیں۔ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے اراکین و مخلصین الحمدللہ قادیانیوں کے سد باب کی مہم میں ہمارے ساتھ ہیں اور ان کے تعاون اور دعاؤں کی وجہ سے ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ حالانکہ قادیانیوں اور ان کے حواریوں کی طرف سے ہمیں ڈرانے اور دھمکانے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، مگر ہم نے بھی تہیہ کرلیا ہے کہ آخری دم تک ناموس رسالتؐ کی حفاظت کریں گے اور ختم نبوتؐ کے دشمنوں سے آخری سانس تک ہماری جنگ جاری رہے گی۔ (انشاءاللہ)

قادیانیوں کی شرانگیزی اور ہماری بے حسی

قادیانیوں کی شرانگیزی میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے مگر تحفظ ختم نبوت کا دم بھرنے والے ہمارے علماء کرام ہاتھ پر ہاتھ رکھے کسی معجزہ کے منتظر ہیں۔ معلوم نہیں ہماری غیرت وحمیت کب جاگے گی؟ نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرمٹنے کا دعویٰ کرکے سیاست کی روٹی سینکنے والے عشاق کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، ان کی بولتی بند ہے۔ کفر اور اسلام کی دکان چلانے والے ان عاشقان کی بے حسی کا یہی حشر رہا تو رحمۃ للعالمینؐ اور اسلام کے بدترین دشمن قادیانی اپنے زہریلے تیر سے ہمارے جسم وروح کو چھلنی کرتے رہیں گے اور اس اہم فریضہ سے عدم توجہی و بے اعتنائی کے سبب ہماری جگ ہنسائی ہوتی رہے گی۔

قادیانیوں کی ایک اور گستاخی اور شرانگیزی کا پردہ فاش کرنے سے قبل قارئین کو بتادیں کہ امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ جماعت جن کو اصحاب رسولؐ کے مقدس اور محترم لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے معزز ومکرم ہیں، اس مقام و

مرتبہ تک نہ کوئی پہنچ سکا ہے اور نہ ہی کوئی پہنچ سکتا ہے۔

”صحابۂ کرامؓ اپنے بعد آنے والے تمام ہی (طبقوں) سے افضل ہیں۔“ (الاصابہ)

ان اصحابؓ میں بھی سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درجہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”اس امت میں نبی کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات سے متعلق یہ روایت کافی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت بلالؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا ابوبکر صدیقؓ کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: یا رسول اللہ! حضرت ابوبکر صدیقؓ تو بہت غمزدہ ہیں جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں تک آواز نہیں پہنچ سکے گی یا لوگ ان کی آواز نہ سن سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار بھی یہی حکم دیا کہ ابوبکر صدیقؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ کے پاس گئیں اور کہنے لگیں کہ تم ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہو کہ ابوبکر صدیقؓ تو بہت غمزدہ ہیں اگر آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگ ان کی آواز نہ سن سکیں گے اس لیے آپ عمر بن الخطابؓ کو حکم دیتے تو ٹھیک تھا۔ حضرت حفصہؓ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور حضرت عائشہؓ کی تجویز کے مطابق عرض فرمایا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا تم سب کی سب یوسفؑ کی ساتھی ہو (برادران یوسفؑ) پھر تیسری مرتبہ فرمایا ابوبکر صدیقؓ کو حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

صحابۂ کرامؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سب سے افضل سمجھتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت موجود

ہے ”ہم لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے برابر یا مقابل کسی اور کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ پھر عثمان غنیؓ پھر حضرت علیؓ اور ان کے بعد دیگر صحابۂ کرامؓ“۔ یہی عقیدہ امت مسلمہ کا ہے، مگر قادیانیوں کی جرأت دیکھیں کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھیوں کو صحابہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں قادینیوں کی سالانہ تقریب سے متعلق جو اشتہار شائع ہوا ہے اس کو بطور نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ اشتہار 26,27 اور 28 دسمبر 2009 کو قادیان میں ہونے والے پروگرام کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ پروگرام کی فہرست میں 8/ پر یہ عبارت تحریر ہے کہ:

” سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم (سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وسیدنا حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ“

قادیانیوں کی اس ذلیل ترین حرکت پر کسی بھی اہل ایمان کا خون کھول اٹھے گا۔ مرزائیوں کے باطل عقیدہ سے عامۃ المسلمین کو باخبر نہ کرنا اور اسے یوں ہی نظرانداز کر دینا اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نام کے ساتھ حکیم نورالدین کا نام لکھ کر قادیانی نے خطرناک پیغام دیا ہے اس پر تمام امت مسلمہ کے علماء ودانشوران کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کیونکہ بسا اوقات جن باتوں کو ہم مصلحت سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں وہ باتیں کبھی کبھی خطرناک مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”جو میرے صحابہؓ سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ گویا مجھ سے بغض رکھتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبت کرے اور یہ ایمان والوں کے لئے ممکن نہیں کہ ان سے محبت نہ

کریں‘‘۔(خلاصہ عقیدۃ الطحاوی)

آخری بات:

قادیانی اپنے باطل عقیدہ کے تحت اپنے دین ومذہب کا نام الگ رکھ لیں اور دیگر مذاہب کی طرح اس گمراہ کن مذہب (فتنہ قادیانی) کی تشہیر کریں تو کسی کو بھی اعتراض کا حق حاصل نہیں ہوگا مگر اسلامی اصطلاحات کا استعمال قادیانیت کی تبلیغ کے لئے ہو یہ قطعی ناقابل برداشت ہے۔ چونکہ قادیانی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں اس لئے ہم مرزائیوں کی اسلام اور انسانیت مخالف سرگرمیوں کو ہرگز کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

انشاء اللہ العزیز

❁ ❁ ❁

اپنے کعبہ کی حفاظت.....

اپنے کعبہ کی حفاظت تمہیں خود کرنی ہے
اب ابابیل کا لشکر نہیں آنے والا

جب ۵۷۰ءیا ۵۷۱ء میں یمن کا بادشاہ ابرہہ ۶۰/ہزار فوج اور دودرجن سے زائد ہاتھی لے کر خانہ کعبہ پرحملہ کی غرض سے روانہ ہوا تو حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق مقام ’الصِّفاح‘ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد محترم عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لیکر آپ کے پاس حاضر ہوجاتے۔ابرہہ نے کہا میں نے سنا ہے کہ یہ ’امن‘ کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ جناب عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے اور آج تک اس نے کسی کو اپنے گھر پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ابرہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کئے بغیر واپس نہیں ہوں گے۔عبدالمطلب نے کہا کہ آپ جو چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں مگر اس نے انکار کردیا اور اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، ابرہہ کی لشکرگاہ سے واپس آکر عبدالمطلب نے اہل قریش سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر

چلے جاؤ تا کہ ان کا قتل عام نہ ہو، پھر عبدالمطلب چند سرداران قریش کے ساتھ حرم میں حاضر ہوئے اور کعبہ کے دروازہ کا کنڈا پکڑ کر دعائیں مانگیں۔اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے مگر ان سرداروں نے صرف خدائے واحد کے سامنے دست سوال دراز کیا۔

یاربّ لا ارجو لھم سواکا
یا ربّ فامنع منھم حماکا
ان عدو البیت من عاداکا
امنعھم ان یخربو اقراکا

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی پہاڑوں پر چلے گئے۔جبکہ محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق ابرہہ کا لشکر قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے بھی دوسو اونٹ تھے۔اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور اہل مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا۔اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہل مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔مکے کے سب سے بڑے سردار اس وقت عبدالمطلب تھے۔ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں، وہ اس پر راضی ہوگئے۔عبدالمطلب اِس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ ان کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا، پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ واپس دے دیے جائیں۔ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا، مگر اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرادیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کررہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے آبائی دین کا مرجع ہے، اِس کے بارے میں

کچھ نہیں کہتے۔انہوں نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور اُنھی کے بارے میں درخواست کررہا ہوں۔رہا یہ گھر، تو اس کا ایک رب ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرلے گا۔ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔عبدالمطلب نے کہا آپ جانیں اور وہ جانے۔یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اٹھ آئے اور اس نے ان کے اونٹ واپس کردیے۔دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا، مگر اس کا خاص ہاتھیؔ محمودؔ جو آگے تھا یکایک بیٹھ گیا، اس کو بہت تبر مارے گئے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، جب اسے جنوب، شمال اور مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا۔اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لئے ہوئے آئے اور لشکر پر سنگریزوں کی بارش کردی۔جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہوجاتا۔محمد بن اسحاق اور حضرت عکرمہؓ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلاد عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہوجاتی اور کھجاتے ہی جلد (چمڑی) پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہوجاتا، خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گررہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گرگر کر مرتے رہے، ابرہہ بھی ہلاک ہوگیا۔تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے ان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم کردیا اور واقعہ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔

قارئین کرام! اس واقعہ کی یاد دہانی کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ 6 دسمبر 1992ء میں ملک کی شان تاریخی بابری مسجد ہندو شدت پسندوں کے ذریعہ شہید کردی

گئی۔ پوری دنیا نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھا۔ ہم اس وقت اتنے بے یارومددگار تھے کہ کچھ نہیں کر سکے۔ بالکل چپ رہے، خاموش احتجاج کیا۔ مگر دنیا نے اس واقعہ کی شدید مذمت کی۔ اس وقت ہم نے بھی خوب دعائیں مانگیں، رو، روکر بارگاہ ایزدی میں التجا کی مگر ہماری دعاؤں میں کوئی اثر نہیں، کیا کبھی ہم نے اس بات پر بہت سنجیدگی سے غور کیا کہ خدائے پاک نے ہماری ایک نہ سنی، ہمیں دشمنوں کے ہاتھوں ذلیل ورسوا کیا؟ اہل قریش تو ۳۶۰ بتوں کی پوجا کرتے تھے پھر بھی انہوں نے خدا سے مدد مانگی، اللہ نے ان کی بھرپور مدد کی اور اصحاب فیل کو تہس نہس کر دیا، لیکن ہماری رسوائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ۳۰ رستمبر ۲۰۱۰ء کو بابری مسجد ملکیت کا جو فیصلہ الٰہ آباد ہائی کورٹ نے سنایا وہ تاریخ پر بدنما داغ ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہمیں وہاں بھی ناکامی اور نامرادی ہاتھ آئی۔ اس کی اہم وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہمارے اندر نہ وہ ایمانی قوت ہے اور نہ خلوص وللّٰہیت، ہماری قوم میں ایمان فروشوں، دلالوں اور مذہب کا سودا کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اس لئے ہمیں ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر قوم نے اب بھی ہوش کے ناخن نہیں لئے تو بقول علامہ اقبالؒ ؎

تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

پیارے دوستو! نبی آخر الزماں محمد ﷺ سے قبل اگر کسی نبی اور رسول کو سخت سے سخت ابتلاء وآزمائش سے گزرنا پڑا ہے تو وہ آپ ﷺ کے جد امجد سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی ذات گرامی ہے۔ آپ کی پوری زندگی ابتلاء وآزمائش سے لبریز اور آپ کی زیست مبارک کا اکثر وبیشتر حصہ مصائب وآلام میں گھرا ہوا ہے۔ محبوب بارگاہ الٰہی کے ساتھ خدائے پاک کا معاملہ دیگر تمام انسانوں جیسا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کو امتحان وآزمائش کی سخت ترین راہوں سے گزرنا پڑتا ہے، جیسا کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

''ہم جماعت انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔''

حضرت ابراہیمؑ ایک جلیل القدر پیغمبر تھے، اس وجہ سے آپ کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن آپ ہر امتحان میں کامیاب وکامران ہوتے گئے۔ اس وقت بھی جب بادشاہ وقت نمرود نے آگ میں ڈالنے کا حکم دیا، آپ ثابت قدم رہے اور صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پھر جب خالق کائنات نے حضرت ہاجرہؓ کو حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ فاران کے بیابان میں چھوڑ کر آنے کا حکم دیا تو آپ نے بخوشی اس حکم کی تعمیل فرمائی۔ کتنی سخت اور جانکاہ آزمائش کی گھڑی تھی۔ اپنے بڑھاپے اور پیری کے سہارا، رات ودن کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے اکلوتے چشم وچراغ حضرت اسماعیلؑ کو صرف اور صرف حکم الٰہی کی تعمیل وامتثال میں ایک بے آب وگیاہ صحرا میں چھوڑ آئے اور پھر ان کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ شاید کہیں شفقت پدری جوش میں آجائے اور تکمیل امر الٰہی میں کوئی لغزش واقع ہو۔ ان سب مراحل کو عبور کرنے کے بعد ایک اور امتحان جو سب سے زیادہ زہر گزار اور جاں گسل تھا وہ ابھی باقی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے مسلسل تین شب خواب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابراہیمؑ! تم ہماری راہ میں اپنے لاڈلے بیٹے کی قربانی دو۔ انبیاء کا خواب رویاء صادقہ اور وحی الٰہی ہوتا ہے۔ اس لیے آپ رضا وتسلیم کا پیکر بن کر تیار ہوگئے، مگر یہ معاملہ محض آپ کی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ اس امتحان کا دوسرا جزو وہ بیٹا تھا، جس کو راہِ خدا میں قربان کرنا تھا۔ اس لیے آپ نے خواب اور فیصلۂ خداوندی سے اپنے فرزند کو آگاہ کیا۔ حضرت اسماعیلؑ نے بھی فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور کہا اگر خدا کا یہی حکم ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔ اس کے بعد سیدنا حضرت ابراہیمؑ بیٹے کی قربانی پیش کرنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ مقام مخصوص پر پہنچ کر انہوں نے مذبوح

جانور کی طرح حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھ پیر باندھ کر چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے۔

فوراً خدا کی طرف سے وحی کا نزول ہوا۔ اے ابراہیمؑ! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بیشک یہ بڑی سخت اور کٹھن آزمائش تھی مگر تم نے اسے سچ کر دکھایا۔ اب تم ننھے اسماعیلؑ کی جگہ اس مینڈھے کو قربان کرو، ہم نیک لوگوں کو اسی طرح نوازتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا شکریہ ادا کیا اور وہاں پر موجود مینڈھے کو راہ خدا میں ذبح کیا۔ یہ قربانی بارگاہ الٰہی میں ایسی مقبول اور معظم ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی اسی تاریخ (دس ذی الحجہ) کو عالم اسلام میں کی جاتی ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اسی جذبۂ صادق کے ساتھ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

روشن خیالی-ایک ناسور

۴/جنوری ۲۰۱۱ء کو پڑوسی ملک پاکستان میں ایک عبرت انگیز واقعہ اس وقت پیش آیا جب صوبہ پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کا اسلام آباد میں ایک سیکورٹی اہلکار ممتاز حسین قادری نے قتل کر دیا۔ اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے قادری نے کہا کہ اس نے یہ حملہ صرف اس لئے کیا کہ گورنر پنجاب نے ناموس رسالتؐ قانون کو ایک ''سیاہ قانون'' کہا تھا اور میں غلام مصطفیؐ ہوں اس بات کو کیسے برداشت کرتا کہ کوئی آقائے نامدار کی شان میں گستاخی کرے اور میں تحفظ ختم نبوت کیلئے کچھ نہ کروں۔ قابل استعجاب امر یہ ہے کہ دینی تعلیم سے بے رغبتی اور روشن خیالی کے زعم میں اعلیٰ طبقہ کے مسلمان بھی ختم نبوت پر بیان بازی کرنے لگے ہیں۔ ایک معروف صحافی کے بقول ''ہمارے ایک شناسا کا انتقال ہوا، ان کی تدفین میں شرکت کے لئے کئی صاحب آئے تھے، کسی صاحب نے قریب بیٹھے ایک مولوی سے دریافت کیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ختم نبوت کا مسئلہ آخر ایسا شدید ہے کہ ملاّ، لوگوں کو ایمان سے خارج کر دیتے ہیں، کہیں ان کا یہ سیاسی ایجنڈہ تو نہیں؟ مولانا نے کہا! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ختم نبوت پر ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا، یہ تو اللہ کا حکم

ہے۔کیا کسی مسلمان سے اس قسم کے سوال کی توقع کی جاسکتی ہے جبکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی، قرآن آخری کتاب ہے اور اس پر ایمان لانے والا ہی مسلمان کہلاتا ہے‘‘۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں، اس پر حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا جو شخص اس سے نبوت کی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے درمیان ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں جو اسلام کے بنیادی عقائد کو بلا جھجک ملاّ اور مولوی کی بات کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔

مملکت خداداد پاکستان میں جہاں اہانت رسولؐ کے مرتکب کی سزا موت ہے وہاں اس قسم کے واقعات کا ظہور حیرت کی بات ہے۔ختم نبوت کا عقیدہ اور رسالت مآبؐ سے حد درجہ وارفتگی اور عقیدت ومحبت کو صرف مولوی، ملاؤں کے ساتھ وابستہ کرنے کا جرم کرنے والے روشن خیال لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وناموس کا تحفظ اور حرمت کے ابدی سفر کا آغاز عہد رسالتؐ میں صحابۂ کرامؓ سے شروع ہوا تو آج تک جاری ہے، محبوب کبریاؐ سے عقیدت ومحبت کی یہ قابل افتخار میراث امت محمدیہؐ کو صحابۂ کرامؓ سے ملی، محبت ہی ادب وتوقیر سکھاتی ہے اور محبت ہی اتباع و اطاعت پر آمادہ کرتی ہے۔

عروہ بن مسعود ثقفی کو قریش مکہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنا سفیر مقرر کر کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا، اسے سمجھایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے حالات کو غور سے دیکھے اور قوم کو آگاہ کرے۔عروہ نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے ہیں تو بقیہ آب وضو پر صحابہؓ یوں گرتے ہیں گویا ابھی لڑ پڑیں گے، مستعمل پانی کو زمین پر گرنے نہیں دیتے، وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پر ہی روک لیا جاتا ہے، جسے وہ منہ پر مل

لیتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ عمل کیلئے دوڑ پڑتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔عروہ نے یہ سب کچھ دیکھا اور قوم سے آ کر یوں بیان کیا۔لوگو! میں نے کسریٰ کا دربار بھی دیکھا اور قیصر کا دربار بھی، نجاشی کا دربار بھی دیکھا مگر اصحاب محمد جو تعظیم محمدؐ کی کرتے ہیں وہ تو کسی بادشاہ کو بھی اپنے دربار اور ملک میں حاصل نہیں۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ومحبت کی یہ قابل افتخار میراث آج بھی مسلمانوں کا سرمایۂ ایمان ہے۔جاں نثاری کا یہ سفر انشاء اللہ آخری ساعتوں تک جاری، ناموس رسالت پر پروانہ وار قربان ہونے کا جذبہ اہل ایمان کی دھڑکن بن کر تا قیامت سلامت رہے گا۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ جب عالم انسانیت کا عام فرد انسان ہونے کے سبب احترام وتکریم کا مستحق ہے تو ایک ارب چالیس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کے حاکم اور عالم انسانیت کے ہادی نبی آخر واعظم، اس احترام انسانیت کے بدرجہا مستحق ہیں۔اس لئے آپؐ کا احترام پوری انسانیت کا احترام ہے اور نعوذ باللہ آپؐ کی شان اقدس میں توہین پوری انسانیت کی توہین اور احترام وتکریم کے منافی عمل ہے۔اس لئے روشن خیال اور ملحدانہ فکر کے حامل لوگوں کو بیان بازی سے حد درجہ اجتناب کی ضرورت ہے کہ تحفظ ناموس رسالت کے پروانوں کی جاں نثاری کا باب نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہوگا۔

نہ جب تک کٹ مروں خواجۂ طیبہؐ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

یہ بانگ درا فرزانوں کی!

"لَبَّیکَ اللّٰھُمّ لَبَّیک، لَبَّیک لا شَرِیکَ لک لَبَّیک اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَۃَلَکَ وَالْمُلْک لاَ شَرِیْک لک"

فرزندان توحید کے 'لبیک' کی صدائے روح پرور نہ صرف عازمین حج کے دل ودماغ کو معرفت کی بلندی کی جانب لے جاتی ہے بلکہ یہ عامۃ المسلمین کی زندگی کے لیے انقلاب آفریں مژدۂ جاں فزا بن جاتی ہے۔

عیدالاضحیٰ کی دستک کی آہٹ ملتے ہی دنیائے انسانیت کی بہت ساری یادیں، تاریخی واقعات اور دلوں کو چھو لینے والی انگڑائیاں ذہن ودماغ میں موجزن ہونے لگتی ہیں۔ عشق ووفا میں ڈوبی ہوئی صدائے لبیک کی بازگشت ہونے لگتی ہے۔ ملت اسلامیہ کے جیالوں اور توحید کے متوالوں کی اجتماعیت کا دلکش منظر ذہن میں آنے لگتا ہے، حج بیت اللہ کا یہ روح پرور اجتماع ہر سال آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ اس فانی دنیا میں قربانی دینے والوں کی ایمان افروز خوشبوئیں چہار سو پھیلتی رہتی ہیں، ایسے مواقع پر ایثار وقربانی کا جیتا جاگتا احساس دل نشیں پیرائے کو جلا بخشتا ہے جب کہ انہی ایام میں حجاز مقدس کی وہ عظیم تاریخی حقیقت بار

بار ابھرتی ہے۔

اے عالم انسانیت کے لوگو! یاد کرو کہ جب وادیٔ بطحا کی سنگلاخ زمین جس کو قرآن الکریم نے بے آب وگیاہ کہا ہے، جہاں آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل سیدنا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اپنی شریک حیات اور اپنے شیر خوار معصوم کو اللہ رب العزت کے حوالے کر کے رخت سفر باندھا تھا۔ آپ کی فرشتہ صفت شریک سفر کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ یہی حکم ربانی ہے، تو وہ بھی سر تسلیم خم کرتی ہیں اور فرماتی ہیں جس رب کریم کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے، انشاء اللہ وہ یقیناً ہمیں کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ دشت وجبل کے دامن میں اس صدق ورضا کی تنہائی اور دشواری وکسمپرسی کی حالت یقیناً قابل دید ہی نہیں بلکہ تاریخ انسانیت میں قابل صد رشک بھی ہے۔ عربی کے ایک عظیم شاعر نے اس کا نقشہ اپنے شعر میں اس طرح کھینچا ہے:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
أنیس ولم یسمر بمکۃ سامر

(ایسا لگتا ہے کہ حجون سے لیکر صفا پہاڑی تک نہ کوئی میرا غمگسار تھا اور نہ مکۃ المکرّمہ کی تنہائی کی راتوں میں میرے ساتھ کوئی دل بہلانے والا اور باتیں کرنے والا تھا)

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے لخت جگر کی پیاس کی شدت وبے تابی نے ماں کے ٹوٹے ہوئے کو غم کو مزید اضطراب وبے چینی میں مبتلا کر دیا تھا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے اپنے جگر کے ٹکڑے کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی، تو آپ کوہ صفا ومروہ کے درمیان دیوانگی کی حالت میں دوڑتیں، یہاں تک کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی کی فکر ہونے لگی لیکن سیدنا اسماعیلؑ کی پیاس بجھانے کے لئے اللہ رب کریم کا کچھ اور ہی فیصلہ ہونا تھا۔ خالق کائنات کو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی یہ دوڑ دھوپ اور تڑپنا اتنا پسند آیا کہ

صدیوں سے پڑی اس بنجر زمین میں پانی کا سرچشمۂ حیات جاری کر دیا، اسی کو آج اہل ایمان آب زم زم کہتے ہیں۔ اللہ نے اس زم زم کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ ایک منٹ میں چھ سو ساٹھ لیٹر نکلنے والا آب زم زم اپنی ابتدا سے لے کر آج تک رواں دواں ہے۔ اس کا حال اللہ ہی کے علم میں ہے کہ ایک ساعت میں دنیا سے آنے والے نہ جانے کتنے حجاج کرام کو سیراب کرتا چلا جا رہا ہے۔

کتنی صدیاں اور مدتیں گزر گئیں مگر حضرت ہاجرہؓ کی صفا ومروہ کے درمیان دیوانہ وار سعی کو آج بھی اسی طرح اللہ نے باقی رکھا ہے۔ یقیناً اللہ نے اسلام کی حقانیت اور ایمان کی عظمت اور اہل ایمان کے یادگار لمحات کو عمل لافانی بنادیا ہے۔ حرم کے معمار و پاسبان حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی پاک طینت ایمانی وعملی زندگی کی بے شمار نشانیاں فکر و وجدان کی عمیق راہوں کو منور کرتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کے لئے ایمان ویقین کے سرچشمے سے بڑھ کر کوئی بھی عظیم طاقت وسلطنت آج تک حاصل نہ ہوئی اور نہ کبھی ہو سکے گی۔

اللہ رب العزت کی ذات پر غیر متزلزل یقین ہی امت کی ڈوبتی کشتی کو ساحل عطا کر سکتا ہے، چونکہ سنگ گراں کی سختیوں کو کافور کرنے اور ظلمت کدہ سے ٹکرانے کا حوصلہ وہی بخشتا ہے اور آتش نمرود کے شعلۂ جوالہ کو بادنسیم کے جھونکوں میں تبدیل کرنے کی قوت بھی اسی کی ہے۔ اس سچائی کے اعتراف اور اسے سمجھنے کیلئے تاریخی داستانیں کرۂ ارض پر ہر چہار سو بکھری ہوئی ہیں۔ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کو ظالم نمرود نے آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں میں ڈالا تو دنیا نے دیکھا کہ آگ اپنی جلانے کی صفت کو بھول گئی اور اللہ کے خلیل کیلئے گل وگلزار ہوگئی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ اس فانی دنیا میں مردان مومن کو دنیوی شکست نہیں ہوئی، یہ بھی نہیں کہ ان کے نشان منزل کے درمیان کوہ ہمالیہ جیسی رکاوٹیں نہیں پیدا کی گئی

ہوں، ایسا بھی نہیں کہ اس کی سالہا سال کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون نہیں ہوا ہو، مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں ہوئی، وہ اپنے عظیم دینی مشن پر یقین واستحکام کے ساتھ قائم اور ڈٹے رہے۔

آپ خود سوچیں کہ اگر افسوس وشکست خوردگی کے بجائے ان کے حصہ میں بار بار فتح ونصرت اور دیگر فتوحات کا مسرت وجشن آئے، ان کی تحریک فکر کو کامیابی ہاتھ لگے، نامرادی وناکامی کے بجائے اس کی جہد مسلسل کو ثمر آور کامیاب زندگی ہی کی سوغات ملتی رہے تو ایسی کامران زندگی میں کون ہے جو ایمان ویقین اور ثبات قدمی کی مضبوط راہ کا دعویٰ نہیں کرے گا۔

ابتلا وآزمائش کی کسوٹی پر ایمان کی کھوٹی اور کھری جہت کو آزمانا اللہ کی عادت ہے۔ اللہ نے سورۂ عنکبوت آیت نمبر دو میں ارشاد فرمایا:

’’کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ (ایسا نہیں وہ تو ضرور آزمائے جائیں گے) ہم تو انہیں بھی آزما چکے جو ان سے پہلے گزر گئے‘‘ لیکن ان میں جس شخص کا ایمان جس قدر مستحکم اور جس قدر مضبوط اور جس قدر قوی ہوگا، اسی قدر اس کی آزمائش کا مرحلہ بھی سخت ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل‘‘ (انسانوں میں انبیاء کی آزمائش سب سے سخت ہوتی ہے، پھر جو انبیاء کے جتنا قریب ہوتا ہے، اس کی آزمائش بھی اسی قدر سخت ہوگی) اسی سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کو زندگی میں دنیوی اعتبار سے بظاہر ناکامی کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن داعیانہ کردار، عشق ونبوت میں ڈوبے ایمانی جذبہ کی دائمی خوشبو اور اس کے عمل خیر کا گلشن، سدا بہار مشک

بار رہتا ہے۔

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ ہی کو دیکھ لیجئے، ان کی آزمائش کا ایک مشکل مرحلہ اکلوتے جگر گوشے کی قربانی کا تھا، خواب میں انہیں لخت جگر کو ذبح کرنے کا جو حکم ملا، اس کی بجاآوری میں کسی چوں و چرا، بلاحیل و حجت کے تیار ہوگئے اور فرزند بھی ایسا جس نے فوراً مرضی رب پر سر تسلیم خم کیا اور باپ بھی ایسا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی، اپنی صد سالہ سحر گاہی، دعاؤں کے ثمر کو قربان کرنے کے لئے شاداں وفرحاں نکل پڑا۔

بقول شاعر:

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیلؑ

قرآن کریم نے تفصیل سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

''وہ لڑکا جب باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر تک پہنچ گیا تو ابراہیمؑ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تم کو ذبح کررہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو، تمہاری کیا رائے ہے، وہ بولے ابا جان جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اسے کر ڈالئے، انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے، پھر جب دونوں نے اللہ کا حکم تسلیم کرلیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا تو ہم نے ندا دی کہ تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، حقیقت میں یہ بڑا امتحان تھا، ہم نے ایک عظیم ذبیحہ فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا اور آنے والی نسلوں میں ان کا ذکر خیر چھوڑا، وہ مومن بندوں میں سے تھے''۔ (سورۃ الصافات، آیت ۱۰۲۔۱۱۱)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

''شیطان ملعون نے ابراہیم خلیل اللہ کو تین مرتبہ اس عظیم امتحان کے موقع پر

بہکانے اور بھٹکانے کی بھرپور کوشش کی مگر آپ نے ہر بار سات کنکریاں مار کر اسے بھگا دیا، عہد ووفا سے سرشار، سر تسلیم خم کرنے کے اس تاریخ ساز حسین لمحہ کی یادگار کے طور پر حجاز مقدس کے وادی منیٰ میں حضرات حجاج کرام ہر سال اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

سیدنا حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جگہ جنت سے اتارا گیا ایک مینڈھا ذبح کیا گیا، عیدالاضحیٰ میں قربانی کی یہ سنت ابراہیمی بھی اسی وقت سے چلی آرہی ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، حضورؐ! یہ قربانی کیا ہے؟ آقاؐ نے فرمایا ''یہ تمہارے ابا حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے'' اور فرمایا کہ استطاعت کے باوجود جو شخص قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کا رخ نہ کرے اور ان تین دنوں میں قربانی سے بڑھ کر کوئی دوسرا نیک عمل اللہ کو محبوب نہیں۔

میرے بھائیو! آج مغرب سے متاثر ہونے والے بہت سے نئے ذہنوں کے افراد میں قربانی کے سلسلہ میں شش وپنج پایا جاتا ہے کہ جانوروں کی قربانی کے بجائے اس کی رقم غرباء ومساکین اور دیگر ضرورت مند لوگوں کو دے دی جائے تو ان کا بھلا ہوگا۔ غرباء ومساکین کے ساتھ ہمدردی کا یہ جذبہ اپنی جگہ، لیکن ایک عبادت کو اس جذبے کی بھینٹ چڑھانے کا مطلب اپنی سوچ، اپنی رائے، اپنی فکر کی غلامی کے سوا کچھ بھی نہیں، بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جو حکم دیا گیا اس کی تعمیل کی جائے۔ یہاں بعض کوتاہ نگاہ اور نام نہاد دانشوران صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں، وہ شریعت کے ہر حکم کو اپنی عقل وخرد کے ناتواں پیمانے پر پرکھنا اور اپنی عقل کی کسوٹی پر ناپنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر اس واضح حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ حکم الٰہی کی تعمیل صرف اور صرف اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا حکم قطعی ہے، اس کا انکار کفر ہے، خواہ عقل اس کی حکمتوں کا احاطہ کرے یا اس سے قاصر رہے۔ آتش نمرود میں کودنے کا کرشمہ عشق کا ہے، یہاں عقل حیران ہے اور لب خاموش!

اس تاریخی حقیقت کو بھلانا نہیں چاہیے کہ یہی متاعِ حیات ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کے نہاں خانوں کے ترانوں کا نہیں، عشق کے جذبوں کا رنگ چھیڑتا ہے اور گتھیاں سلجھانے والے دانشوروں کی منطق وفلسفہ نہیں، اہل جنون کی راہ ورسم اور تکبیر مسلسل کو جاودانی ملتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب عکاسی کی ہے:

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آج کا دور بھی اہل ایمان کے لئے آزمائشوں اور فتنوں کا دور ہے۔ آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال گزشتہ اس پرفتن دور کے فتنوں کی پیشین گوئیاں فرما چکے ہیں۔ سنن ابی داؤد میں امام ابوداؤد نے کتاب الفتن میں ایک روایت نقل کی ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ کفار ان کے خلاف لڑنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گے جس طرح کھانے کے لئے ایک دوسرے کو بلایا جاتا ہے، کسی نے پوچھا کہ کیا اس وقت ہم کم ہوں گے؟ فرمایا تم تعداد میں بہت ہوگے لیکن سیلاب کے جھاگ کی مانند بے کار ہوگے، اللہ تمہارا خوف غیروں کے دل سے ہٹالے گا اور تمہارے دل میں ان کا رعب بٹھا دے گا۔ دنیا کی محبت اور موت سے نفرت تم میں آجائے گی۔

آپ اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کس طرح اس حدیث شریف کا لفظ بلفظ آج کے حالات پر صادق آرہا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف طاغوتی قوتیں متحد ہونے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دے رہی ہیں، اگر آپ دنیا کی مسلم اکثریت پر نظر ڈالیں تو وہ راکھ کا ڈھیر معلوم ہوگی۔ دوسری طرف عالم اسلام کے اکثر ملکوں کو دیکھیں تو مغرب سے مرعوبیت کا وائرس ان کی رگ رگ میں سرایت ہی نہیں بلکہ ذہن ودماغ میں پیوست ہو چکا

ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ہی وہ دین فطرت ہے جو ان تمام فتنوں، طوفانوں اور ہر سمت مخالف سے چلنے والی کالی آندھیوں کے باوجود قیامت تک باقی رہنے والا دین برحق ہے اور رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغام ہی روشنی وامن و اخوت کا ضامن ہے۔ یاد رہے کہ حکومتیں کفر کے ساتھ چلتی رہیں گی مگر ظلم کے ساتھ کبھی بھی باقی نہیں رہ سکتیں۔ پوری دنیا کی قوتیں مل کر کلمۂ حق کو کبھی بھی فنا نہیں کرسکتیں، آزمائش ہے تو صرف بیچارے مسلمانوں کی ہے اور نت نئے فتنے صرف اہل اسلام کو آزمانے کے لئے ہیں کہ وہ اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی اور اپنی جان ومال سمیت کلمۂ حق پر قائم رہتے ہیں کہ نہیں۔ رب کائنات ہم سب کو صحیح سمجھ اور عمل خیر کی توفیق جذبۂ صادق کے ساتھ نصیب فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

عالمی سازش کے نرغے میں مسلمان!

پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

’’وہ وقت قریب آتا ہے، جب تمام کافر قومیں تم کو مٹانے کے لئے مل کر سازشیں کریں گی اور ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے دسترخوان پر کھانا کھانے والے لذیذ کھانے کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کسی نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت ہوگے، البتہ تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ناکارہ ہوگے، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا رعب اور دبدبہ نکال دیں گے اور تمہارے دلوں میں بزدلی ڈال دیں گے۔ کسی نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! بزدلی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔‘‘

اس وقت دنیا بھر میں مسلمان قابل رحم حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، وطن عزیز ہندوستان سمیت جہاں بھی مسلمان موجود ہیں چاہے وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں کسی نہ کسی بہانے سے ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ مسلمان جس قدر ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، شاید ہی کسی دوسری قوم پر کبھی ایسا وقت آیا ہو؟

اسلام کے دشمن ومخالفین یہود ونصاریٰ اور کفار ومشرکین متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچ رہے ہیں۔ حیرت واستعجاب کی بات یہ ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کی سازشوں کے شکار بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم آج بھی متحد ہو جائیں، مذہب کو مسلک پر فوقیت دیں اور کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر ایک پرچم تلے جمع ہو جائیں تو کوئی بھی سازش اور اسلام مخالف منصوبہ ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد بھی اسی صورت میں حاصل ہوگی جب ہماری زندگی دین اور شریعت کے مطابق گزر رہی ہو۔ مذہب اور دین سے دور اور بیزار رہتے ہوئے نصرت الٰہی کی توقع رکھنا کارعبث ہے۔

مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ ضرور ہے، لیکن ساتھ ہی اللہ کی مدد آنے کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ:

”**یاایھاالذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم**“ (محمد:۷)

(اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے اور تمہارے قدموں کو ثابت کریں گے)

جب سے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد چھوڑ دی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں سے اپنی رحمت وعنایت اور مدد کا ہاتھ اٹھالیا ہے، چنانچہ آج ہر طرف مسلمانوں پر یہود ونصاریٰ کی یلغار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور اتحاد واتفاق کے زریں اصول کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں تو انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔

’’حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک لوگ یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جائیں گے، جیسے چھٹائی کے بعد ردی جو یا کھجوریں باقی رہ جاتی ہیں، ایسے ناکارہ لوگ رہ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔‘‘

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو شدید کرب وبلا کا سامنا ہے۔ ادنیٰ سے لے کر

اعلیٰ عہدوں پر فائز حکومت اور انتظامیہ کے لوگوں میں سنگھی سوچ تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'۔

مسلم قائدین و تنظیمیں اس موقع پر سر جوڑ کر بیٹھیں اور دانشمندی، اتفاق و دور اندیشی کا ملی ثبوت فراہم کرتے ہوئے مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ غور وفکر ہی نہیں بلکہ باعزت قوم جو آج ذلت وپستی، ظلم وجبر اور انحطاط کی شکار ہے اس کو قعرِ مذلت سے نکال کر امن وعفت کی شاہراہ پر گامزن کرنے کیلئے مضبوط لائحۂ عمل تیار کریں۔ بلاتفریق مسلک کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور قوم وملت کے جملہ مسائل و پریشانیوں کا حل تلاش کر کے اسلام کے پیغام امن وآشتی کو عام کریں اور اس کی روشنی میں ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی روایت کی آبیاری کریں۔

سب سے پہلے رب کائنات کا شکر گزار ہوں جس کی توفیق سے کم وقت میں بڑا کام ممکن ہوسکا۔ اس شمارہ کی بروقت پیشکش کیلئے معارف قاسم جدید کی پوری ٹیم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تنکا تنکا جمع کر کے تعمیر کیا گیا یہ عالی شان محل ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے اور حکمراں لیڈروں کی توجہ اس جانب مبذول کرانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس موقع پر میں اپنے ان بزرگ کرم فرما علماء ودانشوروں کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے اپنی نیک خواہشات اور پیغامات کے ذریعہ اس خصوصی شمارہ کی اہمیت کو دوچند کردیا۔ مجھے پوری امید ہے کہ معارف قاسم کا ''مسلم مسائل نمبر'' علماء، اہل علم، دانشوران، عامۃ المسلمین اور قارئین کو سابقہ شمارہ کی طرح پسند آئے گا۔

کتنی بربادی مقدر میں تھی آبادی کے بعد
کیا بتائیں ہم پہ کیا گزری ہے آزادی کے بعد

عیدالاضحیٰ: سب سے محبوب عمل

قربانی کے فضائل و برکات کے سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدالاضحیٰ کے دن خالق کائنات کو قربانی سے زیادہ کوئی عمل محبوب اور پسند نہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

ابن آدم (انسان) نے قربانی کے دن کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اللہ کے نزدیک خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور قیامت کے دن وہ ذبح کیا ہوا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوجاتا ہے، لہٰذا تم اس کی وجہ سے (قربانی کرکے) اپنے دلوں کو خوش کرو۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عیدالاضحیٰ کے دن ارشاد فرمایا: آج کے دن کسی آدمی نے خون بہانے سے زیادہ افضل عمل نہیں کیا، ہاں اگر کسی رشتہ دار کے ساتھ حسن سلوک اس سے بڑھ کر ہوتو ہو۔ (الترغیب والترہیب)

خلیفۂ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے (حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے) فرمایا:

اے فاطمہؓ! اٹھو اور اپنی قربانی کے پاس (ذبح کے وقت) موجود رہو، اس لئے کہ اس کے خون کا پہلا قطرہ گرنے کے ساتھ ہی تمہارے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے، یہ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے گوشت اور خون کے ساتھ لایا جائے گا اور تمہارے ترازو میں ستر گنا (زیادہ) کر کے رکھا جائے گا، حضرت ابوسعیدؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! یہ فضیلت خاندان نبوت کے ساتھ خاص ہے جو کسی بھی خیر کے ساتھ مخصوص ہونے کے حقدار ہیں یا تمام مسلمانوں کے لئے ہے؟ فرمایا: یہ فضیلت آلِ محمدؐ کے لئے خصوصاً اور عموماً تمام مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ (الترغیب والترہیب)

حضرت علیؓ سے ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم قربانی کرو اور ان قربانیوں کے خون پر اجر وثواب کی امید رکھو، اس لئے کہ (ان کا) خون اگرچہ زمین پر گرتا ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں چلا جاتا ہے۔ (ایضاً)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: چاندی (یا کوئی بھی مال) کسی ایسی چیز میں خرچ نہیں کیا گیا جو اللہ کے نزدیک اس اونٹ سے پسندیدہ ہو جو عید کے دن ذبح کیا گیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو شخص قربانی کرنے کی گنجائش رکھتا ہو پھر بھی قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔ (ایضاً)

حضرت حسین بن علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص خوش دلی کے ساتھ اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے قربانی کرے گا تو وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے رکاوٹ بن جائے گی۔ (ایضاً)

ماہ ذوالحجہ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’پہلی رات کے چاند کے ساتھ ذوالحجہ کا آغاز ہوتا ہے تو اس کی پہلی دس راتوں میں سے ہر رات اپنی عظمت میں لیلۃ القدر کے برابر ہے‘‘۔

لیلۃ القدر کی مناسبت سے جہاں ماہ رمضان المبارک کو منفرد شان والی ایک رات لیلۃ القدر نصیب ہوئی ہے جس کے اندر چند ساعتیں اللہ کے بندوں کی مغفرت وبخشش کا سامان لئے ہوئے وارد ہوتی ہیں اور جن میں اخلاص کے ساتھ بندہ اپنے رب سے جو بھی اچھی شے طلب کرتا ہے وہ اسے عطا کردی جاتی ہے۔ اسی طرح ماہ ذوالحجہ کی پہلی دس راتوں کو عظمت وفضیلت کا وہ خزانہ عطا کیا گیا ہے کہ ہر ایک رات رمضان المبارک کی لیلۃ القدر کے برابر ہے، جس طرح رمضان المبارک کی برکتوں کو سمیٹ کر عید الفطر میں رکھ دیا گیا اور اس دن کو خوشی کے دن کے طور پر مقرر کردیا گیا، ان دس راتوں کے اختتام پر اللہ رب العزت نے عیدالاضحیٰ کے دن کو مسرت وشادمانی کے دن کی صورت میں یادگار حیثیت کر دی، اس دن کو عرف عام میں قربانی کی عید کہتے ہیں۔

مسلمانانِ عالم کو قربانی کا فریضہ انجام دے کر اتنی خوشی نصیب ہوتی ہے کہ پورے سال میں کسی اور دن نہیں ہوتی۔ قربانی عربی زبان کا لفظ ہے، جو ’’قرب‘‘ سے مشتق ہے۔ ’’قرب‘‘ کسی چیز کے نزدیک ہونے کو کہا جاتا ہے، اس کے برعکس دوری ہے۔ قرب اور دوری دونوں یکجا نہیں ہوسکتے۔ قرب سے قربانی کا لفظ مبالغے کے طور پر واقع ہوا ہے، اس تصور کو کچھ مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ’’قرأت‘‘ کے معنی فقط ’’پڑھنا‘‘ ہے اور قرآن کے معنیٰ اس کتاب کے ہیں جسے بار بار، تواتر اور کثرت سے پڑھا جائے اور اتنا پڑھا جائے کہ قیامت تک اس کا پڑھنا ختم ہی نہ ہو۔ باری تعالیٰ نے کتاب الٰہی کا نام انہی

وجوہ کی بنیاد پر قرآن رکھا ہے کہ کثرت قرأت کے اعتبار سے دنیا کی کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔ اس اعتبار سے عید قربان کا معنیٰ یہ ہوا کہ ذوالحجہ کے مہینے میں کوئی عمل کرے تو اس عمل کی برکت سے یہ عید قربان اس بندے کو اللہ کے اتنے قریب کر دیتی ہے کہ کوئی اور لمحہ اسے اتنے قرب سے آشنا نہیں کرسکتا۔ دوسرے لفظوں میں عیدالاضحٰی میں قربانی کا عمل بندے کو اپنے رب کے قریب کرنے والا عمل ہے جس سے ساری دوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔

بہت سے ایسے اعمال ہیں جن میں اکثر کا مقصد قرب الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی کئی اعمال ایسے ہیں جن کے صدور سے گناہوں کی بخشش کی نوید مل جاتی ہے، کئی اعمال درجات کی بلندی کا موجب بنتے ہیں اور کچھ اعمال ایسے ہیں جن کی بدولت انسان حسد، تکبر و رعونت اور غیبت کرنے سے بچ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض اعمال سے انسان کی طبیعت میں سخاوت اور فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن میں مستحضر کرلیں کہ ہر عمل، انسانی شخصیت پر خاص اثرات مرتب کرتا ہے۔ ہر عمل انسانی نفس، روح اور قلب و باطن کے لئے خاص تاثیر رکھتا ہے، یعنی ہر عمل کے اپنے مخصوص ثمرات اور فیوض و برکات ہیں جو قرب الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں مگر عید قربان میں قربانی کے عمل کو کیوں اللہ کے انتہائی قرب کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے؟ قربانی کا یہ عمل صرف جانور کو ذبح کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ گہرے اور دور رس مضمرات رکھتا ہے۔ جانور کے ذبح کرنے کے عمل کو قربانی سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کا عمل بندے کو اللہ کے انتہائی قریب کر دیتا ہے، لیکن اس میں قربانی کرنے والے بندے کا اخلاص ایک سوالیہ نشان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کیا وہ قربانی جو بندہ ذبح کے طور پر پیش کر رہا ہے اس کے اللہ کی بارگاہ سے مطلوبہ نتائج حاصل ہوئے ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس کا عمل قربانی اس کے لئے اللہ سے انتہائی قرب کا سبب قرار دیا جائے گا۔ گویا قربانی کی روح حقیقت میں اس قربانی کے پیچھے

کارفرما اخلاص ہے اور دوسری اس کی روح اور روح کا تعلق اس کے عقیدے اور نیت کے ساتھ ہے جبکہ ہیئت کا تعلق ظاہری شکل و صورت سے ہے۔ کسی بھی عمل کے پیچھے جو باطنی نیت کارفرما ہوتی ہے اس سے وہ مقبول، نامقبول، پسندیدہ، غیر پسندیدہ ٹھہرایا جاتا ہے، الغرض حسن نیت ہی عمل کی روح ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورۃ الحج میں ارشاد فرماتا ہے:

''اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی مقرر کر دی ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں، ان جانوروں پر جو ہم نے ان کو عطا کئے ہیں''

قرآن مجید میں قربانی کیلئے تین لفظ آئے ہیں۔ ایک نسک، دوسرا نحر اور تیسرا قربان۔

نسک: یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے کہیں عبادت، کہیں اطاعت اور کہیں قربانی کے لئے جیسے سورۂ حج کی آیت 34 میں فرمایا:

''اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی مقرر کر دی ہے''

یہاں یہ لفظ جانور کی قربانی کے لئے ہی آرہا ہے، کیونکہ اس کے فوراً بعد 'من بھیمۃ الانعام' کا لفظ ہے یعنی ان چوپایوں پر اللہ کا نام لے کر قربانی کریں جو اللہ نے ان کو عطا کئے۔ دوسرا لفظ قربانی کے لئے قرآن مجید میں نحر کا آیا ہے جو سورۃ الکوثر میں ہے:

''یعنی اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں اور قربانی کریں''

اور قربانی کا لفظ قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کی 27 ویں آیت میں آیا ہے جہاں حضرت آدمؑ کے دونوں بیٹوں ہابیل اور قابیل کے واقعہ کا ذکر ہے۔

''یعنی آپ ان لوگوں کو آدمؑ کے دو بیٹوں کا سچا واقعہ سنائیے کہ جب دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی''

ہم اردو میں لفظ قربانی ہی عام طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ اسلامی اصطلاح میں قربانی کا ایک خاص مفہوم ہے جس کا تذکرہ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں کیا ہے کہ:

’’یعنی قربانی ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کیا جائے، چاہے وہ جانور ذبح کر کے ہو یا صدقہ وخیرات کر کے۔ چنانچہ عرف عام میں قربانی کا لفظ جانور کی قربانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق کسی حلال جانور کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کرنا حضرت آدمؑ ہی کے زمانے سے شروع ہوا۔ قرآن مجید کے مطابق پہلے انبیاء کے دور میں قربانی کے قبول ہونے یا نہ ہونے کی پہچان یہ تھی کہ جس قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتے تو ایک آگ آسمان سے آتی اور اس کو جلا دیتی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں مقیم یہودیوں کو ایمان لانے کی دعوت دی تو سورۂ آل عمران کی آیت 183 میں بیان فرمایا کہ انہوں نے کہا:

’’یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھالے‘‘

حالانکہ یہ یہود کی انتہائی غلط بیانی تھی لیکن امت محمدیہؐ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام ہے کہ قربانی کا گوشت ان کے لئے حلال کر دیا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت فرما دی کہ قربانی کا مقصد اور اس کا فلسفہ گوشت کھانا نہیں بلکہ ایک حکم شرعی کی تعمیل اور سنت ابراہیمؑ پر عمل کرتے ہوئے ایک جان کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا ہے۔ چنانچہ واضح الفاظ میں فرمایا:

’’یعنی اللہ کے پاس ان قربانیوں کا گوشت نہیں پہنچتا اور نہ خون پہنچتا ہے بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے‘‘

یعنی قربانی کا گوشت کھانا کوئی مقصد نہیں، بلکہ سنت ابراہیمی پر عمل کرتے ہوئے

خالص اللہ کے لئے جان قربان کرنا اصل مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر ابراہیم خلیل اللہ کے اس عمل کو پسند فرما کر قیامت تک ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی ہر صاحب استطاعت پر واجب کر دی۔ قربانی کو شعائر اسلام میں شمار کیا گیا۔ سورۂ حج کی آیت 36 میں فرمایا:

’’یعنی قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے شعائر اللہ یعنی اللہ کی عظمت کا نشان بنایا ہے اس میں تمہارے لئے خیر ہے‘‘

اس لئے قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق قربانی کا فلسفہ اور اس کی حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ انسان قربانی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے لئے جان قربان کرتا ہے، اس میں گوشت کھانا مقصود نہیں اور نہ اس میں ریاکاری دکھاوا آئے اور نہ کوئی اور وسوسہ آنے پائے، یہ خاص اللہ کے لئے جان اور مال کو قربان کرنا ہے اور رسول اللہ کو یہ حکم دیا گیا جو امت کے ایمان کا حصہ ہے کہ:

’’آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہی ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے‘‘

اللہ رب العزت ہمیں اخلاص اور جذبۂ صادق کے ساتھ قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہر طرح کے نام ونمود اور دکھاوے سے ہم سب کی حفاظت کرے۔ (آمین)

'ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'

ہم ایسے موقع پر۲۰۱۴ء کا استقبال کر رہے ہیں جب اتر پردیش کے ضلع مظفرنگر و شاملی میں فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوئے ہزاروں مرد وخواتین اور معصوم بچے و بوڑھوں کو یوپی حکومت کے عتاب کا سامنا ہے۔ پہلے فسادات میں ان کا بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا اور اب ان پر دہشت گردی تک کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ شمالی ہند کی شدید سردی میں بھی ہمارے یہ بھائی اپنے بچوں اور بزرگوں کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، مگر انسانیت سوز مظالم کا ثبوت دیتے ہوئے حکومت کے اشارہ پر یہاں بھی انہیں سکون سے نہیں رہنے دیا جا رہا ہے اور کئی راحتی کیمپوں کو پولیس نے رات کے اندھیروں میں اجاڑ دیا اور خیموں پر بلڈوزر چلا دیا۔ اتر پردیش کی ملائم حکومت سے ہمارا پرزور مطالبہ ہے کہ وہ مظفرنگر اور شاملی کے فسادزدگان کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ان مجرمین کے خلاف سخت کارروائی کرے اور مظلومین کی بازآبادکاری کیلئے مخلصانہ قدم اٹھائے، ورنہ جن مسلمانوں نے انہیں سرآنکھوں پر بٹھایا ہے ۲۰۱۴ء کے لوک سبھا انتخابات میں وہی مسلمان انہیں سبق بھی سکھا دیں گے۔ بلاتفریق مذہب وملت ہماری سبھی مسلمان

بھائیوں سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اپنے ان پریشان حال بھائیوں کی ہر طرح سے مدد کریں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جس جذبہ کے ساتھ اس بار ملی و دینی تنظیمیں اور مدارس کے ذمہ دار مظفرنگر کے مظلومین کے امدادی کیمپوں میں جا جا کر مدد کر رہے ہیں، ان کے اس کارخیر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، ہم ان کے اس جذبہ کو سلام کرتے ہیں۔

اپنے لئے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

قدرت بھی ہمیں ایسے مواقع دیتی رہتی ہے کہ ہم اپنے علاوہ اللہ کے دوسرے بندوں کے لئے بھی کچھ کر سکیں۔ مولانا رومؒ نے اس حوالے سے ایک دلچسپ حکایت لکھی ہے: ایک صاحب حیثیت شخص ایک حاجت مند کے پاس سے گزرا تو اسے اس شخص کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا، اس نے خدا سے عرض کیا کہ اے مالک تو اس کے لئے کیوں کچھ نہیں کرتا۔ اسے غیب سے آواز آئی کہ خدا نے اس غریب شخص کی حاجت روائی کے لئے تجھے پیدا کیا ہے''

جب ہم دوسروں کی بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں تو دراصل اپنا فائدہ کر رہے ہوتے ہیں اور یہی پیغام ہے اس خاص مہینہ ربیع الاول (جس کی ۱۲ تاریخ کو یوم عیدمیلادالنبی ﷺ کے طور پر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے) میں دنیا میں تشریف لانے والے پیغمبر اسلام، حبیب کبریا، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور سیرت کا۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی غریبوں اور مجبوروں کی مدد کی، بیواؤں اور یتیموں، مسکینوں اور معذوروں کی مدد کرنے میں نہ آپ کوئی عار محسوس کرتے تھے اور نہ تھکتے تھے، بلکہ ان کی خدمت کر کے آپ ﷺ اطمینان، سکون اور خوشی محسوس فرماتے تھے۔ نیز صحابہؓ کو بھی آپؐ اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''خیر الناس من ینفع الناس'' لوگوں میں اچھا وہ ہے جو لوگوں کو نفع دیتا ہے۔ لوگوں میں اچھا بننے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم مخلوق خدا کی خدمت کریں اور اس کو فائدہ پہنچائیں، کیونکہ اسی میں ہماری دنیاوی اور آخرت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: ''جو شخص کسی مسلمان کی کوئی دنیاوی تکلیف دور کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن کی مشکلات میں سے کوئی مشکل حل کرے گا، جو شخص دنیا میں کسی تنگ دست کے لئے آسانی پیدا کرے گا، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لئے آسانی پیدا فرمائے گا اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ (اس وقت تک) اپنے بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے''۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

قارئین کرام! ربیع الاول کے مہینہ میں اللہ کے آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، آپؐ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے، کچھ مؤرخین نے ۱۲ ربیع الاول اور کچھ نے ۹ ربیع الاول کو ترجیحی بنیاد پر ذکر کیا ہے۔ اسی مناسبت سے ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر بہت سے مسلم ممالک سمیت برصغیر ہندو پاک میں بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنے گھروں اور محلوں میں چراغاں اور جلسے جلوس کا اہتمام ثواب کی نیت سے کرتا ہے، جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس موقع پر سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنی زندگی کو بدلنے کا عہد کریں، نیکی اور بھلائی کے راستے پر چلنے اور برائیوں کو ترک کرنے کا دل سے ارادہ کریں، دنیا کو اسلام اور اپنے آخری نبی کی سیرت و کردار کا پیغام پہنچانے کا عہد کریں، اصل میں عید میلاد النبی ﷺ یہ ہے، غیر کا طریقہ اختیار کر کے سڑکوں

پر جلوس نکالنا اور شور و ہنگامہ کرنا نہیں۔ جس بات کی کوئی سند دین میں نہ ہو اس کو اختیار کرنا عبادت نہیں ہے، بلکہ مردود ہے۔ اس موقع پر اللہ کے پریشان حال بندوں کی مدد کرنے اور دین اسلام اور مدارس اسلامیہ کے تحفظ و بقا کیلئے کوششیں کرنے کا مستحکم عزم کرتے ہوئے ہم اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ ہماری یہ چند روزہ زندگی اللہ کے پیارے حبیب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے اور تعلیمات کے مطابق بسر ہو رہی ہے کہ نہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور سیرت نبویؐ کی روشنی میں صحیح راستے کا انتخاب کرنے کے بجائے ان طریقوں اور اصولوں پر ایمانی جذبے کے ساتھ چل رہے ہیں جن کے بارے میں واضح ممانعت ہے۔

نبی آخر الزماں، رسول برحق، حبیب کبریا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور، فان كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة،، وفي رواية النسائي وكل ضلالة في النار''.

(مسلمانو! تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقے ہی کو اختیار کرنا اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور دین میں اضافہ شدہ چیزوں سے اپنے کو بچا کر رکھنا اس لئے کہ دین میں نیا کام (چاہے وہ بظاہر کیسا ہی ہو) بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ ہر گمراہی جہنم تک لے جانے والی ہے) (ابوداؤد، نسائی)۔

اب اگر کوئی شخص اجر و ثواب کے لئے یا دین سمجھ کر ایسا کام کرتا ہے جس کام کو نہ نبیؐ نے کیا نہ خلفاء راشدین نے، نہ صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے کیا، نہ تابعین نے نہ تبع

تابعین نے، نہ ائمۂ عظام نے اور نہ ہی محدثین کرام نے، تو ایسے عمل سے اس مسلمان کو ثواب تو نہیں مل سکتا، البتہ گناہ ضرور ملے گا، کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: **من عمل عملا لیس علیه أمرنا فهو رد** ''جس نے کار خیر سمجھ کر کوئی کام کیا اور اس کام کا میں نے حکم نہیں دیا تو وہ عمل مردود ہے''۔ (صحیح مسلم)

میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اسے کسی مسلک کے آئینہ سے نہ دیکھیں بلکہ دینی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی کوشش کریں، یہی میری دعوت ہے اور یہی میرا مقصد پیغام۔

❁ ❁ ❁

ملک وملت کی تعمیر میں مدارس کا کردار

مدارس اسلامیہ، اسلامی تہذیب وثقافت کے امین، علوم دینیہ کی نشر واشاعت کے مراکز، مذہبی اقدار کے پاسبان، قرآنی علوم کے محافظ اور برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے علم بردار ہیں۔ مدارس اسلامیہ کی وجہ سے دنیا میں انسانیت کی بقا ہے، مذہبی رواداری اور حسن اخلاق کا چلن ہے۔ مدارس اسلامیہ کی خدمات روز اول سے تمام شعبہائے زندگی کو محیط ہیں۔ ہندوستان کی آزادی بھی مدارس اسلامیہ کی مرہون منت ہے۔ برصغیر میں اسلامی اقدار کا تحفظ مدارس اسلامیہ کے بغیر ناممکن تھا۔ مذہبی شناخت اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے فروغ کا سہرا براہ راست مدارس اسلامیہ کو جاتا ہے۔ رفاہی اور سماجی کاموں میں بھی مدارس اسلامیہ سب سے آگے ہیں۔

1857ء میں جب مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہندوستان کی سرزمین سے ساڑھے سات سو سالہ مسلم دور اقتدار کا چراغ گل ہوگیا۔ انگریز یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک بن چکے۔ اس وقت سب سے زیادہ خطرات اسلامی تشخص کو ہی لاحق تھے۔ انگریزوں کی پوری توجہ مسلمانوں سے اسلام کی روح کو ختم کرنے، مذہبی تعلیمات سے انھیں

محروم رکھنے اور اسلامی ثقافت سے دور رکھنے پر مرکوز تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کی اصل عداوت مسلمانوں سے نہیں، بلکہ اسلام سے تھی۔ وہ مسلمانوں کو باقی رکھنا چاہ رہے تھے،لیکن اسلام کا نام ونشان مٹانے کے درپے تھے۔ جہاں کہیں سے بھی اسلام کی حقانیت اوراس کی حمایت میں کوئی تحریک بلند ہوتی تھی اسے فوراً کچلنے کی کوشش کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے پھانسی کے پھندے پر صرف اور صرف انہی مدارس کے فارغین اور علماء کو لٹکایا۔ دہلی کی سرزمین پر لاکھوں علماء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا محض اس وجہ سے کہ وہ انگریزوں کے ناپاک تسلط سے آزادی چاہتے تھے۔ فرنگیوں کو راہ فرار کا راستہ دکھانے کے لئے جدوجہد کررہے تھے۔ انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھارہے تھے۔

انگریزوں نے بھی اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک کرلیا تھا کہ ہندوستان میں جب تک یہ علماء اور مدارس کے فضلاء رہیں گے ہماری حکومت پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ مذہبی پاسداری کے نام پر عوام کی انہیں حمایت حاصل رہے گی۔ اس لئے اپنی حکومت کی حفاظت کے پیش نظر ان علماء کا خاتمہ ضروری ہے۔ چناں چہ اسلامی روح کو حرکت دینے والی ہر تحریک کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ جو علماء اس میں شریک تھے انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ہزاروں کو قتل کردیا گیا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ دہلی کے چاندنی چوک سے لیکر جامع مسجد تک کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر کسی عالم کی لاش نہ لٹک رہی ہو؛ لیکن علماء نے انگریزوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ بدترین ظلم وستم کے باوجود ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے، بلکہ وہ اپنے مشن میں مسلسل سرگرم رہے۔ مدارس کے ان جیالوں نے ہمت وحوصلہ اور دانشمندی سے کام لیا۔ بالآخر 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا اور وہاں سے بیک وقت کئی محاذ پر کام کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ انگریزوں کے ساتھ آزادی کی جنگ بھی لڑی گئی،

اسلامی شناخت کو برقرار رکھنے کی مہم بھی چھیڑی گئی۔ فرقہ باطلہ اور دیگر مذاہب سے مناظرے بھی ہوئے۔ سماجی اصلاحات کی تحریکیں بھی چلائی گئیں۔ گویا علماء نے ہر محاذ پر ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی، ان کی قیادت کی اور ملت کو زوال وانحطاط کی کھائی میں گرنے سے بچالیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ علماء نے اپنی کوششوں کی بدولت ہندوستان کو اندلس نہیں بننے دیا۔ آج اگر ہندوستان میں اسلامی تشخص برقرار ہے۔ مذہبی آزادی ہے۔ عوام میں ملی اور مذہبی شعور ہے۔ مساجد آباد ہیں۔ مکاتب کی روایت برقرار ہے۔ لوگوں کو دین سیکھنے اور اپنے بچوں کو دینی علوم کے زیورات سے آراستہ کرنے کا جذبہ ہے۔ حسن سلوک اور رحم دلی کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں موجزن ہے۔ عوام کے مابین غم گساری اور رواداری کا احساس پایا جاتا ہے۔ نئی نسل جاہلانہ عقائد وخیالات سے پاک وصاف ہے۔ پڑھائی لکھائی کی فضا سازگار ہوئی ہے۔ دین سیکھنے اور سکھانے کا جذبہ لوگوں کے درمیان موجود ہے۔ مذہبی اقدار کی حفاظت کے لئے ہر کوئی فکرمند ہے تو بلاواسطہ اس کا سہرا مدارس اسلامیہ کے سر جاتا ہے جنہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کی آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے محض خدائے پاک کی رضامندی کے حصول کی خاطر علوم اسلامیہ کی اشاعت پر اپنی پوری توانائی صرف کی ہے۔ تدریسی، تحریری اور تقریری طور پر ملت کی ترجمانی کی ہے۔ اساتذہ نے طلبہ کی کردار سازی پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

مدارس کی خدمات کا دائرہ صرف مسلمانوں کے درمیان ہی محدود نہیں ہے بلکہ ملک وملت کی تعمیر وترقی اور اس کو بنانے سنوارنے میں بھی مدارس نے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ کسی مستقل آمدنی اور مادی وسائل سے بالکلیہ تہی دست ہونے کے باوجود سماجی، سیاسی، اقتصادی، معاشی اور اخلاقی میدانوں میں بھی مدارس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جس کا مقابلہ کوئی اور تنظیم نہیں کرسکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت پر مبنی سچائی ہے جس کا

اعتراف غیر مسلموں اور دنیا کے دانشوران اور ماہرین نے کیا ہے۔دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ دارالعلوم کے بزرگوں نے ہندوستان کی آزادی کی جو تحریک شروع کی تھی اس سے لوگوں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ابھرا، ان میں امنگ پیدا ہوئی اور انہی کی کوششوں کی بدولت ہندوستان آزاد ہوا۔اسلام اور مسلمانوں نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا ہے۔اس کی ثقافت کو مالا مال کیا ہے اور یہاں کی زندگی پر اس کے گہرے اثرات قائم ہوئے ہیں۔معروف سماجی کارکن پنڈت این کے شرما نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ ’’ملک کو مضبوط کرنے میں مدارس کا اہم کردار ہے۔مدارس دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں جس سے نوجوانوں میں مثبت فکر پیدا ہوتی ہے‘‘۔

ان دنوں مدارس کی افادیت پر ایک طبقہ مسلسل سوال اٹھا رہا ہے۔مدارس کے نصاب پر ان کو شدید اعتراض ہے۔وہاں رائج طریقۂ تدریس سے انہیں اتفاق نہیں ہے۔کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جنہیں مدارس ہی سرے سے قبول نہیں ہیں۔ان کی نگاہ میں مدارس مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔انہیں اس بات سے شدید چڑ ہے کہ مدارس اور وہاں کے فضلاء اور علماء سے عوام اس قدر قریب کیوں ہیں۔زکوٰۃ کی رقم مدارس میں زیر تعلیم غریب بچوں پر ہی خرچ کیوں کی جاتی ہے۔مدارس کے حوالے سے اس طرح کا نظریہ رکھنے والے اور مدارس کی افادیت پر سوال اٹھانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنہیں دین سے کوئی مطلب نہیں ہے۔علوم اسلامیہ کی ان کی نگاہ میں ذرہ برابر کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔وہ اسلامی شناخت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔وہ مکاتب و مساجد کو آباد دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔انہیں اپنے کالجز اور یونیورسٹیز کے ان طلبہ کی کوئی فکر نہیں ہے جو دین سے بالکلیہ عاری ہوتے جا رہے ہیں۔اسلامی تعلیمات سے ذرہ برابر بھی واقفیت نہیں ہوتی

ہے،لیکن انہیں مدارس کے طلبہ کی فکر ستاتی ہے کہ انہیں انگلش کیوں نہیں آتی ہے، یہ سائنس سے ناواقف کیوں ہیں۔یہ ڈاکٹر اور انجینئر کیوں نہیں ہیں۔پائلٹ بننے تک کا سفر طے کرنے میں یہ ناکام کیوں ہیں۔سول سروسز میں ان کی نمائندگی کیوں نہیں ہے، لیکن انہیں ان چیزوں کا کبھی خیال نہیں آتا ہے کہ دین کی بنیادی تعلیم سیکھنا، ضروری مسائل سے واقفیت، قرآن کی تلاوت وغیرہ ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔ایک مسلمان کے لئے ان چیزوں کا جاننا اشد ضروری ہے۔جن سے کالجز اور اسکول کے طلبہ کی اکثریت ناواقف ہوتی ہے انہیں اپنے مذہب کے بارے میں ذرہ برابر بھی پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ نماز کیا ہے؟ مسلمان کسے کہتے ہیں؟

صاف لفظوں میں یہ کہ مدارس اسلامیہ دراصل اسلامی علوم وفنون کے محافظ اور پاسبان ہیں۔خاص کر وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مدارس کا قیام انتہائی ناگزیر ہے، کیوں کہ حکومت دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کرتی ہے، جبکہ ایک مسلمان کے لئے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ بچہ اول مرحلہ میں دین کی بنیادی باتیں سیکھے۔قرآن کریم کا پڑھنا اسے آجائے۔نماز، روزہ اور ارکان خمسہ کو پوری طرح وہ سمجھنے لگے اس کے بعد پھر آپ کو اختیار ہے چاہیں تو مدرسہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں یا پھر موقوف کر کے اس کی لائن تبدیل کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ مدارس سلامیہ جہاں علوم دینیہ کی پاسبانی، اخوت و بھائی چارہ کا پیغام عام کرنے میں مصروف عمل ہیں وہیں وہ وطن عزیز کو بھی سنوارنے اور اسے استحکام بخشنے کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔تمام میدان عمل میں مدارس کی خدمات کا ایک وسیع حصہ ہے۔آج کے دور میں اگر کوئی مدارس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، انہیں برا بھلا کہتا ہے، ان کے ذریعے انجام پا رہے کاموں کو برا بھلا کہتا ہے تو یہ اس شخص کی نااہلی اور جہالت کی واضح

دلیل ہے۔ مدارس کی جتنی ضرورت کل تھی اتنی ہی آج ہے۔ مدارس اسلام کے قلعے ہیں، مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ الحمدللہ اب مدارس کے فضلاء مدارس کی چہار دیواریوں سے باہر نکل کر دیگر شعبوں میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوا رہے ہیں اور دنیا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ آج کے دور میں سب سے زیادہ کامیاب مدارس کے فارغین ہیں۔ ہر میدان میں یہ اپنی صلاحیتوں کا جوہر بکھیرے ہوئے ہیں۔ مدارس کی انہی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر امریکی ریسرچ ادارے کی ایک ٹیم نے مدارس کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا کہ ان مخدوش عمارتوں میں نہ جانے کیا رکھا ہے کہ اس نے گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں برصغیر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔

جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن

امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین نوراللہ مرقدہٗ ملت اسلامیہ کے ایک ایسے عظیم سپوت اور بے مثال قائد تھے جنہوں نے پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ ہزاروں حالات آئے، مختلف ناگفتہ بہ مواقع کا انھوں نے سامنا کیا، لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی، وہ ہمیشہ پوری تندہی اور جوابدہی کے ساتھ اپنے مشن پر گامزن رہے۔ امارت شرعیہ کی ترقی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو اپنے اصل مقصد پر برقرار رکھنے کے لئے ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے دو عظیم شخصیات امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب نوراللہ مرقدہٗ اور قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ کے ساتھ مل کر تقریباً نصف صدی کے محیط عرصہ پر امارت کی خدمات انجام دیں۔ حضرت قاضی صاحبؒ کے ساتھ مل کر انھوں نے امارت کو نئی بلندی اور وسعت عطا کی، امارت میں کئی شعبوں کا اضافہ کیا۔ خاص طور پر ان دونوں بزرگوں نے امارت کو خانقاہ مجیبیہ سے منتقل کر کے پھلواری شریف میں لانے کا نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ معہد القضاء اور آئی ٹی آئی

کے کئی ادارے ان کی نگرانی میں قائم ہوئے۔ مختصر یہ کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ بانی امارت شرعیہ وجمعیۃ علماء ہند کا رنگ اور اثر ان بزرگوں میں مکمل طور پر نمایاں تھا، یا یوں کہئے کہ قائد ملت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ جو تربیت حاصل کی تھی، انہوں نے اپنے ان دونوں رفقاء کو اسی رنگ میں رنگ دیا اور تازندگی یہ حضرات بانی امارت شرعیہ کے نہج پر چلتے ہوئے ان کے وسیع وعظیم افکار کو پروان چڑھاتے رہے، کبھی انہوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا، بلکہ ہمیشہ اپنے مقاصد کو پانے اور ملت کے عظیم سرمایہ کو آگے بڑھانے کیلئے تابناک مستقبل پر نگاہ رکھی۔ ان کے کام، ان کی ہمت اور ان کی فکر سے آشکارا ہوتا تھا:

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تین صدور مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور موجودہ صدر مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ ملت کی بقاوتحفظ اور پرسنل لا کے لیے مثالی جدوجہد پیش کی۔ 1991 میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دوسرے جنرل سکریٹری مقرر ہونے کے بعد اپنی اس ذمہ داری کو بھی بحسن وخوبی نبھا کر قیادت وسیادت کی نئی مثال قائم کی۔ قارئین اس بات سے واقف ہیں کہ بورڈ میں مختلف فرقوں اور مختلف جماعتوں کے نمائندے ہوتے ہیں، اس لیے اختلاف رائے کا ہونا کوئی بعید نہیں ہے، اس کے باوجود تقریباً اپنے 25 سالہ جنرل سکریٹری رہنے کے دور میں اپنی خداداد صلاحیت اور حسن اخلاق کے سبب بورڈ میں انتشار نہیں ہونے دیا اور اس کے وقار کا مکمل خیال رکھا۔

امیر شریعت مولانا نظام الدینؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ

کے شاگردوں میں سے تھے اور آپ کا روحانی تعلق بھی شیخ الاسلام سے ہی تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد مشہور دینی درس گاہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخلہ لیا اور متوسطات کی کتابیں پڑھیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے 1942 میں دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، جہاں سے 1946 میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی۔ 1947 میں دارالعلوم دیوبند سے تکمیل ادب کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن میں بحیثیت صدر مدرس 1962 تک انتظامی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ جب آپ مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی میں خدمات انجام دے رہے تھے تو اسی دوران 1958 میں حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی سے آپ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ جب مولانا رحمانی امیر شریعت رابع منتخب ہوئے؛ تو ان کی دوررس نگاہ نے قابل اور باصلاحیت علماء کا ایک ایسا گروپ امارت شرعیہ میں جمع کرنا شروع کیا جو حضرت کی وفات کے بعد اسلاف واکابر کے مشن کو پوری تندہی اور جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھانے اور افکار سجاد کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرسکے۔ ان ہی چنندہ شخصیات میں قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی نوراللہ مرقدہٗ اور امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحب (رحمہ اللہ) تھے۔ 1965 میں حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کو قاضی صاحبؒ کے اصرار پر امارت کی نظامت کا عہدہ پیش کیا گیا، پھر امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے انتقال کے بعد یکم نومبر 1998 کو اراکین شوریٰ امارت شرعیہ نے آپ کو امیر سادس اور قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کو نائب امیر منتخب کیا۔ تقریباً 50 سالوں تک ملت اسلامیہ ہند کی سیاسی، سماجی اور ملی قیادت کا فریضہ انجام دینے والے ملت کے اس عظیم میر کارواں کی زندگی کا سورج 17 اکتوبر کی شام کو ہمیشہ ہمیش کے لئے غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

امارت شرعیہ میں ان کی خدمات کی روایت بے لوث تھی جسے وہ پوری زندگی نبھاتے رہے، کوئی معاوضہ اور تنخواہ نہیں لیا، ذمہ داروں نے بہت زور دیا کہ طویل دور نظامت کے لئے پنشن کے طور پر کچھ مقرر کر دیا جائے، لیکن انہوں نے یہ بھی گوارہ نہیں کیا۔ بیت المال کے پیسے پیسے کی حفاظت پوری دیانت داری کے ساتھ کی، ذاتی زندگی میں وہ رقیق القلب بھی تھے اور سخی بھی، صبر و تحمل اور برداشت میں اپنی مثال آپ تھے۔ تواضع اور انکساری ان کی فطرت کا حصہ اور پوری زندگی خوبیوں اور اچھائیوں کا گلدستہ تھی، لیکن ان کی دو صفات سب سے نمایاں ہیں جو انہیں اوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک تواضع و انکساری اور امیر شریعت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے ادارے کے جنرل سکریٹری ہونے کے باوجود نام و نمود اور شہرت سے بچنا اور حساب و کتاب کے سلسلے میں اداروں کی امانت میں ہمیشہ محتاط رہنا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہنا حضرت کا خاص طرۂ امتیاز تھا۔ احتیاط کا عالم یہ تھا کہ بقول مولانا انیس الرحمٰن صاحب قاسمی ناظم امارت شرعیہ اگر نئی جھاڑو خرید کر لائی جاتی تو چپراسی سے پوچھ لیتے کہ پرانی جھاڑو ابھی چلنے کے قابل ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس کی کیا ضرورت پڑی؟ آپ نے پوری زندگی عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار کے ساتھ گزار دی، اتحاد امت، خدمت خلق، اصلاح معاشرہ اور پریشان حال لوگوں کی مدد آپ کی زندگی اور خدمات کے نمایاں عناوین ہیں جو تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔

القصہ مختصر یہ کہ حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود، امارت شرعیہ کی تعمیر و ترقی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی بقاء و استحکام سے عبارت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی ملی، سیاسی اور دینی بصیرت سے ہندوستان کے ان دونوں اہم ترین اداروں کو نئی جہت اور نئی شناخت ملی۔ رنج

و غم کے اس موقع پر یقیناً ہم حضرت کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن
ہاں وہی بہاریں رخصت ہوگئیں

بہار میں عظیم اتحاد کی تاریخی جیت فرقہ پرستوں کے منہ پر طمانچہ

2015 کے بہار اسمبلی انتخابات میں 'عظیم اتحاد' کی تاریخی جیت پر ہم ریاست کے عوام، عظیم اتحاد کے لیڈران عالی جناب نتیش کمار، عالی جناب لالو پرساد یادو اور محترمہ سونیا گاندھی کو دل کی گہرائی سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور بہار کے مسلمان اور امن پسند عوام کے جذبہ کو سلام کرتے ہیں، جنھوں نے عظیم اتحاد کو ووٹ دیا۔

اس اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کی شکست فاش دراصل آر ایس ایس جیسی فسطائی طاقتوں کی شرمناک ہار ہے، جس سے کہ ہندوستان کی جمہوریت اور امن و آشتی کو بڑا خطرہ لاحق ہے۔ آج بہار کے امن پسند عوام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان فرقہ پرستی نہیں بلکہ امن پسندی کا علم بردار ملک ہے اور یہی رنگا رنگی اور بقول شاعر:

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں

ہمارے ملک کا امتیاز ہے، جس کا خوبصورت پیغام بہار اسمبلی انتخابات کے نتائج نے دیا ہے، اس نتیجے نے دراصل سنگھ اور دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیموں کے منہ پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے فرقہ پرستوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

بے شک بہار اسمبلی انتخابات کا نتیجہ پورے ملک کے لئے ایک نیا پیغام ثابت ہوگا کیونکہ بہار وہ تاریخی سرزمین ہے جہاں کے علماء اور عوام نے ہر دور میں اور ہر تحریک کو نیا جوش اور نئی سمت دینے میں اہم رول ادا کیا ہے اور آئندہ بھی فرقہ پرستی کے خلاف شمشیر بے نیام ثابت ہوں گے۔ بہار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ولایت کے تاجدار اور انسانیت کے علمبردار شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ، مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ، رئیس القلم علامہ مناظر احسن گیلانیؒ، ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ، قائد ملت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ جیسی عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیات نے اپنے علم و عمل اور کارناموں سے پوری دنیا کو فیض یاب کیا اور ہندوستان میں قوم وملت کی قیادت فرمائی۔ سیمانچل ڈیولپمنٹ فرنٹ بہار کی مہم کا مقصد بھی سیکولر حکومت کا قیام تھا، جس کے لئے فرنٹ نے مسلسل جدوجہد کی اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ جس طرح سے 2015 کے بہار اسمبلی انتخابات میں سیکولر عوام بالخصوص مسلمانوں نے بے نظیر اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بی جے پی اور اس کی ہمنوا جماعتوں کو دھول چٹائی ہے اسی فارمولے کو دوسری ریاستوں میں بھی آزمایا جائے تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا ملک بھگوا رنگ سے مکمل آزاد ہوجائے گا۔

اس تاریخی اور پرمسرت موقع پر ہم امید کرتے ہیں کہ عالی جناب نتیش کمار، عالی جناب لالو پرساد یادو اور محترمہ سونیا گاندھی ہر طبقہ کو ساتھ لے کر بہار کو ترقی دیں گے اور بلاتفریق مذہب محض انسانی بنیاد پر سب کا خیال رکھیں گے۔ مسلمانوں نے جس طرح سے جناب نتیش کمار کو پانچویں مرتبہ بہار کی قیادت سونپنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس کا تقاضا

ہے کہ مسلم مسائل، تعلیمی ادارے اور مسلم اکثریتی علاقوں پر خصوصی توجہ دی جائے، بالخصوص مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی جس کا قیام 1989 میں ہوا تھا وہ آج بھی اپنے وجود کے لئے جدوجہد کررہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عالیجناب نتیش کمار صاحب جو اپنی کرشماتی شخصیت کے لئے مشہور ہیں اور ریاست کے مسلمانوں کو ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں وہ ان کی امیدوں پر کھرا اتریں تا کہ ریاست کے عوام جو انہیں دہلی کی کرسی پر وزیر اعظم کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کی یہ دلی تمنا بھی پوری ہوسکے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

❁ ❁ ❁

باب چہارم

جن کی خوشبو سے معطر تھا چمن

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سرخیل علماء

ہندوستان میں تحفظ دین وشریعت کی خاطر اسلامیان ہند کا ایسا مضبوط و مستحکم اور پرجوش اتحاد منظر عام پر آیا جسے شاید ہی چشم فلک نے دیکھا ہو۔ ملت اسلامیہ کو کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر ایک دھاگے میں پرونے کے لئے جن عالی مرتبت شخصیات نے راتوں کی نیند حرام کی اور دن کا چین وسکون تیاگ دیا وہ ہمارے لئے آج بھی چراغ راہ ہیں۔ ذیل میں چند نگہبان دین وشریعت کا تعارفی خاکہ پیش کیا جارہا ہے (جنہوں نے ملت کو مجتمع ومتحد کرنے کیلئے مسلم پرسنل لا بورڈ جیسی نمائندہ تنظیم قائم کی) تاکہ ان کے نقوش کار، بے نفسی اور کمال درجہ کی دردمندی سے استفادہ کیا جاسکے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

1972.................1983

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو قائم کرنے اور اسے ہمہ گیری عطا کرنے میں جن دو مرکزی کرداروں نے نمایاں رول ادا کیا تھا ان میں چند نمایاں شخصیت حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تھی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء جیسی عظیم تحریک کو پوری قوت کے ساتھ برپا کرنے کے لئے اس وقت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسی بابرکت، باعلم اور فکر ونظر رکھنے والی موزوں ترین کوئی دوسری شخصیت موجود نہ تھی۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے معاونین وعلماء کرام کے مشورہ وتعاون سے 1972 کے وسط میں ایک اجلاس دیوبند میں منعقد کیا جس میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اراکین، ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین قانون ودانشوروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اہل فکر ونظر کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے شریعت اسلامی پر خطرات کے منڈلاتے بادل، اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں اور حکومت کے منفی رویوں سے آگاہ کیا اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی اپنی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے حالات میں جب کہ قوانین اسلام اور ہماری شریعت پر شب خون مارنے کی تمام سازشوں سے ہم مطلع ہو چکے ہوں، کیا ہم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ ہم مکاتب فکر اور مسالک کی تمام دیواروں کو منہدم کردیں اور شریعت کے ہر ہر جز کی حفاظت کے لئے ایک ہو جائیں۔

حضرت حکیم الاسلام کی اضطراری کیفیت اور دردوغم میں ڈوبی ہوئی گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ اسی مجلس میں یہ طے پا گیا کہ ایک وفد بمبئی جائے اور ’’مسلم پرسنل لا کنونشن‘‘ کی تیاری کی فضا ہموار کرے اور یہیں سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا عملی طور پر آغاز ہوگیا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تحریک اور اس کی ابتدائی مہم میں سابق گورنر بہار جناب یونس سلیم، فقیہ العصر قاضی مجاہدالاسلام قاسمی، ڈاکٹر طاہر محمود وغیرہ شریک تھے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کی سرپرستی میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا منظور نعمانیؒ اور حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی پر مشتمل ایک وفد

ممبئی کے لئے روانہ ہوا اور شب وروز کی محنت وجدوجہد کے بعد بالآخر 28-27 دسمبر 1972 کا وہ تاریخ ساز دن بھی آیا جب ملت اسلامیہ کے پانچ لاکھ سے بھی زائد بزرگوں، جوانوں اور ہر مکتب فکر کے قائدین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بمبئی کنونشن میں موجود تھا۔ اس کنونشن کی غیر معمولی کامیابی اور اتحاد ویکجہتی کے عظیم الشان مظاہرے کے نتیجے میں ’’آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ‘‘ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس کے بانی صدر منتخب ہوئے۔

حضرت والاؒ کی ذات گرامی ہی تھی کہ جن کی بھاری بھرکم شخصیت نے مختلف الخیال قائدین اور عوام کو ایک دھاگے میں پرو کر مسلم پرسنل لا بورڈ کو ایک عظیم قوت میں تبدیل کردیا اور بورڈ کو مرکزی اتحاد کا ایسا نمونہ بنایا جو آج بھی اپنی افادیت وتاثیر کے اعتبار سے ثمر آور ہے۔ آپؒ تاحیات بورڈ کی صدارت فرماتے رہے۔ آپ کی وفات 17/جولائی 1983ء میں ہوئی اور مزار قاسمی دیوبند میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ

1972 1991

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی قوانین شرعی کی حفاظت اور اس کے عملی نفاذ کے لئے جس قدر بے چین ومضطرب تھے اس کا صحیح اندازہ تو ان کے رفقاء اور وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان کی صبح وشام، ان کا گفتار وکردار اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت قریب سے دیکھا ہو۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علمی، تحقیقی، تربیتی، تصنیفی، اصلاحی، تبلیغی، تحریکی کاموں میں علماء بہار کا اہم حصہ رہا ہے، امام منطق وفلسفہ صاحب سلم العلوم حضرت علامہ

محبّ اللہ بہاریؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، صاحب عون المعبود شیخ شمس الحق عظیم آبادیؒ، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے نقیب اور بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور مجاہد آزادی حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کردار ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے نقوش جمیل سے ایک جہان مستفید ہوا ہے، ادیب شہیر علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی علمی، تحقیقی و تصنیفی کارناموں کو کسی طرح نہیں بھلایا جاسکتا۔ اسی طرح لاتعداد علمائے دینِ متین اس سرزمین میں پیدا ہوئے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، انہی شخصیات میں سے حضرت اقدس مولانا بشارت کریم صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ، مولانا ولایت علیؒ اور مولانا یحییٰ علی عظیم آبادیؒ، شاہ ولی اللہ تحریک کے علم بردار بن کر سامنے آئے اور سب سے اخیر میں علم و ادب اور فقہ و شریعت کے رمز شناس حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے شاہ ولی اللہ تحریک کے میر کارواں کی حیثیت سے عالم اسلام میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی علماء و مفکرین نے علم و تحقیق کی بزم میں چار چاند لگایا اور دعوت و تبلیغ و اصلاح امت کو اپنا فریضہ جان کر زبردست محنت کی۔ صوبہ بہار کی دو عظیم شخصیتوں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اس خطہ میں کبھی دینی مزاج و ماحول کے لیے سرگرداں رہے تو کبھی رسوم و بدعات کے خاتمہ کے لیے گاؤں گاؤں کی خاک چھانتے رہے اور کبھی قادیانیت سمیت دیگر فرقۂ باطلہ کی سرکوبی کے لیے شب و روز ایک کرتے رہے۔ ان بزرگوں نے اصلاح معاشرہ اور فرقۂ باطلہ کی سرکوبی کے لیے مدارس و مکاتب کے قیام کی تحریک شروع کی، اصلاح معاشرہ و فرقۂ باطلہ کی سرکوبی کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے اندر ملی حمیت اور قوانین اسلامی کے نفاذ جو لو مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جلائی تھی اسے سخت سے سخت حالات اور تیز و تند آندھی میں بھی وہ روشن رکھنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام دشمن عناصر حکومت کے ذریعہ قوانین اسلامی پر شب خون مارنا چاہتے ہیں تو وہ برداشت نہ کرسکے اور اپنی بے چینی کا اظہار اس وقت کے طبقۂ علماء کے سرخیل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے کیا۔ پھر کیا تھا دونوں ہی بزرگوں نے اپنی فراست ایمانی، ملی غیرت اور عزم و ہمت و خود اعتمادی کے ساتھ ایک ایسی فضا تیار کی کہ دسمبر 1972 میں ممبئی میں ایک ایسا تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک ہزار سے زائد علماء و قائدین اور پانچ لاکھ سے زائد سامعین کا ایک ایسا اجتماع جہاں نہ کوئی دیوبندی تھا نہ کوئی بریلوی، نہ کوئی شیعہ تھا نہ سنی، بلکہ کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر جوش ایمانی کا بھرپور مظاہرہ کررہے تھے۔ اس اجلاس کے نتیجے میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا اور مولانا منت اللہ رحمانی اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے لے کر ملک کے ہر گوشے میں اس کا تعارف کرانے تک ہر جگہ مولانا رحمانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور گجرات سے بنگال اور آسام تک بورڈ کی مہمات اور تحریک کو جو بے مثال کامیابی ملی اس کے پیچھے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی پرکشش شخصیت اور جہد مسلسل کارفرما تھی۔ ممبئی، حیدرآباد، رانچی، پٹنہ، کلکتہ اور ملک کے بیشتر حصوں میں منعقد ہونے والے بے شمار بڑے بڑے اجتماعات میں شرکت کرنے والے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے کبھی بورڈ کی طرح پرتاثیر و پرہجوم اجلاس نہیں دیکھے۔''

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے بورڈ کو پوری ملت کی نمائندہ جماعت اور اس کو

ایک عظیم قوت میں تبدیل کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔اس کے علاوہ مسلم پرسنل لا بورڈ کوملت کے تمام طبقوں اور صاحب اقتدار کے گلیاروں میں جو وقار واعتماد حاصل ہے وہ انہی کے طفیل ہے۔ انہوں نے بیش قیمت لٹریچرس خود تحریر فرمائے اور کچھ دوسروں سے لکھوائے اور انہیں مختلف زبانوں میں شائع کرواکر مسلمانوں کو اپنے عائلی قوانین کے تحفظ کے سلسلہ میں شعور وفکر اور علم آگہی سے نوازا اور شریعت پر کسی بھی جانب سے ہونے والے حملوں کا دندان شکن جواب دینے میں ذرا بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ایک اہم علمی وشرعی کارنامہ ’’قوانین اسلامی کی تدوین‘‘ ہے جوانہوں نے ممتاز علماء، فقہاء اور ماہرین قانون کے ذریعہ مرتب کرائی ہے اور ان کی زندگی میں ہی یہ کتاب مکمل ہوگئی تھی۔ یہ کتاب دارالقضاء اور ملکی عدالتوں میں مستند ماخذ اور حوالہ کا کام دے گی جس میں عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین کی گئی ہے۔ یہ کتاب ان کتابوں سے بے نیاز کردے گی جو انگریزوں نے مسلم ماہرین سے لکھوائی تھی اور وہی کتابیں آج ملکی عدالتوں میں مقدمات کے فیصلہ کرنے میں معاون ومددگار ہیں۔

29/مارچ 1991ء میں آپ کی وفات ہوئی اور اپنے والد حضرت مونگیریؒ کے جوار میں خانقاہ رحمانی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

1983..................1999

ملت اسلامیہ کا متحدہ ومشترکہ پلیٹ فارم اور تحفظ دین وشریعت کا بے نظیر کارواں ’’آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ‘‘ طبقہ علماء کے سرخیل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں محوسفر تھا کہ اچانک 17/جولائی 1983 کو انتقال کا حادثۂ جانکاہ

پیش آیا۔ یہ حادثہ جہاں اسلامیان ہند کے لئے ایک المیہ تھا وہیں مسلم پرسنل لا بورڈ اور اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے لئے کسی امتحان وآزمائش سے کم نہ تھا۔ مولانا رحمانیؒ نے 28/دسمبر 1983 کو بورڈ کا سالانہ اجلاس مدراس میں بلایا اور منجدھار میں جانب منزل رواں دواں ملت کی اس کشتی کے کھیون ہار اور حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے جانشیں کی حیثیت سے مولانا رحمانیؒ کی ہی تحریک پر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کو منتخب کرلیا گیا۔ یوں تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بورڈ کے بانی رکن تھے، مگر منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد بورڈ کو جو عالم گیر شہرت، سواد اعظم کی سمع وطاعت اور مختلف میدان ہائے کار میں زبردست کامیابی ملی اس میں موصوف کے علم تفقہ، شعور وفکر اور داعیانہ کردار کا بہت بڑا دخل تھا۔ مولانا فراست ایمانی، دوراندیشی اور حکمت وتدبر کے ساتھ وقت کے نازک سے نازک مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا عہد صدارت 1983ء سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد ان کی ایماپر کلکتہ، دہلی، جے پور، احمد آباد، میرٹھ، پٹنہ اور ممبئی میں بورڈ کے عظیم الشان وتاریخ ساز اجلاس منعقد ہوئے جو بورڈ کے تعارف اور ملت کے دیگر مسائل کو حل کرنے میں بے حد مدد ومعاون ثابت ہوئے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا معاملہ آیا، شاہ بانو کیس کے ذریعہ شریعت میں ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی اور شیلا نیاس سے لے کر بابری مسجد کے انہدام تک کا حادثۂ جانکاہ بھی پیش آیا اور وندے ماترم کا شوشہ بھی کھڑا کیا گیا، ہر مسئلہ پر حضرت مولانا علی میاں ندوی نے شریعت محمدی اور تشخص اسلامی کے تحفظ کو ملحوظ رکھا اور اغیار وفرقہ پرست قوتوں کو دوٹوک انداز میں دندان شکن جواب دیا اور اپنے موقف کو نہایت مضبوط ومدلل انداز میں پیش فرمایا۔

اپریل 1985 میں سپریم کورٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ (125) کا سہارا لے کر شاہ بانو مقدمہ میں مسلم مطلقہ خاتون کو زندگی بھر یا تا نکاح ثانی شوہر پر نان ونفقہ لازم قرار دینے کا غیر شرعی فیصلہ دے دیا جو شریعت اسلامی پر براہ راست حملہ تھا۔ حضرت موصوف اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ چونک پڑے بلکہ لرز گئے اور انتہائی سخت حالات میں صدائے احتجاج بلند کی۔ 2رفروری 1986 کو وزیر اعظم راجیو گاندھی اور دیگر سیاسی وقانونی حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ اس مسئلہ پر ایک طرف غیر مسلم تنظیمیں اور نام نہاد حقوق نسواں کی علمبردار جماعتیں بورڈ کے آمنے سامنے تھیں تو دوسری طرف کچھ روشن خیال ونام نہاد مسلم دانشوروں سے بھی بورڈ کا سابقہ تھا۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی قیادت میں بورڈ نے ملک گیر ایجی ٹیشن شروع کیا۔ ملک کے چپہ چپہ میں اس تحریک نے انقلاب برپا کر دیا جس کے نتیجے میں ہزار مخالفتوں کے باوجود پارلیمنٹ کو ’’قانون حقوق مسلم مطلقہ 1986‘‘ پاس کرنا پڑا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی اس زبردست کامیابی کے پیچھے دراصل حضرت مولانا علی میاں ندویؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی جرأت مندانہ قیادت اور صبر آزما جد وجہد کارفرما تھی۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ 17رسال تک مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت وصدارت کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، بلاشبہ ان کا دور صدارت مسلمانان ہند کے لئے نہایت مبارک ومسعود اور منظّم ومتحد رہا، حضرت مولانا نے مرکز اتحاد کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا بورڈ کو نئے افق اور نئی وسعتیں عطا کی ہیں اور ان کی وجہ سے بورڈ کو وقار واعتماد حاصل ہوا ہے۔ صد افسوس کہ علم وفضل کا یہ روشن چراغ 31ردسمبر 1999 کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا اور آپ کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں سپرد خاک کیا گیا۔

فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

2002.................2000

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی ابتدائی مہم سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک اپنی علمی، فکری اور عملی جد وجہد سے بورڈ کو مسلسل تقویت پہنچاتے رہے ہیں۔ انہوں نے بورڈ کو درپیش مختلف چیلنجوں کا دنداں شکن جواب دیا۔ بورڈ کے قیام کے وقت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے دست وبازو کی حیثیت سے ان کے جملہ علمی وفکری کاموں کو انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے سلسلہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے جو خصوصی میٹنگ دیوبند میں بلائی تھی، حضرت قاضی صاحب اس میٹنگ میں بھی موجود تھے اور اس تاریخ ساز میٹنگ میں تاریخی تجاویز بھی انہوں نے ہی پیش کی تھیں اور ممبئی میں ’’مسلم پرسنل لا کنونشن‘‘ کی تیاری اور اسے مفید ومؤثر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے شاہ بانو کیس کا مسئلہ آیا تو بورڈ کے قائدین چونک پڑے اور اسے شریعت میں مداخلت تصور کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اس کے خلاف جمہوری طریقے پر احتجاج کریں گے اور شرعی قانون پر نئے قانون کی بالادستی سے عوام کو بھی باخبر کریں گے۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے ایک وفد ترتیب دیا جس نے ملک بھر کے دورے اور جلسوں کا پروگرام بنایا۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور پنجاب سے آسام تک بورڈ کے جس وفد نے ملک میں کہرام مچادیا اس میں اپنے پیش رو کے ساتھ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی پیش پیش تھے۔ کہیں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ہمراہ اور کہیں مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شراکت میں اور بہت سی جگہوں پر خود میر کارواں رہے اور

اپنی علمی بصیرت، مخصوص لب ولہجہ اور انداز خطابت سے ملک کے کونے کونے میں ایسا جادو جگایا کہ بورڈ امت مسلمہ کی آواز بن گیا۔ حضرت قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا تعارف نہایت واضح اور مدلل انداز میں کیا۔ اس موضوع پر ان کی لکھی ہوئی گراں قدر تحریر کتابی صورت میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے جے پور کے اجلاس میں نظام دارالقضاء کے قیام سے متعلق تجویز منظور کی اور حضرت قاضی صاحب کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ قاضی صاحب نے اس کے لئے نہ صرف یہ کہ کئی دارالقضاء قائم کئے بلکہ امارت شرعیہ کی نگرانی میں ایک بے مثال ادارہ بھی قائم فرمایا جہاں ممتاز فضلاء کو قضاء وافتاء کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی نگرانی میں عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین کا کام شروع کیا تھا جو مولانا رحمانی کی زندگی میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا، اس اہم علمی کام میں بھی حضرت قاضی صاحب شریک رہے اور امارت شرعیہ کے اپنے چند رفیق کار کے ساتھ اس کی تکمیل میں کلیدی رول ادا کیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے دوسرے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے انتقال کے بعد 23/اپریل 2000 کو جب ارباب حل وعقد نے باتفاق رائے قاضی صاحب کو بورڈ کا صدر منتخب کیا تو اس کو ملک وبیرون ملک کے علماء قائدین نے ’’حق بحقدار رسید‘‘ کہا اور نہایت اطمینان کا اظہار کیا۔ میڈیا نے اس انتخاب کو بڑی اہمیت دی اور شاید ہی کوئی خبر رساں ایجنسی ہوگی جس نے اس خبر کو نمایاں نہ کیا ہو۔ بورڈ کی صدارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد سے انہوں نے بورڈ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ بورڈ کو متحرک وفعال بنانے میں آپ کی جدوجہد ناقابل فراموش ہے، آپ کی کوشش کے نتیجہ میں ہی بورڈ کو مستقل دفتر نصیب ہوا۔ 2002 میں علم وعمل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

2002..................تا حال

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کی وفات کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لیے ذمہ داران بورڈ کے متفقہ فیصلے سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت فیوضکم کا حسن انتخاب عمل میں آیا۔ آپ نے بورڈ کی صدارت جس شان سے فرمائی اس سے مسلم پرسنل لا بورڈ کی اہمیت اور اس کے اثر ورسوخ میں بے پایاں اضافہ ہوا۔ آپ نے بابری مسجد سے دستبرداری کے سلسلے میں نہ یہ کہ سخت گیر ہندوؤں کی مخالفت کی، بلکہ بعض نام نہاد مسلم دانشوروں کی رائے کو بھی مسترد کیا اور آنند سرسوتی کانچی پیٹھ شنکر آچاریہ کو گھٹنا ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ آپ کی صدارت میں 21 تا 23 جون 2002 کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا 16واں اجلاس چار مینار حیدرآباد میں منعقد ہوا جس میں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی کوششوں پر روک لگانے کے لیے متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔

آپ ہی کی صدارت میں 17واں اجلاس ایک اور دو مارچ 2003 کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں منعقد ہوا، جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ پر منڈلاتے خطرات کو ٹالنے کی حکمت عملی پر غور وخوض کیا گیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کا 18واں اجلاس بھی آپ ہی کی صدارت میں تاج المساجد بھوپال میں مورخہ 29/اپریل تا یکم مئی 2005ء میں منعقد ہوا۔ بورڈ کا 19واں اجلاس 10 تا 12/جنوری جنوبی ہند کے شہر چنئی میں منعقد ہوا۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا 20واں اجلاس آپ کی صدارت میں مورخہ 29/فروری تا 2 مارچ 2008ء کو کولکاتہ پارک سرکس میں منعقد ہوا۔ اب تک ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۶ء تک کل ۹/اجلاس عام آپ کی صدارت میں ہو چکے ہیں جس میں ملک کے گوشہ

گوشہ سے بورڈ کے مندوبین نے شرکت کی اور بورڈ کی طرف سے پیش کردہ تجاویز پر اتفاق رائے قائم ہوا۔آج بھی مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کے عائلی مسائل کے تحفظ کے حوالے سے آپ کی قیادت میں سرگرم عمل ہے،اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے سایہ کو تادیر ملت اسلامیہ کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔(آمین)۔

حضرت مولانا سید نظام الدینؒ

جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

1991........................2015

مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے وصال کے بعد اراکین بورڈ کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو نہایت ذمہ داری اور بنا کسی تھکاوٹ اور اکتاہٹ کے عرصہ دراز سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے دست راست بن کر امارت شرعیہ کے منصب نظامت اور پھر امیر شریعت بن کر گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔تیس برس تک امیر شریعت رابع حضرت مولانا رحمانی کی نگرانی میں کام کا تجربہ،ان کی فکری مسلک ومشرب سے واقفیت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک میں ابتداہی سے شرکت کے سبب حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کو بورڈ کو متحرک وفعال رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔اس لئے بھی کہ انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ جیسے بلند پایہ عالم دین اور عالم اسلام کی معروف شخصیت کے تعاون وحمایت میں کام کرنے کا موقع ملا جن کی بھاری بھرکم شخصیت مرکز اتحاد بنی ہوئی تھی۔

انہیں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی جیسے رفیق کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا ہے جن کے ساتھ طویل مدت سے ذہنی وفکری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق رہا ہے۔مولانا مجاہد الاسلام قاسمی اور مولانا سید نظام الدینؒ نے مشترکہ طور پر امارت شرعیہ

بہار واڑیسہ کے دائرۂ کار کو جو وسعت دی ہے وہ بلاشبہ امارت کی تاریخ سنہرا باب ہے۔

حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کی سرکردگی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا احمد آباد اور ممبئی میں عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا جو اپنی اہمیت وافادیت اور تاثیر کے لحاظ سے نہایت اہم اور تاریخ ساز اجتماع تھا۔مولانا کی نگرانی میں بورڈ نے بابری مسجد ودیگر مقدمات کی کامیاب پیروی کی ہے۔17/اکتوبر 2015ءکو 88 سال کی عمر میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔انتقال کے وقت آپ امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے علاوہ متعدد اداروں کی سرپرستی فرمارہے تھے۔نائب امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور بہار کی راجدھانی پٹنہ کے ''حاجی حرمین'' قبرستان میں لاکھوں سوگواران نے نم آنکھوں سے آپ کو سپرد خاک کردیا۔

فقیہ العصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا سانحۂ ارتحال

رفتہ رفتہ اٹھ رہی ہیں ہستیاں بے نظیر
دل کا شاد بڑھتا جارہا ہے پیہم اضطراب

فقیہ العصر قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ملت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم حادثۂ فاجعہ ہے۔ موت تو برحق ہے ہر کسی کو ایک نہ ایک دن اس دنیا کو الوداع کہنا ہے، لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی موت ایک ایسا خلا پیدا کرتی ہے جس کا پر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ بہت کم ایسی ذات ہوتی ہیں جن کے اندر تمام کمالات یکجا، تمام خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری اور مشکل حالات میں امت مسلمہ کی رہنمائی کرنے کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہو، ایسی ہی تمام صفات کی حامل حضرت قاضی صاحب کی ذات گرامی تھی۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد صوبہ بہار کی مشہور دینی درسگاہ خانقاہ جامعہ رحمانی مونگیر بہار سے درس وتدریس اور اپنی عملی زندگی شروع کی تھی۔ آپ اپنی علمی کاوش، خداداد صلاحیت، ذوق سلیم اور قابل رشک تحریر وتقریر کی

صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے چہیتے بن گئے۔ حضرت امیر شریعت کی دوررس نگاہوں نے یہ جان لیا تھا کہ یہ نوجوان ایک دن ملت کی رہنمائی اور بکھری ملت کو متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔ اسی لئے امیر شریعت نے قاضی صاحب کو امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ قاضی صاحب نے ذمہ داری سنبھالتے ہی اس کی کایا پلٹ دی اور امارت شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اس کا دائرہ قصبہ قصبہ، قریہ قریہ تک وسیع ہوا۔ آج مسلمان اپنے عائلی مسائل اسی نظام قضاء کے تحت حل کرتے ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے ہی اس کے رکن رکین رہے اور اخیر میں عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے جو بھی مسئلہ آیا اس کو حل کرنے میں فعال اور قائدانہ کردار ادا کیا ۹۰-۱۹۸۹ء میں جب مرکز میں وی پی سنگھ اور بابری مسجد کا مسئلہ درپیش تھا، تو کئی رہنماؤں مثلاً یونس سلیم (گورنر بہار)، سید شہاب الدین، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ کے ساتھ اس کو حل کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی تھی لیکن مسلم رہنماؤں کی صفوں میں انتشار، اس سے الگ ہو کر ایک گروپ کا وی ایچ پی کے ساتھ مذاکرات کرنا، وی ایچ پی کا اپنے قول سے انحراف وغیرہ نے بابری مسجد کو انہدام تک پہنچایا۔ اس سے پہلے قاضی صاحب نے شاہ بانو کیس میں ملت اسلامیہ کو بیدار اور متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ملت کو بیدار اور یکجا کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان بھر کا طوفانی دورہ کیا اور جلسے جلوس منعقد کئے جس کی وجہ سے راجیو گاندھی کی حکومت ایک نیا بل پارلیمنٹ میں پیش کرنے پر مجبور ہوئی اور قانون پاس بھی ہوگیا۔

قاضی صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ شہرت سے دور رہ کر ملت کے درپیش مسائل حل کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے اور اس کے لئے وہ شعبہ ہائے زندگی کے مختلف

مکتب فکر کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرتے تھے اور وہ کامیاب بھی ہوتے تھے۔اسی جذبہ کے تحت قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کی کرسی سنبھالی تو جمعیۃ علماء سمیت دیگر تنظیموں کے سربراہان سے ملاقات کی، جو مسلم پرسنل لا بورڈ سے دوری بنائے ہوئے تھے اوران سے تعاون چاہا۔

جب سیاہ قانون ٹاڈا ملک پر مسلط کیا گیا اوراس کا شکار بے قصور مسلمان ہوئے تو قاضی صاحب نے اس سلسلے میں زبردست جدوجہد کی اور آل انڈیا ملی کونسل کے بینر تلے کئی کامیاب کنونشن کرکے ٹاڈا کے خلاف عوامی بیداری کی مہم شروع کی اور سیاسی لیڈروں کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کیا جس کی وجہ سے حکومت اس کی میعاد میں اضافہ کرنے سے باز رہی۔حضرت قاضی صاحب کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی بھی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتے تھے، امارت شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ان کا سب سے بڑا کارنامہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا قیام ہے جس کے تحت ملت کے درجنوں حل کے متقاضی مسائل حل ہوئے اوراس ادارے نے مختصر مدت میں علم وتحقیق اور فقہ وفتاویٰ کی دنیا میں ہلچل مچادی۔

راقم الحروف کو بارہا حضرت قاضی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، دوران تعلیم بھی جب قاضی صاحب سجاد لائبریری جو بہار، اڑیسہ، نیپال کے طلبہ کی مرکزی انجمن ہے، کے پروگراموں میں آتے تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی جب جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے سلسلے میں صلاح ومشورہ کے لئے حضرت قاضی صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔قاضی صاحب مفید مشوروں سے نوازتے تھے اور سرپرستی بھی فرماتے تھے۔آخری ملاقات آپ سے اپولو اسپتال نئی دہلی میں ہوئی۔قاضی صاحب بستر علالت پر ہونے کے باوجود اور نقاہت کے عالم میں فرمایا تھا کیا حال ہے جامعۃ القاسم کا۔کیونکہ قاضی صاحب نے کام کرنے والے نوجوانوں میں بندۂ فقیر اور جامعۃ القاسم سے بے حد متاثر

تھے، جبکہ مہلک وموذی مرض نے گھیر رکھا تھا،لیکن قاضی صاحب کے عزم اور قوت ارادی میں ذرہ برابر اضمحلال پیدا نہیں ہوا تھا، کاش حضرت قاضی صاحب کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو ملت کے بہت سے حل طلب مسائل حل ہو چکے ہوتے، اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کے درجات کو بلند فرمائے اوران کے دینی وملی کارناموں کو قبول فرمائے (آمین)۔

بدل جائے نظام ہر دو عالم آن واحد میں
گر کوئی ضد پر آجائے دیوانہ محمدؐ کا

❁ ❁ ❁

محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ

عالم اسلام منبع علم وعرفاں سے محروم

ولادت: ۲۰؍دسمبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ – وفات: ۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۷؍مئی ۲۰۰۵ء

گزشتہ چند برسوں میں سلوک وتصوف میں مقام معرفت کو پہنچ جانے والی ہستیاں، علوم اسلامی اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں نمایاں کارنامہ انجام دینے والی شخصیات اور اسلام ومسلمانوں کے تحفظ وبقا اور شوکت ملی کے لئے کام کرنے والے علماء ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہوگئے اور وہ سخت دن بھی ہمیں دیکھنا پڑا جب علوم ومعرفت کے بحر بیکراں اور سلسلۂ تھانوی کے آخری چشم وچراغ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی ہردوئیؒ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اِنَّا للّٰہ وانا الیہ رَاجعُون۔

راقم الحروف ان دنوں ''معارف قاسم جدید'' کے ''سیرت النبیؐ نمبر'' کی تیاری میں مصروف تھا کہ اس خبر جانکاہ نے پوری ملت سمیت مجھے بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نمناک آنکھوں سے اس عظیم شخصیت کے حوالے سے چند سطور اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ حضرت ہردوئیؒ کی پوری زندگی احیاء سنت اور طریقۂ نبوی کو عام کرنے میں لگی رہی۔ حضرت ممدوح خود چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کرتے اور اپنے متعلقین اور منتسبین کو بھی عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے۔ اس مناسبت سے بطور ضمیمہ سیرت النبیؐ نمبر میں عاشق رسولؐ حضرت ہردوئیؒ کے تعلق سے چند تاثرات پیش کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم وخوشی اور راحت وتکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، نہ یہاں صرف خوشی ہے اور نہ صرف غم اس لئے یہاں غموں اور صدموں کا پیش آنا کوئی اچنبھے کی بات اور نہ کوئی غیر معمولی امر، تاہم بعض ایسے صدمے رونما ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری ملت پہ پڑتا ہے اور ان کے عالم گیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۷؍مئی ۲۰۰۵ء کو ایک ایسا ہی عظیم صدمہ بزم اشرف کے آخری چراغ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب حقی کی وفات کا پیش آیا جس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، افریقہ، بنگلہ دیش اور عرب ملکوں میں اقامت گزیں ان کے لاکھوں مریدوں کو نہ صرف غم زدہ کر دیا بلکہ اس صدمے سے دنیائے انسانیت اس طرح لرز اٹھی کہ اس کو معمول پر آنے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔

ولادت وسلسلۂ نسب:

آپ کی ولادت ۲۰؍دسمبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو شہر ہردوئی (یوپی) میں ہوئی، آپ کا آبائی وطن دہلی کے قرب وجوار میں واقع مقام ''پلول'' ہے، آپ کے آبا واجداد نقل مکانی کر کے ہردوئی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے اور ہردوئی کو حضرت کی نسبت سے عام شہرت ملی۔ آپ کے والد ماجد جناب محمود الحقؒ صاحب تھے جن کا ہردوئی کے معروف ومشہور وکیلوں میں شمار ہوتا تھا۔ آپ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے مجاز صحبت تھے۔ یہ مزاج دراصل انہیں وارثتاً ملا تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب خانوادہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے جاملتا ہے اس وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ حقی کی نسبت لگی ہوتی ہے۔

تعلیم وتربیت کا آغاز:

آپ کی تعلیم کا آغاز حضرت مولانا سید اصغر میاں دیوبندیؒ نے کرایا، آٹھ سال کی عمر میں ہی حفظ قرآن کریم سے بہرہ ور ہوگئے تو مزید تعلیم حاصل کرنے کی خاطر ''انجمن

اسلامیہ“ کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور حضرت مولانا انوار احمد انبیہٹوی مظاہری سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد تکمیل علوم کے لئے دس سال کی عمر میں مدرسہ عالیہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور نحو میر سے دورۂ حدیث شریف تک باضابطہ شبانہ روز محنت ومشقت سے تکمیل علوم کی اور اول نمبر سے کامیاب ہوکر گراں قدر انعامات کے مستحق ٹھہرے۔

۱۳۵۷-۱۳۵۸ھ کے دو سالوں میں آپ نے تکمیل فنون کی جن میں منقولات سے بڑھ کر معقولات کی اعلیٰ ترین کتابیں پڑھیں اور ان میں بھی امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کر کے بیش قیمت کتابوں کے ساتھ پانچ سو روپیہ کا نقد انعام بھی حاصل کیا۔

اساتذہ وشیوخ:

آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید عبداللطیف صاحب سابق ناظم (مظاہر علوم) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری (صدر المدرسین) حضرت مولانا محمد زکریا صاحب (شیخ الحدیث) حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، حضرت مفتی سعید احمد صاحب (صدر مفتی) حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی اور حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دور طالب علمی میں ہی حضرت ہردوئیؒ خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے تھے۔ حکیم الامت کی دور رس نگاہ نے آپ کے جوہر کی شناخت کرلی تھی اس وجہ سے عام معمول کے خلاف عین آغاز شباب میں صرف ۲۲ سال کی عمر میں نہ صرف سلوک وارادت کی منزلیں طے کرادیں بلکہ خلعت خلافت سے بھی آراستہ فرمایا اور زندگی کے ہر گام بھرپور رہنمائی کی، حکیم الامت کی رحلت کے بعد حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ سے وابستہ رہے، پھر ان کی وفات کے بعد شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری سے انتساب بیعت کیا پھر قطب عالم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ سے تعلق رہا۔ ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی سے فیض یاب ہوتے رہے۔

تدریسی ودعوتی خدمات:

۱۳۵۸ھ میں تکمیل فنون سے فراغت کے بعد مظاہر علوم ہی میں معین مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ بعد حضرت حکیم الامتؒ کی ایماء پر حضرت ہی کے قائم کردہ مدرسہ ”جامع العلوم“ کانپور تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال تک مسند درس پر فائز رہے۔ پھر دو سال بعد حضرت ہی کے اشارہ پر فتح پور ہنسوا کے ”مدرسہ اسلامیہ“ میں دو سال تشنگان علوم ومعارف کو سیراب کرتے رہے۔ ۱۳۶۲ھ میں حضرت حکیم الامتؒ کے حکم سے اپنے وطن ہردوئی تشریف لائے اور اشرف المدارس کی داغ بیل ڈالی اور طویل عرصہ تک وسطیٰ تک کی کتابیں بذات خود پڑھاتے رہے اور اخیر تک اپنی حیات کو اس خدمت کے لئے وقف کئے رہے۔ ۱۳۷۰ھ میں احیاء سنت اور قمع بدعت کے مشن کو فروغ دینے کی خاطر ایک ”مجلس دعوۃ الحق“ قائم کی جس کے ذریعہ تشنگان علوم ومعارف کی سیر چشمی اور عاملین راہ صفا کی راہنمائی کا فریضہ تاحیات انجام دیتے رہے۔

طرز زندگی اور کارنامے:

حضرت علیہ الرحمہ کی زندگی کے شب وروز قرآن وسنت کے مطابق تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بیسویں صدی کے آخری تین چار دہائیوں اور اکیسویں صدی کے آغاز میں جتنا حضرت ہردوئی نے انجام دیا وہ کسی اور کے حصہ میں کم ہی آیا۔ ان کی نظر کرامت چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں پر ہوتی، وہ دنیا کے کسی عمل کو آخرت سے خارج تصور نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی باتوں اور کاموں کو بھی انہوں نے سنت کے مطابق کرنے کی تاحیات ترغیب دی، اذان واقامت اور سلام وآداب سے لے کر مسلمانوں کے مردہ جسم کو قبر میں لٹانے تک کی تمام جزئیات پر ان کی جتنی روک ٹوک تھی اس کی جسارت بہت کم علماء میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہی خصوصیات کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے آپ

کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا اور آپ کے فیضان سے ملک و بیرون ملک کے سبھی باشندگان مستفید ہوئے۔ جو بھی آپ کی مجلس میں ایک مرتبہ حاضر ہوا زندگی بھر کے لئے آپ کا گرویدہ ہو گیا اور اپنی زندگی میں انقلاب محسوس کیا۔

الحمد للہ راقم الحروف نے بھی حضرت اقدسؒ کی متعدد مجالس میں شریک ہو کر استفادہ کیا ہے۔

سب سے پہلے جب حضرتؒ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں مربی و محسن حضرت الاستاذ، فقیہ الاسلام مفتیٔ اعظم مفتی مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت والا نے اپنے بیان کا آغاز اس شعر سے شروع فرمایا

نقش قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

پھر احیائے سنت کے مسائل پر بصیرت افروز خطاب فرمایا۔ مجلس کے اختتام پر ایک طالب علم آیا اور حضرت سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ”سلام علیکم“ کہا تو حضرت نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا لیکن اور فرمایا کہو ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ پھر آپ نے مصافحہ کیا۔

دوسری مرتبہ دریا گنج دہلی میں حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب حضرت والا جناب الیاس صاحب کے دولت کدہ پر فروکش تھے، یہاں حضرت والا کے ساتھ عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم بھی موجود تھے۔ یہاں بھی حضرت والا نے چھوٹی چھوٹی سنتیں جن کی طرف بے توجہی عام ہوتی جارہی ہے اپنانے پر زور دیا۔

تیسری مرتبہ حج بیت اللہ کے موقع پر ملاقات ہوئی اور کئی مجالس میں حضرت والا

سے استفادہ کا موقع ملا۔ اس مبارک سفر میں جناب قاری خلیق اللہ صاحب بستوی (مقیم مکہ مکرمہ) اور حضرت اقدس مولانا قاری امیر حسن صاحب مدظلہ العالی خلیفہ ومجاز شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ رفیق سفر تھے۔ ایک مجلس ”میزاب رحمت“ کے سامنے باب میزنہ میں لگی، جس میں حضرت قاری امیر حسن صاحب نے کہا کہ حضرت کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میری دوسری اولاد کا مسئلہ تو حل ہو گیا، میاں مولوی ابرار الحق کا کیا ہوگا، لیکن اللہ نے آج وہ مقام عنایت فرمایا کہ اس سفر میں دیگر خاندان کے کئی لوگ حضرت کے مصارف سے ہی سفر حج میں شریک ہیں۔ اسی مجلس میں دو صاحبان جن میں سے ایک کی سزائے موت اور دوسرے کی عمر قید کا فیصلہ ہو چکا تھا ان کے متعلقین حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا، حضرت والا نے انہیں ”یا سبوح یا قدوس یا غفور یا ودود“ کو تین سو تیرہ دفعہ ہر دن پڑھنے کا حکم فرمایا۔ ابھی اس کی مدت پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ ان کا فیصلہ واپس لے لیا گیا اور وہ بری ہو گئے۔ یہ حضرت والا کی کرامت کا ہی ثمرہ تھا۔

حضرت والا جن سے خصوصی محبت فرماتے تھے ان میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی، عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی، حضرت فقیہ الاسلام مولانا مفتی مظفر حسین صاحب رحمہم اللہ، خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، عارف باللہ حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

باضابطہ فیض یافتگان:

آپ سے باضابطہ فیض یافتگان کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مجازین بیعت (۲) مجازین صحبت۔ مجازین بیعت کی تعداد ۱۰۳ ہے اور مجازین صحبت ۳۶ ہیں۔ مجازین بیعت

ہندوستان میں ۶۰، پاکستان میں ۶، انگلینڈ میں ا، امریکہ میں ا، افریقہ میں ۳، سعودی عرب میں ۵ اور بنگلہ دیش میں ۲۷ ہیں۔ جس میں عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب پاکستان، مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلہ دیش، مولانا ایوب صاحب سورتی، انگلینڈ، مولانا یحییٰ صاحب بھام افریقی، مولانا سلیمان صاحب ڈھانچی، عبدالحق ڈیسائی صاحب افریقہ، جدہ میں انوار الحق صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب حیدرآبادی، اعجاز صاحب حیدرآبادی مدینہ طیبہ میں جناب منصور علی خاں صاحب اور مکہ مکرمہ میں قاری خلیق اللہ صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پسماندگان:

حضرت والا کے کل ۵؍ بھائی اور ا؍ بہن تھیں، دو بھائی بقید حیات ہیں۔ ایک پاکستان اور ایک علی گڑھ میں، حضرت کی اہلیہ محترمہ اور دختر نیک صالحہ باحیات ہیں، ۳ نواسے اور ۳ نواسیاں ہیں جن میں حضرت کے نواسے علیم الحق صاحب مجاز بیعت ہیں۔

حضرت کے صاحبزادے اشرف الحق جو نہایت متقی و پرہیزگار اور زیرک تھے۔ ۲۸ سال کی عمر میں ۱۹۷۵ء میں عالم ناسوت کو رحلت فرماگئے۔ خانوادۂ خانقاہ اشرفیہ کا آخری چراغ حضرت ہردوئیؒ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن وہ اپنے پیچھے اپنے اوصاف اور کارناموں کے ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جن کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا نئی نسل کی ذمہ داری ہے۔ انشاء اللہ حضرت مرحوم کی روشن تعلیمات مینارۂ نور کا کام انجام دیں گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے اور امت مسلمہ کو آپ کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

❁ ❁ ❁

شیخ الادب مولانا اطہر حسینؒ

(ولادت: ۱۳۵۲ھ - وفات: ۲۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۸ھ)

ایک زندہ حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں لیکن موت اس کی ہے جس کے پیچھے پوری دنیا روئے۔ سیدی و مربی بقیۃ السلف، حجۃ الخلف حضرت مولانا اطہر حسین رحمۃ اللہ علیہ کی نابغۂ روزگار شخصیت ایسی ہی تھی۔ 13؍ جولائی کو جب اپنے وطن مالوف سے دہلی آرہا تھا تو علی گڑھ ٹونڈلا کے درمیان آل انڈیا دینی مدارس کے صدر مولانا محمد یعقوب بلندشہری سے بغرض مزاج پرسی فون کیا تو انہوں نے ہی یہ جانکاہ خبر سنائی۔ حضرت مولانا کی وفات کی خبر سنتے ہی میں غم سے نڈھال ہوگیا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی زندگی کو مفلوج پایا۔ دہلی پہنچتے ہی جامعہ مظاہر علوم حاضر ہوا۔ اور حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھا۔

میری ملاقات حضرت مولانا سے 1983ء میں پہلی بار ہوئی اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت والا سے روحانی استفادہ کرتا رہا۔ آپ کی پوری زندگی تعلیم وتربیت کے لئے وقف تھی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ سہارنپور میں لکڑی کی

صنعت سے وابستہ لوگوں کو دین سے جوڑنا ہے، آپ کی وفات کے بعد شہر کے علماء اور دانشوران نے بیک زبان تسلیم کیا کہ سہارنپور نے آج ایک ایسے عالم کو کھو دیا ہے جن کی زندگی کا ہر لمحہ امت کی تربیت میں گزرتا تھا۔ جہاں آپ میدان سلوک وتربیت میں عظیم رتبہ کے مالک تھے وہیں آپ نے درس وتدریس میں بھی جو مقبولیت عامہ حاصل کی تھی وہ ہر اہل علم پر عیاں ہے۔ آپ کو اردو وعربی زبان پر یکساں عبور تھا۔ آپ عربی زبان وادب کے ماہر استاذ ہونے کے ساتھ استاذ حدیث بھی تھے۔ آپ کے درس سے طلبہ پوری طرح مطمئن ہو جاتے تھے، آپ کا تعلق جس خانوادے سے تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا، آپ کے ایک ہاتھ میں سلوک وتربیت کی کنجی تو دوسری طرف حدیث وفقہ میں مہارت !ع

عجب قیامت کا حادثہ ہے اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے افق پہ مہر جبیں نہیں ہے

آپؒ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب قدس سرہٗ سابق مفتیٔ اعظم مظاہر علوم سہارنپور کے فرزند ارجمند تھے۔ فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ صاحب مظاہری، سابق ناظم ومتولی مظاہر علوم وقف سہارنپور کے برادر خورد تھے اور میرے رفیق درس مولانا محمد سعیدی صاحب ناظم ومتولی مظاہر علوم وقف سہارنپور کے والد بزرگوار تھے!

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں، لیکن حضرت مولانا نے جو مشن اور نقوش چھوڑے ہیں ان کو زندہ رکھنا ہی ہم لوگوں کا عظیم سرمایہ ہے اور مولانا کے لئے صدقۂ جاریہ ہے، حضرت مولانا آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا مشن اور ان کے اہداف اور تربیتی نقوش ہمارے سامنے ہیں

جنہیں پورا کر کے حضرت کی روح کو تسکین پہنچا سکتے ہیں اور یہی ہماری طرف سے حضرت کے لئے سب سے بڑا خراج عقیدت ہے!

اخیر میں ہم آپ سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور مولانا کی وفات کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ جملہ پسماندگان کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ اور حضرت مولانا عبد اللطیفؒ صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور، فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ سابق ناظم ومتولی مظاہر علوم وقف سہارنپور کے جوار عافیت میں آسودۂ خواب حضرت مولانا اطہر حسین صاحبؒ استاذ حدیث وادب جامعہ مظاہر علوم وقف سہارنپور کے لئے مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام کی دعا مانگتے ہیں۔

یأ یتها النفس المطمئنة إرجعی إلیٰ ربک راضیةً مرضیة

غنچۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ سپول (بہار) میں تعزیتی اجلاس اور ایصال ثواب کے لئے مجلس کا انعقاد کرایا گیا اور جمعیۃ الامام قاسم التعلیمیہ الخیریہ الاسلامیہ دہلی میں بھی ایصال ثواب نیز ایک تعزیتی میٹنگ کا بھی اہتمام کیا گیا۔

اب مزید ہم اللہ عزوجل سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں جن کا تعلق نہ صرف ہم سے اور آپ سے بلکہ پوری امت سے تھا اپنی وسیع رحمت سے ڈھانپ لے، انہیں اصحاب جنت میں سے بنا دے اور انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اٹھائے اللہ ان کو اجر عظیم سے نوازے آمین ثم آمین۔

شہنشاہ زبان وقلم حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ

ولادت ۱۹۲۸ء وفات ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء مطابق ۱۹ربیع الثانی ۱۴۲۹ء

بندہ ساؤتھ افریقہ کے سفر میں تھا کہ مولانا محمد یوسف انور سکریٹری امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا نے مجھے فون پر یہ خبر دی کہ شہنشاہ زبان وقلم اوراس صدی میں علمائے دیوبند کی آبرو سمجھی جانے والی شخصیت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ خبر پوری دنیا کے لیے اندوہناک ہی نہیں بلکہ کربناک تو تھی ہی لیکن میرے لیے تو یہ ایسا حادثہ تھا جس کی کیفیت کو میں ہی محسوس کرسکتا ہوں۔حضرت شاہ صاحب کے انتقال کی خبر سن کر ذہن ودل میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔یقینی طور پر ایک فرد، ایک عالم دین ہی نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا،ایک ایسی ذات سے دنیا محروم ہوگئی جو خود میں انجمن تھی۔ وہ پوری زندگی اپنے زبان وقلم سے ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے جن کی خوبیوں اور گوناگوں خدمات کا احاطہ کرنا اس بے بساط قلم کی طاقت سے باہر ہے،ان کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کا غم تاحیات ستاتا رہے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا جو علمی مقام ہے اس پر یہ ناچیز قلم تو نہیں اٹھا سکتا البتہ

میری نگاہوں نے دیکھا ہے کہ مسند حدیث پر بیٹھ کر وہ کس طرح علم وتحقیق کی ندیاں بہاتے تھے۔ حدیث،اصول حدیث،فقہ،تفسیر،اصول تفسیر،فلسفہ اور تاریخ وتصوف کے باریک نکات کو اپنے شاگردوں کے سامنے انڈیل دیتے تھے۔وہ طلبہ کے سامنے درسیات کی باتیں کرتے اور سیاستدانوں کے سامنے سیاست کی لیکن ہر بات میں علم وحکمت کے لعل وگہر چھلکتے تھے۔وہ اپنے انداز وذوق کے منفرد شخصیت تھے۔جب تقریر کرتے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا،مجمع میں سناٹا طاری ہوجاتا تھا،کوئی عقل وخرد کی باتوں کو اخذ کرتا تو کوئی ان کے لب ولہجے اور راسٹائل پر متوجہ رہتا اور کوئی موتیوں کی طرح پروئے ہوئے جملوں کی ساخت پر دھیان دیتا،غرض ان کی تقریر ہشت رنگ ہوتی تھی اور ہر ذوق کے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔اسی طرح جب وہ قلم اٹھاتے تھے تو فصاحت وبلاغت ان کی باندی معلوم پڑتی تھی، عام طور پر علماء کی تحریروں میں عربیت وفارسیت کی ثقالت محسوس ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریروں میں چاشنی،روانی،سلاست اور جتنی اثر انگیزی محسوس ہوئی وہ کسی اور صاحب زبان کی تحریروں میں نظر نہیں آئی۔وہ تقریر بھی اپنے منفرد لب ولہجے میں کیا کرتے تھے اور تحریر بھی ان کی ڈھلی ہوئی ہوتی تھی۔ان کی زبان نہ اتنی آسان ہوتی کہ عامی معلوم ہو اور نہ اتنی مشکل کہ اسے سمجھنے میں دقت محسوس ہو،چنانچہ علماء کے علاوہ ادیب وشاعر اور قلمکار وصحافی بھی ان کی تحریروں کے عاشق تھے۔

حضرت شاہ صاحب اپنا ایک نظریہ اور موقف رکھتے تھے،جس کا اظہار وہ حدیث کا درس دیتے وقت بھی کرتے تھے اور دوسرے امور میں بھی اور اپنے موقف کے لیے وہ مضبوط دلیلیں بھی رکھتے تھے۔چنانچہ جب ائمۂ احادیث کی رائے کا ذکر کرتے تو اسی کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی قائم کرتے،اسی طرح چاہے معاملہ سیاسی امور سے متعلق ہو یا شرعی امور سے متعلق اس میں وہ اپنی بے لاگ رائے دیتے تھے،اسی طرح جب تقسیم

دارالعلوم دیوبند کا سانحہ پیش آیا تو اس وقت بھی وہ ان لوگوں میں نہیں رہے جو شورش کو صرف دیکھ رہے تھے اور غیر جانب داری کے خول میں اپنی خودساختہ تقویٰ بگھار رہے تھے بلکہ انہوں نے اول وقت میں ایک موقف اپنایا اور اس پر قائم رہے۔انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حق پر ہیں اس لیے ان کے ساتھ وفاداری کا ثبوت پیش کرتے رہے اور صبر وتحمل کا دامن نہیں چھوڑا، پریشانیوں اور بے بسی کے دور میں بھی حضرت شاہ صاحب ثابت قدم رہے، ہر طرح کی پریشانیاں جھیلیں لیکن علم دین اور علم حدیث کی خدمت کو ہی اپنے لیے باعث فخر سمجھا۔زندگی میں بے پناہ نشیب وفراز آئے لیکن حدیث، طالب حدیث سے اتنی محبت، اتنا لگاؤ کہ اپنا سب کچھ قربان کردیا، کسی چیز کی پروانہیں کی اور اپنے اصول پر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔احقر کا حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ سے گہرا ربط رہا ہے اور سفر وحضر میں رفاقت کا بھی شرف رہا ہے۔ اپنی خورد نوازی میں بے مثال تھے اور خوردوں کو آگے بڑھانے اور بننے وپنپنے کے گر سے واقف کراتے تھے۔جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی ترقی میں حضرت شاہ صاحب کے مشوروں کا بڑا دخل ہے، اللہ رب العزت نے انھیں بڑی ذہانت اور اصابت رائے سے نوازا تھا۔

بہر حال حضرت کے سلسلہ میں کیا تحریر کروں یہ تو دل کے جذبات ہیں جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سامنے آرہے ہیں۔حضرت کا اس دار فانی سے رخصت ہوجانا یقیناً ہمارے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔حضرت شاہ صاحب سے میری عقیدت تو اس وقت قائم ہوگئی تھی جب میرے اساتذہ ان کا غائبانہ ذکر کرتے تھے لیکن قریب سے انھیں دیکھنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب میں بطور طالب علم دیوبند پہنچا، شوق عقیدت نے بہت جلد ہی ان سے قریب کردیا، اس قدر قریب کہ تکلفات کی سبھی رکاوٹیں دور ہوگئیں اور یہاں تک

کہ کبھی کبھی ہم خودسر ہوجاتے۔شاہ صاحب اپنے چہیتے شاگردوں میں مجھے شمار کرتے، کبھی پذیرائی بھی کرتے تو کبھی دوران درس ہی ڈانٹ ڈپٹ دیتے، فراغت کے بعد بھی جب ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو ان کی نگاہیں ملتفت رہتیں اور میں اپنے آپ میں فخر وانبساط محسوس کرتا۔اب جی بیٹھا جارہا ہے کہ

اب وہ محبت وشفقت کا پھوارہ ہم پر کون لٹائے گا

کئی دہائیوں تک مختلف اسلامی علوم کا درس دینے والے حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار ونظریات پر بحث کی جائے تو یہ ایک طویل موضوع ہوگا کیونکہ وہ کئی امور میں اپنے پیش رووں سے اختلاف رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھیں متعدد بار تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ علماء کو دنیاوی امور سے باخبر بھی دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے درس وتدریس کے میدان میں بھی علم وخرد کے جواہر لٹائے اور دنیا وسیاست کے بام ودر کا جائزہ لیا اور جب جہاں کچھ منفی چیزیں محسوس کرتے تو فوراً اس سے متعلقہ شخص یا پارٹی کو مطلع کرتے اور اس پر تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔مولانا کی باضابطہ کانگریس پارٹی سے وابستگی تھی لیکن وہ بارہا کانگریس پارٹی سے اختلاف کرتے رہے اور کئی مواقع ایسے آئے جب انہوں نے پارٹی کے سربراہان پر تنقید بھی کی۔بلاشبہ وہ اپنے طرز وانداز کے نرالے آدمی تھے۔

مدارس اور علماء کے سرخیل حضرت شاہ صاحب ایک برس قبل اس وقت اخبارات کی شہ سرخیوں میں آئے جب انہوں نے حکومت کے مجوزہ مرکزی مدرسہ بورڈ کی زبردست حمایت کی، ہندوستان کے بڑے مدارس کے ذمہ داران اس بورڈ کی مخالفت کررہے تھے ایسے میں حضرت شاہ کا الگ لائن لینا بہت سوں کو گوارانہ ہوا اور تنقیدیں شروع کردیں، لیکن جن لوگوں نے نئی دہلی میں منعقد مرکزی مدرسہ بورڈ کے اجلاس میں ان کی تقریر سنی وہ پوری طرح ان کا قائل ہوگیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ حکومت کے مجوزہ مدرسہ بورڈ پر محض شکوک و

شبہات کی بنا پر خاک ڈالنا مناسب نہیں کیونکہ اگر علماء نے اس طرح کا رویہ اپنایا تو پھر کوئی بھی حکومت ہماری فلاح و بہبود کے لیے سامنے نہیں آئے گی۔ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں دو محاذ ہیں ایک کو ہم سیکولر کہتے ہیں اور دوسرے کو کمیونل، ظاہر ہے کہ ہمیں سیکولر محاذ کی حمایت بھی کرنی ہوگی اور اس سے ہی اپنی دادرسی بھی چاہنی ہوگی، اگر ہم نے کمیونل محاذ سے دشمنی کی اور سیکولر محاذ پر شک وشبہ کرتے رہے تو پھر ہمیں دونوں محاذوں پر خاک ڈالنا چاہیے اور جس دن مسلمانوں نے ایسا کیا تو پھر ہم علیٰحدگی پسند کہلائیں گے۔انہوں نے کہا تھا کہ حکومت جب کہہ رہی ہے کہ مرکزی مدرسہ بورڈ کا انتظام وانصرام علماء کے ہاتھوں میں ہوگا تو ہمیں اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہونے کے بجائے حکومت کو اپنی کارکردگی پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے، انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جس دن حکومت اپنے موقف سے روگردانی کرے گی اور مدارس کے مقاصد پر ضرب پڑے گی اس دن میں پہلا آدمی ہوں گا جو اس بورڈ کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے میدان میں آؤں گا۔افسوس کہ ان کے اس موقف کو علماء نہ سمجھ سکے اور نہ اس کی پذیرائی ہوسکی۔

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔راقم الحروف کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔جب ملاقات ہوتی تو محبت سے قریب بلاتے، کھانے کی فرمائش چاہتے، دوران گفتگو میرا عمامہ اور دراز جبہ ان کے مزاح کا موضوع بھی بنتا لیکن اکثر میں نے دیکھا کہ بے حد محبت سے پیش آتے اور مجھے اس پر فخر ومسرت کا یک گونہ احساس بھی ہوتا۔حضرت شاہ صاحب جامعۃ القاسم کا حال بھی معلوم کرتے اور بار ہا کہتے کہ مجھے اپنے مدرسے میں لے چلو لیکن جب جب میں نے درخواست کی ان کی اپنی مصروفیت حائل ہوگئی۔حضرت شاہ صاحب کے اندر بلا کی ذہانت تھی، وہ دس سال پرانے شاگردوں کے

نام بھی جانتے تھے اور کسی نہ کسی خاص ادا کے حوالے سے اس کو پکارتے تھے۔

اب شاہ صاحبؒ اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے علمی سرمایے ہی ہم سب کے لیے یادگار ہیں۔ان کی تصنیفات اور ملفوظات ہمارے لیے روشنی ورہنمائی کا کام دیں گے، اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحب کے مراتب بلند فرمائے۔آمین۔

فخر المحدثین حضرت علامہ محمد اکرام علیؒ

(۱۹۳۶ء وفات: ۸؍جنوری ۲۰۰۸ء)

آہ! گنجینۂ علوم سپرد خاک ہوا مگر دل ودماغ کے پردہ تک کو متاثر کرگیا۔

جس وقت حضرت علامہ محدث العصر، فرید الدہر، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، فقیہ زمن، امام الفنون حضرت مولانا علامہ محمد اکرام علی تادم آخر شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کے اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت کی خبر ملی تو دل ودماغ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا لگا متاع گرانمایہ کھوگیا، دیکھنے والوں کی نظروں کے مطابق بے خودی، بے صبری اور اضطرار واضطراب چہرہ سے عیاں ہونے لگا، ہوش وخرد نے ساتھ چھوڑ دیئے، ہائے افسوس چمن علم افسردہ ہوگیا، ہائے وہ علم حدیث کا آفتاب عالم تاب جو اپنی تمام تر رعنائیوں، دلکشی وتابانی کے ساتھ چار دہائی تک ضوفشانی کر رہا تھا غروب ہوگیا۔

محقق دوراں، حضرت علامہ، دنیائے علم حدیث کا بے تاج بادشاہ، تحقیق وتدقیق کے میدان کا عظیم ترین شہسوار، عہد حاضر میں میدان فصاحت وبلاغت کا بلاشرکت غیرے قابل فخر سپوت، نازش امت محمدیہ، آبروئے محدثین کے آخری پاسبان وترجمان، علمی دنیا کا

درخشندہ، ستارۂ درس وتدریس اور ائمہ ومحدثین کے رموز کا عالم بے مثل نہ رہا۔

از ہر ہند دار العلوم دیوبند کے تمام اکابرین کی تمام تر نکتہ سنجیوں کو اپنے دامن علم وفضل میں سمیٹے اپنے علمی وتدریسی سفر کا آغاز کیا۔ جامعہ رحمانی مونگیر بہار کے تدریسی ایام میں حضرت علامہ کے علوم وکمالات کے انکشافات وعلمی جلال وکمال کا ظہور جامعہ رحمانی کی درسگاہوں میں جب شروع ہوا تو ہر چہار جانب اس کی شہرت ہونے لگی، تشنگان علوم سنت پروانہ وار شمع علوم نبوت پر گرنے لگے۔

حضرت علامہ حد درجہ با اخلاق وباکردار، مہذب ومتین، غیرت مند وخوددار تھے، گفتگو کا سلیقہ نہایت شستہ وشگفتہ، انداز تکلم نہایت عالمانہ وفاضلانہ، فصاحت وبلاغت کا اظہار جملوں سے ہی نہیں الفاظ سے بھی ہوتے۔ ایسا لگتا رازی وغزالی، زمانہ وقت کا امام اعظم فقہ وحدیث کا درس درایتی وتحقیقی طور پر دے رہا ہے۔

پھر تحقیقی وتدریسی سفر اپنی تمام تر علمی وتحقیقی تابانیوں کے ساتھ سرزمین یوپی پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ فقاہت جس پہ نازاں، خطابت جس پہ قرباں، کا ورود مسعود سرزمین مفتاح العلوم مئو یوپی میں ہوتا ہے اور مبارک سرزمین مرجع محققین ومحدثین بن جاتی ہے۔ جب فضل وکمال کا شہرہ دور بہت دور تک سنا جانے لگا تو تشنگان علوم وفن کا ہجوم بڑھا اور بڑھتا ہی گیا اور حضرت علامہ سے علمی تحقیقی استفادہ کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوگیا۔

بات وہاں تک جا پہنچی جہاں علوم کا ایسا چشمہ بہتا ہے جس کی مثال اس عالم میں نہیں ملتی۔ ایشیا کی عظیم ترین دینی تعلیمی درسگاہ دار العلوم دیوبند نے اپنے مایۂ ناز سپوت، علامۂ زمن، حضرت مولانا محمد اکرام علی کو دار العلوم تشریف لا کر فیض علم حدیث عام کرنے کی دعوت دے دی۔

حضرت علامہ نہایت ظریفانہ وبلیغانہ اسلوب وانداز کے ساتھ دار العلوم دیوبند

تشریف لے گئے، جسے چشم عالم نے دیکھا اور رشک کی نظر سے دیکھا۔ علمی غلغلہ وفضل وکمال دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث سے پھوٹ پڑا۔ علامہ کی ذات گرامی اس ہشت پہل ہیرا جیسی تھی جس کا ہر پہلو قابل رشک اور روشن تھا۔ علمی بھرّا میں مبتلا لوگوں کے ہوش اڑ گئے، علامہ نے قیل وقال کو چھوڑا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ جہاں زمانہ کا حافظ ابن حجر عسقلانی حضرت علامہ انورشاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی کی روح تڑپ رہی تھی، وہ مسند درس جس پر ان بے بدل محدثین نے درس حدیث دیا تھا یعنی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کی مبارک درس گاہ پہنچ کر علامہ اکرام علی صاحب نے درس حدیث کا سلسلہ جاری کیا۔ اس وقت تلمیذ علامہ انورشاہ کشمیری، حضرت مولانا ایوب اعظمی شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین کے فیوض سے طلبہ بہرہ مند ہو رہے تھے۔

جامعہ تعلیم الدین کی قسمت میں یہ نعمت بے بدل تھی چنانچہ علامہ درس حدیث دینے لگے اور اپنے علم وتقویٰ کی روشن کرنیں بکھیرتے ہوئے وہیں کی خاک میں ہمیشہ کیلئے آرام فرما ہوگئے۔ چونکہ حضرت علامہ کی التفات وتوجہات اہل علم وعلماء اور اپنے خوردوں پر بہت زیادہ تھی۔

حضرت علامہ سے کسب فیض کے لئے جب بھی ڈابھیل حاضری ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ علامہ کی ذات گرامی مکمل طور پر ملتفت ہے۔ حد درجہ تعلق ولگاؤ کا اظہار فرماتے، گفت وشنید کا سلسلہ طویل ہوجاتا، چار چار پانچ پانچ گھنٹوں کی نشستیں ہوتیں۔ میں بھی خوب سیراب وفیضیاب ہوتا۔ حضرت علامہ کو وطن مالوف میں ایک دینی ادارہ بنانے کی فکر دامن گیر تھی اور ہمیشہ اس کی جستجو میں رہتے، چنانچہ سرزمین بھاگلپور بہار کو ایک دارالعلوم چمپانگر کے نام سے ادارہ دیا جو حضرت العلام کی یادگار ہے۔

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول بہار اور جمعیۃ الامام قاسم التعلیمیۃ

الخیریۃ الاسلامیۃ ہند کے تمام اساتذہ وکارکنان وطلبہ متعلقین وعزیز گرامی قدر حضرت مولانا انعام صاحب کے اس عظیم غم والم میں برابر کے شریک ہیں اور اس عظیم خلاء علمی کا رب کائنات سے نعم البدل عطا فرمانے کی دعا کرتے ہیں۔

جامعہ تعلیم الدین کی ڈابھیل کے رئیس ومہتمم حضرت مولانا احمد حسن بزرگ ومفتی اعظم گجرات حضرت اقدس مفتی محمد احمد خانپوری صاحب کے ساتھ بھی نہایت دردمندانہ اظہار تعزیت ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ ان بزرگوں کو بھی اپنے عظیم ترین رفیق کی جدائی پر صبر وسکون عطا فرمائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی بشر کو انکار نہیں، لیکن اس دنیا سے جانے والی کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے گزر جانے سے امت میں ایک بڑا خلا محسوس کیا جاتا ہے، ایک عظیم نقصان تصور کیا جاتا ہے، ان کے کارنامے امت کے لیے ہمیشہ نفع بخش ہوتے ہیں، انہی ہستیوں میں سے ایک حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰنؒ صاحب کی ذات تھی جو اب ہمارے بیچ نہیں رہی، مگر ان کی یادیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں باقی رہیں گی اور ہمارے دلوں سے ان کے لیے دعائیں نکلتی رہیں گی۔

حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب القاسمی سابق استاذ و پرنسپل جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند، محدث کبیر حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کے جگر گوشہ اور شیخ الادب حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے برادر اکبر تھے۔ آپ مصلح امت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز کے ساتھ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، آپ کی وفات کی خبر اس وقت ہوئی جب راقم الحروف لندن کے سفر پر تھا۔ دوران سفر ''تعمیر حیات'' پر اچانک میری نظر حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء کے اس چھوٹے سے مضمون پر پڑی جس کے مطالعہ کے بعد پتہ چلا کہ حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب قاسمی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما چکے ''إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون'' اس خبر کو پڑھتے ہی دل کو ایک چوٹ سی لگی، ایک عجیب سا احساس ہوا مگر فوراً دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ قدرت کا یہ نظام ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اس کو اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا۔

حضرت حکیم صاحب مرحوم سے بارہا میری ملاقات ہوتی رہی ہے، پہلی بار حاجی مستحسنؒ صاحب متولی جامع مسجد دیوبند کے ساتھ ہوئی، حضرت حکیم صاحبؒ نے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا، میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب حضرت الاساتذہ صاحبزادہ حکیم الاسلام مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اور میں ان کی عیادت کے لئے گیا تھا، ابھی تھوڑی دیر بیٹھا ہی تھا کہ حضرت حکیم عزیز الرحمٰن صاحب بھی تشریف لے آئے اور حضرت مولانا محمد اسلم صاحب سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اسی دوران حضرت مرحوم نے مجھ سے بھی بڑی محبت وشفقت کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کیں اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ حکیم مرحوم مولانا محمد حسین صاحب ملا بہاری محدث دارالعلوم دیوبند سے بڑی محبت رکھتے تھے، لہٰذا ان سے اکثر ملنے جایا کرتے تھے، چنانچہ میری تیسری ملاقات مولانا محمد حسین بہاریؒ صاحب کی محفل میں ہوئی، اسی طرح چوتھی ملاقات حضرت مولانا قاری عبدالحمید ندوی کی مجلس دبئی میں ہوئی اور پھر اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جب سے ناچیز شیخ الادب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کے لطف وکرم اور شفقت ومحبت کا قرضدار ہوا ہے اس کے بعد سے

تو ان کی حیثیت میرے نزدیک سرپرست کی سی ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب ان کی معرکۃ الآرا وضخیم سہ لسانی ڈکشنری ''سنگم'' شائع ہوئی تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی اور میں نے وہ پورا سیٹ حاصل کیا اور اپنے تمام احباب کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا کہ وہ بھی اس عظیم علمی تحفہ کو حاصل کریں۔

جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے کے زمانے میں حکیم عزیزالرحمٰنؒ نے سب سے پہلے ایک کتاب ''امراض صدر'' کے نام سے تصنیف کی، اس کتاب کو خاص وعام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صدسالہ کے بعد جو بدترین صورت حال پیدا ہوگئی تھی، ان حالات کے پیش نظر حضرت مرحوم چند دنوں کے لیے گھر تشریف لے آئے اور اپنی تصانیف کے بہت سارے مسودے اور عربی، فارسی اور اردو کلام کے بکھرے ہوئے اوراق چھوڑ کر آگئے تھے، کمرہ چونکہ شورش پسندوں کے نرغے میں تھا۔ سوء اتفاق ۲۳/مارچ ۱۹۸۳ء کو شورش پسندوں نے دارالعلوم پر قبضہ کرلیا اور متعدد اساتذۂ کرام کے کمرے کا تالا توڑ کر سامان درہم برہم کردیا جس کی وجہ سے حضرت مرحوم کے تقریباً پانچ مسودے ضائع ہوگئے۔

علمی انحطاط کے اس دور میں کسی ایسے عالم کا وجود مثل کوہ نور ہے جو مدارس کے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی دسترس رکھتا ہو، شعروادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ مسند تدریس پر بھی جلوہ افروز ہو، قلم وقرطاس سے سروکار بھی رکھتا ہو اور مضامین و تصانیف کے انبار بھی لگاتا رہا ہو، بلاشبہ حکیم عزیزالرحمٰن صاحب کی مثال علم وفضل کے اسی کوہ نور جیسی تھی۔ حضرت مرحوم کی تصانیف کی تعداد تقریباً دودرجن سے بھی زائد ہے، حضرت کتابیں لکھتے رہتے تھے، مگر اس کی طباعت واشاعت کی فکر بالکل نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابیں اب بھی غیر مطبوعہ ہیں۔

حضرت حکیم عزیزالرحمٰن ایک دینی اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار اپنے عہد کے ایک ممتاز و نامور عالم دین، علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد اور مشہور شیخ الحدیث تھے، ان کی پوری عمر حدیث نبوی کے درس وتدریس میں گزری۔ حضرت حکیم صاحبؒ نے بھی قدیم درسگاہوں میں اپنی علمی پیاس بجھائی اور اکابر علماء سے فیض اٹھاتے رہے، ان کی ہمت عالی نے ان کو کسی خاص دائرے میں محدود نہیں رکھا، انہوں نے تمام علوم وفنون میں دسترس حاصل کی اور طب وحکمت میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔

حکیم صاحبؒ نے علمی ودینی موضوعات پر کئی بلند پایہ کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ طب پر متعدد مفید کتابیں بھی تحریر فرمائیں جو رہتی دنیا تک لوگوں کے لیے نفع بخش ہیں۔ اللہ رب العزت امت مسلمہ کو حضرت کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق دے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حکیم صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور صاحبزادے و دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، بطور خاص محسن ومربی حضرت مولانا سعیدالرحمٰن اعظمی کو صبر عطا کرے جو ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ حضرت مولانا سعیدالرحمٰن اعظمی مرحوم کے علم وفضل کے قائل تھے اور اکثر مجلسوں میں اس کا ذکر فرماتے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بھائی نے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی خدمت انجام دی تو دوسرے بھائی علماء واہل مدارس کے آرزؤں کا مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اپنے علم وخرد سے سیراب کررہے ہیں جب کہ ان دونوں کے والد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ نے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں رہ کر مسند حدیث کو عرصے تک روشنی بخشی، چنانچہ اس مثلث کے علمی ودینی کارناموں کو امت کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کو اس کا بہترین بدلہ دے اور

بر سر خدمت حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کو قوت و صحت عطا کرے کہ وہ علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ حضرت اقدس کے سایۂ عاطفت کو پوری امت پر تا دیر قائم و دائم رکھے۔ آمین

تنکا چن چن محل بنایا سب کہے گھر ہمارا
نہ گھر میرا نہ گھر تیرا چڑیا رین بسیرا

عارف باللہ، عالم ربانی حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ
قافلۂ تھانوی کا حُدی خواں

سب سے پہلے امت مسلمہ کو ماہ مبارک اور عید سعید کی پر خلوص مبارک باد۔ بارگاہ الٰہ ہم سب کو اس بابرکت ماہ کی قدر دانی نصیب کرے اور فیوض و برکات سے ہمارے دامن کو بھر دے، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری مرادیں پوری کر دے۔ آمین

رمضان المبارک کے موقع پر گراں قدر مضامین سے معارف قاسم جدید کے صفحات مزین ہیں۔ اس شمارے میں بھی ہمیشہ کی طرح دیگر موضوعات پر قیمتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں برما میں مسلمانوں پر ہوئے دلخراش مظالم اور روہنگیا مسلمانوں کے قتل عام اور اس سے متعلق سچائیوں کو امن کا نام نہاد نعرہ لگانے والے ممالک کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے چند صفحات خاص کر کے ہم نے برما کے مظلوم مسلمانوں کی اشک سوئی اور بدھشٹوں کے ذریعہ قتل کیے جانے والے مسلمانوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ معارف قاسم جدید کے خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' کی اشاعت پر علماء کرام، معزز سیاسی و سماجی شخصیات کے علاوہ بڑی تعداد میں دیگر لوگوں کے

خطوط وفون آرہے ہیں ان سب حضرات کو فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے لہٰذا ہم اپنے سبھی چاہنے والوں کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور معارف قاسم جدید کے تئیں ان کی محبت اور جذبے کو سلام کرتے ہیں۔ جزاکم اللہ خیرالجزاء۔

جو تھے نوری وہ گئے افلاک پر
مثل تلچھٹ رہ گیا میں خاک پر

شیخ العرب والعجم عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر جن کیلئے کل تک زبان سے مدظلہ العالی اور مدالطافہم العالی جیسے عظیم دعائیہ کلمات نکلتے تھے اب ان کیلئے زبان رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کہنے پر مجبور ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے ایک ایک کر کے برصغیر صاحب نسبت بزرگوں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے ایک دن اپنے کاروبار اور زندگی کو الوداع کہنا ہی پڑے گا۔ موت کوئی غیر معمولی شے نہیں ہے کہ جس کے وقوع پر حیرت واستعجاب کا مظاہرہ کیا جائے۔ ہر دن اس اقصائے عالم میں نہ جانے کتنے نفوس اس ہنگامۂ زندگی سے منھ موڑ کر اجل کی پکار پر لبیک کہتے ہیں، مگر چند ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کے جانے پر انسان ہی نہیں پوری کائنات کا ذرہ ذرہ ماتم کرتا ہے۔ حضرت مولانا حکیم اختر صاحبؒ بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ایک تھے جن کی موجودگی رحمت وبابرکت تھی۔ برصغیر ہی نہیں پوری دنیا ان کے دعوت وارشاد سے فیضیاب ہورہی تھی۔ حضرت والا روحانی معالج تھے، بیماریوں کی تشخیص اور اس کا علاج کرتے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ آج عالم میں جو شر وفساد برپا ہے وہ اسی روحانی بیماری کا نتیجہ ہے۔ روحانیت کے معالجین سے اب دنیا خالی ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے یہ بیماریاں اب وبا کی شکل اختیار کرتی جارہی ہیں۔ ایسے دور میں حضرت حکیم اخترؒ جیسی شخصیت کا گزر جانا صرف علماء اور علم کا ہی نقصان نہیں ہے بلکہ یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے، مگر موت پر کس کا قابو ہے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں اور لوگوں کے دلوں کو روشن اور منور کرتی رہتی ہیں۔ حضرت حکیم اختر صاحبؒ کی ذات گرامی بھی اسی پاکباز جماعت سے تعلق رکھتی ہے، جنہوں نے اپنے پیچھے رشد وہدایت کا ایک سلسلہ چھوڑا ہے۔ ان کی کتابیں اور تربیت یافتہ سیکڑوں مریدین ومتوسلین کی ایسی جماعت موجود ہے جو اپنے شیخ سے چھوڑی ہوئی تحریک کو جاری رکھنے کیلئے پرعزم ہے۔

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب اتر پردیش کے شہر پرتاب گڑھ کی ایک چھوٹی سی اٹھیہہ نامی بستی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب محمد حسین صاحب ایک سرکاری ملازم تھے۔ حضرت اپنے والد صاحب کے اکلوتے فرزند تھے اور آپ کی دو بہنیں تھیں اس لیے والد صاحب حضرت سے بہت محبت فرماتے تھے۔

یہ بات کافی مشہور ہے کہ آپ میں بچپن ہی سے آثارِ ولایت ظاہر ہوگئے تھے۔

خود حضرتؒ نے ایک موقع پر یہ واقعہ سنایا کہ میرے والد صاحب کا بہ سلسلۂ ملازمت جب ضلع سلطان پور میں قیام تھا اس وقت میری عمر پانچ سال تھی اور میری بڑی ہمشیرہ جو اس وقت بچی تھیں مجھے گود میں اٹھا کر امام صاحب سے دم کرانے کے لیے لے جاتی تھیں۔ جب میں نے امام صاحب کو دیکھا تو ان کی وضع قطع اور داڑھی مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی، مسجد کے درودیوار اور مسجد کی زمین کی خاک مجھے بہت اچھی لگی اور مجھے اب تک یاد ہے کہ مسجد کی زمین کا میں نے بوسہ لیا۔ جب ذرا اور ہوش سنبھالا تو نیک بندوں کی محبت اور زیادہ معلوم ہونے لگی اور ہر حافظ وعالم اور نیک بندوں کی وضع قطع رکھنے والوں کو دیر تک محبت سے دیکھا کرتا اور اللہ تعالیٰ کی محبت دن بدن دل میں بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ درجہ چار پاس کرنے کے بعد والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے دیوبند بھیج دیا جائے، لیکن والد صاحب نے مڈل اسکول میں داخل کرادیا۔ والد صاحب کے حکم پر بادل نخواستہ تین سال

مڈل تک پڑھا، بہت اصرار کیا کہ ان دنیاوی تعلیمات میں میرا دل بالکل نہیں لگتا، مگر والد صاحب کے حکم کے آگے مجبور تھے۔

حضرت نے آگے لکھا ہے کہ ابھی میں نابالغ ہی تھا تو معلوم ہوا کہ مسجد کے امام صاحب جن کا نام حافظ ابوالبرکات صاحب تھا جو بچپن میں دعا پڑھ کر دم کیا کرتے تھے وہ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز بیعت ہیں۔ ایک دن ان سے جا کر عرض کیا کہ مجھے بیعت کر لیجئے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس وقت میں مڈل میں پڑھ رہا تھا، لیکن حافظ صاحب کو مجھ میں نہ جانے کیا نظر آیا کہ فرمایا کہ حضرت حکیم الامت نے مجھے مجاز بیعت بنایا ہے۔

اس دور نابالغی میں گھر سے دور جنگل میں ایک مسجد تھی حضرت وہاں جا کر عبادت کیا کرتے تھے، اس مسجد میں خوب دل لگتا تھا۔ مسجد سے کچھ فاصلے پر چند گھر آباد تھے، لیکن وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے حضرت نے ان کو نماز کی دعوت دی جس کی برکت سے وہ نمازی ہوگئے اور اس مسجد میں اذان اور جماعت بھی ہونے لگی اور لوگ تعریفاً حضرت کو مسجد کے نمازیوں کا پیر کہنے لگے۔

حضرت کا چونکہ بچپن تھا اور یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ نابالغ کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی اس لیے ان لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے کیونکہ وہ لوگ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ ۲۰۰۰ء میں جب حضرت والا کو فالج کا حملہ ہوا تو ایک دن خیال ہوا کہ اس زمانے میں جو نمازیں پڑھائی تھیں تو نابالغ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی نماز واجب الاعادہ ہے، لہٰذا حضرت والا نے سلطان پور کی اس مسجد کے امام صاحب کو رجسٹرڈ خط بھیجا کہ پچاس سال پہلے جب میں نابالغ تھا تو مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں نے وہاں کے نمازیوں کی امامت کی ہے ان کی وہ نمازیں واجب الاعادہ ہیں، لہٰذا ان میں سے اگر کوئی نمازی زندہ ہو تو اس کو بتا دیں

کہ اس زمانے کی نمازوں کو دہرالے۔ دس پندرہ دن بعد اسی مضمون کا دوسرا خط بھی رجسٹری سے روانہ فرمایا۔ اب نہ معلوم وہ امام صاحب اور وہ لوگ زندہ بھی تھے یا نہیں لیکن جتنا اختیار تھا وہ حضرت نے استعمال فرمایا۔

وہ مسجد بالکل ویرانے میں تھی اور رات کو دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا حضرت آدھی رات کے بعد اس مسجد میں جا کر تہجد پڑھتے تھے جبکہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ حضرت کی والدہ ماجدہ منع فرماتیں کہ اتنی رات کو اکیلے مت جایا کرو۔ حضرت کے والد صاحب چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لیے ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے بہت سے دوست اور بہت سے دشمن ہوتے ہیں لہٰذا ان کو رات کو اکیلے مسجد میں نہ جانے دیں، لیکن حضرت کے والد صاحب نے براہ راست منع نہیں فرمایا۔

حضرت نے فرمایا کہ ایک رات کے آخر میں جب میں مسجد سے تہجد پڑھ کے نکلا تو والد صاحب مع چند دوستوں کے مسجد کے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے اور فرمایا کہ تم میرے ایک ہی بیٹے ہو اور یہاں بہت سے دوست اور بہت سے دشمن ہوتے ہیں لہٰذا تم گھر ہی پر تہجد پڑھ لیا کرو، اس کے بعد سے حضرت گھر پر تہجد پڑھنے لگے۔ والد صاحب کے دوست حضرت کو فقیر اور درویش کہتے تھے اور خود والد صاحب نام لینے کے بجائے مولوی صاحب کہتے تھے۔

عصری علوم اور علم طب پڑھنے کے بعد علوم دینیہ کے حصول کا رجحان کیسے بنا اس پر حضرت نے ’ترجمۃ المصنف‘ میں تحریر کیا ہے ’’درجہ ہفتم پاس کرنے کے بعد والد صاحب کا تبادلہ پھر ضلع سلطان پور ہو گیا اور وہاں احقر نے جامع مسجد کے خطیب مولانا قاری صدیق صاحب سے فارسی شروع کی۔ کریما مکمل اور گلستاں کے کچھ باب پڑھ کر احقر نے پھر دیو بند جانے کی اجازت چاہی، مگر والد صاحب نے میری مرضی کے خلاف طبیہ کالج الٰہ آباد

میں داخل کر دیا اور فرمایا طب سے فارغ ہو کر عربی شروع کرنا۔ بڑی مشکل سے پھر یہ دن گزارنے پڑے۔ اس وقت الٰہ آباد میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی اسٹیشن کے قریب مسجد میں درس تفسیر دیا کرتے تھے احقر وہاں حاضری دیا کرتا۔ اس محلّہ میں جہاں قیام تھا تقریباً ایک میل پر کچھ صحرا تھا وہاں ایک مسجد تھی جو جنوں کی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ اسی مسجد میں گاہے گاہے حاضر ہوتا اور مناجات مقبول ہمراہ لے جاتا اور اس مسجد میں خوب تنہائی کا موقع پا کر اپنے رب سے دونوں جہاں کا دکھڑا رو لیا کرتا۔

دونوں جہاں کا دکھڑا مجذوب رو چکا ہے
اب اس پہ فضل کرنا یارب ہے کام تیرا

حضرت نے فرمایا طبیہ کالج میں داخلہ اس وقت مجھے بہت گراں گزرا تھا، لیکن میرے والد صاحب نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں طب کی تعلیم اس لیے دے رہا ہوں تاکہ دین تمہارا ذریعۂ معاش نہ ہو اور دین کی خدمت تم صرف اللہ کے لیے کرو۔ حضرت فرماتے تھے کہ آج والد صاحب کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ واقعی اس سے بہت فائدہ ہوا کہ آج کوئی اس قسم کا الزام نہیں لگا سکتا کیونکہ میرا اپنا دواخانہ اور کتب خانہ ہے۔ طب پڑھنے کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اپنے احباب کو اس قدر وظیفہ و ذکر بتایا جائے کہ جس سے وہ غیر معتدل نہ ہوں کیونکہ آج کل اکثر لوگ اعصابی دباؤ اور ڈپریشن میں مبتلاء ہیں اس لیے مختصر ذکر بتاتا ہوں کیونکہ ولایت کثرت ذکر پر نہیں گناہوں سے بچنے پر موقوف ہے۔ اس سے الحمد للہ احباب کو روحانی وجسمانی دونوں فائدے ہیں۔

اکابرین کی خدمت میں کیسے پہنچے اور ان سے فیض کیسے حاصل کیا اس سلسلہ میں حضرت خود لکھتے ہیں کہ الٰہ آباد میں حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب کے بارے میں علم ہوا جو حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے سلسلہ کے خلیفہ تھے اور بڑے

صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کی زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا علمائے ندوہ کے محضر میں بڑے درد سے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

دل مضطرب کا یہ پیغام ہے
ترے بن سکوں ہے نہ آرام ہے
تڑپنے سے فقط ہم کو کام ہے
یہی بس محبت کا انعام ہے
جو آغاز میں فکر انجام ہے
ترا عشق شاید ابھی خام ہے

حضرت نے لکھا ہے کہ مولانا کو دیکھ کر ان سے بہت محبت و مناسبت محسوس ہوئی، وہ سراپا محبت سراپا جمال تھے اور سینہ میں درد بھرا دل رکھتے تھے۔ حضرت طبیہ کالج سے فارغ ہو کر روزانہ شام پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مولانا شاہ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتے۔ پندرہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک تین سال مسلسل شاہ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں تو اللہ والوں کی گود میں بالغ ہوا ہوں۔ کالج سے فارغ ہو کر میرے ساتھی شام کو دریائے جمنا پر جاتے تھے، نہاتی ہوئی عورتوں کو دیکھنے اور میں مولانا شاہ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جاتا تھا۔ مولانا بھی حضرت سے بہت ہی شفقت اور محبت فرماتے تھے۔ کبھی حضرت مولانا اپنے وطن پھولپور تشریف لے جاتے تو حضرت آپ کی ملاقات کے لیے پھولپور حاضر ہوتے اور وہاں قیام فرماتے تو مولانا گھر سے اپنا بستر لے کر مہمان خانے میں تشریف لے آتے اور فرماتے کہ یہاں بڑے بڑے علماء آتے ہیں میں کسی کے لیے اپنا بستر باہر نہیں لاتا، لیکن صرف آپ کے لیے گھر سے باہر آ کر سوتا ہوں۔ ایک بار الٰہ آباد سے حضرت مولانا

محمد احمد صاحب نے حضرت کو کراچی خط بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ آپ مجھ سے جیسی محبت کرتے ہیں دنیا میں ایسی محبت مجھ سے کوئی نہیں کرتا۔

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا درد دل دیا ہے، اسی درد دل کو پھیلانے اور لوگوں کے دلوں میں اللہ کے عشق، محبت اور معرفت کی آگ لگانے کے لیے دنیا بھر کے اکثر ممالک کا سفر کیا۔ حضرت والا کی اپنی تصنیفات اور مواعظ سے حاصل شدہ چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد 150 تک ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ کتابیں چھپائی کے مراحل میں اور کمپیوٹر و کیسٹس میں ہیں جو آہستہ آہستہ سلسلہ وار شائع ہوتی رہتی ہیں۔

دیگر زبانوں میں کتابیں:

حضرت والا رحمہ اللہ کی تمام کتابیں دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر چھپ کر مفت میں شائع ہوتی ہیں، جن میں اردو، سندھی عربی، پشتو، بنگلا، برما، جرمن، فرنچ، انگریزی، رشین وغیرہ شامل ہیں۔ ویسے تو ہر موضوع پر خطاب فرماتے رہتے تھے لیکن حضرت والا دامت برکاتہم آج کے دور میں سب سے زیادہ پھیلنے والی برائی و گناہ کبیرہ بدنظری، حسن پرستی، عشق مجازی، امرد پرستی، اغلام بازی کی قباحت پر بیانات فرماتے تھے، حضرت کا جو بھی وعظ، کتاب اور بیان ہوتا اس میں لازماً بدنظری، حسن و عشق مجازی کے مضامین شامل ہوتے اور یہ بدنظری اور حسین لڑکوں کا گناہ ایسا قبیح ہے جو ٹی وی فلم، نیٹ، کیبل اور بازاروں و سڑکوں پر گھومنے والی عورتوں کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ اس گناہ کے بارے میں قرآن و حدیث میں سخت قباحت آئی ہے۔

حضرتؒ نے اپنے وقت کے ولی کامل حضرت مولانا محمد احمدؒ، حضرت مولانا عبد الغنی پھولپوریؒ اور محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحقؒ کی صحبت میں جو فیض حاصل کیا تھا اس کی وجہ سے آپ کی شخصیت و ذات گرامی دنیاوی آلائشوں سے پاک ہوگئی۔ دنیا کی بڑی سے

بڑی طاقتیں اور دولت حضرت کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکی۔

نواب قیصر صاحب ریاست باغ پت کے نواب تھے، کراچی میں ان کا بہت بڑا کاروبار ہے، اب بھی وہ نواب ہی کہلاتے ہیں، بہت اللہ والے آدمی ہیں، حضرت مولانا فقیر محمد صاحب جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے ان کے خلیفہ بھی ہیں، بہت مٹے ہوئے ہیں۔ اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب کے حکم سے حضرت والا نے گلشن اقبال میں خانقاہ کی تعمیر کے لیے جب زمین خریدی تو اس وقت عمارت بنانے کے لیے کچھ پیسہ نہیں تھا، زمین بھی حضرت نے اپنا مکان بیچ کر خریدی اور آج جو خانقاہ ہے وہ حضرت والا کے ذاتی پیسے کی ہے، اپنے ذاتی مال کو حضرت والا نے اللہ کے لیے وقف کر دیا۔ جب خانقاہ تعمیر ہو رہی تھی تو ایک مرتبہ نواب قیصر صاحب تشریف لائے، انہوں نے پوچھا کہ حضرت ابھی تک خانقاہ نہیں بنی، کیا وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ جتنی تعمیر اب تک ہوئی ہے یہ بھی ٹھیکہ دار نے اپنے طور پر بنا دی ہے، اس کا ابھی آٹھ لاکھ روپیہ قرض ہے۔ تو نواب صاحب نے فرمایا کہ حضرت آٹھ لاکھ کیا چیز ہے، دبئی کے شیخ میرے دوست ہیں، ان کا بنگلہ میرے بنگلہ کے ساتھ ہے، آٹھ لاکھ روپیہ دینا تو ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں، اگر حضرت فرمائیں تو میں ان سے بات کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ اگلے دن نواب صاحب تشریف لائے اور کہا کہ حضرت شیخ دبئی آٹھ لاکھ روپیہ دینے کے لیے راضی ہوگیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے آپ وصول کر لیجئے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ حضرت آٹھ لاکھ روپے وصول کر کے رجسٹر میں دستخط کرنے کے لیے آپ کو ان کے بنگلہ تک جانا پڑے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، میں اپنے بزرگوں کے طریقے کو نہیں چھوڑ سکتا، اگر میں نے خود جا کر یہ رقم وصول کر لی تو خانقاہ تو بن جائے گی مگر خانقاہ کی روح نکل جائے گی اور اس کی تاریخ میں یہ بات لکھی جائے گی کہ اس خانقاہ کا

بانی ایک بادشاہ کے دروازے پر گیا تھا اور میں **بِئسَ الفَقِیرُ عَلٰی بَابِ الاَمِیرِ** ہو جاؤں گا۔ نواب قیصر صاحب حضرت والا کی یہ بات سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ حضرت آپ تو ہمارے بزرگوں کی یادگار ہیں اور کہا کہ اگر میں کسی اور کو اشارہ کر دوں تو ایک کیا دس آدمی میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور وہاں جا کے رقم وصول کرلیں گے لیکن آپ نے انکار فرما دیا اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں نے حضرت شیخ پھولپوری کی جوتیاں اٹھائی ہیں، یہ انہی کا کمال ہے، ان کی نگاہ کا اثر ہے ورنہ میں بھی جاسکتا ہوں مجھے بھی رقم کی ضرورت ہے، لیکن عظمتِ دین اور عزت نفس کے خلاف میں کوئی کام نہیں کرسکتا۔

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکّوں کی جھنکاریں
ترے دستِ توکل میں تھیں استغناء کی تلواریں
جلالِ قیصری بخشا جمالِ خانقاہی کو
سکھائے فقر کے آداب تو نے بادشاہی کو

پھر حضرت والا نے یہ بات حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب کو لکھی کہ نواب صاحب نے مجھے ایسی پیش کش کی تھی اس پر میں نے یہ جواب دیا تو حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب نے جواب میں لکھا کہ مبارک ہو! تعمیرِ فقیری تعمیرِ شاہی سے افضل ہے۔ چنانچہ الحمدللہ کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی، سب لوگ حیرت میں تھے کہ سب کچھ کیسے ہو گیا، نہ حضرت کے یہاں کسی چندے کی پیش کش ہوئی، نہ مسجد میں کہا گیا، نہ کسی سے اس کا اعلان کیا گیا لیکن خود بخود سارا انتظام ہو گیا۔

حضرتؒ کو اللہ تعالیٰ نے شعر و سخن کا فطری ذوق عطا فرمایا تھا اس کی تربیت مولانا محمد احمد کی صحبت سے ہوئی لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں،

میں نے کسی سے ردیف قافیہ نہیں سیکھا، شاعری میں میرا درد میرا استاد ہے۔ چنانچہ آغاز جوانی میں حضرت کی زندگی کا پہلا شعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کہنہ مشق استاد کا ہے اور حضرت کے سینہ میں منجانب اللہ جو آتش محبت ودیعت ہوئی ہے یہ شعر اس کا ترجمان ہے:

درد فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں اک ماہئ بے آب ہے

ایک مقام پر حضرت نے خود فرمایا کہ جب میں ذرا اور بڑا ہوا تو قلب خدا تعالیٰ کے لیے بے چین رہنے لگا، رات کی تنہائیوں میں آسمان اور چاند ستاروں کو دیکھ کر بہت سکون ملتا اور دیر تک محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ تھک کر سو جاتے اور کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر بار بار حق تعالیٰ سے عرض کرتے کہ:

اپنے ملنے کا پتہ کوئی نشاں
تو بتادے اے مرے رب جہاں

بچپن کے اسی زمانے میں مثنوی مولانا روم کے چند اشعار پڑھ کر حضرت کو مولانا روم سے محبت ہو گئی اور مثنوی سمجھنے کے لیے فارسی پڑھنا شروع کر دیا اور مثنوی کے اشعار پڑھ پڑھ کر رویا کرتے۔ حضرت کے استاذ جو قرآن شریف پڑھاتے تھے بہت خوش الحان تھے، قرآن شریف پڑھنے کے بعد ان سے مثنوی سنانے کی درخواست کرتے وہ بہت درد ناک آواز سے مثنوی پڑھتے تو دل اللہ کی محبت میں تڑپ جاتا۔ رات کی تنہائیوں میں حضرت مثنوی کے اشعار پڑھ کر اللہ کی یاد میں رویا کرتے خصوصاً یہ اشعار

آہ را جز آسماں ہمدم نبود
راز را غیر خدا محرم نبود

ترجمہ: میری آہ کا سوائے آسمان کے کوئی ساتھی نہیں اور میری محبت کے راز کا

سوائے خدا کے کوئی محرم نہیں

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح از درد اشتیاق

ترجمہ: اے خدا آپ کی جدائی کے غم میں چاہتا ہوں کہ میرا سینہ پارہ پارہ جائے تا کہ آپ کی محبت کی شرح نہایت درد سے بیان کروں

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
او ز حرص و عیب کلی پاک شد

ترجمہ: جس کا سینہ اللہ تعالیٰ کے عشق سے چاک ہوگیا وہ جملہ امراض باطنی اور اخلاق رذیلہ سے پاک ہوگیا۔

پانچ سال کی عمر میں جبکہ ہوش وحواس صحیح نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ کی طرف جذب محسوس ہونا جبکہ جوان ہونے کے بعد بھی یہ حالات نصیب نہیں ہوتے یہ دلیل ہے کہ حضرت والا اولیاء اللہ اخص الخواص میں تھے اور مادر زاد ولی تھے۔

چناں چہ حضرتؒ کی تصنیف معارف مثنوی ایک بالکل منفرد شرح ہے جو محض لفظی ترجمہ نہیں بلکہ حضرت رومی کے منتشر اور وسیع علوم کو جمع کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے جس میں حضرت والا کی آتش عشق اور درد دل سے ایک منفرد اور دل آویز اسلوب بیان دلوں میں اللہ کی محبت کی آگ لگا دیتی ہے۔مثنوی مولانا روم سے حضرت والا کا شغف سارے عالم میں معروف ہے چنانچہ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء میں تقریباً آٹھ ملکوں کے علماء خانقاہ میں تشریف لائے اور انہوں نے درس مثنوی کے لیے حضرت والا سے درخواست کی۔ چنانچہ روزانہ بعد فجر حضرت والا نے مثنوی کا درس دیا جو ’’آشوب وچرخ وزلزلہ‘‘ کا مصداق تھا۔ایک ایک لفظ عشق ومستی میں ڈوبا ہوا لیکن عشق کی یہ تیز وتند

شراب جام سنت وشریعت میں محصور تھی، مجال نہیں کہ عشق ومستی حدود شریعت سے باہر قدم رکھ دے جس سے علماء کو وجد آیا۔الحمدللہ یہ درس، درس مثنوی مولانا روم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب سے خواب میں فرمایا کہ درس مثنوی بہت اچھی کتاب ہے تم پڑھا کرو۔

اور مثنوی کے متعلق حضرت والا کی تیسری تالیف فغان رومی ہے جس میں مثنوی کے دعائیہ اشعار کی والہانہ، عاشقانہ اور الہامی تشریح ہے اور یہ بھی درس ہے جو ری یونین سے آنے والے علماء اور سالکین کے محضر میں دیا گیا۔

حضرت والا اب اس دنیا میں نہیں ہیں، مگر حضرت کی تعلیمات ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی، اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت والا کو جنت میں اعلیٰ مقام اور پسماندگان، مریدین اور متوسلین کو صبر وتحمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین!

حاجی عبدالرزاق کالسیکر : کچھ یادیں کچھ باتیں

یہ دنیا آنی اور جانی ہے، موت سے کسی کو رستگاری نہیں، دنیا کے ہر ایک جاندار کے لئے موت کا مزہ چکھنا امر یقینی ہے۔ موت ہی ایک ایسا امر ہے جس پر دنیا کی سبھی قومیں متفق ہیں۔ آج تک کسی نے موت کی حقیقت کا انکار کرنے کی جرأت بیجا نہیں کی ہے اور نہ ہی کوئی کرسکتا ہے۔ کب کس کا بلاوا آجائے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں، اس دنیا کو الوداع کہنے والی کچھ شخصیات کچھ ایسے اوصاف کی حامل ہوتی ہیں جن کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے کبھی ذہن ودماغ سے محو نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے کارنامے، ان کے نمایاں اعمال ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب بھی ان واقعات، حالات کا سامنا ہوتا ہے ان کے ساتھ بیتے ہوئے لمحے ذہن میں تروتازہ ہوجاتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیتوں میں ایک نمایاں نام ہمارے مشفق ومحترم جناب حاجی عبدالرزاق کالسیکر کا تھا جو گزشتہ 10 اگست 2015 کو صبح دس بجے. زندگی کی 84 بہاریں دیکھ کر اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ حاجی صاحب گزشتہ ڈھائی سال سے کوما میں تھے جس سے جانبر نہ ہوسکے اور 10 اگست کو جانب آخرت رخت سفر باندھ گئے اور دبئی میں ہی ان کی تجہیز وتکفین عمل میں آئی۔

حاجی عبدالرزاق صاحب نیک سیرت، رحم دل، منکسر المزاج، متفکر اور صاحب درد شخص تھے۔ انہوں نے پوری زندگی ملی مسائل پر اپنی نگاہ رکھی۔ مختلف مسائل پر اپنے دوست واحباب سے تذکرہ کرتے۔ اہم مسائل پر بحث کرتے۔ جب بھی کوئی نازک مسئلہ پیش آتا وہ اپنی فکرمندی ظاہر کرتے۔ مسلمانوں کی تعمیر وترقی، معاشرہ کی اصلاح، مسلم سماج میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے تئیں اپنی فکرمندی ظاہر کرتے اور جہاں تک ہوتا مسلمانوں کی، ضرورت مندوں اور مدارس اسلامیہ کی مدد کرتے۔

حاجی صاحب سے میرا تعلق تقریباً 22 سالوں سے تھا۔ 1994 میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور اسی ملاقات میں انہوں نے اپنے حسن اخلاق کا ایسا جلوہ پیش کیا کہ میں دن بہ دن ان کے قریب ہوتا گیا۔ ہمارے اور ان کے درمیان تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ حاجی صاحب کے ساتھ احقر کو عمرہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ عمرہ کے اس سفر میں حاجی عبدالرزاق صاحب کالسیکر، حاجی رضوان احمد اعظمی ابوظہبی کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اس مدت میں نے یہی محسوس کیا کہ ان کے اندر ملت کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ہر مسلمان ترقی کے ساتویں آسمان پر ہو۔ مسلمان قوم جہاں بھی رہے عزت اور سربلندی کے ساتھ رہے۔ کسی بھی موقع پر انہیں ذلت ورسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجی عبدالرزاق صاحب کا سانحۂ ارتحال امت کے لئے عظیم خسارہ ہے، کیوں کہ آپ کی ذات گرامی مجموعۂ خیر تھی، وہ دنیا بھر بالخصوص ہندوستان اور صوبہ مہاراشٹر کے سیکڑوں دینی وفلاحی اداروں سے جب تک زندگی نے وفا کی وابستہ رہے، دینی، دعوتی، ملی اور انسانی خدمت کیلئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، ان کے اندر ملت کی فلاح وبہبود کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کا جیتا جاگتا نمونہ

ہے کہ ان کی خدمات کا دائرہ پورے عالم میں پھیلا ہوا ہے، وہ بلا تفریق مذہب وملت خیر کے کام کو انجام دیتے تھے۔ دبئی جیسے چمک دمک والے شہر میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے ساتھ ہمیشہ دین ومذہب سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔

مرحوم حاجی صاحب اخلاق کریمانہ کے پیکر تھے، ہر شخص سے اپنائیت اور خاکساری کے ساتھ ملتے، ایسا لگتا جیسے بہت پرانی شناسائی ہو۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، ہر ایک سے یکساں سلوک فرماتے۔ راقم الحروف کو کئی مرتبہ مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور ہر بار محسوس کیا کہ آپ حق بات کو بلا کسی تردد کے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ آپ کے اندر وسیع القلبی اور وسیع النظری پائی جاتی تھی۔ علما نواز تھے، چنانچہ علما اور اہل علم کی دل سے قدر کرتے تھے اور ہر ممکن اعانت بھی فرماتے تھے۔ اللہ پاک حاجی صاحب کے خیر کو تا قیامت باقی رکھے۔ حاجی صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی آپ کا درد مند دل تھا، چنانچہ انہوں نے خدمت خلق کو اپنا مشن بنالیا تھا۔ اگر حاجی صاحبؒ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کا کوئی عمل اس سے خالی نظر نہیں آتا۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حاجی صاحب کے دینی مشن کو زندہ وپائندہ رکھا جائے۔

میرے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ حضرت حاجی صاحب جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار اور اس کی خدمات کی دل سے ستائش فرماتے تھے۔ یہاں کے کاموں کی تعریف کرتے تھے۔ اور ایک علم دوست شخص ہونے کا پورا ثبوت پیش کرتے تھے۔ جامعۃ القاسم کی ترقی اور اس کی بڑھتی سرگرمیوں کی خبریں ان کے لئے خوشی ومسرت کا باعث ہوا کرتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ جامعۃ القاسم کو اپنا ادارہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس کے تعلق سے فکر مند رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حاجی صاحب کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملتے ہی جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے طلبہ اور اساتذہ میں غم کے بادل چھاگئے۔ ہر کوئی افسردہ اور

غمزدہ نظر آیا۔ ان طلبہ کے چہرے صاف بتا رہے تھے کہ آج جامعۃ القاسم کا ایک بڑا ہمدرد اور علم دوست شخص اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی وقت جامعۃ القاسم میں ایصال ثواب کے لئے دعائیہ مجلس کا اہتمام کیا گیا جس میں اساتذہ اور طلبہ نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور ایک لاکھ ہزار کلمۂ طیبہ پڑھ کر مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لئے دعائیں کی گئیں۔

خلاصہ یہ کہ حاجی صاحب کی شخصیت اپنے آپ میں ایک مثال اور نمونہ تھی۔ ان کی موت سے ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ جس وقت مجھے ان کے انتقال پر ملال کی خبر ملی کچھ دیر کے لئے میں سکتے میں آگیا۔ میرے ذہن ودماغ ماؤف ہوگئے تھے کہ خدایا یہ کیا ہوگیا۔ حاجی صاحب کے فرزند جناب سلیم بھائی، جناب سراج صاحب، جناب ریاض صاحب، جناب جمیل صاحب، جناب انیس صاحب، جناب امتیاز صاحب۔ ان کی تینوں دختران نیک اور اہلیہ محترمہ کی خدمت میں ہم نم آنکھوں کے ساتھ تعزیت پیش کرتے ہیں۔ ان کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ان کی موت سے صرف اہل خانہ غمزدہ نہیں ہیں بلکہ علم وعمل سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا طبقہ ان کی موت کا ماتم منا رہا ہے۔ اس عظیم محسن کی کمی کو یاد کر رہا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے، اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر انہیں سچا خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد رہیں۔ ان کے مشن کو فروغ دیں کیوں کہ یہی ان کے لئے سچا خراج عقیدت ہوگا اور نیک وصالح اولاد کی اپنے والد کے لئے خدمت، عظمت اور محبت شمار کی جائے گی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا سید شاہ شوکت علی عبدالغفور نظیرؒ

(17 نومبر 1934-10 اکتوبر 2015)

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

جلیل القدر روحانی و ربانی عالم دین، شیخ طریقت، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلمیذ رشید، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خلیفہ و مجاز، ہندوستان کے تاریخی شہر عروس البلاد ممبئی کی جامع مسجد کے امام و خطیب، سنت و شریعت، علم و عمل، حلم و بردباری اور زہد و تقویٰ کے عظیم پیکر، ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے قدیم اور مایہ ناز فاضل حضرت مولانا سید شاہ شوکت علی عبدالغفور نظیر صاحبؒ مؤرخہ 10 اکتوبر 2015 کو اپنے آبائی وطن مہسلہ کوکن میں 81 رسال کی عمر میں طویل علالت کے بعد رب حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت کے انتقال پرملال سے نہ صرف ممبئی، کوکن، جامعہ حسینیہ شری وردھن کے اساتذہ وطلبہ، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کی فضا رنج وغم میں تبدیل ہوگئی،

بلکہ اس بے مثال خلیق و نرم دل عالم ربانی کے سانحۂ ارتحال سے ہندوستان کا پورا علمی حلقہ مغموم اور حزن و ملال میں ہے۔

حضرت مولانا شوکت علیؒ اپنے مشہور و معروف اساتذۂ کرام حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا مفتی ظہور، حضرت مولانا بشیر احمد خان، حضرت مولانا عبدالاحد رحمہم اللہ کے علوم و معارف کو گزشتہ پچاس برسوں تک جامع مسجد کے منبر و محراب سے دنیا تک پہنچاتے رہے اور شمالی ہند کے فیضان کو جنوبی ہند میں جاری رکھے ہوئے تھے۔

حضرت مولانا شوکت علی عبدالغفور نظیر رحمۃ اللہ علیہ اس عہد کے عظیم ترین بزرگوں میں سے ایک اور اسلاف و اکابر کی یادگار تھے۔ ان میں بزرگی کے وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے اور اپنے اسلاف کی دینی و علمی مجلسوں میں سنا ہے۔ آپ خلوص و للّٰہیت اور خوف خداوندی کے جذبہ سے سرشار اور مال و متاع کی حرص و لالچ سے ہمیشہ دور رہے۔ ملت کی سربلندی، مسلمانوں کی ترقی، علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے پوری زندگی متفکر رہے، خوش مزاج طبیعت کے مالک تھے۔ اجتماعی فکر و ذہن اور اعمال و خدمات کی وسعتوں کے لحاظ سے ملت اسلامیہ کی ایک معتبر و متعارف شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ متبع سنت عالم دین ہونے کے ساتھ ایک مشفق اور مخلص بزرگ بھی تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خودداری والی صفت سے سرشار تھے۔ حضرت تھانویؒ کے بعد کسی بزرگ میں اگر ہم نے خودداری کا مشاہدہ کیا ہے تو وہ واقعی حضرت مولانا شوکت علی کی ذات تھی۔ دنیاوی منفعت کی خاطر وہ کبھی بھی کہیں کسی سیاست داں اور اہل ثروت سے ملنے نہیں گئے، عہدہ اور پیسہ کے لئے انہوں نے کبھی بھی کسی کی دہلیز پر دستک نہیں

دی۔ہم نے اپنے رفقاء سے یہ بھی سنا ہے کہ جب کوئی صاحب ثروت ملاقات کے لئے فون کر کے حاضر ہونا چاہتا تو آپ ملنے سے انکار کر دیتے اور کہتے وہیں سے میرے لئے دعاء فرمائیں۔ان کی اسی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کے سبب بڑے بڑے سیاست داں اور بزنس مین خود ان سے ملاقات کے لئے آتے تھے۔یہ آپ کا انفرادی طرۂ امتیاز تھا کہ ممبئی میں سبھی طبقہ کے لوگ آپ کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولانا زہد وتقویٰ میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے، وہ اخلاص وللّٰہیت کے منبع ومرکز تھے، انہیں دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، وہ کسی کے سامنے جھکتے نہیں تھے، شہرت وناموری سے دور رہتے تھے اور امت مسلمہ کا مفاد ہی انہیں ہمیشہ عزیز رہتا تھا۔حضرت کا چہرہ انتہائی نورانی اور روشن تھا، آپ ہمیشہ خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے تھے، بے پناہ شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے اور اپنی دعاؤں سے نوازتے تھے۔راقم الحروف کو ممبئی میں کئی بار حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ہر بار بندہ نے یہ محسوس کیا کہ اس اعلیٰ مقام پر فائز رہ کر بھی وہ خورد نوازی کی صفت سے مالا مال تھے، اپنے چھوٹوں سے بھی انتہائی خلوص ومحبت سے ملتے تھے۔میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ آپ حرص وطمع اور ریاکاری سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔آپ کا مزاج مذہب ومسلک کی تفریق کے بغیر سب کو ساتھ لے کر چلنے والا تھا۔بقائے انسانیت اور اصلاح امت کے لئے ہمیشہ فکر مند نظر آتے اور جہاں تک ہوتا آپ عملی طور پر اس کی کوشش کرتے۔حضرت مولانا جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے جن کی موت کا غم یقینی ہے اور ان کی تلافی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔حضرت کی رحلت درحقیقت موت العالم موت العالَم کی مصداق ہے، جس پر ہر شخص غمزدہ اور رنجیدہ نظر آرہا ہے۔

حضرت مولانا شوکت علی بن عبدالغفور نظیر کی 17 نومبر 1934ء کو بمقام میندری

ضلع رائے گڑھ کوکن میں ولادت ہوئی، 1955ء میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹ کر حسبۃً للہ امامت وخطابت نیز مکتب میں دینی تعلیم کے فرائض انجام دینے لگے۔ایک سال تک بستی میندری میں بھی خدمت انجام دی، اس کے بعد حضرت مولانا غلام محی الدین صاحبؒ امام وخطیب جامع مسجد ممبئی جو حسن اتفاق سے شری وردھن کے ہی رہنے والے تھے نے بلا کر بنگالی پورہ مسجد کی امامت کی ذمہ داری ان کو سونپ دی۔ چونکہ آپ کا ذوق علمی تھا اس لئے بنگالی پورہ مسجد کو جلد ہی خیرباد کہہ دیا اور گجرات کی مشہور درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس وتدریس سے منسلک ہوگئے اور مسلسل تین برس تک تدریسی خدمات بحسن وخوبی انجام دیں۔پھر مولانا غلام محی الدینؒ نے جامعہ ڈابھیل کے مہتمم حضرت مولانا سعید بزرگؒ کو خط لکھا کہ اب مولانا شوکت علی کو ممبئی بھیج دیا جائے، چنانچہ مہتمم صاحبؒ کے حکم سے وہ ممبئی آگئے اور تقریباً پچاس سال تک جامع مسجد ممبئی میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔اس دوران کوکن کے بہت سے اداروں کی سرپرستی فرماتے رہے جن میں جامعہ حسینیہ شری وردھن، مدرسہ فیض العلوم نیرول، فیض القرآن کالستہ، انجمن دردمندان تعلیم وترقی ٹرسٹ مہاڈ رائے گڑھ مہاراشٹر بطور خاص شامل ہیں۔حضرت مولانا کے پسماندگان میں دو بھائی سید کفایت اللہ اور سید احسان اللہ، ایک بیٹا سید ارشد علی اور ایک بہن ہیں۔

حضرت کی خدمت کا دائرہ نہ صرف اصلاح وتربیت، امامت وخطابت کا تھا، بلکہ آپ دینی وملی امور میں بھی خاصی دلچسپی لیتے، ہر ملی کانفرنس اور کاز میں شریک رہتے تھے اور اہل خیر کو مدارس ومکاتب کے تعاون پر آمادہ کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ حضرت والا ہر حلقہ میں مقبول ومعروف اور قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کی ۵۰/سالہ دینی وملی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور ان کی رحلت سے ممبئی اور کوکن

سمیت ملک بھر میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو اپنے فضل سے پُر فرمائے۔

میں خصوصی طور سے مہسلہ میندری کے باشندگان، حضرت کے پسماندگان میں دونوں بھائی جناب سید کفایت اللہ صاحب، سید احسان اللہ صاحب، ان کے صاحبزادے جناب سید ارشد علی، ان کی ہمشیرہ سے قلبی طور پر اظہار تعزیت کرتا ہوں اور ان کے لئے صبر جمیل کی دعاء کرتا ہوں اور اپنی بات اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ:

جان کر منجملہ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

❁ ❁ ❁

ٹیپو سلطان

ایک مردمومن ایک مردمجاہد

برصغیر ہندوپاک کی تاریخ میں ٹیپو سلطان ایک لازوال اہمیت وعظمت کا مالک شخص کہلاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ بمشکل اس اولوالعزم سلطان کی نظیر پیش کر سکے گی۔ ٹیپو سلطان نہ صرف ایک مردِ مجاہد تھا بلکہ حقیقی معنی میں ایک مردِ مومن تھا۔ عالم، عابد، ممتاز منتظم، باکمال جرنیل اور خداترس حکمراں تھا۔ اسے ایک تجربہ کار سیاستدان اور غیر معمولی بصیرت رکھنے والا عوامی رہنما اور قائد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔

عنان حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد ٹیپو سلطان نے دو کاموں پر خاص توجہ دی۔ ایک جانب اپنی پوری توجہ اتحاد بین المسلمین اور اتحاد بین الاقوام ہند پر مرکوز کی۔ دوسری جانب ملک کی صنعت وحرفت پر پوری توجہ دی۔ سلطان کے یہی عزائم و ارادے تھے جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سلطان کا مخالف بنادیا اور اسی مخالفت نے اس کو تمام عمر جنگوں میں مصروف رکھا۔ مگر باوجود اس کے سلطنتِ خداداد میسور نے صنعت و حرفت اور دیگر فنون میں جو ترقی کی وہ میسور کو کبھی دوبارہ حاصل نہ ہوسکی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی

جان چکی تھی کہ اگر ٹیپو سلطان کو اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے دیا جائے تو پھر ہندوستان پر قبضہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

ٹیپو سلطان کے خطرہ کو ختم کرنے کے لیے انگریز، نظام اور مرہٹے متحد ہوگئے۔ انگریز اسے ہندوستان پر اپنے اقتدارِ کامل میں سب سے بڑی، بلکہ واحد رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس اتحاد کے مقصد کو مزید کامیاب بنانے اور رائے عامہ کی اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ٹیپو سلطان کی مفروضہ چیرہ دستیوں کو اس انداز میں دور تک پہنچا دیا کہ خود اپنے بھی اس سے نفرت کرنے لگے۔فورٹ ولیم کی دیواروں پر کھڑے ہوکر اعلان کر دیا گیا کہ ٹیپو سفاکی میں چنگیز خان اور ہلاکو سے بڑھ کر ہے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کے زوال کے بعد انگریزوں کے مقابلے کے لیے کوئی بڑی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ ملک میں ان کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں ٹیپو سلطان ہی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔اس کی شہادت کے بعد ہی ان کی زبان سے پہلی دفعہ یہ معنی خیز جملہ نکلا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

ٹیپو سلطان نے اپنے عہد حکومت میں زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان اور چین سے نہیں گزارا۔ یہ سارا عرصہ جنگی معرکوں میں گزرا جو مہلت ملی اس میں وہ اپنے زیرِ اقتدار علاقوں میں زراعت کی ترقی، آب رسانی کی سہولتوں میں اضافے، نہروں، تالابوں، سڑکوں، پلوں، بندرگاہوں اور نئے شہروں کی تعمیر، چھوٹی بڑی صنعتوں کی ترقی، فوجی و انتظامی اصلاحات اور بیرون ملک و پڑوسی حکمرانوں سے سفارتی روابط اور داخلی معاملات پر گفت و شنید جیسے اہم انتظامی و تعمیراتی امور میں الجھا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ میدان جنگ کے نقشوں کو مرتب کرتا، لڑائی کی منصوبہ بندی کرتا اور اپنے عمال حکومت، فوجی سالاروں اور قلعہ داروں کو ہدایات جاری کرتا۔اس کی شہادت کے بعد اس کے ذخیرے سے ملنے والے چار ہزار

سے زائد خطوط کے موضوعات و مندرجات اس کی ایسی کارگزاریوں کا واضح ثبوت ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس فرمانروا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شہزادگی سے شہادت تک مسلسل خوفناک لڑائیوں میں گزرا، اسے ان معاملات پر توجہ دینے کا وقت کیوں کر ملتا تھا۔حق یہ ہے کہ سلطان حکومت کو خدا کی طرف سے امانت سمجھتا تھا اور اس امانت کا حق ادا کرنے کی جیسی عملی مثال اس نے پیش کی، اس کی نظیریں بہت کم ملیں گی۔

ٹیپو سلطان نے تخت نشینی کے بعد اپنی رعایا کے نام جو پہلا سرکاری فرمان جاری کیا اس میں بلاتفریق مذہب و ملت اپنی رعایا کی اخلاقی اصلاح، ان کی خوشحالی، معاشی و سیاسی ترقی، عدل و انصاف، جاگیرداروں اور زمین داروں کے ظلم وستم سے نجات، مذہبی و لسانی و طبقاتی عصبیت کا خاتمہ اور دفاع وطن کے لیے جان کی بازی لگادینے کا عزم کیا۔ملک کے قدیم طرز حکمرانی کو یکسر بدل دیا۔سلطنت کے امور میں عوام کو زیادہ سے زیادہ حصہ دینے کے لیے کوشاں رہا۔اس نے جمہوری تقاضوں کے پیش نظر ایک مجلس شوریٰ قائم کی جس کا نام مجلس غم نباشد تھا۔

ٹیپو سلطان نے تخت نشین ہونے کے بعد دو نئے آئین بنائے۔ایک فوج کے لیے جس کا نام فتح المجاہدین تھا اور دوسرا عوام کے لیے جس کا نام ملکی آئین تھا۔سرنگا پٹم میں جامع الامور کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں بیک وقت دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جاتی تھی۔حکومت کی طرف سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو بھاری مشاہرہ پر یہاں مقرر کیا گیا تھا۔

ٹیپو سلطان کی اس طرح کی بے شمار خصوصیات، عظیم کارنامے اور حیرت انگیز واقعات ہیں جو سالوں گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دل ودماغ میں نقش ہیں۔شہر میسور میں جانے کے بعد یہ چیزیں اور بھی تر و تازہ ہوجاتی ہیں۔کچھ ایسا ہی حال چند دنوں قبل

میسور میں ایک پروگرام میں شرکت کے دوران ہوا تھا۔ 15 اگست 2015 کو دارالعلوم صدیقیہ عربک کالج میسور میں جنگ آزادی میں علماء کے کردار کے عنوان پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔جس میں ہندوستان کے نامور علماء کرام کے ساتھ احقر بھی شریک تھا۔ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا شاہد صاحب مظاہری امین عام مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مہتمم درالعلوم وقف دیوبند، حضرت مولانا حکیم محمد عثمان صاحب قاسمی مدنی چیئرمین برکت المدینہ فاؤنڈیشن مدینہ منورہ، حضرت مولانا قاری عبدالحمید صاحب امام وخطیب مسجد السلام دبئی، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب دہلی اور دیگر کئی اہل علم اور بزرگان دین شامل تھے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی علماء کرام اور مدارس اسلامیہ کی مرہون منت ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے دور رکھنے کے لئے ٹیپو سلطان نے پوری زندگی اپنی جدو جہد جاری رکھی لیکن جب اپنے ہی غداروں کی بدولت انہیں کامیابی نہیں مل سکی اور 1857 میں بالکلیہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اسے برٹش حکومت کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے پوری جدوجہد یہاں کے مسلمانوں نے ہی کی۔علماء نے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ تن من دھن کی بازیاں لگائی گئیں اور بالآخر علماء کی قربانیوں کی بدولت ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی ملی۔

ہندوستان میں جنگ آزادی کی تاریخ 17 ویں صدی سے ہی شروع ہوجاتی ہے جب ملک میں انگریز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے اثرات کو دیکھتے ہوئے حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا اور مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک شروع کردی تھی۔جس میں تقریباً ہزاروں لاکھوں علماء نے اپنی قربانیاں

پیش کیں۔نواب سراج الدولہ والی بنگال، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، سید الطائفہ مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد علی جوہر، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، شاہ اسمٰعیل شہید رائے بریلی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، حضرت مولانا ولایت علی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، اور دیگر علماء کرام شروع سے پیش پیش رہے ۔انگریزوں نے بھی اپنی جدو جہد انہی علماء پر مرکوز کردی۔انگریزوں کو بھی اس بات کا یقین تھا، ٹیپو سلطان کے بعد ہماری راہ میں حائل یہی علماء اور مدارس کے پروردہ ہیں۔ ہندوستان پر حکومت برقرار رکھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان علماء کا خاتمہ کیا جائے، انہیں جیل کی کالی کوٹھریوں میں بند کردیا جائے۔ جب تک یہ علماء رہیں گے ہندوستان پر اطمینان کے ساتھ حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ انگریزوں نے علماء کے خلاف ملک بھر میں گرفتاری شروع کردی۔ایک انگریز مؤرخ کے مطابق صرف دہلی میں 52 ہزار علماء کرام کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ٹیپو سلطان کے شہر میں علماء کرام اور مجاہدین آزادی کی خدمات اور قربانیوں کے حوالے سے یہ پروگرام کافی اہم رہا۔ پروگرام کا عنوان ہی اپنے آپ میں اہم تھا اور پھر اس کا مرد مجاہد ٹیپو سلطان کی سرزمین میں ہونا ایک اور عظیم بات تھی۔

ٹیپو کی سرزمین سے ٹیپو سلطان اور مجاہدین آزادی کی خدمات کا تذکرہ کرکے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان حالات کا ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔علماء کرام کی قربانیاں اور انگریزوں کو یہاں سے دور رکھنے کی ٹیپو سلطان کی جہد مسلسل کل کی بات ہے۔ پروگرام کے منتظم حاجی محمد شفیع اللہ عراقی صاحب دبئی، محمد تاج الدین صاحب، دارالعلوم

صدیقیہ عربک کالج میسور اور ٹیپو سلطان ویلفیئر ٹرسٹ کے ذمہ داران قابل مبارکباد ہیں اور یہ توقع ہے کہ ٹیپو کی خدمات اور ان کے بعد ان کے مشن پر چلتے ہوئے بعد کے لوگ جنھوں نے تحریک جنگ آزادی میں شرکت کی تھی ان کی قربانیوں کو یاد کرنے اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

میرے استاد اور میرے شیخ
شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ

علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شارح، پیکر کتاب وسنت، عالم اسلام کے داعی، امام المحدثین، شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی قدس سرہ کے علمی جانشین، عالم انسانی کے مبلغ، امیر المومنین فی الحدیث، محمد بن اسماعیل البخاری کی جامع صحیح بخاری کے عملی ترجمان اور دنیا کے مقبول ترین استاذ و مربی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری نوراللہ مرقدہ کی رحلت علمی دنیا کیلئے ایک عظیم خسارہ اور میرے لئے سوہان روح ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مخدوم استاذ گرامی کا انتقال ایک عظیم دینی وملی خسارہ اور ایک باکمال مربی کا خاتمہ ہے، مخدوم گرامی کا درس بخاری ومسلم شریف پوری دنیا میں یکتائے روزگار اور لاثانی تھا، حدیث پر کلام اور اسماالرجال پر بحث کی مثال اقصائے عالم میں بے نظیر تھی، جب آپ پڑھاتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنے سینے سے علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاگردوں کے سینے میں منتقل فرمارہے ہیں، آپ نے چھ دہائی تک سہارنپور میں علم حدیث کی گتھیاں

سلجھائی ہیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ علیہ کے حقیقی علمی جانشیں ہونے کا بین ثبوت پیش فرمایا ہے۔شاید ایسے ہی عظیم شاگرد اور یکتائے روزگار محدث کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

حضرت شیخ کا وطن اصلی جونپور تھا، وہیں آپ کی پیدائش 25 رجب المرجب 1355 ہجری مطابق 2/ اکتوبر 1937ء میں ہوئی۔ جب آپ کی عمر پانچ سال دس ماہ کی ہوئی تو والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم آپ نے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی اور 13 سال کی عمر میں آپ عربی تعلیم کے حصول کیلئے ضلع جونپور میں واقع مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں میں داخل ہوئے، فارسی سے لیکر نورالانوار کی تک تعلیم آپ نے یہاں حاصل کی، مانی کلاں میں دوران تعلیم وہاں کے استاذ محترم مولانا محمد ضیاء مرحوم نے آپ کی خصوصی تعلیم وتربیت کی اور انہیں کے مشورہ سے 1377 ہجری مطابق 1958 عیسوی میں ہندوستان کی عظیم علمی درس گاہ جامعہ مظاہر علوم میں داخل ہوئے، حضرت شیخ مولانا ضیاء کا تذکرہ بخاری کے سبق میں بارہا فرمایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے میں نے انہیں کی وجہ سے تعلیم حاصل کی ہے، وہ میرے عظیم محسن ہیں۔ 1380 ہجری مطابق 1961 میں آپ نے یہاں سے فراغت حاصل کی، اگلے سال یہیں معین مدرس کی حیثیت سے آپ کی بحالی ہوگئی اور پھر یہیں آخری دم تک درس وتدریس میں مصروف رہے، آٹھ سالوں بعد 1388 میں استاذ محترم شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی کے انتقال پرملال کے بعد آپ شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے اور بلاانقطاع تقریبا پچاس سالوں تک آپ نے بخاری شریف کا درس دیا۔

مناظر اسلام حضرت مولانا اسعداللہ صاحب رامپوریؒ سابق ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ ناظم جامعہ مظاہر علوم، حضرت مولانا منظور احمد خان صاحبؒ آپ کے کبار اساتذہ تھے اور ان سے خاص قلبی لگاؤ رکھتے تھے، آپ کے رفقاء میں حضرت مولانا اطہر حسین صاحب ابن مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی سعید اجراڑوی، حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائپوری سابق ناظم جامعہ مظاہر علوم اور حضرت مولانا محمد اللہ ابن حضرت مولانا اسعداللہ صاحب رامپوری سابق ناظم جامعہ مظاہر علوم، حضرت مولانا عبدالحفیظ عبدالحق مکی مکہ مکرمہ، حضرت مولانا اسماعیل بدات مقیم مدینہ منورہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا نسیم احمد صاحب غازی خلیفہ ومجاز حضرت مولانا اسعداللہ صاحب، حضرت مولانا عبدالرحیم متالا رحمہم اللہ، حضرت مولانا حبیب اللہ مدنی مسجد نبوی شریف، شیخ الحدیث حضرت مولانا یوسف متالا مدظلہ العالی دارالعلوم بری انگلینڈ، کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں جن سے آپ خصوصی تعلق رکھتے تھے اور موقع بہ موقع ان کے بارے میں اظہار خیال بھی فرماتے تھے۔

حضرت اقدس اپنے اسلاف کی عظیم یادگار، بخاری شریف کے بے مثال شارح اور عصر حاضر کے امیر المومنین فی الحدیث تھے، آپ کی ذات سراپا مربی ومحسن اور عظیم روحانی پیشوا کی تھی، زہد وتقوی کے امام تھے، آج پوری دنیا میں آپ کے پھیلے ہوئے لاکھوں شاگرد، مرید ومتوسلین، عقیدت مند، مدارس ومساجد اور خانقاہوں کے ذمہ داران شدید صدمے سے دوچار ہیں، خود کو یتیم محسوس کررہے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ ان سے بہت بڑی قیمتی شی گم ہوگئی ہے۔

رنج وغم کی اس اندوہناک گھڑی میں استاذ گرامی قدر حضرت اقدس مولانا محمد عاقل صاحب مظاہری محدث وصدر المدرسین جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، استاذ گرامی قدر حضرت اقدس مولانا محمد سلمان مظاہری دامت برکاتہم ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور،

خلف الرشید حضرت اقدس مولانا محمد طلحہ کاندھلوی جانشین شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور حضرت شیخ زکریا کے علوم ومعارف کے امین و پاسبان، مخدوم گرامی حضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد الحسنی سہارنپوری امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے اظہار تعزیت کرتے ہیں، اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں اور حضرت الاستاذ کی بلندی درجات کیلئے دعا گو ہیں۔

17 شوال مطابق 11 جولائی 2017 کو میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے سفر پر تھا، وہاں مرشد الامت مدبر اسلام حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنو وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، عالم ربانی حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے ملاقات میں مصروف تھا اسی دوران برادر گرامی قدر مولانا عبداللہ مخدومی ندوی اور مولانا جمیل احمد مظاہری نے انتہائی افسردگی کے عالم میں یہ اندوہناک خبر سنائی کہ شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد یونس صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی ہے، یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں سے آنسو بہ پڑے، حضرت کی شاگردی کے ایام یاد آ گئے، ان کی محبت وشفقت کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا اور ماضی کے دریچوں میں کھو گیا۔

فوراً میں نے حضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد الحسینی صاحب سہارنپوری مدظلہ العالی کو فون کیا تو موبائل ان کا گجراتی بول رہا تھا، بڑی جدوجہد کے بعد مولانا سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کو جو خبر ملی ہے وہ صحیح ہے، میں احمد آباد سے تقریباً تین سو کیلومیٹر دور ہوں، کل صبح سات بجے دہلی ہوتے ہوئے سہارنپور پہونچ رہا ہوں، پھر اس کے بعد سہارنپور میں اخی الکریم مفتی محمد صالح مظاہری استاذ مظاہر علوم اور عزیزی مولانا محمد یاسر مظاہری معتمد مرکز الشیخ لتحفیظ القرآن الکریم سہارنپور سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی

لیکن وہاں موجود لوگوں کی بھیڑ میرے ربط کے درمیان حائل ہوگئی، پھر میں نے تجہیز وتکفین کا وقت معلوم کرنے کیلئے مخدوم گرامی قدر حضرت الاستاذ مولانا محمد سلمان مظاہری عمت فیوضہم ناظم مظاہر علوم سہارنپور سے فون پر رابطہ کیا تو ان سے بات چیت ہوئی اور جنازہ کا وقت معلوم ہوا کہ شام چھ بجے نماز جنازہ ہوگی، چناں چہ میں نے فوراً لکھنوء سے دہلی کیلئے انڈیگو فلائٹ کا ٹکٹ بک کیا، پرواز کا وقت 40:10 (دس چالیس) کا تھا، ڈھائی گھنٹہ قبل ندوہ سے نکل گیا، لیکن سوئے اتفاق راستے میں شدید اژدحام تھا، عالمی یوم آبادی کی مناسبت سے نکلنے والی ریلی نے پورا راستہ بند کررکھا تھا، اس ریلی میں اتر پردیش کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کو بھی شرکت کرنی تھی جس کی وجہ سے ٹریفک کی صورت حال اور زیادہ خراب تھی چناں چہ ریلی کی وجہ سے میں بروقت ایئر پورٹ نہیں پہونچ سکا اور یوں یہ فلائٹ چھوٹ گئی، تاہم اللہ تعالی کے فضل سے میں نے ہمت نہیں ہاری اور مختلف ایئر لائنز کی آفس کا چکر لگانے لگا اسی دوران میرے بیٹے عزیزم حافظ ظفر اقبال مدنی سلمہ کا فون آیا کہ ابھی ڈیڑھ بجے کی ایک فلائٹ ہے ابو آپ اس سے نکل جائیں، ہم نے اپنے ٹریول ایجنٹ سولوشن پوائنٹ کے چیرمین بھائی آفتاب عالم کو بتایا کہ ڈیڑھ بجے ایک فلائٹ ہے اس سے فوری ایک ٹکٹ بک کرلیں۔ اس طرح گوایئر کی فلائٹ سے میں دہلی کیلئے روانہ ہوگیا، 2:15 پر اسے دہلی پہونچنا تھا لیکن سوئے اتفاق موسلا دھار بارش اور شدید طوفان کی وجہ سے یہ فلائٹ بھی ایک گھنٹہ لیٹ ہوگئی اور میری زباں پر اچانک یہ شعر آ گیا کہ:

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

بہرحال ساڑھے تین بجے دہلی ایئر پورٹ پر فلائٹ لینڈ ہوئی، باہر نکلتے نکلتے چار بج گئے اور وہیں سے فوراً سہارنپور کیلئے روانہ ہوگیا، اس موقع پر اپنے دوست محترم جناب قاری

محمود الحسن صاحب زید مجدہ مہتمم مدرسہ تجوید القرآن آزاد مارکیٹ دہلی کا تذکرہ ضروری ہے جنہوں نے اپنی گاڑی ایئرپورٹ پر بھیج دی اور یوں جلد سہارنپور پہونچے میں ان کی اعانت خاص طور پر شامل حال رہی، اس سفر میں میرے ساتھ برادر گرامی مولانا یوسف انور قاسمی، مولانا شمس تبریز قاسمی اور حافظ محمد اکبر علی بھی شریک تھے جن کے ساتھ ہم ایئرپورٹ سے براہ راست پانی پت، کرنال، یمنا نگر ہوتے ہوئے سہارنپور کیلئے روانہ ہوگئے، وہاں پہونچنے کے بعد مرکز الشیخ زکریا لتحفیظ القرآن الکریم سہارنپور میں نماز ادا کی اور اس کے بعد حاجی شاہ کمال قبرستان پہونچ کر نماز جنازہ پڑھی، بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ ساڑھے دس بجے مٹی دینے کا موقع ملا۔

حضرت شیخ کی نماز جنازہ 11 جولائی 2017 کی شام کو ساڑھ چھ بجے مولانا محمد طلحہ صاحب نے پڑھائی اور شاہ کمال قبرستان میں تدفین عمل میں آئی محتاط اندازہ اور میڈیا رپورٹس کے مطابق نماز جنازہ میں 10 لاکھ سے زائد فرزندان توحید کا مجمع تھا۔

اس دوران دنیا کے مختلف ممالک میں موجود میرے دوستوں، بہی خواہوں، حضرت شیخ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے اس خبر کے ملتے ہی فون کر کے صورت حال سے آگاہی حاصل کی، اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا، مسجد نبوی شریف سے مخدوم ومکرم حضرت مولانا حکیم محمد عثمان مدنی مدظلہ العالی نے بھی فون کر کے اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے وہاں اپنے دوست واحباب کو جمع کر کے ایصال ثواب کی مجلس منعقد کی، پناما، سینٹرل امریکہ سے محترم حاجی ادریس بھائی تالیہ، بریڈفورٹ انگلینڈ کی مسجد قبا کے صدر حافظ احمد پٹیل وغیرہم نے بھی فون کر کے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کیا اور حضرت کی وفات کو ملت اسلامیہ کیلئے شدید نقصان بتایا:

رفتہ رفتہ اٹھ رہی ہیں ہستیاں بے نظیر
دل کا شاد بڑھتا جارہا ہے پیہم اضطراب

واپسی پر مادر علمی جامعہ مظاہر علوم پہنچا جہاں سناٹا اور اداسی تھی، در و دیوار غمزدہ تھے، پورا شہر خاموش اور سوگ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا، پھر میں نے حضرت الاستاذ مولانا محمد سلمان مظاہری زیدہ مجدہ ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کیا اور تعزیت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد مفتی محمد صالح اور مولانا محمد یاسر، گرامی قدر بھائی محمد راشد سہارنپوری کے ہمراہ ان کے گھر گیا جہاں ہمارے تمام رفقاء کی خدمت میں انہوں نے ماحضر پیش کیا۔ فجزاکم اللہ خیرو خیرا کثیرا۔

سہارنپور میں بھیڑ تھی، ہر طرف ہجوم تھا، افراتفری کا عالم تھا اس لئے میں مخدوم گرامی مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری سے رخصت ہونے کی اجازت لیکر دیوبند کیلئے روانہ ہوگیا، راستے میں گرامی قدر حضرت اقدس مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کہیں اور جانے کے بجائے آستانہ قاسمی پر تشریف لائیں، یہ آپ کا اپنا گھر ہے یہیں آپ کا قیام رہے گا، الحمدللہ بندہ نے اپنے تمام رفقاء کے ساتھ یہیں شب گزارا۔ صبح ناشتے کے بعد مخدوم گرامی، ہندوستان میں سرمایہ ملت کے پاسبان، حضرت اقدس مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم جانشین شیخ العرب والعجم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے ملاقات اور شرف نیاز حاصل ہوا، تقریباً تین ماہ کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی تھی، حضرت نے ڈھیر ساری دعائیں دی، نیک خواہشات سے نوازا اور وعدہ کرایا کہ اب کب آئیں گے، میں نے کہا کہ رواں ماہ کے اخیر میں پھر حاضری ہوگی انشاء اللہ تعالی۔ بعدہ استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد اسلم قاسمیؒ ناظم تعلیمات دارالعلوم وقف دیوبند (افسوس کے حضرت الاستاذؒ بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، 13 نومبر 2017ء کو داغ مفارقت دے گئے اور اپنی جدائی کے غم سے دنیا کو مغموم کر گئے) سے ملاقات اور عیادت کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن

حضرت کے شدید علیل ہونے کے باعث ملاقات کی کوئی شکل نہیں نکل سکی۔

ادھر حضرت شیخ کے انتقال کی خبر ملنے کے فوراً بعد جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار میں تعزیتی پروگرام اور ایصال ثواب کی مجلس منعقد ہوئی جس میں اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی جن میں مولانا مفتی محمد انصار قاسمی، مولانا حمید الدین مظاہری، مفتی عقیل مظاہری، مفتی نبی حسن مظاہری، مولانا عقیل قاسمی، مولانا فیاض قاسمی، قاری شمشیر عالم جامعی، مظفر حسین رحمانی، مظہر حسین رحمانی کے علاوہ دیگر اساتذہ اور بہی خواہان ملت نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے حضرت کیلئے بلندی درجات کی دعا کا اہتمام کیا۔

حضرت اقدس عصر حاضر کے محدث کبیر، امیر المومنین فی الحدیث اور علمی دنیا کے ایک عظیم سرمایہ تھے، وہ اسلاف کی یادگار اور بزرگان دین کی شان تھے، ان کے وجود سے صرف مظاہر علوم نہیں بلکہ پورے علم حدیث کی دنیا میں چہل پہل اور رونق سی تھی، آپ سے سند حدیث لینے کیلئے دنیا بھر کے معروف علماء اور محدثین تشریف لاتے تھے، آپ کی وفات سے ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، مظاہر علوم نے ایک باکمال محدث کھو دیا ہے۔ بارگاہ ایزدی میں ہم دعاء گو ہیں کہ پروردگار عالم حضرت الاستاذ کی قبر کو نور سے منور فرمائے، جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے، آپ کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت ملے، آپ کا فیض پوری کائنات اور اقصائے عالم میں جابجا اور کوہ بکو باقی رکھے۔

غزالاں! تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

حضرت الاستاد مولانا محمد اسلم قاسمی رمزیؒ

کیوں اے باد صبا! وہ لوگ چمن سے کدھر گئے

۱۳؍نومبر ۲۰۱۷ء کی دوپہر جس وقت یہ جانکاہ خبر سماعت سے ٹکرائی کہ خانوادہ قاسمی کے فرزند ارجمند جگر گوشہ حکیم الاسلام حضرت الاستاد مولانا محمد اسلم قاسمی رمزیؔ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، صبح کے گیارہ بجے کے قریب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو وطن عزیز سے دور دیار غیر (زامبیا، جنوبی افریقہ) میں دل مسوس کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور ذہن ودماغ نے کام کرنا بند کر دیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون، پڑھا اور یہ سوچ کر خود کو سنبھالا کہ یہی قانون فطرت ہے اور یہی دستور مشیت ایزدی ہے کہ جو بھی اس دنیائے فانی میں آیا ہے کل اسے اس دنیا کو الوداع کہنا پڑے گا۔ بقول شیخ ابراہیم ذوقؔ کہ:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
ہو عمر خضر بھی تو ہو معلوم وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

اور سب سے بڑھ کر خود خالق کائنات کا فرمان ہے کہ:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ

(سورہ آل عمران:۱۸۵)

(ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے)

اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے سب سے پہلے جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار میں اساتذہ کرام کو حضرت الاستاد کے سانحہ ارتحال کی اطلاع دینے کے ساتھ تعلیمی سرگرمیاں منقطع کرکے ایصال وثواب کی مجلس منعقد کرنے کی ہدایت دی۔جب طبیعت کچھ بحال ہوئی تو ایک ایک کرکے ماضی کی ساری کڑیاں کھلتی چلی گئیں جو زمانہ طالب علمی میں دیوبند سے وابستہ تھیں۔

بچپن سے ہی خاندان قاسمی کیلئے دل میں جو عظمت وعقیدت تھی وہ دھیرے دھیرے پروان چڑھتی گئی،جب دیوبند آیا تو اس خاندان کی معزز شخصیات کو نہ صرف دیکھنے کی حسرت پوری ہوئی بلکہ ان سے زانوے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے علم وعرفاں کے بارے میں جیسا کہ علماء کرام سے سنتا آرہا تھا اس سے کہیں زیادہ آپؒ کی زندگی نے متاثر کیا،حالاں کہ وہ زمانہ دارالعلوم کے خلفشار کا زمانہ تھا،روز ایک کرب کو سہنا پڑتا تھا،باوجود اس کے حضرت مہتمم صاحبؒ کے عزم،حوصلہ واستحکام کے ساتھ دارالعلوم سے ان کی بے پناہ محبت اور اس کے لئے تڑپ کسی اور فرد وبشر میں ان آنکھوں نے ابتک نہیں دیکھی۔

خانوادہ قاسمی کی جن شخصیات سے شرف تلمذ حاصل ہوا ان قابل تکریم وقابل فخر ہستی میں متکلم اسلام حضرت الاستاد مولانا محمد اسلم قاسمیؒ کا اسم گرامی سب سے پہلے آتا ہے۔۱۹۸۵ء میں جب دارالعلوم کی تقسیم کے بعد اس خوش نصیب جماعت کا ایک فرد میں بھی تھا جنہیں حضرت الاستاد نے طیب منزل میں 'نفحۃ العرب' اور 'قرآن کریم' کا ترجمہ پڑھایا تھا۔یہ ہمارے لئے بڑے عزوشرف اور فخر کی بات ہے کہ ہم دارالعلوم وقف دیوبند کی ابتدائی تعلیمی سرگرمیوں کے چشم دید ہیں اور سارے واقعات ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔طیب منزل کی جس چھت کے نیچے ہم نے دارالعلوم وقف کے ابتدائی دور میں تعلیم شروع کیا اس کی پنکھے کے پنکھڑیاں لکڑی کی تھیں،یہ افراتفری کا زمانہ تھا،حضرت حکیم الاسلام سے سچی عقیدت ومحبت کرنے والوں کو ہم نے دیکھا کہ اپنے گزر بسر کیلئے راتوں میں رکشا چلا رہے ہیں اور دنوں میں وقف دارالعلوم میں خدمت انجام دے رہے ہیں،ایک وقت کے کھانے کا اگر انتظام ہوجاتا تو دوسرے وقت کی فکر کہ اس کا انتظام ہوگا بھی کہ نہیں۔ان حضرات کی یہ وہ قربانیاں ہیں جن کا بدل اللہ پاک ہی دینے والا ہے۔میری اس جماعت کے ساتھیوں میں مولانا رضوان الحق مظفرپوری،مولانا عبدالجبار دکوی،مولانا ہارون دکوی، مولانا زید رانچوی،اور مولانا عبداللہ دیوبندی شامل ہیں۔مگر یہ موقع اس سانحاتی واقعات کو یاد کرنے کا نہیں ہے،یہاں پر صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ دارالعلوم وقف دیوبند کے ان خوش نصیب طالب علموں میں میں بھی شامل تھا جسے پہلے پہلے حضرت الاستادؒ سے شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔اسی طیب منزل میں علمی تشنگی بجھانے والوں کیلئے شاندار لائبریری بھی موجود تھی،جس میں درسی کتب کے علاوہ نادر ونایاب کتابیں موجود تھیں۔

طلباء سے بیحد پیار ومحبت اور شفقت فرمانا آپؒ کا خاص وصف تھا،حضرت الاستاد کی یہ وہ خوبی ہے جس کے سب معترف ہیں۔عجز وانکساری اور شرافت تو خانوادہ قاسمی کا

خاص وصف ہے آپؒ بھی اس صفت سے سراپا متصف تھے۔آپ کا درس بیحد مقبول تھا، پہلے دارالعلوم پھر دارالعلوم وقف دونوں جگہوں پر آپ نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ چھوٹی سے بڑی جو کتابیں بھی متعلق رہیں دوران اسباق آپؒ طلبہ کو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے، وقت کے تقاضوں کی مناسبت سے آسان انداز بیان میں پیش فرماتے۔پیچیدہ مضامین کو دلنشیں اسلوب میں خوب سہل کر کے خوبصورتی کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ایک محبوب و مقبول مربی واستاد کی حیثیت سے دیوبند میں آپ طلبا کے درمیان بیحد معروف تھے۔ دیوبند میں آپ کی تدریسی اور تنظیمی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہے، آج دنیا بھر میں آپ کے شاگرد موجود ہیں اور مختلف شعبوں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے مادر علمی اور اپنے مشفق اساتذ کرام کا نام روشن کر رہے ہیں۔

حضرت الاستاد گوناگوں صلاحیتوں کے حامل، خاموش طبیعت، متین، پروقار اور بردبار، یورپی ممالک میں حکیم الاسلامؒ کے رفیق سفر اور حکیمانہ خطاب کے ترجمان، اجلاس صدسالہ کے ناظم وروح رواں، دارالعلوم وقف دیوبند کے محدث، صدرالمدرسین کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔آپ ایک کامیاب مدرس ومربی کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر اور بلند پایہ شاعر بھی تھے، باتیں کرتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پھول جھڑتے ہوں۔جب کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو شروع سے آخر تک اپنی باتوں کو اسی عنوان پر مرکوز رکھتے تھے۔سیرت النبیؐ اور اخلاق حسنہ پر اثر انگیز وعظ فرماتے تھے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیرت النبی کے اجلاس میں متعدد بار آپ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کو اپنے خطاب سے مسحور و مستفیض فرمایا۔زبان وبیان میں بڑی چاشنی تھی پل میں ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔شاعری میں رمزیؔ آپ کا تخلص تھا، دوران سبق قدیم شعراء کے اشعار اور کبھی کبھی اپنا کلام بھی سناتے تھے، حضرت کی متعدد غزلیں، نظمیں اور نعتیہ کلام کو

پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔

آپ کو اللہ تبارک وتعالی نے قلم کا بھی سپاہی بنایا تھا چناں چہ کئی معرکۃ الآراء کتابیں آپ نے تصنیف فرمائی۔سیرت حلبیہ کا مکمل ترجمہ ’سیرت پاک‘ کے نام سے کیا جو آپ کا زندہ جاوید علمی کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ اصحاب کہف، ولادت نشوونما اور تفسیر راضی کا ترجمہ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی تحقیقی کتابیں ہیں۔عربی ڈکشنری ’المنجد‘ پر ضمیمہ بھی آپ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔والد محترم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے شعری مجموعہ ’عرفان عارف‘ کے مرتب بھی آپ ہیں۔پروردگار عالم اپنے پیارے حبیب محسن انسانیت رحمت للعالمینؐ کے صدقہ طفیل میں حضرت الاستاد کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، نیز دارالعلوم وقف دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔بلاشبہ آپ کا انتقال پر ملال ملت اسلامیہ ہندیہ کیلئے عظیم علمی خسارہ ہے۔بندہ حقیر کا سفر ابھی جاری ہے اور ذہن ودماغ پر صدمہ حاوی ہے اس لئے حضرت خطیب الاسلام مدظلہ العالی کے ایک نایاب اقتباس پر اپنی بات ختم کرتا ہوں (تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ)۔دراصل حضرت نے یہ الفاظ اپنے جد امجد فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے لئے تحریر فرمایا ہے، میں اسی تحریر کو حضرت الاستاد کے نام منسوب کرتا ہوں۔

’’حضرت الاستاد متکلم الاسلام مولانا محمد اسلم صاحب قاسمیؒ کی تعلیم وتربیت اور نشوونما جس علمی وروحانی ماحول میں ہوئی، وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، خیال کیجئے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ جیسی شخصیت اپنے فرزند فرید کی تعلیم وتربیت، جس بہتر انداز میں کر سکتے تھے اور ان کے دینی مستقبل کی جو فکر ان کے ذہن میں رہی ہوگی ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا اثر نہ دکھاتی۔‘‘

مذکورہ چند بے ترتیب سطور کے ساتھ ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان حضرت

اقدس مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم العالیہ،حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی،مولانا محمد فاروق صاحب قاسمی، بھائی مولانا حشام قاسمی اور مولانا شکیب قاسمی اور دیگر پسماندگان سے اظہار تعزیت پیش کرتا ہوں اس شعر کے ساتھ کہ:

جنگل کو باغ،باغ کو خلا کر گئے
کیوں اے بادِ صبا! وہ لوگ چمن سے کدھر گئے

❁ ❁ ❁

باب پنجم

تعارف و تبصره

رہبر انسانیت ﷺ

مؤلف: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

محسن انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ ہر لمحہ عالم انسانیت کیلئے مشعل راہ ہے، ابتداء سے لے کر انتہاء تک آپؐ نے انسانیت کی تعلیم دی، امت مسلمہ کی کامیابی، تعمیر وترقی اور ان کے درمیان اتحاد واتفاق کے قیام کی دعائیں مانگیں، آپؐ کی زندگی، آپؐ کی سیرت طیبہ صرف اہل اسلام اور مسلمانوں کیلئے نہیں، بلکہ پوری دنیا کیلئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مسلم اسکالرز اور علماء کرام نے لاکھوں کتابیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ برصغیر ہند وپاک میں غلامان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ سرسید احمد خان کے خطبات احمدیہ، مولانا حالی کے مولود نامے کے علاوہ معراج نامے، شمائل نامے، نور نامے تحریر ہوئے، ان ہی کتابوں کی فہرست میں عالم اسلام کی مشہور شخصیت نامور عالم دین آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کی کتاب رہبر انسانیت ہے۔

رہبر انسانیت میں مولانا نے انتہائی خوبصورت اور ادیبانہ انداز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، سیرت طیبہ کے ہر پہلو پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے ان امور پر خاص توجہ دی گئی ہے جسے مغرب کے متعصب میڈیا نے غلط رخ دے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو تصنیف کرنے کی اہم وجہ بھی مغرب کے متعصّبانہ رویہ کا جواب دینا ہے۔

’’انسانی زندگی کے حالات میں کبھی کبھی یہ دلچسپ بات بھی پیش آجاتی ہے کہ شر سے خیر نکل آتی ہے اور شر کرنے والوں کے شر کا نتیجہ الٹا ہوجاتا ہے، کچھ اس طرح کی بات اس معاملہ میں بھی سامنے آئی کہ ادھر دو سال قبل حضور اکرم رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یورپ کے بعض اہل فکر نے گستاخی اور شر انگیزی کا جو رویہ اختیار کیا، اس نے حضور سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں اور وفاداروں کو ایسا ہوشیار کردیا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے، جگہ جگہ سمینار ہوئے اور آپ کی سیرت طیبہ جو انسانی زندگی کیلئے عزت وبرتری کے حصول کیلئے رہبر اعظم ہے، اس کو پیش کرنے کیلئے جگہ جگہ خیر پسند اہل قلم متحرک ہوگئے اور کتابیں تصنیف کی گئیں اور نبی اعظم رہبر انسانیت اور رحمت عالم کی حیات طیبہ کے شاندار پہلو کو پیش کرنے لگے اور یہ کام ہر زبان میں کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔ اس کی ایک کڑی میری بھی ایک کوشش ’’رہبر انسانیت‘‘ کے نام سے لائق اشاعت پذیر ہوئی جو کہ الحمد للہ پسند بھی کی گئی اور کم مدت ہی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے اور اب تیسرا ایڈیشن شائع ہونے جارہا ہے۔‘‘

مدبر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہٗ کی یہ کتاب کل دس ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں آپ نے جغرافیائی بحث کرتے ہوئے

عرب، یورپ اور مختلف ممالک کا تذکرہ کیا ہے، دوسرے باب میں بعثت نبویؐ سے قبل عرب کی صورت حال، وہاں کے قبائل اور سابقہ اقوام کا تذکرہ کیا ہے اور تیسرے باب سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

کتاب کی اہمیت اور افادیت کے تعلق سے رئیس القلم حضرت مولانا واضح رشید ندوی صاحب معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ یوں رقم طراز ہیں:

’’سیرت پر مختلف زاویوں سے کتابیں لکھی گئیں، کسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قائد کی حیثیت سے پیش کیا گیا، کبھی ایک سیاسی لیڈر یا انقلابی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا گیا، کسی میں عربوں کا نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل خصوصیت معلم اخلاق اور رحمۃ للعالمین ہے اور اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ برادر گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی اس سیرت کی کتاب میں آپ کی جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔‘‘

’رہبر انسانیت‘ سیرت نبویؐ پر ایک عظیم علمی شاہکار ہے جو ہر طبقے کے اہل علم کے لئے یکساں مفید ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے مطالعہ میں لایا جائے۔

خطبات بہاول پور

مؤلف: ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس، فرانس

ماضی قریب میں علم وتحقیق اور فکر وتدقیق کی دنیا میں عالمی سطح پر جو چند شخصیات نمودار ہوئیں اور انھوں نے اپنے علم ونظر اور بصیرت مندی ودیدہ ریزی سے علمی دنیا کو ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور گراں قدر علمی، فکری، تحقیقی وتصنیفی تحفے دیے، ان میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نام ممتاز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات مجمعِ کمالات تھی، ان کا علمی ذوق نہایت ہی اعلیٰ، فکری سراپا بلند وبالا اور تحقیق ونظر کے معاملے میں وہ اپنے بیشتر معاصرین میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عمر میں اللہ بہت برکت دیتا ہے، جنہیں دیکھ کر یقین ہی نہیں ہوتا کہ اتنا کام کسی ایک شخص نے کیا ہے، وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اشاعت دین کے لئے وقف کردیتے ہیں، جو ایک شخص نہیں شخصیت ہوا کرتی ہے، انہی عظیم شخصیات میں سے ایک نام جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا ہے، ان کی علمی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں، آپ 16 رمحرم الحرام 1366ھ مطابق 9 فروری 1908ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تعلیم وتربیت کے مختلف مراحل بھی اسی سرزمین میں

طے کئے، ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ پہنچے، بون یونیورسٹی (جرمنی) سے ڈی فل اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ علم وادب کا یہ آفتاب 17 ردسمبر 2002 کو امریکی شہر جیک سونول میں 94 سال کی عمر میں غروب ہوگیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اردو، فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے اور ہر زبان کی سیکڑوں کتابیں اور قیمتی علمی مآثر آپ کے زیر مطالعہ رہیں، آپ نے مختلف یورپی زبانوں میں کتابیں لکھیں جو علمی حلقوں میں کافی سراہی گئیں، خاص طور پہ مختلف اقوام وادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی وتحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے، آپ نے سیرۃ النبیؐ کے اجتماعی اور سیاسی پہلوؤں پر مختلف زبانوں میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جو مقبول عام وخاص ہوئیں اور انھیں مستند تاریخی مرجع وماخذ حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ''خطبات بہاولپور'' ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ان برجستہ محاضرات اور خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف مجلسوں میں پاکستان کی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں دیے ہیں، بعد میں افادۂ عام کی غرض سے ان خطبات کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کی اشاعت ''اسلامک بک فاؤنڈیشن'' نئی دہلی کی جانب سے ہوئی ہے، کتاب کی ضخامت 492 صفحات کی ہے، کتاب مجلد ہے، مواد کی طرح اس کتاب کی طباعت بھی دیدہ زیب اور خوب صورت ہے۔

''خطبات بہاول پور'' ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے 12 مدلل اور تحقیقی خطبات اور محاضرات کا مجموعہ ہے، جس میں ہر موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ دین اسلام اور اس کے نظام کا ایک واضح تصور ذہن میں چھا جاتا ہے، کسی بھی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا۔

تاریخی، سیاسی، جغرافیائی اور تقابلی، ہر اعتبار سے مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہر خطبے میں بہت سی ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اکثر لوگوں کے لئے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً پہلے خطبہ ''تاریخ قرآن مجید'' میں آپ نے مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کو صحیح صورت میں جمع کرنے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مکمل ہو گیا تھا، بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے انتہائی احتیاط واہتمام سے ایک کتاب کی صورت میں مدون کیا۔ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جمع کیا تھا تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں کو ایک نسخہ قرآن پر جمع اور متفق کیا۔ قدیم صحائف کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بحرِ مردار کے پاس بعض غاروں میں کچھ مخطوطے ملے ہیں، ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرا خنوخ یا حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''پران'' کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کے کسی نبی پر نازل شدہ کتاب ہونے کے بارے میں بھی دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ ''پران'' وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا یعنی قدیم کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، قرآن میں بھی اس کے بارے میں عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے، ''وانہ لفی زبر الاولین''. (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے)۔ نیز قرآن مجید کے عربی زبان میں نازل ہونے کے نکتے کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثناء حاصل ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو عربی زبان ہے، ورنہ ہر ایک زبان میں ایک زمانہ کے بعد اتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں کہ اسے پڑھنا اور سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ جب عربی زبان میں کوئی ایسی جوہری تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو قرآن کریم میں بھی ایسی تبدیلی وتحریف کی گنجائش نہیں رہتی، اس کا اعلان

تو خود اللہ تعالیٰ نے کردیا ہے کہ ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کا انتظام کریں گے، تو جب قرآن پاک کی حفاظت ہوگی تو اس کے ساتھ جس زبان میں یہ کتاب نازل کی گئی ہے، اس زبان کی حفاظت کا بھی گویا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی ولسانی اعتبار سے قرآن کریم کی اہمیت وعظمت آج بھی مسلم ہے اور اس سے کسی بھی صاحبِ بصیرت انسان کو انکار کی جرأت نہیں۔

قرآن وحدیث میں مماثلت کو ایک مثال سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں'' قرآن وحدیث کا درجہ بالکل مساوی ہے جس طرح کسی بادشاہ کے بھیجے ہوئے سفیر کا ہر ہر لفظ بھیجنے والے کا سمجھا جاتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی امور میں ارشاد فرمائی گئی ہر بات کو اللہ کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ اسی کی طرف اللہ نے قرآن میں اشارہ کیا ہے،''وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی ''۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ فقہ میں اسلامی قانون سازی کا موازنہ دیگر قوموں کے قوانین سے کرنے کے بعد اسلامی قوانین کی برتری، وسعت، گہرائی اور ہمہ جہتی ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''محققین اور مؤرخین کے نزدیک سب سے بڑی قانون ساز قوم رومیوں کی گزری ہے، لیکن رومیوں کی حکومت کی توسیع ہوتی رہی تو انہیں اپنے قوانین میں بہت سے اضافے، تبدیلیاں اور ترمیمیں کرنا پڑیں، کیوں کہ اس قانون کی اساس یہ ہے کہ انسان خود قانون ساز ہے اس لئے اس میں استحکام نہیں رہا اس کے برخلاف اگر قانون کی اساس اللہ کے احکام پر ہو تو اس میں استحکام اور پائیداری ہوگی جو انسان کے قانون کے اندر نہیں ہو سکتی''۔ اس طرح انھوں نے بڑے سادے اور منطقی انداز میں اسلامی قانون کی پختگی اور پائیداری کو ثابت کیا ہے۔

''اسلامی قانون بین الممالک'' کی اہمیت بتاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے

کہا ہے کہ یہ ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا ہی رہین منت ہے اور مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اس کو وجود بخشا، قانون بین الممالک یعنی عالمی قانون چند مخصوص قوموں کے لئے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ممالک پر یکساں ہونا چاہئے ، اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں کے پاس جو قانون ہے، وہ کسی دوسری قوم کے پاس تا حال موجود نہیں ہے، کیوں کہ اس وقت مجلس اقوام متحدہ کا خود بخود دیا بہ استحقاق ممبر بننا کسی سلطنت کے لئے ممکن نہیں جب تک دو ممبر سلطنتیں اس کی سفارش نہ کریں اور اس کی ذمہ داری نہ لیں کہ یہ واقعی متمدن سلطنت ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی قانون میں اس فرق وامتیاز کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا، حتیٰ کہ ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کرے تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کریں گے۔ واقعتاً یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس کے شرعی قوانین ومسائل سے لے کر سیاسی دستور تک میں امتیاز وعدمِ مساوات کا ذرہ برابر شائبہ تک نہیں ہے اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی واضح کر دیا ہے کہ انسانوں کے مابین فرق اور امتیاز ذات، نسل یا رنگ کی وجہ سے نہیں ہوگا، بلکہ انسان کے اعمال واخلاق اور تقویٰ کے ذریعے ہوگا اور اسی چیز کو نبی اکرم ﷺ نے مزید وضاحت کے ساتھ اپنے آخری خطبے میں بیان فرما دیا تھا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوگی، البتہ تقویٰ اور ذاتی اعمال واخلاق کی بنیاد پر اس کا مرتبہ عنداللہ متعین کیا جائے گا۔ لہٰذا سیاسی ومعاشرتی معاملات ومسائل میں ہر انسان اسلام کی نگاہ میں برابر ہے اور اسلامی دستور وقوانین کی رو سے اس کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ اور نابرابری نہیں کی جاسکتی۔

''عہد نبویؐ میں نظم ونسق'' کے ضمن میں ایک جگہ ڈاکٹر صاحبؒ نے دلائل سے یہ

بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کل ترقی یافتہ انتظامی ادارے نظر آرہے ہیں ان سب کی بنیاد عہد نبویؐ میں پڑ چکی تھی، کیوں کہ مملکت کے نظام کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجیحی طور پر توجہ دی۔ مثلاً مدینہ میں اول مرحلے میں ''صفہ'' میں تعلیمی مرکز کا قیام، فوج کا انتظام، مال کا انتظام اور سرکاری سکریٹریٹ کا بھی انتظام کیا، جس کے نتیجے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو شہری مملکت سے لے کر ایک وسیع سلطنت کا دارالسلطنت بنا دیا۔ اس وسیع سلطنت کا رقبہ تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ اس سلطنت میں مسلسل دس سال تک اوسطاً روزانہ کوئی آٹھ سو پینتالیس (845) مربع کلومیٹر علاقے کا ملک کے رقبے میں اضافہ ہوتا رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے خطبات کا مجموعہ نہایت ہی وقیع اور تحقیقی ہے، اللہ جزائے خیر دے اس کے مرتبین کو کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے افادات کو علمی دنیا کے سامنے لا کر شائقینِ علم وتحقیق کو ایک قیمتی تحفہ فراہم کر دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے فائدہ مند ہے جو اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن وثقافت اور اسلامی نظامِ حکومت وسیاست پر تحقیقی مطالعے کا خواہاں ہو۔ کتاب میں شامل ہر خطبہ اپنے آپ میں بے پناہ قدر وقیمت رکھتا ہے اور فکر ونظر کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے، اسلامی موضوعات، خاص طور سے اسلامی تاریخ اور سیرت کے موضوع پر بولنے یا لکھنے والے عام طور پر مروجہ روایتی طریقے پر انحصار کرتے ہیں، مگر ڈاکٹر صاحبؒ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر انتہائی دقتِ نظری، دیدہ ریزی اور بصیرت مندی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور جہاں موضوع کا مکمل احاطہ کرتے ہیں، وہیں اپنی تحریر یا تقریر میں علمی وتحقیقی نکات کی بھی ایک دنیا آباد کر دیتے ہیں۔

عکس احمد

مؤلف: مولانا محمد شکیب قاسمی، سکریٹری حجۃ الاسلام اکیڈمی دیوبند

برصغیر میں قاسمی خاندان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ان کی عظمت رفتہ کے نقوش ان گنت ہیں۔ مسلمانوں کی سربلندی، شعائر اسلام کی حفاظت اور تعلیمی، معاشرتی، سماجی ترقی کا سہرا حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کو براہ راست جاتا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ 1857 اور اس کے بعد برصغیر میں برپا ہونے والی تمام تحریکوں کا سہرا بالواسطہ یا بلاواسطہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو ہی جاتا ہے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمات جلیلہ میں سرفہرست دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے جہاں سے مسلمانوں کی عزت وسربلندی کا سلسلہ شروع ہوا، مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد ہندی مسلمانوں کو سوچنے، سمجھنے اور یہاں کے ماحول میں رہنے کے لئے ایک نئی راہ ملی۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد جن بزرگوں نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے، اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لیا ہے اور اسے عالمی سطح کا ادارہ بنایا ہے ان کی فہرست طویل ہے تاہم ان میں قاسمی خاندان کے افراد سرفہرست ہیں، خاص طور

پر بانی دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب اور پوتے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جنہوں نے طویل عرصے تک دارالعلوم سے وابستہ رہ کر اس کی نوک و پلک کو سنوارا، اپنی انتظامی صلاحیتوں سے اس ادارہ کو بھرپور فائدہ پہنچایا، اسے عالمی سطح کا ادارہ بنایا اور دارالعلوم دیوبند کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ایشیا کی عظیم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم خامس فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ تھے جن کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے بے مثال ترقی کی، ان کے عہد کو دارالعلوم کے لئے موسم بہار کے نام سے جانا جاتا ہے، دیوبند اور یوپی سے تجاوز کر کے اس کی شہرت بیرون ہند تک پہنچی، بیرون ممالک سے زائرین کے علاوہ طالبان علوم نبویؐ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعبۂ تجوید، شعبۂ تبلیغ سمیت کئی شعبوں کا قیام عمل میں آیا، ماہنامہ القاسم اور الرشید کی شروعات ہوئی، کتب خانہ، مسجد قدیم، نودرہ، دارالاقامہ، ریلوے اسٹیشن پر مسجد اور دیگر عمارتوں کی تعمیر ہوئی، آپ کے دور کی سب سے یادگار عمارت دارالحدیث کی تعمیر ہے جو دارالعلوم دیوبند کی شناخت اور پہچان ہے۔ انتظامی اور تعلیمی اعتبار سے بھی کافی ترقی ہوئی، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب کا 35 سالہ دور اہتمام دارالعلوم دیوبند کی ترقی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور تاریخ دارالعلوم کا زریں باب ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اب تک اس عظیم شخصیت کی کوئی مستقل سوانح نہیں تھی، ان کی حیات وخدمات کسی جگہ یکجا نہیں تھیں۔ قابل مبارکباد ہیں خاندان قاسمی کے ہونہار چشم و چراغ مولانا شکیب قاسمی ازہری جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور 'عکس احمد' کے نام سے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی حیات وخدمات پر ایک کتاب تصنیف کی۔ عکس احمد کی تصنیف میں ان کے ساتھ نوجوان فاضل متحرک وفعال عالم دین مولانا نوشاد

نوری استاذ دارالعلوم وقف دیوبند بھی شریک ہیں اور عکس احمد کی تصنیف میں انہوں نے اپنا کلیدی رول ادا کیا ہے، تقریباً تین سالوں کی انتھک محنت اور جدوجہد کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آسکی ہے۔

مولانا احمد صاحب کی حیات وخدمات پر مستقل تصنیف خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کی بھی دیرینہ خواہش تھی جس کا اظہار انہوں نے کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے، کتاب کی تصنیف میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، پہلے سے مستقل کوئی کتاب نہ ہونے اور دیگر وجوہات کی بنا پر کتاب کے مواد کی تلاش میں مصنفین کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس سے اہل تصنیف وتالیف بخوبی واقف ہیں۔

کتاب کا انداز سادہ، شگفتہ اور سلیس ہے، مواد سے بھرپور ہے، اس کتاب کی حیثیت صرف سوانح تک محدود نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، علماء کی تحریکات اور ان کے کارناموں کی مکمل تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں، یہ کسی خاص شخص کی سوانح نہیں، بلکہ اس عہد کے تمام بزرگوں کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔ دارالعلوم کی جامع تاریخ ہے، عکس احمد کے صفحات کی تعداد 488 ہے جو کل 14 ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے ابواب میں خاندانی پس منظر، اس وقت کے حالات، دارالعلوم دیوبند کے قیام کا پس منظر، ابتدائی احوال اور دیگر امور کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے وابستگی، آپ کے اساتذہ، آپ کے نامور شاگرد، عہد اہتمام کا تفصیلی جائزہ اور اس دوران ہونے والی ہمہ جہت ترقی سے بحث کی گئی ہے، دو ابواب میں دکن سے آپ کی وابستگی، وہاں دی گئی خدمات اور اس تعلق سے دیگر امور کا جائزہ لیا گیا ہے، کتاب میں آپ کی تحریر، تجاویز اور دیگر چیزوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اور اس کی تالیف کا کام حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر اہتمام ہوا ہے جس کے بارے میں اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا شکیب قاسمی رقم طراز ہیں:

ہم اسے اپنی سعادت اور اللہ تعالیٰ کا کرم ہی سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم خدمت حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند سے ہم ایسے کم سوادوں کے ذریعہ انجام پارہی ہے اور اس کے ذریعہ جد امجد خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم اور خانوادۂ قاسمی کے دوسرے بزرگوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر سامنے آرہی ہے۔ (عکس احمد صفحہ نمبر 30)

خلاصہ یہ کہ فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کی یہ پہلی سوانح ہونے کے ساتھ جامع سوانح بھی ہے، اس میں تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، خوبصورت طباعت، عمدہ کاغذ کا استعمال اور دیدہ زیب سرورق نے کتاب کی خوبصورتی میں مزید چار چاند لگادیئے ہیں۔ اس گراں قدر تصنیف کی اشاعت پر عزیزی مولانا شکیب قاسمی کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے بیحد خوشی ہورہی ہے، اللہ پاک ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

حیات طیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مرتب: مولانا شکیب قاسمی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی صرف برصغیر ہندو پاک نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں نمایاں شناخت اور مقام رکھتی ہے، عظمت ورفعت اور بلندی کے ساتویں آسمان پر آپ فائز تھے، علم دین اور حکمت ودانش کے بلند پایہ حامل تھے، آپ نے اپنے عظیم مورث، علوم دینیہ میں عظیم مقام رکھنے والے اور 1857 کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کو نئی سمت دینے والی عظیم شخصیت حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی گہرائی اور وسعت کی وراثت پائی تھی۔ حجۃ الاسلام کی طرح آپ کا دل بھی جذبہ اور تڑپ سے سرشار تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی شناخت برقرار رکھنے اور شعائر اسلام کی حفاظت کیلئے حضرت نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کرکے امت مسلمہ کو عظیم تحفہ دیا تھا۔ آپ نے پچاس سال سے زائد عرصہ تک اس ادارہ کی سربراہی کی، اسے استحکام بخشا اور پوری دنیا میں اسے متعارف کرایا۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اس قافلۂ حق کے لیے آپ کی طویل اور مسلسل خدمات ہیں جن میں کوئی دوسری شخصیت آپ کی مثل نہیں ہے۔ آپ کے طویل دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند نے جو ترقی کی اور وسعت وتنوع کے جن دائروں سے یہ از ہر ایشیا متعارف ہوا، وہ علمی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور نہ صرف خاندان قاسمی، بلکہ قافلہ رشید وقاسم رحمہم اللہ کے لیے باعث فخر واعزاز ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم دادا کے ورثہ کو نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اس میں بیش بہا اضافہ کرکے اسے تاریخ میں زندۂ جاوید بنادیا اور تاریخ کے اوراق میں جب بھی دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ ہوگا، حکیم الاسلام حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوسکے گا۔ آپ کی متنوع خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

”دارالعلوم دیوبند کی نمائندگی مولانا محمد طیب صاحب نے اپنی پوری زندگی میں اس طرح انجام دی کہ بہت سے ذہنوں میں ان کا نام دارالعلوم دیوبند کے نام کے ساتھ وابستہ رہا اور اس طرح سے ان کی کوششوں کا فائدہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کو خصوصی طور پر پہنچا اور دوسری طرف ان کی باتوں کا وزن لوگوں کی اصلاح اور دینی رہنمائی کے کام میں مؤثر رہا۔“

دارالعلوم دیوبند کو ترقی سے ہم کنار اور اس کی آبیاری کرنے کے ساتھ آپ علمی دنیا میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے، علم کا پہاڑ اور معلومات کا سمندر ہونے کے ساتھ علم کے اظہار اور ابلاغ کے لیے آپ کا انداز واسلوب ایسا حکیمانہ اور فطری تھا کہ ان کو سننے اور پڑھنے والا افادہ اور استفادہ کے اس سفر میں خود کو ان کے قدم بہ قدم چلتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ متکلمین اسلام کے ناموں کی فہرست میں آپ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حضرت حکیم

الاسلام عالم اسلام کی عظیم شخصیت اور مسلمانوں کے مسیحا تھے، ملت اسلامیہ کی ترقی اور مسلمانوں کے تئیں آپ کی فکرمندی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی پر متعدد کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا، اہل علم حضرت حکیم الاسلام کو ان کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے، تاہم ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس میں حضرت کی خدمات کا مکمل اور تفصیلی تذکرہ ہو، آپ کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کا احاطہ کیا گیا ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند وقف کے زیر اہتمام قائم حجۃ الاسلام اکیڈمی نے اس جانب پہلی فرصت میں توجہ دی اور خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے دو ضخیم جلدوں پر ’حیات طیب‘ کی تصنیف کا اہم فریضہ انجام دیا۔ جواں سال فاضل، فکر قاسمی کے امین، خاندان قاسمی کے ہونہار چشم وچراغ مولانا شکیب قاسمی اور دارالعلوم وقف کے اہم استاذ مولانا غلام نبی قاسمی نے مشترکہ طور پر اس کتاب کو مرتب کیا۔ اس کتاب میں ان مقالات سے خاص معاونت لی گئی ہے جو 2007 میں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کی ذات گرامی پر ہونے والے عالمی سمینار کیلئے لکھے گئے تھے۔ کتاب کا مقدمہ خطیب الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”2007 میں جب آپ کی حیات ووفات پر ایک عالمی سمینار کا انعقاد کیا گیا اس وقت مضامین ومقالات کی صورت میں مشاہیر اہل علم کی معیاری تحریریں ہمیں موصول ہوئیں، جنہیں سمینار کے بعد شائع کرنے کا عزم تھا مگر تاخیر ہوتی چلی گئی بالآخر قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ تحریریں حکیم الاسلام کی سوانح کا حصہ بنیں۔ رب کریم کا احسان ہے کہ آج ہمارے دیرینہ خواب کی تعبیر ”حیات طیب“ کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔“

’حیات طیب‘ حضرت حکیم الاسلام کی شخصیت پر ایک جامع اور گراں قدر تصنیف ہے، مصنفین نے حکیم الاسلام کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کیا ہے، ابتدائی حالات، تعلیم، آپ کی سیاسی، سماجی، ملی اور تعلیمی خدمات کے ساتھ آپ کی تقریر وتحریر کے حوالے سے بھی بیش قیمت باتیں لکھی گئی ہیں۔ گویا یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب کاغذ کا اہتمام کیا گیا ہے، انداز بیان اچھوتا، اسلوب پرکشش اور نرالا ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور قاری جب اس کتاب کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کا دل یہ چاہتا ہے کہ اسی مجلس میں یہ کتاب ختم کردیں کیوں کہ تمام چیزوں سے اس کی توجہ ہٹ کر کتاب کی جانب مبذول ہوجاتی ہے اور یہ کتاب خود بخود مطالعہ کا انہماک پیدا کردیتی ہے۔

نوجوان فاضل عزیزی مولانا شکیب قاسمی قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے ’حیات طیب‘ ترتیب دیکر ملت اسلامیہ ہند کی جانب سے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے، ساتھ ہی مولانا غلام نبی قاسمی بھی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے یہ بیش قیمت کتاب تحریر کرکے امت مسلمہ کو ایک خوبصورت تحفے سے نوازا ہے۔

۴۸؍سال شفقتوں کے سائے میں

مؤلف: ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

عالم ربانی حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم رئیس البعث الاسلامی، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء وچانسلر انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے قلم سے نکلی ہوئی اس مایہ ناز کتاب کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یادرفتگاں اور یادمشفقاں کا حسین امتزاج ہے '۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں' اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ایک تاریخ ساز اور عظیم شخصیت کے ساتھ بیتے ہوئے حسین لمحوں اور نصف صدی پر محیط زندگی کی پل پل کی یادگاری اور تعمیری کہانی کو ایک تاریخ ساز شخصیت نے اپنے ذہن ودماغ کے دریچوں میں ایک عرصہ سنبھال کر رکھا اور پھر اسے صفحۂ قرطاس پر سلیقے سے لعل وگوہر کی طرح بکھیر دیا۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مضامین کا زمانی دائرہ تقریباً گزشتہ پانچ دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے، ابواب وعناوین سے بہت سے ایسے واقعات سے شناسائی ہوتی ہے جن کے چشم دید راوی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ہیں۔ اس کے بعد اہل ذوق کے اندر قابل توجہ تخلیقات، تحقیقات اور گراں قدر مضامین کے مطالعے کا داعیہ پیدا ہونا

ایک فطری امر ہے۔ حضرت مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ کی معیت میں رہ کر مصنف نے آپ کے محاسن کا نہ صرف اعتراف کیا ہے، بلکہ ان خصوصیات کو اپنی زندگی میں شامل کر کے انہوں نے دنیا کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ ایسے محسن اور مشفق کی قدردانی کے بعد نہ صرف زندگی میں انقلاب برپا ہوجاتا ہے، بلکہ ان کے اصول زریں پر عمل پیرا ہوکر کوئی بھی انسان منزل یاب ہوسکتا ہے۔

'شفقتوں کے سائے میں' میں شامل صرف مشہور واقعات اور مضامین پر ہی مصنف نے خصوصی توجہ نہیں دی ہے، بلکہ ایک ایک نگارش اور ہر ہر پہلو پر اپنی محبت نچھاور کی ہے جسے دوران مطالعہ پوری کتاب میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب سنجیدہ قاری کو اپنی جانب اس وجہ سے متوجہ کرے گی کہ شروع سے آخر تک مضامین میں ایک تسلسل اور ربط ہے جو 'اور آگے اور آگے' کی دلچسپی پیدا کرتا ہے۔

عالم عرب و عالم اسلام کی بہت سی عبقری شخصیات جن کا ذکر کتاب میں کسی حوالے سے آیا ہے، ان کی زندگی پر بھی بقدر ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح 'عالمی رابطہ ادب اسلامی' کا قیام کیسے، کہاں اور کس طرح ہوا۔ کون سی شخصیات اور کن واقعات سے تحریک پاکر اس اہم تحریک کا قیام عمل میں آیا اس کے ابتدائی محرک اور عہدیداران کون تھے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں ''ندوۃ العلماء'' کے قیام کا پس منظر بھی خاصا معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ حضرت مولانا نے ندوۃ العلماء کی علمی، تعلیمی اور ہمہ گیر دعوتی تصویر کو پوری طرح مضبوط کر کے ایک اجمالی خاکہ میں پیش کیا ہے۔ اس سے ندوہ کے علمی اور فکری ماحول کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی ادبی، دینی اور دعوتی سرگرمیوں کا ایک مختصر، مگر معلوماتی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

"اپنے مقاصد پر ندوۃ العلماء نے غیر معمولی توجہ دی اور بہت حد تک کامیابی اس کے حصہ میں آئی لیکن اب بھی بعض حلقوں میں اس کی تصویر بہت دھندلی اور اس کے نقوش غیر واضح ہیں، زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر اس وقت ندوۃ العلماء کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔موجودہ ذمہ داران اس مشن کو لے کر سرگرم عمل ہیں اور حقائق و واقعات کے تناظر میں اس کی افادیت کو عام آشکار کر رہے ہیں"

صفحہ ۵۷ر پر تحریک ندوۃ العلماء اور عقیدۂ ختم نبوت کے عنوان کے تحت جو چند سطریں آپ نے رقم کی ہیں اسے نظر انداز کرنا سراسر ناانصافی ہوگی، چونکہ اس کے ذیل میں آپ نے اس فتنہ کی جس خطرناکی کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی مسلمانوں کیلئے بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔چنانچہ اس فتنہ کے سدباب میں حائل دشواری کے تعلق سے آپ لکھتے ہیں:

"آج مسلمانوں کو فریب دینے والی اور اسلام کو نیست و نابود کرنے والی تحریکوں میں قادیانیت سرفہرست ہے، یہ تحریک ہمیشہ ہمیش باقی رہنے والی نبوت کے خاتمہ اور اسلامی شریعت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے خود مذہب اسلام کی آڑ لے کر مہم جو ہے، اسی وجہ سے اسلام اور امت مسلمہ کے سر پر منڈلانے والے تمام خطروں میں یہ اولین خطرہ ہے۔چنانچہ اس سے دفاع اور مقابلہ کیلئے ہر میدان میں کوشش و سرگرمی کی ضرورت ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو زائل کرنے اور اس زہریلے پودے کو تن آور درخت کی شکل اختیار کرنے سے قبل اس کے خلاف ہر طرح کے وسائل وذرائع کو اپنانے کی ضرورت ہے"

دوسرے باب میں آپ نے اپنے جن مشفق اساتذۂ کرام کا تعارف پیش کیا ہے۔ان میں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی، حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی، حضرت مولانا مفتی محمد سعید، حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، اسی باب میں آپ نے اپنے دور طالب علمی کے

چند احباب و رفقاء کا بھی ذکر کیا ہے۔اس باب کے ذیل میں 'مفکر اسلام اپنی شخصیت کے آئینہ میں' کے عنوان سے شامل تحریر ہر خاص و عام کیلئے مفید اور کارآمد ہے اور حضرت مولانا کی زندگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔مصنف نے اس مضمون میں دریا کو کوزے میں سمیٹ دیا ہے۔

"حضرت مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہٗ اپنی ذات سے ایک انجمن، امت اسلامیہ کے عظیم و ہونہار فرزند ارجمند اور عالم انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور ایک مثالی انسان تھے، آپ کی اسلامی شخصیت کے تعارف کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات سے جن کی تعداد ۲۰۰ر سے بھی زائد ہے پورا عالم باخبر ہے، حتیٰ کہ مسلم نوجوانوں کے اندر ان کتابوں کو جمع کرنے اور ان سے خالص اسلامی فکر کی غذا حاصل کرنے میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پایا جارہا ہے، کیونکہ ان میں اسلامی فکر کا ایسا خلاصہ و نچوڑ پیش کیا گیا ہے، جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محاذ سے ہے"۔

کتاب کا چوتھا باب اس لئے بہت خاص ہے کہ اس میں فتنۂ قادیانیت جیسے حساس مسئلہ پر حضرت مولاناؒ کی فکرمندی اور اس تعلق سے آپ کی علمی کاوش پر تحریر کیا گیا ہے کہ جب حضرت مولانا کے مرشد و مربی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے خاص توجہ اور اصرار کے ساتھ عالم اسلام میں قادیانیت کا تعارف کرانے اور وہاں کے علمی اور دینی حلقوں کو اس نئی نبوت سے متعارف کرانے کیلئے عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا اور حضرت رائے پوری کی خصوصی توجہ سے اس کتاب کا نام "**القادیانی والقادیانیة**" رکھا گیا اور اس کی عالم اسلام کے تمام حلقوں میں پذیرائی ہوئی، پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوا اور رد قادیانیت میں اس کتاب کا فائدہ وسیع پیمانے پر ظاہر

ہوا۔ ادب اور حکمت وموعظت کے اسلوب میں لکھے جانے کی وجہ سے قادیانی حلقوں میں بھی اس کتاب کا اچھا اثر پڑا اور عقیدۂ ختم نبوت کے سمجھنے میں اس کتاب کا کردار نہایت مؤثر اور مقبول ثابت ہوا اور اس حلقہ کے لوگوں نے بھی اسے دلچسپی سے پڑھا اور عقیدۂ ختم نبوت کو تقویت حاصل ہوئی۔

اسی باب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی پر حضرت مولانا کی سنجیدگی اور ان کی جدوجہد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

’’جب اس کا اقلیتی کردار اور اس کے بنیادی مقاصد خطرے میں پڑ گئے اور وہ تخریبی تحریکوں اور ذہنی اور اخلاقی انتشار کا مرکز بنتی نظر آئی تو اس مسئلہ پر منعقد ہونے والے پہلے جلسے میں حضرت مولانا نے صاف صاف تقریر کی اور اس کے لئے ملت کے سبھی دردمند حضرات نے متفقہ طور پر آواز اٹھائی‘‘

’’نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کی بقا کا مسئلہ‘‘ کے عنوان سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر صوبائی کانفرنس اور دینی تعلیمی کونسل کا قیام، حضرت مولانا کا دنیا کے تمام مسلمانوں سے گہرا تعلق، ذیل میں حضرت مولانا کا پوری دنیا کے مسلمانوں سے تعلق تھا اور مسلمانوں کا درد جس نے آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس حوالے سے آپ کا یہ موقف کہ ’’ہماری اولاد اور آنے والی نسلوں کو دین پر باقی رکھنے اور اللہ کی عبادت پر ثابت قدم رکھنے ہی میں ہمارے مسائل کا حل موجود ہے‘ دعوت فکر دیتا ہے، یہاں پر آپ کے ایک خطاب کا ذکر بطور خاص کیا گیا ہے:

’’کسی ملک کے مسلمانوں کا خواہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، یا اقلیت میں اولین واہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے بالغین کی دینی واقفیت اور بچوں کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا ہے؟ میں اپنے محدود مطالعہ اور دینی واقفیت کی بنا پر یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ

یہ مسئلہ ان کے تمام قومی مسائل سے مقدم اور اہم ہے، یہ ان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے‘‘۔

’۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں‘ کا ایک ایک باب قیمتی ہے اور ایک ایک صفحہ پر معلومات کے خزانے بکھرے پڑے ہیں، اس لئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کونسا حصہ زیادہ توجہ طلب ہے اور اسے بطور خاص پڑھنے کی طلبہ واہل علم کو ترغیب دی جائے۔ حضرت مصنف کا جو دلچسپ انداز واسلوب ہے وہ کسی بھی ایماندار اور اہل ذوق قاری کو شروع سے آخر تک سطر در سطر مطالعہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ قاری میں یہ جذبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے چونکہ مصنف نے خود نیک جذبہ سے مغلوب ہوکر یہ عظیم علمی و دینی دستاویز تیار کیا ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے مقدمہ میں بالکل برحق فرمایا ہے کہ یہ تالیف بیک وقت آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، یہ تالیف خود حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی علمی وتدریسی زندگی کا بہترین سفرنامہ بھی ہے، جس میں اکثر مولانا نے اپنے آپ کو چھپانے اور پیچھے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ان کی تحریر کے ساتھ اپنی بات ختم کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

’’اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کی شخصیتوں میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ پر ان کی وفات کے بعد کم عرصہ میں سب سے زیادہ لکھا گیا، لیکن مولانا اعظمی کی یہ تالیف ان کتابوں میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے جس میں ایک ایسا شخص مولانا کی فکر، ان کے مزاج ومذاق، طرز زندگی، علمی وادبی مقام، ذاتی زندگی اور اخلاق وعادات پر روشنی ڈال رہا ہے جو سفر وحضر کا حاضر باش، شب وروز کا مقرب ہے اور وہ صاحب تذکرہ کی ہر حرکت و سکون اور قول وعمل کو نگاہ عبرت سے دیکھتا اور دامن دل سے باندھتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ تالیف خود حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی علمی وتدریسی زندگی کا بہترین

سفرنامہ بھی ہے، جس میں اکثر مولانا نے اپنے آپ کو چھپانے اور پیچھے رکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایک طالب علم اس کے بین السطور میں خود مؤلف کی زندگی کو پڑھ سکتا ہے اور اسے اپنے لئے نقش راہ بنا سکتا ہے''۔

❁ ❁ ❁

سوانح حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ

مؤلف: مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری

آج پوری دنیا میں تبلیغی جماعت دعوت وتبلیغ کے فرائض کو پوری محنت، اخلاص وللّٰہیت اور ایک نظم کے ساتھ کر رہی ہے اور اس کام کے اثرات وثمرات سے آج کوئی بھی ذی ہوش انسان انکار نہیں کرسکتا۔ دن رات اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ومعصیت اور فسق وفجور میں زندگی گزارنے والے لاکھوں افراد اس تبلیغی جماعت کی بدولت تہجد گزار، متقی، پرہیزگار اور دین کے داعی بنتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ سادگی اور خاموشی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پیغامات کو عام انسانوں تک پہنچانا اس جماعت کا نصب العین ہے اور وہ اس میں کامیاب ہے، دنیا بھر کے تقریباً تمام ملکوں میں اس کے لاکھوں نمائندے پائے جاتے ہیں جو بے لوث اور خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی سرگرمی میں مصروف رہتے ہیں، موجودہ دور میں دین کی دعوت وتبلیغ کے جتنے طریقے اور ذرائع رائج ہیں ان میں تحریکِ تبلیغ واحد ایسی تحریک ہے جس میں حصہ لینے والے بڑے سے چھوٹے تک تمام افراد اپنے خرچ سے تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس کی بے

پناہ مقبولیت کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہے۔اسلام کی خدمت کرنے والے دنیا بھر میں بے شمار ادارے ہیں، افراد ہیں اور تنظیمیں ہیں مگر بیسویں صدی میں شروع ہونے والی تبلیغ کی یہ تحریک مقبولیت وہر دل عزیزی کے جس مقام پر ہے، اس کی ہمسری کوئی اور تحریک نہیں کرسکتی۔خوش اخلاقی، شگفتہ روئی اور نرم دلی کے ساتھ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی دعوت دینا اس جماعت کے کارکنوں کا امتیاز ہے، برصغیر ہندوپاک میں چوں کہ مسلمانوں کی بے شمار دینی تحریکیں اور مسالک ہیں اور ان کے مابین کسی نہ کسی وجہ سے رسہ کشی بھی جاری رہتی ہے، جس کی بنا پر بہت بار ایسا بھی ہوا ہے کہ دعوت وتبلیغ کے کارکنان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے، انھیں برا بھلا کہا جاتا ہے اور کئی بار تو انھیں مسجدوں سے ہی نکال دیا جاتا ہے، لیکن ان کی تربیت ایسی کی جاتی ہے کہ یہ لوگ مکمل امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض اپنی باتوں اور نرم دلی ومصالحت کے ذریعے ہی اپنے مخالفین کا جواب دیتے ہیں، اب تک دنیا بھر میں کہیں بھی تبلیغ میں سرگرم جماعتوں کی جانب سے کسی بھی قسم کی غیر قانونی سرگرمی میں شامل ہونے یا تشدد پسندی کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اس کا دائرۂ کار مسلسل بڑھ رہا ہے اور تبلیغی جماعت کے ذریعے اسلام کی پرامن تعلیمات سے متاثر ہوکر جہاں بہت سے بھٹکے ہوئے مسلمان راہِ راست پر آرہے ہیں، وہیں غیر مسلموں پر بھی اس کا خاطر خواہ مثبت اثر پڑ رہا ہے اور وہ بھی دامنِ اسلام سے وابستہ ہورہے ہیں۔دعوت وتبلیغ کے اس کام کی مثال پوری دنیا میں کسی مذہب والے کے پاس نہیں ہے۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اس تبلیغی جماعت کی افادیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اصلاح نفس کے چار طریقے ہیں اور حُسنِ اتفاق سے تبلیغ کے اندر یہ چاروں طریقے جمع ہیں، صحبتِ صالح بھی ہے، ذکر وفکر بھی، مواخات فی اللہ بھی ہے، دشمن سے عبرت و

موعظت بھی اور محاسبۂ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔

ہر زمانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دعوت وتبلیغ اور اصلاح امت کے لئے چنندہ لوگوں کا انتخاب کیا ہے، جنھوں نے بصیرت، عزم واستقلال اور فہم وفراست کے ساتھ جغرافیائی حدود کے امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر ساری دنیا میں اللہ اور رسول ﷺ کے پیغام کو پہنچانے کا کام کیا، جن کی زندگی داعیان اسلام اور عوام کے لئے مشعل راہ اور ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، جن کو دیکھ کر ہمارے اندر اولوالعزمی اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ایسی ہی شخصیات میں سے ایک مبلغ اسلام حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی ذات گرامی تھی، جن کے حالات وواقعات اور علمی وعملی کارناموں پر زیر نظر کتاب ''سوانح حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ'' محیط ہے۔

اکابر وبزرگان دین کے حالات زندگی اور خدمات کو تحریری شکل میں پیش کرنا ایک بہت ہی مستحسن اور مبارک قدم ہے، بڑوں کے کارناموں کو پڑھ کر اور سن کر چھوٹوں اور آنے والی نسلوں میں بھی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ خدمتِ قوم ودین کے راستے میں اپنا حصہ ڈالنے کا حوصلہ کرتی ہیں۔اس خدمت جلیلہ کو انجام دینے کے لئے مخدوم گرامی حضرت مولانا سید شاہد صاحب قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن صاحب علیہ الرحمہ کے دور امارت اور حیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنے پاس موجود نادر ونایاب مکتوبات، ملفوظات، اسفار، دینی اجتماعات اور حالات پر روشنی ڈالی ہے۔یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد کی ضخامت 485 صفحات ہے، کتابت عمدہ، سرورق خوبصورت اور کاغذ بھی شاندار ہے۔ یہ کتاب مکتبہ یادگار شیخ محلہ مفتی سہارنپور، یوپی سے شائع ہوئی ہے۔

حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری نے قارئین کی سہولت کے لئے

مذکورہ کتاب میں 8ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں مختصراً حضرت مولانا الیاس صاحب کے حالات زندگی اور دعوت وتبلیغ کے ابتدائی ایام ومجاہدات پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں حضرتؒ کی ولادت، حفظ قرآن، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے رجوع، نکاح، پہلا سفرحج، نظام الدین آمد، مجاہدات، میوات میں اصلاح وارشاد کا آغاز، دوسرا سفرحج اور دعوتی کام کا آغاز، جماعت وتبلیغ کے اصول وضوابط، تیسرا حج اور وسعت، آخری حج، مدارس عربیہ میں کام کا آغاز اور حکمت عملی اور سانحۂ وفات کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں حضرت جی ثانی رئیس مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی کی زندگی اور خدمات مختصراً بیان کی گئی ہیں، ولادت، حفظ قرآن، ابتدائی تعلیم، جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ، نکاح، بیعت وارادت، دعوتی محنت کا عملی آغاز، جانشینی، دینی اجتماعات، بیعت وطریقت، قیام پاکستان کے بعد جدوجہد، تین حج اور دو عمروں کی تفصیلات، مجلس شوریٰ مظاہر علوم کی رکنیت، پاکستان کا آخری سفر، سانحۂ وفات، تدفین، آپؒ کی تصانیف ''امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار'' اور ''حیاۃ الصحابہ'' کا تعارف اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے والدمحترم مولانا ہارون صاحبؒ کا تعارفی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے والدمحترم مولانا اکرام الحسن صاحب کا تذکرہ، تعلیم وتربیت، بیعت اور مظاہر علوم وعلماء سے نسبت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی تعلیم وتربیت، حفظ قرآن اور مولانا الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور حضرت جی ثالثؒ کے علمی انہماک اور وسعت مطالعہ کا تذکرہ، شیخ زکریاؒ سے عملی مراجعت کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی کئی علمی یادگاریں بھی ہیں، جن میں ابواب وتراجم بخاری، الابواب المنتخبہ من مشکوٰۃ المصابیح، ایمان کی اہمیت اور مومنانہ زندگی کافی مقبول ہوئیں جن کا تعارف

بھی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

الغرض اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے تین اساطین کا تذکرہ آگیا ہے، ان کی زندگیوں اور خدمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب ان بزرگ شخصیات کے تعارف میں بھی مددگار رہے اور اس کے ساتھ ساتھ تحریکِ تبلیغ کی تاریخ اور اس کی مقبولیت کے مختلف ادوار سے واقف کراتی ہے۔ جو لوگ دعوت وتبلیغ کے کام سے جڑے ہوئے ہیں، ان کے لیے تو یہ کتاب ایک گراں قدر تحفہ ہے ہی، لیکن جو لوگ دوسرے ذرائع کو استعمال کرکے علم ودین کی خدمت انجام دے رہے ہیں انھیں بھی اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ذریعے چھیڑی گئی تحریک کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اور دنیا بھر میں خاص وعام میں اس کی مقبولیت کا راز کیا ہے۔

❁ ❁ ❁

خطبات حرم

مؤلف: سماحۃ الشیخ الدکتور عبدالرحمٰن السدیس، امام حرم، مکہ

امام کعبہ الدکتور حضرت شیخ عبدالرحمٰن السدیس عالم اسلام کی ان شخصیات میں سرفہرست ہیں جنہیں اللہ نے عوام وخواص میں یکساں مقبولیت عطا فرمائی ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ اس طرح کی مقبولیت بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ امام کعبہ شیخ عبدالرحمٰن السدیس کی مقبولیت کی بنیادی وجہ خوبصورت لب ولہجہ میں قرآن کریم کی تلاوت کرنا ہے، دنیا بھر میں امام کعبہ شیخ عبدالرحمٰن السدیس کی تلاوت سب سے زیادہ مقبول ہے، ہزاروں لوگ آپ کی تلاوت سن کر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں، بے شمار تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے آپ کی تلاوت سن کر حفظ قرآن کا شرف حاصل کیا ہے، لیکن خوبصورت لب ولہجہ میں قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ امام کعبہ فقہی، سماجی، ملی اور سیاسی علوم پر مکمل دسترس رکھتے ہیں، علوم کی گہرائی اور گیرائی میں آپ کی شخصیت یکتائے روزگار ہے، انہی خصوصیات اور اوصاف وکمالات کی وجہ سے آپ ائمۂ حرم میں سب سے مقبول ہونے کے ساتھ ائمۂ حرم کے چیئرمین بھی ہیں۔ تلاوت قرآن کریم کے ساتھ آپ

کا خطبۂ جمعہ بھی بہت زیادہ مقبول ہے، علمی گہرائی، ملی اتحاد، فقہی مسائل اور ملت میں اتحاد و اتفاق پر آپ کے خطبات مشتمل ہوتے ہیں۔

خطبات حرم کے مترجم نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ آپ کے خطبات کی نرالی شان ہے، زبان وبیان کی مہارت گویا موجیں مارتا ہوا سمندر ہے، عموماً حمد وثنا میں ہی خطبے کے موضوع کا خلاصہ سمیٹ دیتے ہیں، پھر حالات حاضرہ پر بقدر ضرورت تبصرہ اور عالم اسلام کے مرکزی منبر سے متعلقین، حکام، علماء، مبلغین، صحافی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کیلئے ان کی ذمہ داریوں کی حکیمانہ اسلوب میں یاددہانی آپ کا خاص امتیاز ہے، علامہ موصوف کے دل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے جو دل میں تڑپ ہے اس کا اندازہ ان خطبات پر نظر ڈالتے ہی ہوجاتا ہے اور امت مسلمہ کیلئے شیخ محترم کی پرسوز دعاؤں کا تذکرہ تو زبان زد عام ہے۔

آپ کے خطبات کا پہلا مجموعہ **السفر الاول کوکبۃ الخطب المنیفۃ من منبر الکعبۃ الشریفۃ** کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ جس کو اہل علم کے درمیان بے پناہ مقبولیت ملی، ہر طرف ستائش کی گئی اور بڑے پیمانے پر اس کتاب کو مقبولیت ملی، کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے، امام کعبہ خود مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ علمی حلقوں اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں میں اس کتاب کو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہوئی، ملک کے اندر اور باہر عالم اسلام میں پھیلی ہوئی مساجد ومراکز کے ذریعہ ائمہ اور خطباء کی کثیر تعداد اس سے مستفید ہوئی۔

خود امام حرم فرماتے ہیں کہ دین اسلام میں خطابت کا مرتبہ بہت بلند ہے، شریعت نے اس کو خصوصی اہمیت دی ہے، اسلام نے اس کی شان بہت بلند کی ہے کیوں کہ دعوت تبلیغ

میں خطابت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم خطباء کے امام اور ان کیلئے بہترین نمونہ تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمایا تھا، آپ نہایت کم الفاظ میں جامع ترین مفہوم ادا کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب وعجم پر فصاحت وبلاغت میں فوقیت دی۔

امام حرم کے خطبات کے مجموعہ کو اہل علم کے درمیان بے پناہ مقبولیت ملی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی کیا گیا، دیگر زبانوں کے ساتھ اردو زبان میں بھی اس کے ترجمہ کی شدید ضرورت تھی جس کی تکمیل فضیلۃ الشیخ محمد عبدالہادی العمری کے ذریعہ پوری ہوئی اور انہوں نے خوبصورت پیرایہ میں اس کا اردو ترجمہ کر کے امت کو ایک عظیم تحفہ سے سرفراز کیا اور اس کی اشاعت کا فریضہ مکتبہ دارالسلام نے انجام دیا۔

مترجم نے امام حرم کے خطبات کا ترجمہ انتہائی سلیس اور خوبصورت انداز میں کیا ہے، زبان وبیان میں شائستگی اور شگفتگی مکمل طور پر عیاں ہے، خطبات کو پڑھ کر اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہیں، مترجم نے عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اردو لب ولہجہ، تعبیرات اور اصلاحات کا بھی مکمل خیال رکھا ہے، صاحب خطبہ نے جس مفہوم کی ادائیگی کیلئے عربی زبان کا لفظ استعمال کیا ہے مترجم نے لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے اس مفہوم کی ادائیگی کیلئے اردو میں مستعمل ہونے والے محاورے کا انتخاب کیا ہے اور پیچیدگی، گنجلک عبارت، بے لفاظی اور غیر مقصود الفاظ سے احتراز کیا ہے۔

مکتبہ دارالسلام کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب عبدالمالک مجاہد کتاب میں ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ اس کتاب کے مترجم فضیلۃ الشیخ محمد عبدالہادی العمری ہیں، میرا ان سے رابطہ، تعلق اور دوستی برسوں پرانی ہے، برمنگھم میں مقیم عبدالہادی عمری نہایت نفیس شخصیت

کے مالک ہیں، اصل وطن ہندوستان ہے، مگر مدت ہوئی برطانیہ کے ہو چکے ہیں، وہاں وہ مجلس القضاء الاسلامی کے صدر کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں، متعدد بار وہاں کی مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے امیر اور مرکزی عہدہ دار رہے ہیں۔ بہت بڑے عالم وفاضل اور بڑے پایہ کے خطیب ہیں، انہوں نے نہایت محبت اور شوق سے ان خطبات کا ترجمہ کیا ہے۔

امام حرم کے خطبات کا یہ اردو ترجمہ امت مسلمہ بالخصوص اردو داں طبقہ کیلئے ایک بیش بہا تحفہ ہے، عوام اور خواص دونوں کیلئے اس کی حیثیت ہیرے اور جواہرات جیسی ہے، نماز جمعہ کے ائمہ کیلئے یہ زیادہ مفید ہے، ائمۂ کرام اس مجموعہ سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان حضرات کیلئے یہ کتاب نمونہ ثابت ہوگی۔ جمعہ کے خطبہ میں کس موضوع پر بات کرنی چاہئے، کس عنوان پر تقریر کرنی چاہئے، کن مسائل کا تذکرہ ہونا چاہئے، کس انداز میں خطبۂ جمعہ پیش کرنا چاہئے اس طرح کی بے شمار باتیں خطبات حرم سے اخذ کی جاسکتی ہیں اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے علماء کرام جمعہ سے قبل کے خطاب کو مزید مؤثر اور مفید بنانے میں تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔

فتاویٰ ندوۃ العلماء

ترتیب: مولانا ناصریؒ، مولانا احمد ندوی اور حضرت مولانا ظہور ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنی روشن تاریخ میں دین وایمان اور مسلمانوں کے تعلیمی وثقافتی نظام کے احیاء و پاسبانی کے لئے جو خدمات پیش کی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ندوۃ العلماء کے کارہائے نمایاں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ عالم اسلام کی تاریخ میں ایک یادگار اور شاندار باب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس ادارہ نے عظیم مؤرخین، مایہ ناز ادباء، دانشوران، محدثین اور بے مثال مصنفین کو پیدا کیا، جن کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ندوۃ العلماء نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تدریس، اردو وعربی زبان کے فروغ، تصنیف وتالیف اور انشا وصحافت، مسلمانوں کی قیادت اور عرب ممالک سے تعلیمی وتہذیبی تعلقات اور زندگی کے دیگر شعبوں میں جو اثرات چھوڑے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں، خاص طور پر تعلیمی میدان میں زمانہ کے مزاج کے مطابق اور عصری تقاضوں کی رعایت کے ساتھ اپنی کشادہ ذہنی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے نظام تعلیم اور نصابِ تعلیم

میں تبدیلیوں کے تسلسل نے اسے ایک ممتاز ادارہ بنادیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا امتیاز اور اس کی اصل شناخت زبان وادب اور عربی نثر وانشا کے فروغ سے ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو قضاء اور فتاویٰ کا بھی ہے، اسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ''فتاویٰ ندوۃ العلماء'' ہے، جس میں ندوہ کے دارالافتاء میں آئے سوالات کے جوابات کو تحقیق واستخراج کے بعد افادۂ عام کے لئے کتابی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ''مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، پوسٹ باکس نمبر 93 لکھنؤ'' نے شائع کیا ہے، کتاب کی ضخامت 611 صفحات پر مشتمل ہے، کتاب مجلد سرورق عمدہ اور کاغذ دیدہ زیب ہے۔

اس کتاب میں جن مفتیان کرام کے فتاویٰ کو خاص طور پر جمع کیا گیا ہے ان میں حضرت مولانا ناصر علی ندوی صاحبؒ، مولانا نیاز احمد ندوی صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا ظہور ندوی صاحب نائب ناظم ندوۃ العلماء کے نام قابل ذکر ہیں، نیز اس کتاب پہ مدیر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم نے بہت ہی پر مغز اور معلومات افزاء مقدمہ لکھا ہے جس سے کتاب کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔

کتاب لکھنے کا انداز روایتی طریقوں سے ہٹ کر اور اچھوتا ہے جو کہ استفادہ کے زیادہ قریب ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے سب سے پہلے چند مرکزی ابواب قائم کئے گئے ہیں، ان کے تحت ذیلی عناوین ہیں، اس کے بعد اس عنوان سے متعلق تمام جزئیات و مسائل کو بحوالہ بیان کیا گیا ہے۔ اصولی طور پر علم، طہارت، اوقات نماز، اذان واقامت کے نام سے ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے ذیلی عناوین قائم کئے گئے ہیں۔

تیسرا باب ''کتاب الصلاۃ'' ہے جس کے تحت فجر کی نماز کا مستحب وقت، طلوع فجر کے بعد نفل نمازوں کا حکم، فجر کی نماز کے بعد قضاء عمری، فجر کے وقت عشاء کی نماز، فجر کی نماز کے بعد سنت کیوں نہیں؟ طلوع آفتاب کے قریب نماز، صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیان فاصلہ، صبح صادق اور صبح کاذب کے درمیان فرق، فجر کا آخری وقت، فجر وظہر کی فوت شدہ سنتوں کی قضاء، فجر اور عصر کے درمیان سنن ونوافل، ظہر اور جمعہ کا وقت، جمعہ کی نماز تاخیر سے پڑھنا، زوال کے وقت نماز مکروہ، مکروہ وقت زوال ہے یا استواء؟، استواءِ شمس معلوم کرنے کا طریقہ، عصر اور فجر کے بعد قضا نماز، غروب آفتاب سے قبل عصر کی نماز، عصر اور مغرب کے درمیان نماز، مغرب کا وقت، مغرب کے بعد نفل نماز، عشاء کا وقت، صبح صادق کے وقت عشاء کی نماز، عصر ومغرب کے درمیان وظائف، تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کے اوقات، اشراق، چاشت اور زوال کے اوقات، مکروہ اوقات میں نوافل، فجر اور عصر کے بعد سجدۂ تلاوت، طلوع وغروب کے اوقات میں ریڈیو اور جنتری میں فرق، اوقات میں حساب کا اعتبار اور قضاء عمری جیسے اہم دینی مسائل درج ہیں۔

اسی طرح ''اذان واقامت'' عنوان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان دینے کا ثبوت، اذان کے بغیر نماز، وقت سے پہلے اذان کا اعتبار، رمضان میں اذان فجر کا مسئلہ، مغرب کی اذان میں تاخیر، فاسق کی اذان واقامت، داڑھی نہ رکھنے والے کی اذان واقامت، بیڑی سگریٹ پینے والے کی اذان واقامت، نس بندی کرانے والے کی اذان، پینٹ شرٹ پہن کر اذان دینا، معذور کی اذان، ناپاکی کی حالت میں اذان دینا، بغیر وضو کے اذان دینا، اذان میں تجوید کی رعایت، اذان سے پہلے تکبیر کہنا، کلمۂ شہادت کے بعد آہستہ درود پڑھنا، مسجد کے اندر اذان دینا، مسجد سے دور اذان دینا، ٹی وی اور ریڈیو کی اذان کا جواب دینا، بیک وقت دو لوگوں کی اذان، مؤذن کا اذان کے بعد مسجد سے

باہر جانا، مکروہ اوقات کا اعلان، اذان کے وقت نفل، اقامت کے بغیر اذان، لاؤڈ اسپیکر سے اقامت کہنا، مغرب کی اذان واقامت کے درمیان وقفہ، اقامت کے کلمات کی تعداد، معذور کی اقامت، اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی دلیل اور نومولود کے کان میں اذان واقامت کے مسائل مذکور ہیں۔

کتاب کے مذکورہ مرکزی عناوین سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مسائل کو بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، مسائل کے علاوہ اس کتاب سے اسلامی تاریخ کے سرچشمہ یعنی سیرتِ نبویؐ کا بھی تفصیلی اور سیر حاصل علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انبیاء کرامؑ کے خاص خاص حالات پر بھی تحقیق کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب محض عملی مسائل کو ہی بیان نہیں کرتی؛ بلکہ علم وتاریخ کے دیگر اہم گوشوں پر بھی بخوبی روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب کا مطالعہ ایک طرف جہاں فقہ وفتاویٰ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے وہیں عام لوگوں کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔ ایسی کتابوں کی ہر گھر میں موجودگی انتہائی ضروری ہے۔ اللہ پاک مؤلف کتاب کی اس علمی کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے (آمین)

۞ ۞ ۞

فتاویٰ بسم اللہ

مؤلف: مولانا مفتی اسماعیل بن محمد بسم اللہ

فتاویٰ بسم اللہ، مفتی اعظم برما و گجرات حضرت مولانا مفتی اسماعیل بن محمد بسم اللہ صاحبؒ (م:۱۹۵۹) سابق صدر مفتی و مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک گجرات کے ''مسلم گجرات فتاویٰ سنگرہ'' کا اردو ترجمہ ہے جسے ایک طویل عرصہ کے بعد منظر پر لانے کی سعادت حضرت مولانا مفتی عباس داؤد بسم اللہ صاحب، جو صاحب فتاویٰ کے حفید ہیں کو حاصل ہوئی۔ فتاویٰ بسم اللہ کی اشاعت حضرت مفتی عباس صاحب مدظلہ العالی کا ایک خواب تھا جو الحمد للہ شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ان فتاویٰ کو گجرات کے مؤقر علماء ومفتیان کرام کی ٹیم نے بڑی عرق ریزی اور انتھک کوشش کے بعد مرتب کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرات مرتبین نے کتاب کو مرتب کرتے وقت بہت زیادہ عرق ریزی سے کام لیا ہے، صرف صفحات بھرنے کا کام نہیں کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ حضرت مفتی اسماعیل صاحبؒ کو گجراتی، اردو، فارسی اور عربی زبان پر مکمل عبور تھا، اس لئے ضرورت مند لوگوں نے جس زبان میں سوال پوچھا حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب اسی زبان میں تحریر فرمایا۔ یہی

وجہ ہے کہ آپؒ کے فتاویٰ کو ہر زمانے میں علماء و دانشوران نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی علمی حلقوں میں پذیرائی بھی ان کے شایان شان ہوئی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح میں ایک جگہ ذکر ہے کہ:

''ایک دفعہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آپ کا فتویٰ ملاحظہ کیا تو فرمایا ''اس آدمی کے فتاوے سے تفقہ کی بو آرہی ہے''۔

'فتاویٰ بسم اللہ' کی پہلی جلد ہمارے سامنے ہے جو ۵۱۰ رصفحات پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان بالخصوص گجرات کے جید علماء کرام بالخصوص مفتیٔ گجرات حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب اور مفکر گجرات حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی جیسے جید علماء کرام کے کتاب کی اشاعت پر کلمات تحسین وتأثرات شامل ہیں۔ جو بذات خود تمام کے تمام میرے نزدیک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فتاویٰ کے اردو ایڈیشن کی طباعت پر مرتب اور ناشر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب رقم طراز ہیں:

''آپؒ کے فتاویٰ گجرات کے مقبول اور مشہور ہفتہ وار جریدہ ''مسلم گجرات'' میں شائع ہوتے تھے، جس سے ملک اور بیرون ملک میں ہزاروں تشنگان علم کو سیرابی ہوتی رہی، کئی سال کی مدت تک مسلسل پابندی سے شائع ہونے والے یہ فتاوے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے اور ہر طرف سے مطالبہ ہونے لگا کہ ان قیمتی فتاویٰ کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے 'مسلم گجرات' کے فاضل مدیر جناب سید عظیم الدین منادی صاحب نے انتخاب کرکے ''مسلم گجرات فتاویٰ سنگرہ'' کے نام سے گجراتی میں شائع کئے۔ شائقین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب کے دیگر ہزاروں فتاویٰ کو بھی شائع کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ سعادت حضرت مفتی صاحب کے ہونہار اور فاضل پوتے مفتی عباس داؤد بسم اللہ صاحب سلمہٗ کے حصہ میں آئی''۔

’فتاویٰ بسم اللہ‘ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ کے چھوٹے بڑے مسائل واشکالات اور شک وشبہ کا تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔ مثلاً: خدا کی توہین کرنے والے کا شرعی حکم، غیر اللہ کو سجدہ کرنا، تعظیمی سجدہ کا حکم، قبر کے سامنے سجدہ کر کے دعا مانگنا، خواجہ نہ دیں گے تو پھر کون دے گا، کیا اجمیری دروازہ کا داخلہ جنت دلائے گا، غیر اللہ کیلئے منت ماننا، غیر اللہ کی نذر ماننا، کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، شریعت کی توہین کرنا، شگون، بدشگون کا عقیدہ، کسی کو کافر کہنے کا حکم، جوئے کو تجارت سمجھنا، قادیانی اسلام سے خارج ہے، اس کے علاوہ عقائد، رسالت، علم غیب، درود وسلام ومیلاد، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وغیرہ جیسے اہم دینی سوالات پر فتاوے شامل ہیں۔

اس لحاظ سے فتاویٰ بسم اللہ کا ہر گھر، ہر لائبریری، مدارس اسلامیہ و دیگر تعلیمی اداروں، خاص طور پر ائمۂ مساجد اور مفتیان کرام کے پاس ہونا فائدہ سے خالی نہیں ہے اور بطور خاص اردوداں حلقہ کیلئے۔

فتاویٰ کی زبان بالکل عام فہم ہے، اردو زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والے قارئین بھی پڑھ کر استفادہ کر سکتے ہیں، مثال کے طور پر صفحہ ۲۰۸ پر ایک سوال ہے:

اگر کوئی پیر علماء دیوبند کو کافر کہے تو کیا ایسے پیر سے مرید ہونا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: علماء دیوبند کثر اللہ سوادھم چونکہ بفضلہٖ تعالیٰ فی زمانہ گروہ اہل حق میں سے ہیں اور ان کے عقائد حقہ کی تبلیغ ہونے کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے تجارتی پیروں کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس لئے ان کی طرف غلط سلط باتیں منسوب کر کے ان کو بدنام کرتے رہتے ہیں، ایسی جماعت دین حق کو جو پیر کافر کہے اسے خود اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے، کیوں کہ فقہاء احناف نے صراحتاً یہ حکم دیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا اس پر کفر عائد ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فتاویٰ بسم اللہ کی جلد اول میں عام طور سے توحید و رسالت

اور عقائد کی تصحیح سے متعلق جوابات شامل ہیں، لیکن جو جوابات حضرت مفتی بسم اللہ صاحبؒ نے دیے ہیں ان میں غایت درجہ شرعی معاملات میں احتیاط، اسلاف کی علمی روایات کی قدر اور کتاب وسنت سے جوابات کو ہم آہنگ رکھنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ فتاویٰ بسم اللہ کی دقت اور اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے تحریر کردہ فتاویٰ کی تصحیح وتصویب اس دور کے اہم علماء اور مفتیان کرام نے کی ہے۔ جن میں حضرت مفتی ظفر احمد صاحب، حضرت مفتی احمد اشرف راندیری صاحب، حضرت مفتی ابراہیم صاحب، حضرت مفتی اسماعیل صاحب، حضرت مفتی احمد اللہ صاحب (مبلغ جمعیۃ) حضرت مفتی عبدالغنی پشاوری صاحب اور حضرت مفتی ابراہیم صاحب راندیری علیہم الرحمہ والرضوان جیسے جبل العلم اور اصحاب تقویٰ کے اسماء گرامی شامل ہیں اور خاکم بدہن یہ ناچیز حضرت کے تحریر کردہ فتاویٰ پر کیا تبصرہ کر سکتا ہے، بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اہل علم اور ارباب افتا کیلئے دیگر فتاویٰ اکابر کی طرح یہ بھی علمی اور فقہی منارۂ نور ہے۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور صفحات معیاری ہیں جو ناشر کے ذوق سلیم کی ترجمانی کرتے ہیں، جوابات کے ساتھ آخر میں اس کے مستند حوالے موجود ہیں، جس سے قاری کو مکمل اطمینان ہونا یقینی ہے۔ ’فتاویٰ بسم اللہ‘ مدارس، دینی حلقوں اور اعلیٰ جماعت کے طلبہ کیلئے بیحد مفید ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فتاویٰ کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

فقہ اسلامی کا درخشاں باب-فتاویٰ دینیہ

مصنف: مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب مدظلہ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓاْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (سورۂ توبہ آیت ۱۲۲)

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین (بخاری جلداول ص: ۱۶)

فتاویٰ دینیہ اس عہد کے ممتاز فقیہ اور علوم اسلامی کے رمز شناس حضرت مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی مدظلہٗ کے تحریر کردہ ''فتاویٰ کا مجموعہ'' ہے جو فقہ وفتاویٰ کے میدان میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل اس مجموعہ میں جدید فقہی مسائل کے ساتھ ساتھ مختلف ابواب کے تحت عقائد، عبادات، معاملات اور متفرق مسائل پر جو سوالات ان کے سامنے آئے ان کے جوابات شامل ہیں۔ دراصل اس میں وہ فتاویٰ شامل ہیں جو حضرت موصوف نے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات میں بحیثیت مفتی جاری کیے ہیں، اس کے علاوہ وہ فتاویٰ شامل کردیے گئے ہیں جو انہوں نے انگلینڈ میں قیام کے دوران دیے ہیں۔

فقہ وفتاویٰ کی بزم تو عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی روشن رہی ہے، تاہم

عہد خلفائے راشدین اور پھر بعد کے دنوں میں فقہا اور علوم اسلامی کے ممتاز علماء نے فتاویٰ کی مجلسیں منعقد کیں اور قرآن وسنت کی روشنی میں زندگی گزارنے والے افراد کی رہنمائی کرتے رہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے عہد میں جگہ جگہ علماء اور مفتیان کی مجلسیں قائم رہتی تھیں اور لوگ وہاں اپنے مسائل لے کر پہنچتے تھے، خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ عرصہ تک عوام کی شرعی رہنمائی کرتے رہے۔ اس وقت سے آج تک فتویٰ نویسی کا سلسلہ جاری رہا اور فی زمانہ بھی دنیا میں ہزاروں دارالافتاء قائم ہیں جہاں ہر روز فتاویٰ صادر کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی سیکڑوں مفتیان کرام فتویٰ نویسی کے ذریعے عامۃ المسلمین کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی مدظلہٗ بھی ہندوستان کے چند مشہور مفتیان کرام میں سے ایک ہیں جن کے تحریر کردہ فتووں کی غیر معمولی اہمیت ہے۔

حضرت مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب تقریباً بیس برسوں تک گجرات کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ دارالافتاء کے سربراہ کی حیثیت سے رہنمائی فرماتے رہے ہیں، حضرت والا نے کچھ برسوں تک انگلینڈ میں بھی قیام کیا، چنانچہ وہاں بھی ان کے گرد استفتاء کا ہالہ رہا اور وہ ہمیشہ فتویٰ لکھنے میں مصروف رہے، فی الوقت وہ جامعہ حسینیہ راندیر سورت میں دین ودعوت کی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری، آپ کے مسائل اور ان کا حل، کفایت المفتی، فتاویٰ امدادیہ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، فتاویٰ مظاہر علوم سہارنپور، فتاویٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، نظام الفتاویٰ، احسن الفتاویٰ، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ امارت شرعیہ، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ امدادیہ، فتاویٰ خلیلیہ، فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ اکوڑہ، فتاویٰ بسم اللہ، فتاویٰ

مولانا عبدالحی وغیرہ مقبول ہیں اور تمام مجموعۂ فتاویٰ میں کئی ابواب ومسائل یکساں ہیں، لیکن اس کے باوجود کسی بھی مجموعۂ فتاویٰ کو غیر اہم یا غیر ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ہر عہد کے مسائل الگ، احوال شخصیہ جدا اور سائل کے مقاصد میں فرق ہونے کی وجہ سے ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلو مفتی کے سامنے آتے ہیں جس کی روشنی میں مفتی کو جواب دینا ہوتا ہے، چنانچہ زیر نظر فتاویٰ دینیہ کی بھی الگ اہمیت ہے بلکہ اس مجموعۂ فتاویٰ کی کئی چیزیں منفرد بھی ہیں۔

فتاویٰ دینیہ میں بیشتر فتاویٰ وہ ہیں جو گجرات کے عوام کے سوالات کے جوابات میں دیے گئے ہیں، اس لئے گجرات کا معاشرتی ماحول، وہاں کے باہمی تعلقات اور دیگر مسائل کا اثر اس میں صاف نظر آتا ہے، اس مجموعہ میں شامل تمام فتاویٰ سب سے پہلے گجراتی زبان کے مشہور دینی رسالہ ''التبلیغ'' میں قسط وار شائع ہوچکے ہیں، وقت وحالات کی مناسبت سے جو سوالات آتے تھے ان کے جوابات حالات کے تناظر میں ہی حضرت مفتی اسماعیل کچھولوی نے دیے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان تمام فتاویٰ پر گجرات کا خاص اثر ہے۔

حضرت مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی مدظلہ العالی اس عہد کے ممتاز عالم دین، صاحب طریقت بزرگ اور روشن نظر فقیہ ہیں۔ آپ نے جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے مختلف علوم اسلامی میں دسترس حاصل کی اور اکابر علماء کی خصوصی توجہات سے سرفراز ہوئے۔ یہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی کی خوش نصیبی رہی کہ انہیں استاذ الاساتذہ اور عالم اسلام کی محبوب شخصیت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے نہ صرف کسب فیض کا موقع نصیب ہوا بلکہ ان کی خلافت سے بھی سرفراز ہوئے، دوسری طرف انہیں فقہ وفتاویٰ کے میدان میں یکتائے روزگار اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود گنگوہیؒ کی بھی رہنمائی، شفقت اور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے مشورے سے ہی مفتی اسماعیل صاحب نے جامعہ تعلیم

الدین ڈابھیل میں تدریسی خدمات کے ساتھ فتاویٰ نویسی کے کام کو سنبھالا جس کے نتیجے میں 'فتاویٰ دینیہ' جیسا عظیم علمی کام امت کے سامنے آسکا۔

حضرت مولانا اسماعیل مدظلہ العالی کو علوم شرعیہ میں دسترس تو حاصل ہے ہی لیکن یہ ان کی عظمت وعبقریت کی دلیل ہے کہ انہیں ملک کے ممتاز علماء وصلحا سے براہ راست فیض حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر اور طرز زندگی میں بزرگان دین کی روش صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ مفتی صاحب نے برطانیہ سے ہندوستان واپسی کے بعد جامعہ حسینیہ راندیر میں حدیث کے تدریس کو حرز جاں بنایا تو فقہ وفتاویٰ کا بھی دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اس وقت بھی وہ فتاویٰ نویسی کے ذریعے امت کی رہنمائی کررہے ہیں، ان تمام مشغولیات کے ساتھ ذکر واذکار اور اصلاح کی مجلسیں منعقد کرکے اکابر علماء کی روش کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جن سے امت کو غیر معمولی فائدہ ہورہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کے ان فتاویٰ میں فقہ کی کتابوں کی طرح ابواب قائم کیے گئے ہیں اور ان کے تحت متعلقہ مسائل شامل کیے گئے ہیں، لیکن فتاویٰ کی فہرست کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کے سامنے کس قدر گوناگوں مسائل سامنے آئے۔ کچھ جدید قسم کے مسائل بھی ہیں جن کا مفتی صاحب نے بہتر اور واضح جواب تحریر کیا ہے۔ مفتی صاحب نے اس میں تصوف، میاں بیوی اور والدین کے حقوق کے ساتھ ساتھ کھانے پینے اور لباس کے تعلق سے بھی مصادر شریعت سے احکام کا استخراج کیا ہے۔ اس میں درجنوں فتاویٰ اس نوعیت کے ہیں جو فتاویٰ کی دیگر کتابوں میں نہیں ملتے۔

فتاویٰ دینیہ کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور تمام جلدوں کے صفحات کی تعداد 2890 ہے، جن میں عبادات، معاملات، سماجیات، اقتصادیات اور اخلاقیات سمیت تقریباً زندگی کے تمام شعبۂ حیات کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ فتاویٰ کی ترتیب میں کتب فقہ کی

ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور کتاب العقائد سے آغاز کیا گیا ہے، صاحب کتاب نے ہر کتاب اور باب کا عنوان قائم کر کے مسائل کو مرتب کیا ہے، پہلی جلد کتاب العقائد، کتاب الطہارت اور کتاب الصلوۃ پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں مصنف نے کتاب الصلوٰۃ کے کچھ ابواب جیسے باب الامامت وغیرہ کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ اس جلد میں کتاب المساجد، کتاب الوقف، کتاب الجنائز اور کتاب الزکوٰۃ کا تذکرہ ہے، تیسری جلد میں کتاب الصوم، کتاب الحج ، کتاب النکاح اور کتاب الطلاق شامل ہے، چوتھی جلد میں کتاب البیوع، کتاب الربا، کتاب المضاربہ، کتاب الاجارہ، کتاب الرہن، کتاب الاضحیہ اور کتاب المیراث کو شامل کیا گیا ہے، جبکہ پانچویں جلد میں مصنف نے کتاب التصوف، کتاب الاکل ، کتاب اللباس، حقوق الوالدین والزوجین، مایتعلق ضبط التولید کو بیان کیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ فتاویٰ دینیہ صاحب کتاب کی بیس سالہ خدمات اوران کے فتاوی کا مجموعہ ہے، علاوہ ازیں صاحب کتاب کے ان فتاوی کو بھی یہاں جمع کرلیا گیا ہے جو انہیں ڈابھیل سے چھوڑ کر لندن میں سکونت اختیار کرنے کے بعد لکھے ہیں، یہ تمام فتاوے گجراتی زبان میں تھے جنہیں علماء کرام کے اصرار مسلسل کے بعد اردو زبان میں بھی شائع کیا گیا ہے چناں چہ خود صاحب فتاویٰ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

"فتاوی دینیہ کے نام سے چار جلدوں میں گجراتی میں یہ فتاویٰ چھپ گئے اور تقسیم ہونے لگے، رسائل میں اس پر اچھے الفاظ کے ساتھ تبصرے آئے اور لوگوں نے اردو جامہ پہنانے کی بہت ہی زیادہ خواہش ظاہر کی اور حضرت مولانا محمود شبیر صاحب مدظلہ العالی نے مہتمم جامعہ راندیر اور حافظ داؤد صاحب وغیرہ نے خوب اصرار کیا، اللہ تعالیٰ نے غیبی نصرت فرمائی مفتی امین صاحب، اللہ جل شانہٗ ان کو دارین میں بہت ہی بہترین جزائے خیر اور درجات عالیہ نصیب فرمائے انہوں نے گجراتی سے اردو اور پھر کمپیوٹر پر تیار کرنے کی ساری ذمہ

داری سنبھال لی تو انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی، یوکے والے مشائخ تو پہلے ہی سے اس کے اردو کرانے پر اور طبع کرانے پر مکمل اصرار اور انتظار کر رہے تھے اس لئے ان تین سالوں میں جامعہ حسینیہ کے جو فتاویٰ صادر ہوئے ہیں ان کو بھی شامل کرلیا گیا ہے" (فتاویٰ دینیہ ص:50)

فتاویٰ دینیہ میں انتہائی عام فہم اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے جو عام آدمی کو سمجھ میں آسکے، گجراتی سے اردو میں ترجمہ ہونے کے باوجود اسے پڑھتے وقت یہ احساس نہیں ہو پاتا ہے کہ یہ فتاویٰ کسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہیں، فتاویٰ دینیہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ صاحب فتاویٰ نے کسی بھی مسئلے کے تمام اجزاء کا احاطہ کیا ہے اور ایک باب سے متعلق تمام مسائل کو یکجا جمع کر دیا ہے، مراجع کا مکمل خیال کیا گیا ہے اور ہر بات بحوالہ نقل کی گئی ہے جس سے فتاویٰ میں مزید چار چاند لگ گیا ہے۔ فتاویٰ دینیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ اس میں عبادات اور سماجیات کے ساتھ انسانی زندگی میں پیش آنے والے تقریباً اکثر مسائل کا احاطہ کرلیا گیا ہے، یہاں تک کہ تصوف اور حقوق الوالدین کے تعلق سے بھی صاحب فتاویٰ نے مستقل باب عنوان قائم کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔

ہندوستان کے ماحول اور ملکی قانون کے تناظر میں جو سوالات معلوم کئے گئے ہیں اس میں بھی آپ نے بہت ہی لچک سے کام لیا ہے، چناں چہ ایک صاحب نے جھنڈے کو سلامی دینے اور راشٹر یہ گیت گانے کے تعلق سے سوال کیا ہے کہ ہندوستان میں یوم آزادی کے موقع پر ہر اسکول میں جھنڈا لہرایا جاتا ہے اور جب "جن گن من" یا "جھنڈا اونچا رہے" گایا جاتا ہے تو سب اسے سلامی دیتے ہیں، تو مسلمانوں کے لئے اس پروگرام میں حصہ لے کر جھنڈے کو سلامی دینے کے بارے میں کیا حکم ہے۔ اس سوال کے جواب میں نہایت معتدل انداز میں حضرت مفتی صاحب یوں رقم طراز ہیں

”جھنڈے کوسلامی دینا، اس کے سامنے جن گن من وغیرہ گیت گانے کی مذہب اسلام میں اجازت نہیں ہے، ایسا کرنے سے سخت گناہ ہوگا، لیکن مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے فتویٰ کے مطابق یہ فعل ملکی حمیت کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں اس لئے جائز ہے (واللہ اعلم بالصواب)

اسی طرح ایک صاحب کا استفتاء عقیدے کے تعلق سے ہے، سائل کا سوال ہے کہ حدیث شریف کے منکرین اور خلفاء راشدین کے منکرین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے ایسا انسان کافر کہلائے گا یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب اس کا جواب لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حدیث شریف اور خلفائے راشدین کا منکر گمراہ اور کافر ہے، اگر کوئی صاف لفظوں میں انکار نہ کرے بلکہ انکار پر کچھ تاویل یا توجیہ کرے تو اس کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد کوئی قطعی حکم لگایا جاسکتا ہے اس سے پہلے نہیں (فتاویٰ دینیہ جلد اول، ص 102)

فتاویٰ دینیہ میں عصر حاضر میں پیش آمدہ مسائل اور بدلتے زمانے کے ساتھ عوام کے بدلتے مزاج کے اعتبار سے بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے اور موجودہ زمانے سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے شریعت کے دائرے میں رہنے کی رہنمائی کی گئی ہے، چناں چہ ایک صاحب نے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا ہے جس کے جواب میں صاحب فتاویٰ رقم طراز ہیں کہ ”اسلام میں جس طرح مردوں کے لئے علم حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کریں، لیکن عورتوں کے لئے ان کے جنسی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے شریعت میں ایک خاص حد مقرر کی گئی ہے، اس حد سے باہر نکلنا ممنوع ہے، اسی میں سے اجنبی مردوں کے ساتھ ملنا جلنا اور اختلاط بھی ہے (فتاویٰ دینیہ جلد اول، ص 194)

صاحب فتاویٰ نے عبادات، معاملات، سماجیات کے ساتھ تصوف کے مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے، اس حوالے سے جو استفتاء موصول ہوئے ہیں ان کے دیئے گئے جوابات انتہائی معقول اور تصوف کی اعلیٰ اقدار پر مشتمل ہیں۔ پانچویں جلد میں مصنف نے اس کے لئے مستقل ایک باب قائم کرکے تمام مسائل کو یکجا کردیا ہے، چناں چہ ایک صاحب نے پیر کے اوصاف کے متعلق معلوم کیا ہے جس کے جواب میں آپ وضاحت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اور اپنے دل میں اللہ کی محبت، ایمان ویقین پیدا کرنا اور اخلاق رذیلہ سے بچ کر اللہ کے اوامر کو بجالانا اور ہر گھڑی یہ دھیان رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یہ بیعت کا مقصد ہے اور اس کے لئے کسی دیندار، عالم دین اور اس راستہ کے ماہر کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے اور اس کی رہبری حاصل کرنے کے لئے بیعت کی جاتی ہے، جس کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی ہے اسے پیر اور پیر کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے والوں کو مرید کہا جاتا ہے، جس طرح جسمانی بیماریوں سے تندرستی حاصل کرنے کے لئے ماہر تجربہ کار ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں (مثلاً اللہ کے اوامر سے غفلت، حب مال وجاہ، کینہ، غصہ، بخیلی وغیرہ) سے پاک ہونے کے لئے پیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ (فتاویٰ دینیہ جلد پنجم ص 27)

خلاصہ یہ کہ فتاویٰ دینیہ فقہ وفتاویٰ کی دنیا میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور امید ہے کہ اہل علم اس سے خوب سے خوب استفادہ کریں گے، اللہ تعالیٰ صاحب فتاویٰ، ان کے معاونین، ناشرین اور دیگر سبھی علماء وطلبہ، دینی وملی خدام اور ملت اسلامیہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

محمود الفتاویٰ

مؤلف: مولانا مفتی احمد خان پوری

امت مسلمہ کی دینی رہنمائی اوران کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں اکابرواسلاف کی خدمات وقربانیوں کوفراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جب جیسی ضرورت پڑی وارثین انبیاء ہمیشہ تیار کھڑے رہے، انہوں نے دین واسلام کا کوئی شعبہ اور پہلو نہیں چھوڑا وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر اسلام کے دفاع اوراس کی حقانیت کوثابت کرنے کے لئے ہمیشہ دیوار آہنی بن کر کھڑے رہے، چاہے وہ دعوت وتبلیغ ہو، اصلاح وتزکیہ ہو، درس وتدریس ہو یا تصنیف وتالیف کسی شعبے کوتشنہ نہیں چھوڑا، انہی شعبوں میں سے ایک شرعی احکام ومسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی بھی ہے، جس کوعلماء ''فتویٰ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ اہم ذمہ داری یا فریضہ ہے جسے سب سے پہلے خودرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا، آپ ﷺ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرامؓ نے اس مقدس منصب کوسنبھالا، اس کے بعد تابعین وتبع تابعین اور ائمۂ مجتہدین نے اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے خود کو وقف کردیا، اسی طرح ہمیشہ یہ فریضہ اللہ کے مخصوص بندوں کے ذریعہ انجام پاتا رہا، جو الحمد للہ آج تک

جاری ہے اوران شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی زیرنظر کتاب ''محمود الفتاویٰ'' ہے۔ جو 3 جلدوں پر مشتمل ہے، عمدہ اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے، اس کی پہلی جلد کی ضخامت 523، دوسری جلد کی 492 اور تیسری جلد کی 404 صفحات پر مشتمل ہے، گویا مجموعی طور پر کل 1400 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے، اس کتاب کو مکتبہ انور محمود نگر متصل جامعہ ڈابھیل نے شائع کیا ہے۔

''محمود الفتاویٰ'' حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ جس کی تقدیم وترتیب مفتی عبد القیوم راجکوٹی نے کی ہے۔ مفتی عبد القیوم صاحب نے اس کتاب پر تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل طویل، بہت عمدہ اور معلوماتی مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں انہوں نے صوبہ گجرات کے شہر بھروچ کے بارے میں جغرافیائی، تاریخی اور علمی منظرنامے پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح سے اسلام کی کرن ہندوستان میں ضلع بھروچ کے ذریعہ ہی پھیلی، کون سی عظیم شخصیات سرزمین بھروچ پر جلوہ افروز ہوئیں، پورا برصغیر جن کی روشنی سے منور ہوگیا اس کی تفصیلات اس مقدمے میں درج ہیں۔ مقدمہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر پندرہویں صدی ہجری تک یعنی حضرت حکم بن العاصؓ سے لے کر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ تک قدم رنجہ فرمانے والی عظیم ہستیوں کے حالات بھی مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد صاحبِ فتاویٰ مفتی احمد صاحب خانپوری صاحب کی سوانح لکھی گئی ہے۔ مفتی صاحب کے اساتذۂ کرام کا تعارف اوران کے مکتوبات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری کی شخصیت ہندو بیرون ہند کی علمی دنیا کے لئے محتاج تعارف نہیں، آپ کے علمی، اصلاحی، تبلیغی اور تربیتی کارناموں کا دائرہ سرحدوں کو تجاوز

کر چکا ہے اور آپ کے ذریعے سے علم دین کی خدمت اور اصلاح ودعوت کا عظیم کام انجام پا رہا ہے۔ آپ کی ولادت 24 ستمبر 1946ء میں خانپور ضلع بھروچ میں ہوئی، آپ نے دار العلوم اشرفیہ راندیر میں فارسی وعربی اول تا دورۂ حدیث شریف تعلیم حاصل کی، یہاں سے فراغت کے بعد دار العلوم دیوبند سے اکتساب فیض کیا، مفتی سید مہدی حسن صاحبؒ اور مفتی نظام الدینؒ سے افتاء کی کتابیں پڑھیں اور فتاویٰ نویسی کی مشق کی۔ مفتی صاحب کے دار العلوم کے اساتذہ میں نمونۂ اسلاف شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ، مولانا حسین احمد بہاریؒ، مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آپ کا اصلاحی وتربیتی تعلق شیخ زکریاؒ سے بھی بہت گہرا تھا۔ آپ کو فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے عشق کی حد تک محبت تھی، اسی لئے آپ اپنے کاموں کو مفتی صاحبؒ کی طرف انتساب فرماتے ہیں۔ آپ کا کئی سالوں تک حضرت مفتی صاحبؒ سے اصلاح وارشاد کا تعلق رہا اور مفتی صاحب سے ہی خلافت وجانشینی ملی۔ اس کتاب کا نام بھی ''محمود الفتاویٰ'' انہی کی ذات بابرکت کی طرف منسوب ہے۔

مفتی صاحب جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے شعبۂ افتاء (جس میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب سملکیؒ اور مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب جیسے ہندوستان کے ممتاز اور مایہ ناز مفتیان کرام نے خدمات انجام دی ہیں) میں تقریباً 23 سال سے زائد عرصے سے افتا کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس عرصے میں دنیا بھر کے ممالک سے آئے فقہی سوالات، محاکمہ کے لئے بھیجے گئے مسائل اور ڈاک کے ذریعے مریدین ومتعلقین کے خطوط کے جو جوابات انھوں نے تحریر فرمائے ہیں، انہی کے مجموعہ کا نام ''محمود الفتاویٰ'' ہے۔ اس کتاب کی 3 جلدوں میں شرعی، سماجی، سیاسی، تجارتی،

ضروریات زندگی اور جدید مسائل کو مدلل، مفصل قرآن وحدیث اور اسلاف کی کتابوں کے حوالے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک اہم خصوصیت جو اسے دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قارئین کی سہولت کے لئے مسائل کو بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ ابواب کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے نیز ہر مسئلے سے پہلے اس کا ایک عنوان متعین کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ''کتاب العقائد'' کے مسائل مذکور ہیں، جن میں عذاب قبر کے برحق ہونے اور کھڑے ہو کر سلام پڑھنے کے شرعی حکم کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب التصوف میں پیری مریدی اور سلوک وتصوف کا شرعی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب الطہارۃ کے 29 مسائل مذکور ہیں، مثلاً سینٹ کا استعمال، ستر کھل جانے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں، حائضہ عورت اور کنویں میں جانور وغیرہ کے گر جانے کے مسائل۔ کتاب الصلاۃ میں نماز کے اوقات، مسجد شرعی میں تکرار جماعت مکروہ تحریمی، نماز میں قرأت سبعہ پڑھنا، قضاء عمری کی نماز پڑھنے کا طریقہ، ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں اور دیگر 80 مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ مسائل امامت میں جن اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں داڑھی کٹوانے والے کو امام بنانے کی کراہت، ٹی وی دیکھنے والے کو امام بنانے کی کراہت اور داڑھی نہ رکھنے والے کی امامت کی کراہت کے مسائل ہیں۔ مسائل تراویح میں تراویح پر ہدیہ لینے کی ممانعت، ہر سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور تراویح الگ پڑھنے کی صورت میں عشاء کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھنا ضروری ہے جیسے مسائل مذکور ہیں۔ اس کے علاوہ مسائل سفر، مسائل جمعہ، مسائل عیدین، مسائل جنائز جیسے ابواب میں بھی بہت ضروری اور تفصیلی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

دوسری جلد میں کتاب الزکاۃ کے تحت زکاۃ کے تمام ضروری اور اہم مسائل کے

جوابات بہت ہی تشفی بخش انداز میں دیے گئے ہیں، اس کے بعد عشر وخراج کے مسائل بھی مذکور ہیں۔ 'کتاب الصوم' کے تحت چاند کے ثبوت اور روزے کے مسائل ذکر کئے گئے ہیں۔ 'کتاب الحج' کے اندر حج کے مسائل کو بہت ہی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس میں حج سے متعلق 228 مسائل مذکور ہیں۔ شیئرز کے مسائل، کھیتی کے مسائل، مکانات کی کرایہ داری اور خرید وفروخت کے مسائل، گیسٹ ہاؤس وغیرہ کے مسائل، بیمہ اور سود کے مسائل، ٹیکسی کے مسائل، ہیرے کے کاروبار کے مسائل، سہکاری منڈڑی اور دودھ کی بیع وغیرہ کے مسائل اور پولٹری فارم یعنی مرغی، انڈے وغیرہ کی خرید وفروخت جیسے جدید مسائل بھی بہت ہی تسلی بخش اور بحوالہ بیان کئے گئے ہیں۔

تیسری جلد میں خرید وفروخت کے مسائل، اقالہ کی فضیلت، ربا کے مسائل جیسے حکومتی ٹیکسوں میں سودی رقم لینا، مکان وغیرہ بنانے کے لئے حکومت سے لون لینا، فکس ڈپازٹ سے حاصل شدہ رقم کا استعمال، سودی رقم سے بنائی گئی عمارت میں نماز ومکتب کا حکم وغیرہ کے مسائل ہیں۔ اسی طرح ہبہ، اجارہ اور قربانی کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں کتاب میں سیاست سے متعلقہ سوالات کے جوابات ہیں۔ بابری مسجد کے تنازع کے سلسلے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتاویٰ کی روشنی میں بہت ہی عمدہ طریقے سے مسلمانوں کے لئے اس کا حل پیش کیا ہے۔

کتاب ظاہر و باطن ہر اعتبار سے مکمل اور جامع و مانع ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے بھی وقیع ہے اور اپنے مواد کے اعتبار سے بھی۔ مفتی احمد خان پوری صاحب موجودہ وقت میں ہندوستان کے چند گنے چنے اہلِ علم وفضل اور اربابِ فقہ وفتاویٰ میں سے ہیں، ان کی تحریروں اور فتاویٰ کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کا علمی وتحقیقی سراپا بہت

ہی اعلیٰ و بلند ہے۔ اس لیے حضرت کے فتاویٰ کا یہ مجموعہ فقہ وفتاویٰ کا ذوق رکھنے والے علماء کے لیے مطالعہ کرنے اور مسلسل اپنے پاس رکھنے کے لائق ہے، جو لوگ کم پڑھے لکھے ہیں اور وہ دینی مسائل میں تشفی بخش شرعی رہنمائی چاہتے ہیں، وہ بھی اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

صحبتے با اہل دل

مؤلف: مفکر اسلام ابوالحسن علی حسنی ندوی، محل شاہ یعقوب مجددی بھوپال

شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ ''مرشد کی تلاش اس لئے ضروری ہے کہ اس کی تربیت میں رہ کر انسان ایسی روح حاصل کرلے جو دل کو زندہ کردے اور مرید اپنے رب کی معرفت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے''۔(سرالاسرار صفحہ 204)۔اس لئے بزرگوں کے ملفوظات اور ان کی مجالس کے قلم بند کرنے کا سلسلہ ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔یہ ایک بڑا مبارک ونہایت دانشمندانہ تصنیفی اقدام ہے، کیوں کہ ملفوظات اور مجالس میں جو زندگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ قدرتی طور پر علمی تصنیفات اور عام تحریرات میں نہیں ملتی، پھر زندگی کے مختلف حالات ومسائل میں مختلف المزاج لوگوں کو ان سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کی توقع بھی رائج طریقوں پر لکھی ہوئی کتابوں سے نہیں کی جاسکتی۔سادگی وبے تکلفی، شفقت و رعایت، نباضی ومزاج شناسی، عمومی بیماریوں و کمزوریوں سے گہری واقفیت اور ان کا صحیح علاج ہمیشہ سے بزرگان دین اور صوفیائے کرام کا شیوہ رہا ہے اور اس کا بہترین نمونہ ان کے ملفوظات ومجالس میں ملتا ہے۔

اِس دور میں ہندوستان میں جن شخصیات کو ہمہ جہت مقبولیت حاصل ہوئی اور انھوں نے اپنے علم وقلم سے لے کر زبان و بیان کے ذریعے سے امت کی خدمات انجام دیں، ان میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی کئی اعتبار سے ممتاز ہے۔ حضرت مولاناؒ نے ہندوستان ہی نہیں، دنیا بھر میں جا جا کر اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا، وہ عربی واردو زبان کے بے مثال ادیب بھی تھے اور ان کی تصنیفات میں دعوت کے ساتھ ادبیت کی بھی ایک لذیذ چاشنی پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ مولانا علی میاں کا ایک خاص وصف معرفت وسلوک سے ان کی گہری اور مضبوط وابستگی بھی تھا، اپنی زندگی میں ان کا تعلق شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ اور تحریکِ تبلیغ کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ جیسے متعدد اہل دل بزرگوں اور اصحابِ معرفت سے رہا اور ان سے انھوں نے خوب خوب استفادہ کیا اور خود ہی استفادہ نہیں کیا، بلکہ آنے والی نسلوں کو اخلاقی، عملی اعتبار سے رہنمائی فراہم کرنے کے لیے ان بزرگوں کی زندگیوں کے تذکرے لکھے، امت کے تئیں ان کی فکرمندی و دردمندی کو اپنے دلچسپ اسلوب میں بیان کرکے ان سے ہر خاص وعام کے لیے استفادے کو آسان بنایا اور عملی، شرعی و دینی معاملوں کے علاوہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کے مطالبات اور تقاضوں سے آشنا کرنے کے لیے اپنے دور کے مختلف اکابرِ امت کی سوانحِ حیات، ان کے کارناموں اور ان کے اقوال وملفوظات کو تحریری شکل میں پیش کرکے امت پر احسانِ عظیم فرمایا۔ زیرِ نظر کتاب ''صحبتے با اہل دل'' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب خاندان مجددی کے امین حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجدد علیہ الرحمہ کی مجالس اور ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی علیہ الرحمہ نے ترتیب دیا ہے۔مولانا علی میاں ندویؒ کا مولانا یعقوب صاحبؒ سے کوئی بیعت وغیرہ کا

باضابطہ تعلق نہ تھا،لیکن چوں کہ فطری طور پر مولانا کا ایسا مزاج تھا کہ جب بھی کسی اہلِ دل سے ملتے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے اور ان سے انھیں فائدہ محسوس ہوتا،تو بار بار ایسے عارفوں سے ملتے اوران سے استفادہ کرتے، پھراس سے اپنے متعلقین ومتوسلین اور دوسرے مسلمانوں کوبھی فائدہ پہنچانے کی فوری کوشش کرتے تھے۔اس لیے وہ جب بھی بھوپال جاتے تھے،تو حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کی خدمت میں ضرورحاضری دیتے تھے اوران کے افادات وملفوظات سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے۔شاہ صاحب کی صحبت میں متعدد بار بیٹھنے،ان سے ملنے اورامت کی اصلاح کے تعلق سے ان کی فکرمندی کودیکھتے ہوئے مولاناعلی میاںؒ کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ شاہ صاحب کے قیمتی ملفوظات اگر کتابی شکل میں آجائیں،توان لوگوں کے لیے بھی استفادہ کی صورت نکل آئے گی،جواُن تک نہیں پہنچ پاتے،انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے رفیقِ گرامی مولانا منظور نعمانی صاحب سے کیا،مولانا نعمانی بھی نہ صرف ایک جید عالم و فاضل اور اہلِ قلم تھے،بلکہ وہ بھی سلوک ومعرفت کے رموز سے آشنا صاحبِ دل انسان تھے،چنانچہ حضرت مولاناعلی میاںؒ کی اس خواہش کوانہوں نے نہ صرف پسند کیا،بلکہ ان ملفوظات وافادات کو پہلے قسط وار اپنے مقبول ومشہور مجلّہ ’الفرقان‘ میں شائع فرمایا،بعد میں ان شائع شدہ مواد کوکتابی شکل میں مرتب کردیا گیااوراس کے لیے حضرت مولاناعلی میاںؒ نے ’صحبتے با اہلِ دل‘ کا نام تجویز فرمایا۔موجودہ کتابی شکل میں اس کی ضخامت 373 صفحات ہے،کتب خانہ الفرقان 31 نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔کتاب کی علمی وافادی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب نے بھی اپنے تاثرات ’’پیش لفظ‘‘ کے عنوان سے پیش کیے ہیں۔

اس کتاب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحبؒ نے سب سے

پہلے ’’تعارف‘‘ کے عنوان سے حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی علیہ الرحمہ کے خاندان،ان کے سلسلۂ نسب،تعلیم وتربیت، بیعت وخلافت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔
حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی کے والدگرامی حضرت شاہ پیرابواحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جوخوداپنے عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے اورسلطنت مغلیہ کے آخری دور میں نسبت مجددیہ کا ان سے بڑھ کر مظہر اور علوم ومعارف کا ان سے بڑھ کر عارف وترجمان نظرنہیں آتا، وہ غایت درجہ سنت کے متبع اور آداب طریقت کے امین ومحافظ تھے۔انھوں نے اپنے پھوپھا اور مشہور بزرگ حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے مدینہ طیبہ میں سلوک کی تعلیم وتربیت حاصل کی اورانہی سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی،حضرت شاہ عبدالغنی صاحب حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے چھوٹے بھائی اور حضرت شاہ اسحٰق صاحب کے ممتاز ترین تلامذہ اور اساتذۂ حدیث میں ہیں۔حضرت مولانا شاہ پیر ابواحمدؒ کے دادا حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددیؒ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے اورنسباً ونسبتاً اول سے آخر تک مجددی ہیں۔ان کا سلسلۂ نسب چار واسطوں سے حضرت خواجہ محمد یحییٰ فرزند اصغر حضرت مجدد الف ثانیؒ تک اور سلسلۂ طریقت چار واسطوں سے حضرت خواجہ محمد معصومؒ فرزند وخلیفۂ ارشد حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے۔

کتاب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ’مجلس‘ کے عنوان سے الگ الگ باب قائم کرکے 30 مجالس میں حضرتؒ کے ملفوظات کوجمع کیا ہے،پہلی مجلس میں قرآن کی روحانیت، نماز کی فضیلت، حیات طیبہ کا اصل مفہوم،اخبار بینی کا فائدہ،دین پر عمل کرنے کے آداب، رمضان کی قدر اوراللہ کی قدرت پر یقین جیسے موضوعات پر بہت ہی تسلی بخش گفتگو ہے۔دوسری مجلس میں ادعیۂ ماثورہ،قبولیت دعا کا راز،سلاسل اربعہ کی تشریح،تزکیہ اورنظربندی میں فرق،آخرت کی فکر،سلوک کے طریقوں اور حفظ قرآن کی فضیلت کو بیان

کیا گیا ہے۔ تیسری مجلس میں مشائخ کی تقلید واتباع، انانیت کا علاج، بندگی کا مقام، معدے، قوت اربعہ کی باریکیاں اور نفس سے مغلوب کرنے کی تمثیل کو بہت شستہ انداز میں بتایا اور سمجھایا گیا ہے۔ چوتھی مجلس میں شرعی حدود و قیود کی نوعیت اور حکمت، استخارہ کا صحیح طریقہ، قرآن سے القاء والہام کا ثبوت، ائمہ کی تقلید، مغربی تہذیب کے اثرات اور صبر کی حقیقت کا ذکر ہے۔ پانچویں مجلس میں تبلیغ میں اثر کا راز، اذکار کی حقیقت، مدینہ میں موت کی آرزو اور اصلی اور نقلی اشیاء میں فرق کو مثال کے ساتھ بڑی خوبصورتی کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرتؒ نے تصوف کی اہمیت، علم وعمل کی برتری، موت کی یاد، تواضع کے فوائد نیز تصوف کے تمام ضروری مسائل پر بہت ہی سادگی اور نکتہ وری کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

مختلف مواقع پر صوفیاء کرام کے جو اقوال جمع کیے گئے ہیں وہ اخلاق واحسان کی روح اور تزکیۂ نفس کی جان ہیں، ان کے مطالعے سے دنیا سے بے رغبتی اور ہوائے نفس سے بیزاری پیدا ہوتی ہے اور تعلق باللہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے۔ انسان کو زندگی میں کئی بار بہت پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے اور حادثات ومصائب اسے گھیر لیتے ہیں، ایسے میں فوری طور پر آدمی کا ذہن ظاہری اسباب ووسائل کی جانب جاتا ہے کہ ایسا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو یوں نہ ہوتا وغیرہ، لیکن بزرگانِ دین اور اصحابِ معرفت ہمیں قرآن کے اس بیان پر توجہ دلاتے ہیں کہ انسان پر جو بھی اچھی یا بری حالت آتی ہے، اس میں خود اس کے اعمال وافعال کا عمل دخل ہوتا ہے اور ظاہری اسباب ووسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ بندے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے رب سے لو لگائے، اس کے احکام واوامر کو اپنی زندگی میں داخل کرے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے احتراز کرے۔ تصوف، سلوک شریعت ہی کا ایک اہم جز ہے، فرق یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کا نظری علم انسان کے پاس

پہلے سے موجود ہوتا ہے، لیکن اس کی عملی زندگی میں وہ چیزیں داخل نہیں ہوتیں، تو یہ اہل اللہ ہمیں اپنے قول وعمل کے ذریعے اس چیز کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اور دین و دنیا کی کامیابی کا انحصار دونوں پر ہے، خاص طور سے ایک مسلمان کی کامیابی تو اسی پر مشروط ہے کہ وہ دین کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے، اس پر عمل بھی کرے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی کے لیے قرآن کریم میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان والا ہو اور نیک اعمال بھی کیے ہوں۔ لہٰذا اپنے دل میں فکرِ آخرت پیدا کرنے کے لیے اور اپنا رشتہ رب سے مضبوط کرنے کے لیے قرآن وسنت اور اللہ کے مقرب بندوں کی صحبت اور ان کے افادات وملفوظات سے استفادہ کرنا نہایت ہی ضروری ہے اور اس سے انسان کی عملی واخلاقی زندگی میں خوشگوار انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

حدیث کے اصلاحی مضامین

مؤلف:مفتی احمد خانپوری

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم،ابدی صلاح وفلاح اور رشدو ہدایت کیلئے نبیوں ورسولوں کو بھیجا اور یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا،سب سے آخر میں خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجا۔آپ کے ذریعہ ایسی ابدی تعلیم دی جو ہمیشہ کیلئے کافی ہے اور زندگی کے ہر مسئلہ کا حل ہے۔اس کے دو حصے ہیں۔(۱) قرآن (۲) حدیث۔

حدیث قرآن مجید کے بعد دین وہدایات کی دوسری اہم بنیاد ہے جو آپ ﷺ کے ارشادات،اعمال اور آپ کے سامنے ہونے والے وہ افعال ہیں جن پر آپ نے خاموشی اختیار کی کا جامع مجموعہ ہے،احادیث نبویہ قرآن کریم کی تفسیر ہیں اس لئے خود قرآن کریم کو حدیث کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں،احادیث کے ذریعہ احکام اسلام کی تفصیلات اورنقوش نبوی کا امت کو علم ہوا۔جب سے احادیث رسول نے مدون علم کی صورت اختیار کی ہے مختلف طریقے سے ان کی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ کتاب ’’حدیث کے اصلاحی مضامین‘‘ دراصل عالم اسلام کے مشہور بزرگ

نامور عالم دین حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم صدر مفتی وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات، خلیفہ مجاز فقیہ الامت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ سابق مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند کے ان مجالس علمیہ کا مجموعہ ہے۔ جوانہوں نے حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ کی وفات کے بعد ان کے معتقدین ومتوسلین کے درمیان مختلف مجالس میں باطنی وروحانی تربیت وتزکیہ کے سلسلے میں ارشاد فرمائے، نیز عارف باللہ علامہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی قدس سرہٗ بانی ومہتمم جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ یوپی، خلیفہ ومجاز اسدالامۃ مناظر اسلام حضرت مولانا اسعد اللہ نوراللہ مرقدہٗ ناظم جامعۃ مظاہرعلوم سہارنپوری، نے تاکید کے ساتھ یہ سلسلہ شروع کرنے کو کہا تھا۔

لہٰذا مسجد ابرار (شالیمار سوسائٹی سورت) پھر مجمع کی زیادتی کی وجہ سے مسجد انوار (نشاط سوسائٹی سورت) میں یہ حلقۂ درس شروع ہوا اور اس کی ترتیب یہ طے ہوئی کہ بعد نماز مغرب تا عشاء مجلس ذکر اور عشاء کی نماز کے بعد درس حدیث ہو اور اس کیلئے امام المحدثین حافظ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ کی مشہور ومعروف کتاب ’’ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین‘‘ کا انتخاب کیا۔

’’ریاض الصالحین‘‘ بالکل اچھوتے اورنرالے انداز میں ترتیب دی گئی ہے جس میں دین کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے کہ ایک پڑھنے والا پڑھتا رہے اور اس کا رشتہ اسلام سے مضبوط ہوتا جائے ساتھ ہی اس میں احادیث کے ذکر سے پہلے باب سے متعلق آیات قرآنی کو بھی ذکر کیا گیا ہے، آخر میں حسب ضرورت مشکل الفاظ کے معانی، تشریح اورسند کے اعتبار سے بھی کلام کیا گیا ہے۔

مزید برآں حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم جو اپنے علم وفضل، ورع وتقویٰ، تقریری وتحریری خدمات اور گوناگوں اوصاف وکمالات کے جامع ہیں ان کے

درس نے اس پر چار چاند لگا دیئے، جس کا اظہار مفتی اعظم گجرات حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ صاحب ''فتاوی رحیمیہ'' نے ''دو آتشہ شراب اور سونے پر سہاگہ'' والی مثل مشہور سے کیا۔ دراصل اس درس کو حضرت کے خادم خاص مولانا عبد المنان صاحب نے ریکارڈنگ کے ذریعہ محفوظ کیا پھر انہوں نے مولانا سلمان منیار صاحب کے ساتھ ملکر ''حدیث کے اسباق'' نام سے شائع کیا اب یہ مجموعہ ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کے نام سے چھپا ہے۔

یہ کتاب بارہ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد اپنے مشمولات ومضامین کے اعتبار سے انتہائی وقیع، علمی اور مفید ہے۔

اختصار کے ساتھ آئندہ سطور میں ہم کتاب کا کچھ مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ کہنے کو تو یہ بات ہے کہ یہ درس حدیث کی مجلس کا مجموعہ ہے لیکن اپنی جامعیت، پرکشش عنوانات، علمی وادبی لطائف، واقعاتی مضامین، احادیث کی تشریح وتفسیر کے ساتھ فقہی احکام، مشکل الفاظ کے لغوی معنیٰ کی وضاحت، عصر حاضر میں مسلمانوں کے مسائل کا حل اور اصلاحی اشعار پر مشتمل ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

عنوانات:

رات کا غم، دن کا شرم، اخلاق ومزاج ناپنے کا تھرمامیٹر، معاشقہ والے نکاح کا آپریشن، جیسی محنت ویسی برکت، صدیق کی رائے صادق، گناہ پر پنالٹی، وہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں، نفس کا مکر اور اس کی پکڑ، عیادت، نہ ہو شکایت۔ کتاب میں قائم عنوانات کی یہ کچھ جھلکیاں ہیں جنہیں قارئین کو پڑھنے اور سامعین کو سنے بغیر سکون نہیں ملے گا۔

الفاظ کے معانی:

مراقبہ کا معنیٰ کس اسلوب میں انہوں نے بیان کیا ہے اس کی ایک جھلک دیکھئے:

''(راقب یراقب مراقبۃ) کا معنیٰ نگرانی کرنا، کسی کا خیال رکھنا، کسی کی نقل و حرکت کو دیکھتے رہنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ اس کو نوٹ کرنا، اگر ایک معشوق کے دو عاشق ہوں تو ان کو بھی اردو زبان میں ''رقیب'' کہا جاتا ہے............ شاعر کہتا ہے:

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعن اقربا   تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لئے بھی لفظ رقیب صفت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے...

''ما يلفظ من قول الالديه رقيب عتيد''

(حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد:۲صفحہ نمبر:۵۸، ۵۹)

صاحب مجلس کی نکتہ سنجی

ایک جگہ رقمطراز ہیں: ''قافلہ کو عربی زبان میں ''قافلہ'' اسی لیے کہتے ہیں کہ ''قفل يقفل'' کا معنیٰ ہے ''لوٹنا'' یعنی لوٹ کر آنے والی جماعت .... اہل عرب کے یہاں ایک مزاج تھا کہ وہ لوگ کسی چیز کا نام رکھنے میں نیک فالی لیا کرتے تھے۔ ایسا نام رکھتے تھے جس کا اچھا معنیٰ نکلے....... اس زمانہ میں جو لوگ سفر کے لئے نکلتے تھے تو بدامنی اور جان ومال کے خطرہ کی وجہ سے ان کی واپسی کے متعلق اندیشہ رہتا تھا...... یعنی نام کے اندر ہی ایسا معنیٰ رکھ دیا کہ جب کئی آدمیوں کی زبان سے ایک لفظ بولا جائے گا تو معلوم نہیں کس کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے، اس کا بول قبول ہو جائے'' (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد نمبر: ۱۰، صفحہ نمبر: ۳۸۶۔۳۸۵)

اسی طرح بڑے اچھے اور البیلے انداز میں ساعۃ اور سلیم کی نیک فالی کو ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''عربی زبان میں سانپ کے ڈسے ہوئے کو ''سلیم'' کہتے ہیں حالانکہ

"سلیم" کا معنیٰ: وہ آدمی جو سلامتی والا ہے، لیکن جس کو سانپ کانٹ لے، عام طور پر وہ سلامت نہیں رہتا بلکہ مر جاتا ہے.... جب کئی لوگوں کی زبان سے سلیم کا لفظ نکلے گا، تو ہوسکتا ہے کسی کی زبان سے نکلا ہوا بول قبول ہو جائے اور اس کی جان بچ جائے۔ اسی طرح قیامت کو "ساعۃ" کہتے ہیں یعنی ایک لمحہ اور ایک گھڑی تو گویا "ساعۃ" نیک فالی کے طور پر کہا گیا ہے ویسے قیامت کا دن بڑا لمبا دن ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لیے ایک لمحہ اور ایک گھڑی کے برابر بنا دے" (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد نمبر: ۱۰، صفحہ نمبر: ۳۸۶)

عصر حاضر کے تناظر میں فقہی مسائل:

(الف) میاں بیوی کا رشتہ ایک محترم رشتہ ہے، جب یہ رشتہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے تو گھر اور خاندان کا ماحول پرسکون رہتا ہے، لیکن اگر رشتے میں درار ہو جائے اور بناؤ کے بجائے بگاڑ ہو جائے تو خاندان اجڑ جاتا ہے۔ آپ نے میاں بیوی کے آپسی معاملات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور قرآنی ترتیب کے مطابق سبب اصلاح کو واضح کرنے کے ساتھ گیارہ ایسی صورتیں بتائی ہیں جن کی بنیاد پر بیوی کو پٹائی کرنے کی اجازت ہے اور وہ بھی کتنا اور کیسے؟ یہاں موقع کی مناسبت سے آٹھ ایسی وجوہات شمار کی گئی ہیں جن میں شریعت نے عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ یہاں کچھ ایسے واقعات بھی مذکور ہیں جنہیں پڑھ کر اور سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر نیک، صالح میاں اور بیوی ہوں تو گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد نمبر: ۲، صفحہ نمبر: ۱۳۰۔۱۱۱)

(ب) عصر حاضر میں کھانے کا طریقہ بہت بدل گیا ہے اور فیشن اس طرح ہماری تہذیب کو دیمک کی طرح کھائے جا رہا ہے کہ لوگوں کو ذرہ برابر عار کا ہونا تو درکنار کوئی

احساس تک نہیں ہوتا ہے کہ اس کا یہ طریقہ سنت نبویؐ، انسانی طرز حیات سے ہم آہنگ اور اس کے موافق بھی ہے یا نہیں، موصوف نے اس باب میں نبی کریم ﷺ کے فرمودات کو بیان کرنے کے بعد یہ خلاصہ کیا ہے کہ آدمی ایسے کھائے جس سے معلوم ہو کہ وہ کھانے کا محتاج ہے۔ اس باب میں بیٹھنے کے طریقے پر علامہ شامیؒ کی تحقیق ذکر کرنے کے بعد ٹیبل کرسی پر کھانے کو جائز قرار دیا ہے۔ ہاں! آج کل کے فیشن والے بوفے سسٹم پر سخت نکیر کی ہے۔ لکھتے ہیں: "ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟ تو پہلے زمانہ کے اندر وہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ بات باقی نہیں رہی، اس لئے نفس جائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے"۔ (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد: ۹ صفحہ نمبر: ۴۳۸)۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک مرتبہ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھایا، اس وقت یہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا اس لیے حضرت نے ان کے تشبہ سے بچنے کے لئے ٹانگیں اوپر لے لیں، لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے بلکہ جواز کی حیثیت سے اس کی بھی پوری گنجائش ہے، باقی یہ ہے کہ سنت سے زیادہ قریب یہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے" (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد: ۹ صفحہ نمبر: ۴۳۹)

اسی باب میں آپ نے بڑی باریکی سے ذکر کرتے ہوئے کھڑے اور چلتے ہوئے کھانے کے بارے میں لکھا ہے کہ "عام طور پر جو کھانا اہتمام کے ساتھ کھایا جاتا ہے اس کے لئے دسترخوان وغیرہ بچھاتے ہیں اور مقررہ اوقات کے کھانے ہوتے ہیں؛ تو وہ تو کھڑے ہو کر کھانے کی اجازت نہیں ہے، لیکن کوئی ایسی چیز جس کو کھڑے ہو کر کھانا عیب نہیں سمجھا جاتا جیسے چاکلیٹ، دانے، چنے، پان وغیرہ؛ کہ آدمی چلتے پھرتے کھا لیا کرتا ہے تو اس کی اجازت ہے باقی اپنے مقررہ اوقات کا کھانا، جس کو ہم لنچ اور ڈنر "ظہرانہ" اور "عشائیہ" کہتے ہیں تو وہ چلتے چلتے کھانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ (حدیث کے اصلاحی مضامین:

جلد:۹صفحہ نمبر:۴۸۶۔۴۸۵)

اس طرح ایسے بہت سے فقہی مسائل ہیں جس کو آپ نے بڑے اچھے انداز میں سلجھایا ہے اوراس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مثال سے وضاحت:

(الف) درمیان درمیان میں ایسی انوکھی مثال دیتے ہیں کہ قاری عش عش کرنے لگتا ہے،مثال کے طور پر مشہور حدیث ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جسم کے اندر لوتھڑا ہے، جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اوراگر بگڑ گیا تو سارے اعمال خراب ہوجاتے ہیں۔آپ اسے مثال سے سمجھاتے ہیں ”جیسے پانی ٹنکی سے سپلائی ہو رہا ہے اگر وہیں گر پڑے، وہاں سے پانی زہریلا نکل رہا ہے تو سب جگہ ایسا ہی زہریلا پہنچے گا اوراگر وہاں اچھا ہے تو دوسری جگہ اچھا ہی پہنچے گا“۔(حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد:۱صفحہ نمبر:۶۰)

(ب) بعض مرتبہ انسان حالات سے پریشان ہوکر کچھ ایسے جملے اورکلمات نکالتا ہے جو بددعاء اورلعنت کے ہوتے ہیں۔اس کی مثال دے کر رقم طراز ہیں: ”بددعاء اور لعنت کی مثال گیند(Ball) جیسی ہے اس کو آپ نے کسی جگہ پھینک کر مارا،اب اگر وہ جگہ نرم ہے اوراپنے اندر اس گیند کو کیچ کر لیتی ہے،تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر وہ جگہ ایسی نہیں ہے جو اس گیند کو اپنے اندر جذب کر سکے، بلکہ وہ سخت ہے تو پھر وہ گیند دوبارہ لوٹ کر جس نے پھینکی ہے اسی کی طرف آجاتی ہے۔ بددعاء اورلعنت کا حال ایسا ہی ہے“(حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد:۱۲صفحہ نمبر:۳۴۶)

بلا شبہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ پڑھنے والوں کے بھی ایسی مثالوں سے بات دل میں اتر جائے گی۔

واقعات:

(الف) آدمی اس دنیا میں آکر جیسے بھی زندگی گزار لے لیکن آخر ایک دن اس کے حصہ میں موت ہے خواہ مومن ہو یا کافر،نیکوکار ہو یا بدکار ہرایک کو میدان حشر میں اللہ جمع کرے گا۔نیکوکار جنت میں جائیں گے اور بدبخت جہنم میں،قرآن نے قیامت اور میدان حشر کی مختلف جگہوں پر ایسی منظر کشی کی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں،اللہ تعالیٰ سے خوف وخشیت اور ڈرنے کیلئے تفسیر قرطبی کے حوالہ سے جو واقعہ اس کتاب میں نقل کیا ہے وہ دل کو دہلا دینے والا ہے۔”کہ ایک آدمی رات کو سویا تو اس کے بال سیاہ تھے،صبح میں اٹھ کر دیکھا تو سب بال سفید تھے۔اس سے پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے رات کو خواب میں قیامت کا منظر دیکھا،اس کی مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی اور میری طبیعت پر ایسا اثر پڑا کہ سارے سیاہ بال سفید ہوگئے،خواب میں یہ منظر دیکھ کر جب ایسا حال ہوسکتا ہے،تو بیداری میں کیا حال ہوگا؟“(حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد:۷صفحہ نمبر:۴۳)

(ب) قرآن وحدیث میں تاکیدی حکم ہے کہ آدمی اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے،اس کا ہرممکن خیال رکھے کہ انہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہو،لیکن آج کل معاشرہ کی عجیب صورتحال ہے کہ بوڑھے والدین کو بھائیوں کے درمیان تقسیم کردیا جاتا ہے یا پھر شہروں میں بڈھا گھر میں ڈال دیا جاتا ہے۔موصوف نے چیف جسٹس حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نائب رئیس دارالعلوم کراچی کے حوالے سے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے کہ آدمی سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟

”کہ بیٹا باپ کو بڈھا گھر(اولڈ ہاؤس) میں چھوڑ آیا تھا،باپ کا وہاں انتقال ہوگیا تو اولڈ ہاؤس والوں نے اس کو اطلاع دی کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ پلیز آپ ذرا ان کے کفن دفن کا انتظام کردیجئے، اس کا جو بل ہوگا وہ میں ادا

کردوں گا اور جنازہ کا جو وقت طے کروگے وہ مجھے بتا دینا، میں پہنچ جاؤں گا۔ خیر! انہوں نے جنازہ کا وقت اس کو بتایا، لیکن اسی وقت صاحبزادے کو کوئی اہم میٹنگ پیش آ گئی اس لیے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اس وقت تو میری بہت اہم میٹنگ ہے، اس لیے میں حاضر ہونے سے قاصر ہوں، مہربانی کر کے آپ ان کو دفن کر دیں اور جو بل ہو، وہ مجھے بھیج دینا، میں ادا کردوں گا۔ یہ ساری چیزیں جو ہمارے معاشرہ میں آ رہی ہیں، وہ سب درحقیقت اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں''۔ (حدیث کے اصلاحی مضامین: جلد:۶ صفحہ نمبر:۷۱۔۷۲)

آپ کے درس کی ایک عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ درمیان میں مفید اور قیمتی مشورہ بھی دیتے ہیں جیسے ایک جگہ آپ نے تاجروں سے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو تعلیم سکھا کر اپنی تجارت میں شامل نہ کریں، بلکہ اسے دعوت وتبلیغ کیلئے دنیوی مشاغل سے فارغ کردیں، رہا اس کے کھانے پینے کا مسئلہ؟ تو ایک طریقہ یہ ہے: ''آج کل تجارت کے اندر سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) ہوتا ہے کہ وہ کام نہیں کرتا لیکن اس کا حصہ ہوتا ہے۔ آپ بھی اپنے اس بیٹے کو اپنی تجارت میں سلیپنگ پارٹنر کے طور پر رکھ لیجیے، کہ آپ کمائیں گے اور یہ کھاتا پیتا رہے گا اور چونکہ اس کے دینی مشاغل میں لگنے میں آپ کی محنت کو بھی دخل ہے، آپ کو بھی ان مشاغل کا پورا پورا اجر ملے گا، لیکن یوں نہ سمجھنا کہ آپ لوگ اس کو کھلا رہے ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے اس فیصلہ کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ آپ کی تجارت میں برکت دے اور پھر اس کی وجہ سے آپ کو روزی ملے، جیسا کہ یہاں حضور ﷺ نے فرمایا: (لعلک ترزق بہ) یہاں تو ''لعلک'' فرمایا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شاید تم کو اس کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ ایک دوسری روایت میں ''لعل'' نہیں ہے، بلکہ یقین کے ساتھ آپ نے فرمایا: (انکم ترزقون بضعفائکم) کہ تم لوگوں کو روزی تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتی ہے۔ (حدیث کے اصلاحی مضامین:

جلد:۲ صفحہ نمبر:۲۳۵۔۲۳۶)

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے اصلاحی اشعار سے آراستہ کیا ہے مثلاً:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

پردہ دری کا یہ نتیجہ نکلا
جس کو سمجھتے تھے بیٹا وہ بھتیجہ نکلا

گدا کو بھی اہل کرم کم نہ سمجھیں
بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعاء دی
آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی خاص بات یہ ہے کہ سب سے پہلے احادیث عربی کو درج کیا گیا ہے پھر اس کا ترجمہ، افادات، تشریحات، متعلقات اور ساتھ ہی دو احادیث کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں بہتر تطبیق دی گئی ہے تا کہ قاری نہ الجھے۔

یہ کتاب اس وجہ سے بھی ممتاز ہے کہ جابجا الفاظ کو سمجھانے کے لئے اردو کے بعد بین القوسین انگلش اور گجراتی زبان میں اس کی وضاحت کی ہے۔

کتاب کی پہلی جلد میں صاحب ریاض الصالحین کا مختصر تعارف، مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کی لاجواب تقریظ ہے اور اس کے علاوہ کئی اکابرین کی تقاریظ اور دعائیہ

کلمات ہیں۔

کتاب کی کتابت وطباعت کا معیار بھی اچھا ہے۔ اس کی اکثر جلدیں ''ادارۃ الصدیق ڈابھیل گجرات'' اور کچھ جلدیں ''مکتبہ محمودیہ محمودنگر، ڈابھیل، گجرات'' نے شائع کی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب معلمین، متعلمین، واعظین، مقررین اور ہر گھر کی ضرورت ہے کہ وہ اسے پڑھ کر اسلامی سانچہ میں ڈھلے اور اپنی زندگی سنت کے مطابق گزارے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور جن حضرات نے اس علمی مجلس کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے کی کوشش کی اسے بہتر صلہ سے نوازے۔

اسلامی قانون نکاح وطلاق

مؤلف: مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی

اسلام میں نکاح وطلاق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ قوانین اسلامی میں اس موضوع پر مفصل بحث اور اس کے ہر ہر پہلو پر احکامات موجود ہیں، تاہم نکاح وطلاق کے تعلق سے دنیا کے مختلف حصوں میں طرح طرح کی روایت اور عرف وعادت عام ہے جن کی وجہ سے مختلف قسم کی مشکلات درپیش آتی رہتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''اسلامی قانون نکاح وطلاق'' نہ صرف ان مسائل کی رہنمائی کرتی ہے، بلکہ مغربی سماج میں نکاح وطلاق کے تعلق سے جو غلط روایات رائج ہیں ان پر شرعی رہنمائی بھی کرتی ہے۔

نکاح کی اہمیت وفضیلت، نکاح کے اصول وآداب اور نکاح سے متعلق شرعی احکامات نیز طلاق وخلع اور نزاعی امور میں اسلام نے جو قابل قبول حل پیش کیا ہے اس پر مصنف کتاب حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی چیئرمین شرعیہ کونسل ڈیوزبری انگلینڈ نے قرآن وحدیث اور فقہی مآخذ کے حوالے سے تفصیلی بحث پیش کی ہے۔ نکاح میں معیار انتخاب، کفو کی بحث، تعدد ازدواج، طلاق کے اثرات، زن وشوہر کے ایک دوسرے پر حقوق، طلاق کے تعلق سے قوانین

اسلامی کا رخ ومزاج، مطلقات کے مسائل ومشکلات جیسے امور پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس کتاب میں طلاق کے وقوع کی شرائط پر خاصی طویل بحث کی گئی ہے اوراس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ اسلام کس طرح سماج کی تشکیل چاہتا ہےاور خاندانی امور میں کس طرح افراط وتفریط کے بجائے صراط مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے۔

مصنف موصوف نے برطانوی سماج میں درآئی برائیوں اوراس کے منفی نتائج کی بھی نشاندہی کی ہے اورامت اسلامیہ کومغربی تہذیب کی یلغار کوسمجھنے اوراس سے بچنے کی بھی تلقین کی ہے۔مولانا یعقوب اسماعیل منشی نے نہایت عرق ریزی سے اس موضوع پر کام کیا ہے اوراس میں برطانوی سماج کے حوالے سے مسائل کو دیکھا اور پرکھا ہے اوراس سلسلے میں اسلامی ہدایات سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔موصوف ان علماء میں سے ہیں جومغرب کی چمک دمک سے کبھی متاثر نہ ہوئے، بلکہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ کس طرح مغربی ممالک میں آباد مسلمانوں کو اسلامی خطوط پر چلنے کے لیے آمادہ کیا جائے، وہ ایک عرصے سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور وہاں دینی، دعوتی اور علمی وتحقیقی امور انجام دے رہے ہیں۔ان کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے اور خاص طور پر انہوں نے علمی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس تعلق سے ان کی حیثیت انفرادی ہے۔ہم امید کرتے ہیں کہ مولانا یعقوب اسماعیل منشی مدظلہٗ اپنا علمی سفر جاری رکھیں گے اورامت کو رہنمائی ملتی رہے گی۔زیرنظر کتاب کی اہمیت عوام کے لیے بھی ہے اور علما کے لیے بھی، اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ اس سے مسلمانوں کا ہر طبقہ یکساں طور پر مستفید ہوگا۔

برطانیہ واعلیٰ عروض البلاد پر اوقات صبح صادق وشفق کی تحقیق

مصنف: مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی

شریعت مطہرہ کے بنیادی ارکان خمسہ میں نماز کواولیت حاصل ہے۔نماز کی فرضیت کا سبب وقت ہے اور نماز کو وقت کی پابندی سے ادا کرنا ضروری ہے۔خود باری تعالیٰ کاارشاد ہے:إن الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباًموقوتاً (نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے اندر فرض کی گئی ہے) نماز پنجگانہ کے اوقات کے سلسلے میں اس فلکی نظام کے تحت دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ممالک میں اختلاف مسلمہ امر ہے۔ابتداء اسلام سے ہی فقہا نے نماز پنجگانہ خاص طور سے ابتدا اوراس کا انتہاء وقت کے سلسلے میں تحقیق وتفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔دور نبوی میں احکام شرع کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عملی طور پر صحابۂ کرامؓ کے سامنے پیش کرتے رہے، بعد میں جب اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے تو یہاں انہیں اوقات صلوٰۃ کے سلسلے میں نمایاں فرق کا سامنا ہوا۔ظاہر ہے کہ یہ اہم کام ہرکس وناکس کے بس سے باہر ہے۔اس لیے اس عظیم ذمہ داری کو فقہاء شرع نے بحسن وخوبی نبھانے کا اہتمام کیا۔

زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں فاضل مؤلف حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی نے علم ہیئت وفلکیات کے مبادیات، برطانیہ میں اوقات صبح صادق کے بارے میں معروف مفتیان کرام کے فتاویٰ، غیر معتدل الایام علاقوں کے لیے نمازوں کے احکام، غیر معتدل الاوقات علاقوں میں تقدیر کی مختلف صورتوں کے فقہی دلائل، برطانیہ میں صبح صادق وشفق کے چار مختلف اوقات اوران کا جائزہ، حزب العلماء کے مشاہدات، صبح وشفق اوراس کی بنیاد پر مرتب کردہ دونوں ٹائم ٹیبل کا تجزیہ، برطانیہ میں صبح وشفق کے مشاہدات، برطانیہ میں وقت نماز عشا کے بارے میں تحقیق اوراوقات مثل مثلین کی تحقیق جیسے اہم جلی عناوین کے تحت مفصل ومدلل بحث کی ہے۔ یہ کام وقت وحالات کا متقاضی تھا، چنانچہ مؤلف کتاب نے اس کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے یہ علمی وتحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لئے یقیناً وہ قابل ستائش ہیں۔ اللہ پاک ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

تالیفات مرغوب

مؤلف: حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری

علوم شرعیہ کی نشر واشاعت میں سرزمین گجرات کے علماء واکابر کا نمایاں حصہ ہے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور عقائد جیسے اہم موضوعات پر علماء گجرات نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان سے ہر صاحب علم ودانش بخوبی واقف ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ انسان کی اصلاح وفلاح کا دارومدار عقائد پر ہے، اگر کوئی شخص دنیا کے تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کرلے، لیکن اس کے عقیدہ میں کھوٹ ہو تو اس کا سارا عمل رائیگاں سمجھا جائے گا۔ زیر تبصرہ کتاب ''تالیفات مرغوب'' سرزمین گجرات کے مشہور ومعروف عالم دین حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری کی تین کتابوں کا مجموعہ ہے، پہلی کتاب ''توحید الاسلام'' ہے جس میں مقدمہ کتاب میں ضروری تمہیدات کی تین فصلیں اور باب اول میں دو فصلیں ہیں۔ فصل اول میں پچیس دلائل عقلیہ وشواہد نظریہ مسلسل بیان کرنے کے بعد ایک فرضی مناظرہ وجود باری تعالیٰ پر لکھا گیا ہے، فصل دوم میں دس براہین عقلیہ توحید باری پر بالترتیب مرقوم ہیں، جبکہ باب دوم قرآن پاک سے وجود باری

تعالیٰ اور توحید پر دس دلائل نقلیہ عقلی پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں، اخیر میں خاتمہ کے عنوان کے تحت دین حق کا صحیح معیار بتا کر دین اسلام کو حق کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔

دوسری کتاب ''**جمع الاربعین فی تعلیم الدین**'' ہے جس میں دین کے مختلف شعبوں کے احکامات پر مشتمل چالیس صحیح احادیث کا نہایت ہی جامع مجموعہ، آسان ترجمہ مفید و معلومات افزا تشریح کے ساتھ موقع کی مناسبت سے جمع کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے اشعار نے اس مجموعہ کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے، اسے چالیس احادیث کا نام دیا گیا ہے، لیکن شرح حدیث کے دوران فاضل مؤلف نے مزید احادیث کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

تالیفات مرغوب میں شامل تیسری کتاب ''**سفینۃ النجات فی ذکر مناقب السادات**'' ہے اس میں نہایت خوش اسلوبی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے فضائل، خصوصیات بنی فاطمہؓ، حضرات صحابۂ کرامؓ اور صلحائے امت کی نظروں میں اہل بیت کا احترام قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی اکابر اہل بیت کے تفصیلی حالات، نادر حکایات، ان کے کشف وکرامات اور ان کی علمی جلالت شان کو نہایت دلچسپ انداز میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو خود مؤلف کی علمی جلالت شان پر دلالت کرتا ہے، ان تینوں مجموعوں کا نام تالیفات مرغوب رکھا گیا ہے، ہر ایک مجموعہ پر مولانا مرغوب احمد لاجپوری جو مؤلف کتاب کے نبیرہ ہیں، نے وقیع علمی کام کیا ہے۔ اس سے کتاب کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ ایسی کتابیں دین سے وابستہ لوگوں کے لیے بہترین غذا ہیں۔ کتاب کی معنویت پر تو کوئی کلام ہی نہیں کیا جا سکتا، کتاب کی ظاہری آراستگی بھی خوب ہے، کتابت وطباعت بھی معیاری ہے، توقع کی جاتی ہے کہ ارباب علم وفضل کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

❁ ❁ ❁

فقہ السنہ

مؤلف: علامہ شیخ السید سابق علیہ الرحمہ

مترجم: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

'فقہ' ایک عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ ''جاننا'' اور اصلاحی معنیٰ ''قانون'' کے ہیں، قرآن مجید میں قانون کا ایک بہت ہی لطیف انداز میں ذکر آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا تصور قانون کیا تھا۔ ''مثل کلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء'' (اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہے اس کی جڑیں تو زمین میں گڑی ہوئی ہیں، لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں) دوسرے الفاظ میں قانون کی بنیاد بیج جیسی چھوٹی سی چیز کی طرح ہے کہ اس سے جو درخت نکلے گا وہ آسمان تک پھیل جائے گا اور اس کی شاخیں ہر چیز کو ڈھانپ سکیں گی، چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اگر ہم قرآن اور حدیث کو جڑ یا بیج تصور کریں تو اس جڑ یا بیج سے نکلا ہوا درخت اتنا تناور اور اتنا شاخ درشاخ پھیل جاتا ہے کہ انسان کی ہر ضرورت کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور شاخ درشاخ روزانہ

اس درخت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

فقہ اور قانون اسلامی کی ایک بہت ہی معتبر اور مایہ ناز عربی کتاب ''فقہ السنہ'' ہے، جو 3 جلدوں میں 1755 صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں عبادات، معاملات اور حدود وقیاس وغیرہ کے احکام بہت ہی جامع انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا اب تک کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں انگریزی، فارسی، تھائی لینڈی، ترکی اور بنگالی زبان شامل ہیں۔ اس کتاب کی ارباب علم ودانش کے حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی ہے، بطور خاص اخوان المسلمین کے مرشد عام وبانی امام حسن البنا شہیدؒ نے اسے خوب سراہا، یہ کتاب بعض ملکوں کے تعلیمی نصاب میں بھی شامل ہے۔ بہت کم کتابوں کو اس طرح کی مقبولیت ملتی ہے کہ اس کا نام لیتے ہی مصنف کی عظمت اور محبت فوراً ذہن میں آجاتی ہے، اسی طرح مصنف کا نام لیتے ہی اس کی شاہکار کتاب کی طرف ذہن چلا جاتا ہو۔ فقہ السنہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہی احکام کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ان کے دلائل ذکر کرانے کے ساتھ ائمۂ مجتہدین کے دلائل کا موازنہ اور تقابل بھی کیا گیا ہے، جس سے مصنفؒ کی مجتہدانہ شان صاف جھلکتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف بیسویں صدی عیسوی کے مشہور و مایہ ناز فقیہ اور مجتہد علامہ شیخ السید سابق علیہ الرحمہ ہیں، جو مصر کے باصلاحیت فقیہ، باکمال خطیب اور ممتاز پروفیسر اور مجتہد تھے۔ ان کے علمی اور فقہی مضامین ومقالات مختلف رسائل ومجلّات میں بھی شائع ہوتے رہے اور کتابی شکل میں بھی ان کی اشاعت ہوئی۔ ان کی ولادت جنوری 1915 میں ہوئی، 1947 میں عالم اسلام کی عظیم یونیورسٹی جامعہ ازہر قاہرہ سے اسلامی علوم میں عالمیت کی ڈگری حاصل کی۔ سعودی عرب میں بھی کئی یونیورسٹیوں میں متعدد اہم عہدوں پر فائز رہے۔ تحریک اخوان المسلمین میں بھی کافی سرگرم رہے۔ ''فقہ السنہ'' کے علاوہ آپ نے کئی اہم کتابیں بھی لکھی

ہیں۔ آپ کی فقہی خدمات کے اعتراف اور علمی وتربیتی کارناموں کو سراہتے ہوئے جید عالم دین ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے ساتھ مشترکہ طور پر آپ کو عالم اسلام کے سب سے معزز اور عظیم شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شیخ سابق علیہ الرحمہ کی وفات 23/ذی قعدہ 1420ھ مطابق 27/جنوری 2000 میں 85 سال کی عمر میں مصر میں ہوئی۔

زیر نظر کتاب ''فقہ السنہ'' اسی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، جس کی ضخامت 514 صفحات پر مشتمل ہے، المنار پبلشنگ ہاؤس، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب غیر مجلد، عمدہ ورنگین سرورق ہے۔ اس کتاب کے مترجم مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب استاذ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ ہیں۔ مولانا ولی اللہ صاحب بہت ہی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے ایک بہت ہی اہم کتاب کا ترجمہ بہت ہی سادہ، عام فہم زبان اور سہل انداز میں کیا ہے، نہایت محنت وجانفشانی کے ساتھ مصادر ومراجع کا بھی ذکر کیا ہے، اسی طرح جہاں مصنفؒ کی باتوں میں انہیں کچھ پیچیدگی نظر آئی وہاں پر انہوں نے حاشیہ لگادیا ہے نیز قرآن پاک کی آیات اور احادیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔

کتاب میں سب سے پہلے حضرتؒ نے فقہی مسائل کے حل کے سلسلے میں مسلمانوں کی رہنمائی اور اس کی روشنی میں زندگی گزارنے کے لئے چند عمومی ضابطے بیان کئے ہیں۔ جیسے غیر پیش آمدہ مسائل کی چھان بین کی ممانعت، بکثرت سوالات کرنے اور پیچیدہ مسائل سے بچنا، دین میں اختلاف وانتشار سے بچنا اور اختلافی مسائل میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا۔ ''فقہ السنہ'' میں دو ابواب ہیں، ایک کتاب الطہارۃ، دوسرا کتاب الصلاۃ۔ مسائل کو تلاش کرنے کی سہولت کے پیش نظر ان کے تحت ذیلی عناوین لگائے گئے ہیں جن میں ایک مسلمان کی ضرورت کے تقریباً تمام مسائل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ممکن حد تک اختلافی مسائل سے گریز کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''طہارت'' ہے، اس کے تحت سب سے پہلے پانی اور اس کی اقسام کا بیان ہے۔ مثلاً مطلق پانی جیسے سمندر کا پانی، زمزم کا پانی اور وہ پانی جس کا رنگ زیادہ دنوں تک ایک جگہ رہنے کی وجہ سے بدل گیا ہو۔ مستعمل پانی، مخلوط پانی اور نجاست سے آلودہ پانی۔ دوسرا ذیلی عنوان ہے ''نجاست''۔ اس کے تحت نجاست کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً مردار، خون، خنزیر کا گوشت، انسان کا پائخانہ، پیشاب اور قے، ودی، مذی، منی، ایسے جانور جن کا پیشاب اور لید حلال نہیں ہے، جلالہ، شراب اور کتا۔ اس کے بعد پاکی حاصل کرنے کے طریقوں کا بیان ہے، مثلاً کپڑے اور بدن کو پاک کرنے کا طریقہ، زمین کی پاکی کا طریقہ، گھی وغیرہ کی پاکی کا طریقہ، مردہ جانور کی کھال کو پاک کرنے کا طریقہ، آئینہ وغیرہ کی پاکی کا طریقہ اور جوتا کو پاک کرنے کے طریقہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سنن فطرت کا بیان ہے جو کہ 10 ہیں۔ ختنہ کرنا، ناف کے نیچے کے بال کو مونڈنا، بغل کے بال کو اکھاڑنا، ناخن تراشنا، مونچھ چھوٹا کرنا یا بالکل پست کرنا، داڑھی بڑھانا، بڑے بال کا خیال رکھنا اور اسے تیل اور کنگھی کے بغیر نہ چھوڑ دینا، سفید بال کو نہ اکھاڑنا اور اسے باقی رکھنا، سفید بال کو مہندی، سرخ یا زرد رنگ سے رنگنا اور خوشبو لگانا۔ ایک ذیلی عنوان ''وضو'' کے تحت وضو کے فرائض، وضو کی سنتیں، وضو کے مکروہات، نواقض وضو اور جو نواقض وضو نہیں ہیں، وہ چیزیں جن کے لئے وضو ضروری ہیں اور وہ چیزیں جن کے لئے وضو مستحب ہیں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد خفین پر مسح کرنے کا بیان ہے۔ ''غسل'' عنوان کے تحت وہ چیزیں جن سے غسل فرض ہے، مستحب غسل، غسل کے ارکان، غسل کی سنتیں اور عورت کے غسل کے مسائل مذکور ہیں۔ ''تیمّم'' کے بیان میں تیمّم کی مشروعیت، خصوصیت، جواز کے اسباب، تیمّم کا طریقہ، نواقض تیمّم اور جبیرہ وغیرہ پر تیمّم کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حیض، نفاس اور استحاضہ کے مسائل کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔

دوسرا باب ''صلاۃ'' ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت، ترک صلاۃ کا حکم، نماز کے اوقات اور اوقات ممنوعہ کے مسائل ہیں۔ نماز کی شرائط، نماز کی کیفیت، نماز کے فرائض، سنتیں، سنت ونفل، سنت فجر، سنت ظہر، سنت عصر، سنت مغرب، سنت عشاء، سنت غیر مؤکدہ وغیر مؤکدہ، وتر، تہجد، قیام رمضان یا تراویح، صلاۃ چاشت، استخارہ، تسبیح، حاجت، توبہ، کسوف اور استسقاء کے مسائل کو بہت ہی مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سجدۂ تلاوت، سجدۂ شکر اور سجدۂ سہو کو بھی بیان کیا ہے۔ مکروہات صلات، صلات کو باطل کرنے والی چیزیں، صلات سفر، جمع بین الصلاتین، صلات مریض، صلات قضاء اور صلات خوف کے طریقوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''اذان'' کی فضیلت، مشروعیت کا سبب، کیفیت اور اذان کی بدعات بھی مذکور ہیں۔ آخر میں ''جمعہ'' عنوان کے تحت جمعہ کے دن کی فضیلت، جمعہ کے دن اور رات میں کثرت سے دعا کرنے کی فضیلت، سورۂ کہف پڑھنے کا اجر وثواب، جمعہ کی سنتیں، جمعہ کا وقت اور خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کی حرمت وغیرہ کا ذکر ہیں۔ سب سے آخر میں ''صلاۃ عیدین'' کا عنوان ہے جس کے تحت عیدین کی سنتیں، صلاۃ عیدین کا وقت، عید کا خطبہ، عیدین کی مبارکباد دینا، عیدگاہ جانے سے پہلے کچھ تناول فرمانا اور عید سے پہلے اور بعد میں نفل سے متعلق مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کی وقعت واہمیت میں کوئی کلام نہیں ہے، ساتھ میں مترجم موصوف نے بھی بہت ہی دقت نظری اور دیدہ ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے، اس لئے یہ کہنا سوفیصد درست ہے کہ 'فقہ السنہ' نئے دور کے تناظر میں مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اہل علم کے لئے ایک نایاب تحفہ۔

گجرات کی علمی وادبی شخصیات

ناشر: جامعہ علوم الفرقان، جبوسی، گجرات

گجرات کی سرزمین علمی وادبی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ زرخیز رہی ہے، بلکہ مسلمانوں کی اس برصغیر میں آمد کا دروازہ بھی یہی صوبہ رہا ہے۔ ویسے تو ہندوستان میں مسلمان تین بحری اور تین بری راستوں سے داخل ہوئے اور ان تینوں بحری وبری راستوں سے مسلمان آتے تھے، لیکن سب سے پہلے عربوں کا اس برصغیر سے تعلق اسی سرزمین سے شروع ہوا اور مسلمانوں کی پہلی کھیپ یہیں کے ساحلوں پر پہنچی، جس کی طرف قرون اولیٰ سے مسلمانوں کی توجہ رہی اور اسی سرزمین کے ذریعے ہندوستان کے عربوں، بلکہ حجاز مقدس سے تعلق کا نقطۂ آغاز ہوا۔

یہ تاریخی واقعہ بہت مشہور ہے کہ 10 ہجری میں حضرت محمد مصطفی ﷺ کے رحلت فرمانے کے صرف 5 برس بعد حضرت عمر فاروقؓ نے بحرین وعمان کی حکومت پر حضرت عثمان بن العاص الثقفیؓ کو نامزد کیا جن کا شمار صحابہ میں تھا، انہوں نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے بھائی حکم بن العاصؓ کو بحرین کی حکومت پر نامزد کر کے حکم دیا کہ وہ

ہندوستان پر فوج کشی کریں، چناں چہ حضرت حکمؓ نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت منزلیں طے کیں اور اپنی فوج کے ساتھ سب سے پہلے ساحل گجرات پر قدم رکھا اور سب سے پہلے ہندوستان کی سرزمین کا جو خطہ اسلامی علوم ومعارف اور توحید ورسالت سے شرف یاب ہوا وہ گجرات ہے، اس حملے میں وہ مقدس اور پاکباز نفوس شہید ہوئے جو محمد ﷺ کے فیض یافتہ تھے۔ اس کے بعد دوسرا حملہ حضرت حکم بن العاصؓ نے بھروچ پر کیا جس کو عربی کتابوں میں بروج یا بروص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور گندھار میں مسجد کی بنیا د رکھی، یقیناً یہ ہندوستان کی پہلی مسجد ہے۔ چونکہ اس سرزمین کا اسلام کی ابتدا سے ہی خصوصی تعلق رہا، اس لئے کچھ صحابہ اور تابعین نے بھی اس سرزمین کا رخ کیا، عباسی خلیفہ نے 159ھ میں جب یہاں کچھ لوگوں کو بھیجا تو ان میں حضرت ابوبکر ربیع بن صبیح البصری تابعیؒ بھی شامل تھے۔ اسی طرح 93ھ میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ دمشق نے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ بھیجا، وہ سندھ کی مہم سے فارغ ہوتے ہی سیدھے بھروچ پہنچے۔ الغرض مختلف حکمرانوں کے دور میں بلاد عرب سے تاجر، درویش، صوفیاء کرام، سیاح، دعاۃ ومبلغین، فقہاء اور محدثین کی گجرات میں خصوصاً آمد ہوئی اور ان کے ذریعہ اسلام کا تعارف اور اسلامی علوم کا تعارف اس ملک میں ہوا اور حکمرانوں نے بھی اسے اپنا میدان عمل بنایا۔ گجرات کی متعدد ایسی عظیم شخصیات ہیں جو اس برصغیر میں ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، خاص طور پر شیخ علی متقی صاحب کنز العمال کے شاگرد اور خلیفہ مولانا عبدالوہاب جو علامہ شیخ عبدالحقؒ کے مرشد ومربی اور استاذ ہیں ان کا تعلق گجرات کے مشہور شہر بھروچ سے تھا، اسی طرح شیخ علاء الدین علی ابن احمد المہائی، علامہ وجیہ الدین گجراتی اور علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی جیسی عبقری شخصیات ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

زیر نظر کتاب ''گجرات کی علمی وادبی شخصیات'' ان محدثین، مفسرین، فقہاء، ادباء

،صلحاء،قضاۃ،صوفیاء، مصنفین ،مؤلفین اورعلماء کی علمی وادبی خدمات پر جامعہ علوم القرآن ،جمبوسر میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت بتاریخ 8-6 صفر 1431ھ مطابق 24 جنوری 2010ء رابطہ ادب اسلامی کے 28 ویں مذاکرۂ علمی کی مناسبت سے پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ بہت ہی ضخیم اور کل 1080 صفحات پر مشتمل ہے، کتاب مجلد اور سرورق عمدہ ہے، اس بیش قیمت مجموعۂ مقالات کی اشاعت کا بیڑہ ’علامہ محمد بن طاہر پٹنی اکیڈمی بھروچ‘ نے اٹھایا ہے۔

اس کتاب میں گجرات کے مختلف فنون اور شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ رہنے والی شخصیات کے مختلف پہلوؤں پر 48 مقالات پیش کئے گئے ہیں۔اس سے پہلے مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم کا خطبۂ صدارت ہے، جو تقریباً 10 صفحات پر مشتمل ہے، اس میں حضرت نے گجرات کی تاریخ، ادب اسلامی اور حدیث شریف وقرآن مجید کی خدمات کی مماثلت کو بہت ہی شستہ انداز میں بیان کیا ہے، اس کے بعد خطبۂ استقبالیہ کے عنوان سے حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب مہتمم جامعہ علوم القرآن کا 20 صفحات پر مشتمل مقالہ ہے جس میں حضرت نے حدیث مبارکہ ’الدین کلہ ادب ‘‘ کا ذکر فرما کر دین اور ادب کی مناسبت کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اسی طرح سرزمین گجرات کی علمی ،ادبی اور تحقیقی کاوشوں کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا کہ ہر دور میں یہ ’و مثل کلمة طيبة كشجرة طيبة ‘‘ کی طرح ’’ تعطي اكلها كل حين باذن ربها‘‘ کا نقشہ پیش کرتی رہی ہے۔اسی کے ساتھ حضرت نے گجرات سے تعلق رکھنے والے علماء یا کسی بھی طور پر اس سرزمین سے وابستہ عظیم شخصیات کا تذکرہ فرمایا ہے۔اس کے بعد عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سکریٹری اور ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا واضح رشید ندوی صاحب نے سکریٹری رپورٹ پیش کی ہے، جس

میں انہوں نے اب تک عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ہوئے 27 سمیناروں کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

نیز روایتی طریقوں سے ہٹ کر قارئین کی سہولت کے لئے نویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک کے نام سے 6 ابواب قائم کئے گئے ہیں۔سب سے پہلے نویں صدی کی جو عظیم شخصیات ہیں ان کی خدمات پر مقالات ہیں، پہلا مقالہ ’’علامہ ربیع الدین سعدی بصری اور ان کی خدمات‘‘ کے عنوان سے ہے، مقالہ نگار مولانا شجاع الحق صاحب ہیں۔

نویں صدی ہجری کے باب میں 5 مقالات ہیں، ان میں ’’العالم الربانی علامہ علاء الدین الحسن المہائی‘‘، ’’شیخ مخدوم علی مہائمی اور ان کی تفسیر تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان ایک تجزیاتی مطالعہ‘‘ اور ’’شیخ عبداللطیف بن جمال سراج پٹنی‘‘ ہیں۔دسویں صدی باب میں ’’علامہ قطب الدین نہروالی گجراتی مہاجر مکی مختصر حالات وخدمات‘‘، ’’ملک المحدثین علامہ محمد بن طاہر پٹنی گجراتیؒ حیات ،افکار وخدمات‘‘، ’’علامہ محمد بن طاہر پٹنی اور دیگر علماء گجرات اور ان کی خدمات حدیث‘‘، ’’مظفر شاہی دور میں علم حدیث کا ارتقاء‘‘، ’’فخر گجرات محدث اعظم علامہ جلال الدین محمد بن طاہر پٹنی‘‘، ’’علامہ شاہ وجیہ الدین کی علمی ،ادبی فنی خدمات‘‘، ’’مولانا صبغۃ اللہ بھروچیؒ‘‘، ’’محدث کبیر علی متقی، علم وتقویٰ کی نادر مثال‘‘ اور ’’شیخ عبدالمعطی ملیؒ اور ان کی علمی ودینی خدمات‘‘ پر مشتمل مقالات ہیں۔گیارہویں صدی کے باب میں ’’شیخ فی الدین عبدالقادر عیدروس اور ان کا تذکرہ النور السافر‘‘، ’’شیخ مولانا احمد بن سلیمان الکردی الاحمدی آبادیؒ‘‘، ’’حضرت مولانا صدیق بن محمد شریف پٹنی‘‘ اور ’’قاضی عبدالوہاب صاحب اورنگ زیب کے زمانہ کے ایک ممتاز قاضی‘‘ کے عنوان سے مقالے مذکور ہیں۔تیرہویں وچودہویں صدی ہجری کے باب میں ’’حضرت قاضی سید رحمت اللہ

صاحب لاجپوری محدثؒ‘‘، ’’مولانا عبدالحی کفلیتوی سورتیؒ‘‘، ’’عارف باللہ حضرت مولانا مفتی احمد بیمات صاحبؒ‘‘، ’’حضرت مولانا آدم منوبری صاحبؒ اوران کی علمی خدمات‘‘، ’’بلبل گجرات حضرت مولانا احمد اللہ صاحب راندیریؒ‘‘، ’’فقہاء گجرات اوران کی فقہی خدمات‘‘ اورآخر میں ’’علماء گجرات اوران کی علمی وادبی خدمات‘‘ کے عنوان سے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم کا 23 صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی اور تفصیلی مقالہ ہے،جس میں حضرت نے گویا پوری کتاب کا خلاصہ بیان کردیا ہے،کئی شخصیات مثلاً شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ وغیرہ کے حالات مختصراً بیان کئے ہیں، یقیناً اسے اس کتاب کالب لباب کہا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نہایت قیمتی علمی و تاریخی تحفہ ہے،اس کے ذریعے سے اسلامی ہندکی تاریخ کا بھی علم حاصل ہوتا ہے اوران صحابہ،تابعین اور علماء ومحدثین کے احوال کا بھی تفصیلی وتحقیقی علم حاصل ہوتا ہے،جنھوں نے سرزمینِ حجاز یادیگرخطوں سے ہندوستان آکراسلام کی اشاعت وتبلیغ کی خدمت انجام دی،اس کے علاوہ ہندوستان کی سرزمین سے اٹھنے والے ماہرینِ علوم وفنون کی ایک لمبی جماعت کے حالاتِ زندگی سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔جولوگ علم وتحقیق کا ذوق رکھتے ہیں انھیں بھی اس کتاب کاضرورمطالعہ کرنا چاہیے اور جو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے ورود کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں،ان کے لیے بھی یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

تذکرۂ قاریان گجرات

ناشر: جامعۃ القرأت کفلیتہ گجرات

یہ بات مسلم ہے کہ ہرزبان کاایک لہجہ اورانداز ہوتا ہے،جس کی رعایت ضروری ہوتی ہے ورنہ بولنے اور سمجھنے میں فرق ہوجائے گا۔اسی طرح قرآن مجید کوبھی تجوید کے ساتھ ٹھہرٹھہر کر ہرحرف کو اپنے مخرج اور جملہ صفات کے ساتھ اداکرنے کا حکم ہے جسے ’’تجوید‘‘ کہتے ہیں،جیسا کہ آقائے مدنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے’’ان اللّٰہ یحب ان یقرأ القرآن کماانزل‘‘،بلاشبہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم ایسے ہی پڑھا جائے جیسے وہ نازل کیا گیا ہے،اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجوید کی رعایت نہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے’’قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم رب قارء للقرآن والقرآن یلعنہ‘‘ کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پہ خودقرآن لعنت کرتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جوترتیل کے بغیر قرآن مجید پڑھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم کواپنی آواز سے مزین کرو یعنی اچھی آواز میں آدابِ تلاوت کی رعایت کرتے ہوئے تلاوت کرو،خودآپ ﷺ کے کئی صحابہ

ایسے تھے جو قرآن کریم کو نہایت ہی عمدہ آواز و انداز میں تلاوت فرمایا کرتے تھے اور آپ ﷺ بڑے شوق و ذوق کے ساتھ ان کی تلاوت سماعت فرماتے تھے۔

تجوید وقرأت ایک اہم فن ہے اور اس کو حاصل کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر قرآن پاک کی صحیح تلاوت پر قدرت نہیں ہوسکتی۔ تاریخ میں دنیا کی کسی بھی کتاب کے پڑھنے کے طریقے اور طرز ادا کے بارے میں کوئی خاص قسم کی ہدایات نہیں ملتیں، قرآن وہ واحد کتاب ہے کہ صرف اس کے الفاظ کی قرأت اور پڑھنے کے طریقے کے بارے میں مستقل ہدایات ہیں، اس کے متعلق بڑے بڑے قراء عظام اور علماء نے کئی کئی جلدوں میں ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے علمِ قرأت و تجوید ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، دیگر علوم وفنون کے بالمقابل اس فن کو فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس کا تعلق اللہ کی آخری اور محبوب ترین کتاب قرآن کریم سے ہے، لہٰذا اس فن کو حاصل کرنا اور اسے پڑھنا پڑھانا راست طور پر قرآن کریم کو پڑھنا پڑھانا ہے اور جو لوگ قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور اس کے درس وتدریس میں مصروف رہتے ہیں ان کو اللہ کے نبی ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ وہ لوگ امت کے بہترین لوگ ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جو قرآن کریم کو پڑھے اور پڑھائے۔ (بخاری شریف)

زیر نظر کتاب ''تذکرۂ قاریان گجرات'' اسی فن کے ماہرین کے تذکروں پر مشتمل ہے، اس میں ان عظیم قراء اور ماہرین فن تجوید کا ذکر ہے، جن کا تعلق کسی بھی طور سے تجوید وقرأت کے تعلق سے مشہور و مایہ ناز سرزمین صوبہ گجرات سے ہے۔ صوبہ گجرات ہمیشہ علماء کرام اور قراء عظام کا ملجا و ماویٰ رہا ہے، بہت سے ممتاز واکابر علماء وقراء نے گجرات کو اپنا مسکن بنایا ہے، گجرات کی سرزمین خاص طور پر تجوید وقرأت کے حوالے سے کافی شہرت

کی حامل ہے۔ اس سرزمین پہ بڑے بڑے قراء پیدا ہوئے اور باہر سے بھی آغاز اسلام کے بعد سے ہی نامور قراء عظام یہاں تشریف لائے اور یہاں بود و باش اختیار کی۔ یہ کتاب انہی قراء عظام کے تذکروں پر مشتمل ہے، اس کی دو ضخیم جلدیں ہیں، پہلی جلد 672 صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ دوسری جلد 624 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو جامعۃ القرأت کفلیتہ کے تجوید وقرأت کے اساتذہ نے ترتیب دیا ہے، اس کی اشاعت بھی جامعۃ القرأت مولانا عبدالحی نگر، مقام پوسٹ کفلیتہ ضلع سورت (گجرات) سے ہوئی ہے۔ کتاب مجلد، رنگین، عمدہ سرورق اور کاغذ دیدہ زیب ہے۔

''تذکرۂ قاریان گجرات'' 11/12 جمادی الاول 1433ھ مطابق 4/5 اپریل 2012ء کو جامعۃ القرأت کفلیتہ میں ''گجرات میں تجوید وقرأت کی خدمات'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار میں ملک و بیرون ملک سے تشریف لانے والے علماء اور قراء عظام کی جانب سے پیش کئے گئے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں علم تجوید اور اس سے متعلق کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ یوں تو آئے دن دنیا میں مختلف عناوین پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ شاید پہلا موقع تھا کہ جب تجوید و قرأت پر اتنا عظیم الشان سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔

اس عظیم الشان خدمت جلیلہ کے لئے قاری اسماعیل بسم اللہ صاحب بانی ومہتمم جامعۃ القرأت کفلیتہ گجرات دلی وقلبی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا اور علم تجوید کے عالم افق پر چمکنے والی افریقہ، پناما، امریکہ اور برطانیہ جیسے دور دراز ممالک کی عظیم ہستیوں کو ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ علماء کے تاثرات، تقریظات، مکتوبات اور تہنیتی پیغامات نے اس کتاب کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں، بطور خاص شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا مکتوب جس میں انہوں نے اس سیمینار کے انعقاد پہ مبارکباد اور

کامیاب ہونے کی دعا کی ہے۔نیز یہ سمینار استاذ الاساتذہ اور صدر القراء حضرت مولانا قاری احمد اللہ صاحب مدظلہ العالی کی سرپرستی میں منعقد ہوا جو خود فن تجوید کا بڑا نام ہے۔

''تذکرۂ قاریان گجرات'' میں سب سے پہلے سمینار کی مجالس اربعہ کی تفصیلی رپورٹ، خطبۂ صدارت اور استقبالیہ پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد فن تجوید وقرأت سے متعلق 24 علمی و تحقیق مقالات پیش کئے گئے ہیں،سب سے پہلے استاذ الاساتذہ قاری احمد اللہ صاحب کا تقریباً 11 صفحات پر مشتمل تحقیقی اور مدلل مقالہ بعنوان ''ارکان قرأت صحیحہ'' ہے۔جس میں حضرت نے وحی کی حقیقت اور اس کا مفہوم،نزول کے اعتبار سے وحی کی اقسام،قرأت اور تلاوت کے اعتبار سے وحی کی قسمیں،حاملین قرآن کی فضیلت اور قرآن کریم سے اشتغال کی اہمیت،صحابۂ کرامؓ اور تابعین کی جماعت میں مشائخ قرأت،کلمات قرآنیہ کی اقسام،سبعۃ احرف کی نوعیتیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن مجید کی تدوین وتالیف پر قرآن وحدیث اور اکابر ومشائخ کی عبارت کی روشنی میں بہت ہی مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

حضرت مولانا قاری احمد اللہ قاسمی صاحب کے علاوہ ہندوستان کے کئی علماء اور قراء عظام کے مقالات ہیں،جن میں راقم الحروف کے علاوہ سابق صدر القراء دارالعلوم دیوبند قاری ابوالحسن اعظمی صاحب،قاری علاء الدین صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند اور مفتی احمد یارخان صاحب خانپوری دامت برکاتہم حضرت مولانا مفتی عباس بسم اللہ مدظلہ العالی شیخ الحدیث جامعۃ القرآن کفلیتہ مفتی جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل اور مفتی دبیر عالم قاسمی استاد صاحب جامعۃ القرآن کفلیتہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

''تذکرۂ قاریان گجرات'' کی جلد دوم میں مقالات کو فن تجوید کے مختلف پہلوؤں پر پیش کرتے ہوئے قارئین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا باب مقالات برائے خدمات تجوید،دوسرا باب مقالات برائے تعارف وخدمات مدارس وجامعات،تیسرا باب مقالات برائے رسم عثمانی۔آخر میں چند کلمات دعائیہ اور جامعۃ القرأت کفلیتہ کی مطبوعات کا ذکر ہے۔

یہ مجموعہ تجوید وقرأت اور مدارس کے طلبہ اور اساتذہ اور ان لوگوں کے لئے جو فن تجوید وقرأت اور اس کی تاریخ کی واقفیت چاہتے ہیں ان کے لئے ایک بیش بہا تحفہ اور نایاب ذخیرہ ہے۔جس میں علم تجوید کے اصول ومبادی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اس کی تاریخ کو بھی بیان کیا گیا ہے،اسی طرح اس کے قیمتی علمی وتحقیقی مقالات سے ہندوستان میں علمِ تجوید کی خدمات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے، ان اداروں کے بارے میں بھی جانکاری ملتی ہے جو قرآن کریم کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں اور فن تجوید کو فروغ دے رہے ہیں،مختلف زمانوں میں پائی جانے والی ان عظیم اور بابرکت شخصیات کی زندگیوں اور ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے،جنھوں نے اپنی زندگی قرآن مقدس کی خدمت میں بسر کی اور علم تجوید کو بلندیوں اور مقبولیت کی نئی منزلوں پر پہنچا دیا۔جو لوگ علمِ تجوید سے اشتغال رکھتے ہیں، انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے،اس کے علاوہ علمائے کرام اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی یہ کتاب دلچسپ ہے،خاص طور پر جو لوگ تحقیقی مزاج رکھتے ہیں اور انھیں قرآن اور قرآنی علوم سے انسیت ہے ان کے لیے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے،علم تجوید کے حوالے سے اردو زبان میں اتنی جامع کتاب شاید ہی مل پائے۔

۞ ۞ ۞

صدائے دل

مؤلف: حضرت مولانا عبداللہ اسمٰعیل صاحب کاپودروی
(رئیس دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات)

خطابت ووعظ صرف فن ہی نہیں ہے، بلکہ اسلام میں خطابت اعلیٰ درجہ کی عبادت، عظیم الشان سعادت اور انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے۔ علامہ ابن رشد اپنی کتاب ''تلخیص الخطابہ'' میں فرماتے ہیں: ''خطابت نام ہے اس فن کا جس کی مدد سے اپنی بات دوسروں سے کہی اور منوائی جاسکتی ہے''۔ گویا اس سے مراد وہ بیان ہے جو دلوں کو گرمانے، کسی بات کو واضح کرنے، کسی امر کا یقین دلانے، اثر پیدا کرنے، ترغیب دینے یا سامعین کو کسی خاص عمل یا روش پر آمادہ کرنے میں مدد دے۔

خطابت بے حس قوموں کو چونکاتی ہے، مردہ جذبات کو جگاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، دکھ میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے، گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے، یہ عوام کے جمگھٹوں کو پرکیف، غم ومسرت کی محفلوں کو کامیاب اور دینی وسیاسی جلسوں کو پرلطف بنادیتی ہے۔

ایک قادر الکلام خطیب اور واعظ مختصر وقت میں ہزاروں، لاکھوں افراد تک اپنا پیغام پہنچاسکتا ہے اور اپنے عقائد ونظریات ان تک منتقل کرسکتا ہے۔

علامہ جاحظ کے نزدیک خطابت بیان وبلاغت کی ہی ایک صورت ہے اور ارسطو نے اسے اثر انگیزی کا فن قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں خطابت کو مہتم بالشان اور قابل فخر فن کی حیثیت حاصل رہی اور قوم وملت کے قائدین اور امراء کے لئے فصیح اللسان خطیب ہونا لازمی امر تھا، بلکہ نازیوں کی شکست کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب اس بات کو قرار دیا جاتا ہے کہ ان کا قائد خطابت سے نابلد تھا۔

چونکہ خطابت وسائلِ دعوت وتبلیغ میں سے ایک اہم، زوداثر اور بالغ التاثیر ذریعہ ہے اس لئے اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت، امت کی رہنمائی اور تبلیغ کے لئے اس فن پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، بلکہ اسلام میں اسے بعض عبادات کا حصہ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ خطبۂ جمعہ، عیدین کا خطبہ اور خطبۂ حج وغیرہ۔

اسی عظیم الشان سلسلے کی ایک اہم کڑی زیرِنظر کتاب ''صدائے دل'' مفکر ملت اور برصغیر کی معروف شخصیت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم رئیس جامعہ دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، سورت، گجرات کے مواعظ اور افادات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے مگر میرے پیشِ نظر جلد دوم ہے، جس کی ضخامت 280 صفحات ہے، یہ کتاب مجلس معارف کاپودرا سے شائع ہوئی ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ وراثت نبوی کے محافظ اور مبلغ دین ہیں، آپ نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور اس کی ودیعت کردہ ملکۂ خطابت سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے پرزور انداز میں دعوت حق کو پیش کیا، لوگوں کے قلوب واذہان کو کتاب وسنت سے منور کیا اور لوگوں نے آپ کی سخنوری،

سحر بیانی اور انقلاب آفریں خطابت کا کھلے عام اعتراف بھی کیا ہے۔آپ کی ولادت 28 دسمبر 1933ء مطابق 11 رمضان 1352ھ میں ملک برما (میانمار) کے شہر ہیہو میں ہوئی، آپ کے والد جو ایک تاجر تھے، 1935ء میں ہندوستان کے شہر کاپودرہ منتقل ہوگئے۔آپ صوبہ گجرات کے ایک معروف ومشہور ادارے جامعہ فلاح دارین کے سابق مہتمم ہیں، صوبہ گجرات کے کئی تعلیمی اداروں میں تقریباً 30 سال تک طلبہ اور عوام کے درمیان تعلیمی، انتظامی، تربیتی اور اصلاحی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد آپ 1994 میں ٹورنٹو، کناڈا منتقل ہوگئے، وہاں جمعیۃ علماء کناڈا کے قیام میں اہم کردار ادا کیا اور مختلف مساجد اور مجالس میں دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کے فرائض انجام دیتے رہے۔آپ عربی اور اردو کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، کئی کتابوں کا آپ نے ترجمہ بھی کیا ہے، آپ دینی علوم پر مہارت کے ساتھ وقت کی ضروریات اور ملی مسائل پر بھی گہری بصیرت، مختلف النوع دینی لٹریچر کا وسیع مطالعہ، تعلیم وتربیت کے میدان میں طویل خدمات اور دنیا کے مختلف ممالک میں علمی اور تبلیغی اسفار کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔آپ کو حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ اور مفتی محمود الحسنؒ سے مسلسلات کی اجازت حاصل ہے۔شیخ ابوالفتاح ابوغدہ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے نیز جامعہ ازہر کے مبعوث شیخ محمود عبدالوہابؒ سے خصوصی طور پر عربی زبان سیکھی ہے۔شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنیؒ سے بھی آپ کا بیعت کا خصوصی تعلق رہا۔

''صدائے دل'' حضرت مولانا عبداللہ صاحب دامت برکاتہم کاپودروی کے ٹورنٹو (کناڈا) کے مواعظ اور تقاریر کا مجموعہ ہے، ان تقریروں کو ریکارڈنگ کے ذریعے سے ترتیب دیا گیا ہے، یہ مواعظ دین وشریعت، ان کے دینی اخلاص، تزکیۂ نفس، تجربہ ومشاہدہ، علمی تبحر اور اصلاح امت کی پرخلوص کوشش کا بولتا ہوا ثبوت ہیں۔کتاب میں ''ایک پیام علماء برطانیہ

کے نام''، ''تقویٰ: انسان کی قدر وقیمت کا پیمانہ''، ''صفت احسان''، ''مشعل راہ''، ''حکیم الامتؒ کی حکمت بھری باتیں''، ''طلبۂ کرام کو چند زریں نصیحتیں'' اور دیگر اہم ایمان افروز ابواب پر مشتمل مواعظ شامل ہیں۔ان میں قرآن وحدیث کے ساتھ حالات حاضرہ کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، ملکی حالات اور عالمی مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے، آپ کا طرز خطابت، انداز بیان اور حسن ادا لوگوں کو دعوت فکر اور غور وخوض پر مجبور کرتا ہے۔

اپنے ایک خطاب ''ایک پیام علماء برطانیہ کے نام'' میں حضرت فرماتے ہیں کہ علماء کرام کو اپنے آپ کو وقت اور حالات کے مطابق ڈھالنا چاہئے، پوری بیداری کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لینا چاہئے اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر حکمت عملی طے کرنی چاہئے جس طرح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا رومیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کو بدل دیا۔اپنی اس بات کو ایک مثال سے ثابت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبداللہ صاحب نے اپنے سامنے پیش آئے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنیؒ کا واقعہ بیان فرمایا ہے جب 1947ء میں ملک کی تقسیم ہوئی ہم بہت مایوسی کے عالم میں تھے، ہم لوگ تو ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے لیکن میرے سامنے ابھی تک وہ نقشہ ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں ایسا نہیں تھا کہ وہاں کا مسلمان گھبرایا ہوا اور سراسیمہ نہ ہو اور وہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ اب اس ملک میں ہم کبھی بھی نہیں رہ سکتے اور ہمیں یہاں سے ہجرت کر کے جانا ہے، میں نے دیکھا کہ حضرت مدنیؒ جو دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے اور جن کا ایک خانقاہی نظام تھا، وہ تصوف میں اپنے زمانے کے بہت بڑے شیخ تھے لیکن انہوں نے خانقاہ کو بھی ایک طرف رکھا، انہوں نے دارالحدیث کے درس کو بھی تھوڑے دن کے لیے موقوف کیا اور پورے ہندوستان کا سفر کیا، ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ گاؤں کا سفر فرماتے اور رات کو

دودو بجے تک جلسوں میں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں جاکر مسلمانوں سے کہتے کہ مسلمانو! تمہارے اوپر یہ کیسی آفت طاری ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے، تم اللہ کے اوپر بھروسہ کیوں نہیں کرتے؟ تمہارے اندر صبر کا مادہ نہیں ہے؟۔ایسی تقریر حضرتؒ نے کشمیر سے کنیا کماری تک کی، طویل دورے کئے تاکہ امت مسلمہ کو ہمت آئے اور ان کے قدم یہاں جم جائیں، اگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کوشش نہ ہوتی تو امت کا بہت بڑا نقصان ہونے والا تھا، اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کے اندر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی اور ان کے قدم یہاں جم گئے۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے سمجھانے کا انداز بڑا شیریں اور دل نشیں ہے، بڑی سادگی اور عام فہم زبان میں کسی بھی بات کو سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی بات براہ راست دل پر اثر کرتی ہے۔انسان کی قدروقیمت کے پیمانہ کو سمجھاتے ہوئے حضرت کہتے ہیں ’’ہر زمانے میں انسان کی قدروقیمت ناپی جاتی رہی ہے، جس دور میں دنیا والوں نے انسان کی قدروقیمت اور اس کا ویلیو مال ودولت بنایا تو وہ فتنہ وفساد کا دور ہے، پوری تاریخ انسانی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جب بھی اس سرزمین پر انسانوں کی قدروقیمت مال ودولت سے ناپی گئی تو فتنے فساد پھیلتے رہے اور جب انسان کی قدروقیمت کا اندازہ اس کے تقویٰ اور اخلاق سے لگایا گیا تو دنیا میں امن وسکون کا دور دورہ رہا‘‘۔

’صدائے دل‘ فن خطابت کے شائقین کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔سرورق عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کے فائدے کو عام کرے اور حضرت دامت برکاتہم کے سائے کو تادیر قائم رکھے۔(آمین)

افکار پریشاں

مؤلف: حضرت مولانا عبداللہ اسمٰعیل کاپودروی

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی مشہور عالم دین اور نامور صاحب قلم ہیں، آپ کے قلم میں دریا کی روانی، بلا کی طغیانی اور بے پناہ سلاسلت ہے، جس موضوع پر بھی آپ لکھتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں، انتہائی صاف ستھری اور شیریں زبان استعمال کرتے ہیں، سلجھے ہوئے انداز میں قلم کو جنبش دیتے ہیں، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی باتیں لکھتے ہیں، تحقیقاتی اور معلوماتی باتیں کرتے ہیں، اسلوب انتہائی سادہ، پرکشش اور دلآویز ہوتا ہے، درد انگیز، فکر انگیز اور معلومات کا خزانہ ہوتا ہے، مضامین چشم کشا، بصیرت افروز اور دعوت کے درد سموئے ہوئے ہوتے ہیں، علمی موشگافیوں اور تحقیقی نکتہ سنجیوں کا بھی خوب پتہ چلتا ہے، آپ کے مضامین کی یہی نمایاں خصوصیات ہیں جن کی بنا پر دنیا بھر میں آپ کے مضامین اور رشحات قلم کو اہمیت اور فضیلت حاصل ہے، بے شمار قارئین آپ کے پائے جاتے ہیں اور جہاں آپ کا مضمون شائع ہوتا ہے اس ماہنامے اور میگزین کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے، آپ کی وجہ سے اس کی ریڈرشپ میں اضافہ ہوجاتا ہے، آپ کے ایسے

ہی مضامین کا مجموعہ افکار پریشاں ہے جو آپ کے مختلف علمی، ادبی، اصلاحی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور تحقیقاتی مضامین کا مجموعہ ہے جومختلف عناوین پر مشتمل ہے اور انتہائی بیش قیمت ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کوحق تعالیٰ شانہ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے، وہ قدیم وجدید کا سنگم ہیں، ہر مکتبۂ فکر کی اچھائیوں اوران کی خوبیوں کا انتہائی عالی ظرفی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں، انہوں نے قدیم سرمایہ کوبھی کھنگالا ہے، جدید تہذیب کوبھی قریب سے دیکھا ہے، مغربی تمدن سے بھی انہیں واسطہ پڑا ہے اور مشرقی ثقافت تو ان کے گھر کی اصیل ہے، آپ نے جدید نظریات اور نئے کتب خانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے، علم وتحقیق کے میدان میں بھی نئے افق تلاش کئے ہیں، سیاست سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں، سماجی مسائل پر بھی آپ کی مکمل نگاہ ہے، حالات حاضرہ اور زمانے کی سیاست پر نبض رکھتے ہیں، زبان وبیان کی وسعت و رعنائی میں بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔

’افکار پریشاں‘ مختلف مواقع پر لکھے گئے اور مختلف اخبارات ومیگزین میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ ہے چناں چہ صاحب مضمون خود ایک جگہ رقم طراز ہیں:

’’ناچیز نہ تو مصنف ہے نہ محقق البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون کسی خاص مناسبت اور کسی خاص موقع پر سمجھ میں آتا ہے، تو چند سطریں لکھ کر ماہانہ یا ہفتہ واری رسائل میں ارسال کردیتا ہوں، پیش نظر مضامین ملک کے معروف مجلّات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، بعض مخلص احباب اور عزیزوں کی یہ رائے ہوئی کہ ان متفرق مضامین کو کتابی شکل میں شائع کردیا جائے تاکہ یہ مجموعہ محفوظ ہوجائے‘‘۔

’’افکار پریشاں‘‘ ایک حسین اور خوبصورت علمی گلدستہ ہے، دینی، سماجی اور شخصی

مضامین زیادہ تر یہاں موجود ہیں اور سب کے سب انتہائی محققانہ اور مفید ہیں ’افکار پریشاں‘ کا مطالعہ قارئین کیلئے بہت ہی مفید اور ثمرآور ثابت ہوگا، نیز یہ کتاب عوام وخواص دونوں کیلئے بے شمار فوائد سے خالی نہیں، خاص طور پر طلبۂ مدارس اور عصری اداروں میں زیر تعلیم ان طلبہ کے لئے زیادہ کارآمد ہے جن کومضمون نگاری کا شوق ہے۔

مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین سے استفادہ کرکے وہ بھی اپنی صلاحیت کونکھار سکتے ہیں۔

بکھرے موتی

مؤلف: حضرت مولانا محمد یونس عمر پالن پوری

حضرت مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں سے ایک ہیں جنہیں مطالعہ کا بیحد شوق تھا، شب وروز کے اکثر لمحات میں وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے، حضرت مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ صرف مطالعہ کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ دوران مطالعہ اہم باتوں کو اپنی کاپی میں نوٹ کرنے کا اہتمام فرماتے تھے، مطالعہ کے دوران جو بھی بات آپ کو اہم اور بیش قیمت لگتی اسے نوٹ فرما لیتے تھے۔

حضرت مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری کو مطالعہ کا یہ شوق دراصل اپنے والد گرامی مولانا محمد عمر پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملا تھا، جن لوگوں نے مولانا کو دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مطالعہ کے دوران حضرت پر استغراق کی کیفیت طاری ہوتی اور ہمہ تن کتاب کی جانب متوجہ ہوتے، تفسیر کا حضرت کو انتہائی ذوق تھا۔ مولانا عثمان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ اب کتب حدیث کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں قرآن کریم ایسا گہرا سمندر ہے کہ اس میں غوطے کھاتے جاؤ اور موتیاں نکالتے

جاؤ، وہ موتیاں نکلتی رہتی ہیں، قرآن کریم کے سمندر میں غوطے کھانے سے فرصت نہیں مل رہی ہے کہ حدیث کے سمندر میں غوطے کھاؤں۔

ایک جگہ اور مولانا عثمان صاحب یوں لکھتے ہیں کہ مطالعہ اور کتب بینی کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ نظام الدین میں بندہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ کی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں، پلنگ پر بیٹھتے ہوئے رو دیئے اور ان کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے مصنفین کو جزائے خیر عطا فرمائے، انہوں نے کتنی محنت سے یہ کتابیں لکھی ہیں اور آج صرف ان کا پڑھنا مشکل ہو رہا ہے، لیکن مولوی عثمان! ان کو بے کار نہ سمجھنا کہ خواہ مخواہ کی اتنی کتابیں لکھ دیں اور پھر فرمایا کہ دل میں بھی یہ بات نہ لانا بلکہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کتابوں کی ایک ایک سطر اور ایک ایک مسئلہ وجز کو انسانی زندگیوں میں زندہ کردے گا اور کر رہا ہے اور پھر فرمایا مجھے جینے اور زندہ رہنے کی تمنا صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں ان سب کتابوں کو ایک مرتبہ پڑھ ڈالوں۔

مطالعہ کا یہی ذوق وشوق اور انہماک حضرت مولانا یونس صاحب کی شخصیت میں بھی تھا، جماعت کی ذمہ داری، دیگر ضروری کاموں کے باوجود اپنے مطالعہ کے خصوصیت کے ساتھ وقت نکالتے تھے اور دوران مطالعہ پیش آنے والی اہم باتوں کو خصوصیت کے ساتھ لکھ لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا محمد عثمان صاحب کراچی کو جنہوں نے حضرت سے تعلق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کاپی طلب کرلی اور وہاں موجود تمام حاصل مطالعہ مواد کو کتابی شکل میں پیش کردیا جو اب ''بکھرے موتی'' کے نام سے عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ کتاب کے مرتب مولانا محمد عثمان کراچی خود ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا محمد یونس صاحب کی اس کاپی کو دیکھا تو اس میں کتب کے حوالوں کے ساتھ بہت مفید اور اہم مضامین تھے جن کو جمع کرنا ان کے ذوق کی نشانی ہے، بندہ نے عرض کیا کہ اس کو چھپوادیا جائے تو بہتر ہوگا، مولانا منع کرتے رہے کہ یہ تو اپنی ذاتی یادداشت کیلئے لکھا ہے لیکن بندہ نے اصرار کیا کہ اگر اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچ جائے تو کیا حرج ہے اور یہ ہمارے اکابر کا معمول چلا آرہا ہے۔ کشکول، زریں خزانے وغیرہ کے نام سے وہ اپنا عرق مطالعہ چھپواتے رہے ہیں۔ الحمدللہ ان کے والد صاحب سے تعلق کی وجہ سے بھی انہوں نے میری عاجزانہ درخواست کو قبول کرلیا اور کاپی مجھے دے دی، یہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جس میں باہمی ربط تلاش نہ کیا جائے، جیسے جیسے کوئی مفید باتیں سامنے آتی رہیں وہ جمع کرتے رہے''۔

بکھرے موتی قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، قصص وحکایات، سیرت نبویؐ، احوال صحابہؓ، حکایات اولیاء، واقعات بزرگان دین، فضائل اعمال، اعمال صالحہ کی ترغیب سمیت بہت سے موضوعات پر مشتمل ہے، تقریباً ہر طرح کے مضامین یہاں موجود ہیں۔ کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی موضوع پر انتہائی مختصر مضمون یہاں موجود ہے، مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ باتیں جو ہزاروں صفحات کی روگردانی کرکے بھی نہیں مل پاتی ہیں، دسیوں لائبریریوں کی خاک چھاننے کے باوجود بھی ایک انسان ان تمام باتوں کا احاطہ نہیں کرپاتا ہے وہ تمام ہیرے اور قیمتی جواہرات اس بکھرے موتی میں موجود ہیں اور ایک علم دوست اور مطالعہ کا شوق وذوق رکھنے والے کو تمام چیزوں سے بے نیاز کرسکتی ہے۔

بکھرے موتی کل چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک جلد بیش بہا موتیوں کا خزانہ ہے، علم کا سمندر ہے، سماجی اصلاحات پر تفصیلی مضامین موجود ہیں، نماز روزہ اور احکام

شریعت پر عمل کرنے کی مکمل ترغیب اس کتاب سے ملتی ہے، بزرگان دین اور سلف صالحین کے واقعات جابجا یہاں مذکور ہیں، ان کتابوں کو پڑھ کر شریعت پر عمل پیرا ہونے، احکام شریعت کو دل سے لگانے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے، دلوں میں خوف خدا پیدا ہوتا ہے، عبادات پر دل کی آمادگی بڑھتی ہے، اللہ تبارک وتعالی کے احکامات کو بجالانے کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔

بکھرے موتی حضرت مولانا محمد یونس صاحب کے صرف مطالعہ کا عرق نہیں بلکہ حضرت کی پوری زندگی کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والے حضرات کیلئے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی ضروری اور مفید ہے۔

دارالمصنفین کے سوسال

مؤلف: صفات عالم

دارالمصنفین کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین اور انتہائی اہم اداروں میں ہوتا ہے، برصغیر کے مسلمانوں کی علمی، فکری، سماجی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ میں دارالمصنفین کا کردار ناقابل فراموش ہے، تحقیق وتصنیف اور ترتیب وتالیف کی دنیا میں اس ادارے کو پورے خطے میں نمایاں امتیاز حاصل ہے۔نومبر 1914 میں اس ادارے کا قیام عمل میں آیا تھا جس نے اپنا سوسالہ سفر مکمل کرلیا ہے اور آج بھی اپنے مشن کی جانب مکمل عزم وحوصلہ کے ساتھ رواں دواں ہے۔

دارالمصنفین ہندوستان کے نامور ادیب، محقق اور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی کی سب سے آخری اور عظیم الشان یادگار ہے، یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، اپنی علمی شناخت اور منفرد طرز وانداز کے سبب یہ ملک وملت کے مایہ ناز علمی وتحقیقی ادارہ کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں مشہور ہے، بلکہ اس کی شہرت کا دائرہ مغربی ممالک، مشرق وسطیٰ سمیت پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ علامہ شبلی کے ذہن میں پہلی مرتبہ 1910 میں آیا اور انہوں نے اس سلسلہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاس دہلی کی سہ سالہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ قومی اور مذہبی ضروریات کیلئے جس طرح مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمانوں کے علوم، ان کے مذہب اور تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم وفنون کا سرمایہ موجود ہو، جس سے مسلمان مصنفین اور اہل قلم استفادہ کرسکیں، پھر اسی جلسہ میں ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت کے عنوان پر علامہ مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے تقریر کی جس میں انہوں نے دارالمصنفین کے قیام کی تجویز کا اعادہ کیا۔

علامہ شبلی نے اس تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مکمل کوشش کی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا مسعود علی ندوی سے اس سلسلے میں مراسلت کے ذریعہ رابطہ کیا، ان بزرگوں نے مختلف جگہوں کی تجویز پیش کی اور بالآخر اعظم گڑھ پر سبھی حضرات کا اتفاق ہوگیا، اگست 1914 میں مولانا اسحاق صاحب کی وفات کے بعد علامہ شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولانا مسعود علی ندوی تشریف لائے اور یہیں دارالمصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ادارہ کا پورا علمی وتعلیمی خاکہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی زندگی میں مرتب کردیا تھا، اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ اس ادارے کیلئے وقف کردیا، رشتہ داروں سے بھی اس کیلئے زمینیں دلوائیں، اپنی اور احباب کی سات الماریوں پر مشتمل کتابیں مہیا کیں، مہمان خانہ اور دیگر چیزوں کی تعمیر کرائی۔

18 نومبر 1914 میں علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد آپ کے تلامذہ میں سے مولانا حمید الدین مظاہری نے علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی سمیت متعدد اہل علم کے ساتھ میٹنگ طلب کرکے اس کے بچے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور انہی خطوط پر دارالمصنفین کے کاز کو آگے بڑھایا جن کی

مرنے سے قبل علامہ شبلی نعمانی وصیت کر گئے تھے۔

دارالمصنفین کے قیام کا پس منظر اور اس کی مختصر تاریخ ہے، اس ادارے کے قیام کو اب سو سال پورے ہو چکے ہیں، سو سالہ سفر میں دارالمصنفین نے بے شمار کارنامے انجام دیئے ہیں، یہاں سے شائع ہزاروں علمی اور تحقیقی کتابوں نے اہل علم کی تشنگی بجھائی ہے، دنیا بھر کی لائبریریوں کی زینت بنی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے 1965 میں صد سالہ تقریب کے موقع پر اس ادارے کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا تھا:

”علامہ شبلی نعمانی اور دارالمصنفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ وسیر، تاریخ ہند اور تاریخ وتنقید ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خصوصیت میں نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان وبیان کی سلاست کے علاوہ ان سے بھی زیادہ نمایاں قلب ونظر کی وسعت ہے، اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں بھی اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم، یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب دکھائے ہیں وہاں فصل کے بیمہ بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا گیا ہے اور قصہ سکندر رو دارا ”سنانے پر“ حکایت مہر ووفا“ بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔“

دارالمصنفین کی علمی وتحقیقی خدمات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس نے مولانا شبلی کے پیش نظر مقاصد کو سامنے رکھ کر اپنی منزلیں طے کیں، اس نے اپنی کتابوں اور ترجموں میں دین ودنیا دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی، مشرقی زبانوں سے آگاہ طبقہ کیلئے جدید علوم اور جدید خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کیا اور تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دور حاضر کے جدید اصول کے تقاضوں کے مطابق اسلامی علوم وآداب پیش کئے، ان دونوں ضرورتوں کی تکمیل کیلئے دونوں قسم کی تالیفات وتراجم شائع کئے، اب تک دارالمصنفین نے سیرت، ادب، تاریخ ہند، تاریخ اسلام، فلسفہ وکلام، نفسیات، قرآنیات،

عصری مسائل، تذکرہ وسوانح، سفرنامے اور مختلف علوم وفنون پر بڑا لٹریچر پیش کیا ہے۔

دارالمصنفین کے سو سال مکمل ہونے پر جناب صفات عالم اصلاحی صاحب نے ایک جامع کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام ”دارالمصنفین کے سو سال“ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ادارہ کے قیام کا پس منظر، بانی، تمام ذمہ داران اور اس سے وابستہ رہنے والی تمام شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، علاوہ ازیں اس ادارے سے انجام پانے والے کاموں کا تذکرہ اور 1965 میں منائی گئی صد سالہ تقریب کے تعلق سے اہم باتوں اور واقعات کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

پیش لفظ میں صفات اصلاحی صاحب خود یوں رقم طراز ہیں:

”دارالمصنفین کی گزشتہ تاریخ، گوناگوں خدمات اور تصنیفی کارناموں کی تاریخ اس انداز سے مرتب کر دی جائے کہ اس میں ادارے کے بانی، صدور، نظما، مہتممین، رفقاء، اراکین، اعزازی رفقاء، خصوصی محسنین والیہ سلطان جہاں بیگم، نواب سر مزمل اللہ خاں، نواب میر عثمان علی اور مولانا کوثر نیازی (پاکستان) کے قدرے مفصل اور شعبہ جات دارالمصنفین اور اس سے وابستہ خدمت گزاروں، مناظرین، کتب خانہ، کاتبین، پریس ودفتر، کتب خانہ کے عملہ کے ساتھ ساتھ مالیوں، چوکیداروں اور توسیعی خطبات، مطبوعات ومسودات، دارالمصنفین جو اب تک شائع نہ ہو سکے کی نشان دہی بھی کی جائے، ان سپاس ناموں کا بھی ذکر کیا جائے جو دارالمصنفین میں اہم اور بڑی شخصیتوں کو پیش کئے گئے۔“

الحمدللہ صفات عالم کی یہ کتاب دارالمصنفین کی پوری تاریخ کا احاطہ کرتی ہے اور اس ادارے کی خدمات کے حوالے سے یہاں مکمل باتیں آگئی ہیں۔ خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب ورق نے کتاب کی خوبصورتی میں مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔

نقوش بزرگاں

مؤلف: مولانا عبدالقیوم راجکوٹی

حضرت مولانا محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد سعید بزرگ صاحب رحمۃ اللہ علیہا جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، یہ دونوں حضرات جید عالم دین اور علماء دیوبند کے نیر تاباں تھے، ان کا فیض صرف گجرات نہیں بلکہ ہندوستان اور دیگر ملکوں تک پھیلا ہوا تھا، ملک وملت کی تعمیر وترقی، انسانیت کی فلاح وبہبود اور دین وشریعت کی ترویج واشاعت میں آپ کا نمایاں کردار ہے، آپ کی خدمات کا دائرہ گجرات سمیت دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے اور عوام وخواص دونوں میں ان بزرگوں کو نمایاں مقبولیت حاصل ہے۔

حضرت مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنی خدمات، اوصاف وکمالات کی بنا پر محتاج تعارف نہیں ہے، لیکن وقت کی دبیز چادر ہر چیز پر پردہ ڈال دیتی ہے، بے شمار اولیاء اللہ وبزرگان دین اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے پیوندزمین ہوکر طاق نسیان کی نذر ہوگئے، آج نہ ان کے نام سے کوئی واقف ہے اور نہ ہی تاریخ ان کے وجود کی خبر دیتی ہے، لیکن حضرت مولانا محمد احمد بزرگ کی شخصیت آج بھی زندہ وتابندہ ہے اور اپنی گوناگوں

خصوصیات کے سبب ہزاروں دلوں میں بستے ہیں، آپ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے آخری مرید، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے شاگرد وخادم خاص، حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں اور آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سعید بزرگ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے تلمیذ خاص حضرت مولا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی کے شاگرد اور شیخ الاسلام حضرت مولا حسین احمد مدنی کے فیض یافتہ ہیں۔

نقوش بزرگاں انہی دونوں بزرگوں کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے جس میں مصنف کتاب حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب راجکوٹی معین مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات نے حضرت مولانا محمد احمد بزرگ سملکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد سعید بزرگ سملکی رحمۃ اللہ علیہ کو خوبصورت خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

چنانچہ کتاب کے مرتب پیش گفتار میں لکھتے ہیں:

”مولانا احمد بزرگ کے انتقال کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس طویل عرصہ میں ان کی خدمات اور حیات وسوانح پر جو کچھ لکھا جانا چاہئے جامعہ کی طرف سے تاریخ جامعہ میں چند اوراق کے سوا کچھ نہ لکھا گیا، جن حضرات نے مولانا کی محنت اور جدوجہد اور خدمات کا بسر وچشم مشاہدہ کیا ہے وہ رخصت ہوچکے ہیں یا ہو رہے ہیں، مولانا احمد بزرگ کے احسانات وخدمات کا تعارف تو درکنار نئی نسل خود مولانا کے نام وکام سے بھی ناواقف ہوتی جارہی ہے“۔

دوسری جگہ مرتب موصوف مولانا کی حیات وخدمات پر کچھ نہ لکھے جانے کا شکوہ کچھ یوں کرتے ہیں:

''جامعہ ہی کے ایک نامور فاضل اور میرے رفیق درس مولانا مرغوب احمد لاجپوری نے اپنے جد امجد حضرت مولانا احمد صاحب لاجپوری کے ایک مضمون جو مولانا بزرگ کی وفات کے دو ماہ بعد لکھا تھا کی شرح فرما کر''حیات احمد''نامی کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں مختصر حالات کی صورت میں مولانا بزرگ کا ایک مرقع پیش فرمایا ہے، تاہم مولانا احمد بزرگ کی حیات وخدمات کے کئی گوشے باقی تھے جو ہنوز گوشہ خموش تھے، ان کو منصۂ شہود پر لانا اہالیان جامعہ پر ایک واجبی حق تھا، میں سمجھتا ہوں کہ مولانا بزرگ کے وصال کے بعد ان کے پسماندگان یا متعلقین میں سے کسی نے معمولی توجہ بھی کر لی ہوتی تو بہت کچھ سوانحی مواد جمع ہو جاتا، نیز مولانا بزرگ جو تین سال تک مفتیٔ اعظم رنگون رہ چکے ہیں بعد میں چند سال جامعہ ڈابھیل کے دارالافتاء میں فتاویٰ نویسی کی خدمات بھی انجام دی ہیں، ان کے فتاویٰ کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہوتی تو مسائل شرعیہ کا بہت بڑا ذخیرہ امت کیلئے کارآمد ثابت ہوتا اخیر! قصہ پارینہ ہو چکا ہے، اس پر کف افسوس ملنے کے بجائے جو کچھ اب ہوا ہے اسے غنیمت سمجھا جائے۔''

مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سعید بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات پر یہ تفصیلی سوانحی کتاب ہے، مرتب کے مضامین کے علاوہ اس میں مشاہیر علماء کے مضامین، رشحات قلم اور تاثرات بھی شامل ہیں، جلد اول مکمل سوانحی خاکہ ہے اور جلد ثانی میں مختلف شخصیات کے مضامین ومقالات شامل ہیں، کتاب جامع، مواد سے بھرپور، خاکہ نگاری کے اصول پر منطبق اور تمام تر محاسن سے لبریز ہے، خوبصورت اشاعت اور دیدہ زیب کتابت اس کی چاشنی اور دلکشی کو مزید دوبالا کرتی ہے۔

احکام رمضان المبارک

مؤلف: صاحبزادہ ڈاکٹر قاری عبداللہ الباسط محمد

رمضان المبارک اسلامی تقویم کا نواں مہینہ ہے۔ اللہ نے اس ماہ مبارک کی اپنی طرف خاص نسبت فرمائی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ''**رمضان شهر الله**''رمضان اللہ کا مہینہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مبارک مہینے سے رب ذوالجلال کا خصوصی تعلق ہے جس کی وجہ سے یہ مبارک مہینہ دوسرے مہینوں سے ممتاز ہے۔ اس ماہ سے خصوصی تعلق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ اس مبارک ماہ میں اس درجہ نازل ہوتی ہیں گویا موسلا دھار بارش کی طرح برستی رہتی ہیں۔ اس مہینے میں انسان کے اعمال کی تطہیر اور نیتوں کا تزکیہ ہوتا ہے، یہ مہینہ انسان کا رشتہ اپنے خالق ومالک کے ساتھ جوڑتا اور اسے پختہ کرتا ہے۔ رمضان کا مہینہ ان گنت فضائل اور برکتوں اور اللہ کی خاص رحمتوں کے نزول کا مہینہ ہے۔

اس مبارک مہینے کے کچھ خاص مسائل واحکام بھی ہیں، کچھ مسائل روزے سے تعلق رکھتے ہیں، تو کچھ تراویح واعتکاف سے اور بہت سے احکام وہ ہیں جو اس مبارک

ومقدس مہینے کے احترام وتکریم کے پیش نظر ہیں۔ زیر نظر کتاب ''احکام رمضان المبارک'' اسی پہلو کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ اس میں رمضان المبارک کے فضائل اور روزہ کی اہمیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اوراعتکاف، شب قدر اور تراویح وغیرہ کا بھی تفصیلاً ذکر کیا گیاہے۔کتاب کل 784 صفحات پر مشتمل ہے، پیپر بائنڈنگ ،رنگین سرورق کے ساتھ کاغذوطباعت نہایت ہی معیاری اورعمدہ ہے، اس کتاب کی اشاعت '' مرکز عبداللہ بن مسعودلتحفیظ القرآن الکریم حی العزیزیہ جدہ'' سے ہوئی ہے۔

کتاب کے مصنف صاحبزادہ ڈاکٹر قاری عبداللہ الباسط محمد ہیں، جوجدہ میں مقیم ہیں اورجدہ کی معروف مسجد ''مسجد شعبی''میں نائب امام کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ،مصنف علمی وفقہی ذوق رکھنے والے جید عالمِ دین ہیں۔

کتاب کی علمی افادیت واہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر نابغۂ روزگار اور بلند پایہ شخصیات نے تقاریظ اوراپنی آراء پیش کی ہیں اور کھلے لفظوں میں مصنف کی اس عظیم کاوش کو سراہاہے۔ان شخصیات میں فقیہ العصر حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم ،خطیب بے مثال محدث عصر حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند اور حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پاکستان) شامل ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں رمضان المبارک کے فضائل ومسائل، روزہ، تلاوت وعبادات، نماز وتر، نماز تراویح، تہجد، لیلۃ القدر، اعتکاف، نفلی روزے، صدقۂ فطر، عیدالفطر اور رویت ہلال وغیرہ کے مسائل پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔کتاب کی ابتدا رمضان المبارک

کے چاند دیکھنے کے حکم سے کی گئی ہے۔اس میں رویت ہلال کے مسائل، دعاء، یوم الشک کا روزہ، استقبال رمضان کا طریقہ، رمضان کی تیاری، فضیلت رمضان، صبر کی تربیت، دیگر مذاہب اور زمانۂ جاہلیت میں روزے کا تصور، ماہ رمضان میں روزہ فرض ہونے، رات میں روزہ مقرر نہ ہونے اور سال میں ایک دفعہ روزوں کے فرض ہونے کی وجوہات، روزہ داروں کی فضیلت، روزے پہ اجر عظیم کا وعدہ، روزہ داروں کے لئے جنت کے باب الریان سے داخلے کی بشارت، اعضا وجوارح کا روزہ، روزہ اور قرآن میں مناسبت، روزے کے طبی فوائد، روزے میں اعتدال کے ساتھ کھانے کی تلقین، امت محمدیہؐ کے روزوں کی خصوصیات، بلاعذر روزہ توڑنے کی سزا، روزوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی، روزہ کی فرضیت اوراس کی شرائط، فرضیت صوم کے مراحل، سحری کی فضیلت اوراس کا حکم، افطار کا حکم اوراس کی دعائیں، بچوں کو روزہ رکھنے کی ترغیب، روزہ کی نیت، نواقض روزہ، مکروہات روزہ، قضاروزوں کا حکم، روزہ کا فدیہ اور روزہ سے متعلق عورتوں کے ضروری مسائل مدلل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد وتر کے وجوب، اس کے احکام ومسائل، ایک سلام سے تین رکعت، قبل الرکوع دعاء قنوت اور دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین کو احادیث وصحابہؓ کے اقوال کی روشنی میں ثبوت اور دعاء قنوت کے آہستہ پڑھنے کی فضیلت کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا گیا ہے۔

کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اختلافی مسائل پر بہت ہی تفصیل آمیز گفتگو کی ہے، ائمۂ اربعہ اور دیگر فقہا وعلما کے اقوال کو جمع کیا ہے، نیز تمام کے دلائل کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہیں۔

قاری صاحب نے نماز تراویح کی 20 رکعات کے بارے میں بھی بہت مفصل اور مدلل گفتگو کی ہے۔قرآن وحدیث، آثار صحابہؓ، حرم مکی، مسجد نبویؐ اور تراویح کی چودہ سالہ

تاریخ کے حوالے کے ساتھ سعودی عرب کے سابق مفتی عام شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز سابق سابق مفتی عام مملکت سعودی عربیہ کے استاذ سماحۃ الشیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ (1311-1389ھ) استاذ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز سابق مفتی عام مملکت سعودی عربیہ اور سپریم کورٹ کے صدر جج کی رائے بھی نقل کی ہے جو 20 رکعات تراویح کے قائل تھے۔اس کے علاوہ اس کی تائید میں الشیخ احمد بن عبدالعزیز الحمدان مدیر مرکز الدعوۃ والارشاد (جدہ) کی کتاب سے بھی حوالہ نقل کیا گیا ہے۔نیز شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بھی 29 رکعات کا ہی نقل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ مفتی عام مملکت سعودی عربیہ کا ایک تفصیلی انٹرویو بھی ہے جس میں انہوں نے کھلے لفظوں میں 20 رکعات تراویح کو بدعت قرار دینے والوں کی سخت الفاظ میں مذمت اور 20 کو سنت قرار دیا ہے۔

الغرض یہ ضخیم کتاب رمضان المبارک اور اس میں مخصوص عبادتوں کے مسائل و احکام کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔خاص بات اس کتاب کی یہ ہے کہ ہر مسئلے کو بحوالہ اور معتبر کتابوں سے استدلال کر کے بیان کیا گیا ہے۔فقہ کی بڑی بڑی کتابوں میں رمضان اور روزہ، تراویح واعتکاف اور شب قدر وغیرہ کے مسائل مرقوم ہیں، مگر چوں کہ ان کتابوں میں دوسرے پہلوؤں پر بھی مسائل واحکام کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے، اس لیے ان سے استفادہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ایسے میں جو لوگ خاص رمضان المبارک اور اس کے تعلق سے خاص احکام و مسائل سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔الحمدللہ اس کتاب کے مطالعے سے ان تمام امور کا بخوبی اور تشفی بخش علم حاصل ہوتا ہے جن کے اہل علم متلاشی ہوتے ہیں۔

ریاض الصالحین

مترجم: حضرت مولانا محمد ادریس صاحب

قرآن کریم دین الٰہی کی آخری اور مکمل کتاب ہے، جو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مبلغ اور معلم بنا کر مبعوث کیا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کتاب مقدس کو اول سے آخر تک لوگوں کو سنایا، لکھوایا، یاد کرایا اور بخوبی سمجھایا اور خود اس کے جملہ احکام وتعلیمات پر عمل پیرا ہو کر امت کو دکھایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ حقیقت میں قرآن مجید کی قولی اور عملی تفسیر ہے اور آپ ﷺ کے ان ہی اقوال، اعمال اور احوال کا نام حدیث ہے۔

پہلی صدی سے ہی احادیث کی تدوین وتالیف کا آغاز کر دیا گیا تھا، فن حدیث کی بہت ہی مایہ ناز اور اہم کتابیں ترتیب دی گئیں، ان ہی فن حدیث کی معتبر کتابوں میں سے ایک زیر نظر کتاب ’’ریاض الصالحین‘‘ کا اردو ترجمہ ہے، جو کہ حدیث کی مقبول وممتاز کتاب مانی جاتی ہے۔ریاض الصالحین کے مصنف شیخ الاسلام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی علیہ الرحمہ ہیں۔ساتویں صدی ہجری کے بلند پایہ علماء میں شمار امام نوویؒ عظیم

المرتبت محدثین میں سے ہیں، جنھوں نے حفاظت واشاعت حدیث کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔''ریاض الصالحین'' بھی آپ کا ہی ایک بلند پایہ علمی شاہکار ہے جس سے لاتعداد لوگوں نے علم کا نور حاصل کیا پھر اس کے بے شمار تشریحات وتراجم ہوئے، اردو میں بھی اس کے کئی تراجم ہوئے اور علوم نبوت کے پیاسے اس سے سیراب ہوتے رہے۔اس کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کے کئی اہم اداروں میں درس نظامی میں شامل نصاب بھی ہے۔

ریاض الصالحین کے مترجم حضرت مولانا محمد ادریس صاحب ہیں، جنھوں نے بڑی ہی جانفشانی اور عرق ریزی سے اس کام کو انجام دیا ہے۔مولانا نے اپنی کتاب کے اندر احادیث مبارکہ کے ترجمے پر صرف اکتفا نہیں کیا، بلکہ تشریحات، نکات اور فوائد کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ویسے تو اس کتاب کے اردو زبان میں کئی ترجمے ہوئے ہیں، لیکن یہ کتاب ان تمام کتابوں میں ممتاز اور ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔مولانا نے اس کتاب کو معنوی اعتبار سے ایک شاہکار بنانے کے لئے کئی اہم چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ ترجمۃ الباب کو اس کے تحت مذکورہ آیات واحادیث سے منطبق کرنے جیسے مشکل مسئلے کو حل کرنے کے لئے ترجمۃ الباب کی از روئے لغت اور از روئے اصلاح شریعت تشریح کی ہے، ہر عنوان کی مکمل تشریح کی ہے اور اس باب سے احادیث کے تعلق اور مناسبت کو واضح کیا ہے، نیز ان کو ذہن نشیں کرنے کی غرض سے ذیلی عنوانات بھی قائم کیا ہے۔احادیث کے متعدد اجزا میں سے کون سا جز مذکور ترجمۃ الباب سے متعلق ہے اس کی اس کتاب میں نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ طویل احادیث میں متعدد ذیلی عنوانات قائم کیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو یہ احساس ہو سکے کہ ہر حصہ ایک مستقل مضمون پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے اندر 18 ابواب ہیں۔پہلا باب اخلاص ونیت کے بیان میں

ہے، کیوں کہ تمام عبادات کی قبولیت کا تمام تر مدار صرف اخلاص اور نیت کی موجودگی پر ہے۔دوسرا باب توبہ کے بیان میں ہے، جس کے تحت گناہ اور توبہ کی قسمیں اور شرطیں، توبہ کا حکم اور قبول توبہ کے متعلق تفصیلات مذکور ہیں۔تیسرا باب صبر کے بیان میں ہے، جس میں قرآنی آیات میں صبر سے متعلق احکامات اور احادیث کی روشنی میں تشریحات مذکور ہیں۔ چوتھا باب صدق کے بیان میں ہے۔پانچویں باب میں مراقبہ، ایمان، اسلام، احسان اور علامات قیامت کا بیان ہے۔چھٹے باب میں تقویٰ کا بیان ہے، جس کے تحت تقویٰ کے لفظی اور شرعی معنیٰ میں فرق، تقویٰ کے مختلف مراحل ومدارج مذکور ہیں۔ساتویں باب میں یقین وتوکل کا بیان ہے، جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں توکل کا مرتبہ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں بے مثل توکل کے واقعات مذکور ہیں۔آٹھواں باب استقامت کے بیان میں ہے، جس میں استقامت کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ، استقامت کے فوائد اور اہمیت سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ موجود ہیں۔نواں باب تفکر کے بیان میں ہے، جس میں تفکر کی حقیقت، اس کے عبادت ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث سے، تفکر کا حاصل ونتیجہ اور اس سے متعلقہ دوسرے امور مذکور ہیں۔دسویں باب سے آخر تک قرآنی آیات اور مختلف موضوعات سے متعلق احادیث اور ان کی تشریح مذکور ہے۔

اس کتاب سے اعتقادی وشرعی مسائل میں احادیث کے ذریعے رہنمائی تو حاصل ہوتی ہی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ مختلف ابواب وعناوین کے تحت اخلاقی وروحانی مسائل کے تعلق سے بھی قیمتی احادیث کا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔امام نوویؒ خود علم حدیث کے ایک بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ احسان وسلوک کے اعلیٰ مقام پر فائز ولیِ کامل تھے، اسی وجہ سے جہاں انھوں نے حدیث کی امہاتِ کتب کی تشریح وتوضیح کا فریضہ

انجام دیا ہے، وہیں ریاض الصالحین جیسی عظیم ترین کتاب بھی مرتب کی ہے، یہ کتاب انسان کی زندگی میں عملی انقلاب برپا کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے، یہ کتاب شروع ہی سے حدیث کے نصابِ درس میں بھی شامل ہے اور ہندوستان کے درجاتِ علیا وفضیلت کے بیشتر مدارس میں بھی یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے، مرتب نے احادیث کے انتخاب میں یہ بھی ملحوظ رکھا ہے کہ حتی الامکان مشہور ومرفوع اور صحیح احادیث نقل کی جائیں، حوالے بھی تمام احادیث کے مذکور ہیں اور احادیث کی مناسبت سے عناوین لگائے گئے ہیں۔ مترجم نے ریاض الصالحین کی افادیت کو عام کرنے کے لیے اس کے ترجمے کا بہتر اور قابلِ تعریف قدم اٹھایا ہے، اس کی وجہ سے یہ سہولت ہوگئی ہے کہ جو لوگ صرف اردو زبان جانتے ہیں اور عربی نہیں جانتے، وہ بھی اس سے خاطر خواہ طریقے پر فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کتاب کے مصنف حضرت علامہ شیخ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف نوویؒ اور مترجم مولانا محمد ادریس کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کے عربی ایڈیشن کی طرح ترجمے کو بھی بے پناہ مقبولیتوں سے نوازے۔ (آمین)

تجلیاتِ قدسیہ

مصنف: مفتی محمد ثمین اشرف قاسمی

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''**وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ**'' کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر مہر لگادی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال مستند اور خدائے تعالیٰ کی ذات سے مربوط ہیں۔ چاہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت اللہ کی طرف کی ہو یا نہ کی ہو وہ اللہ کی طرف سے ہی وحی شدہ ہیں، لیکن احادیث کی تدوین وتالیف کے دور میں اصول واصلاحات وضع کیے گئے تو اس میں یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ حدیث کس کی طرف منسوب ہے، اس وقت حدیث کی اقسام کی گئیں، ان ہی اقسام میں ایک ''حدیث قدسی'' بھی ہے۔

''حدیث قدسی'' کہتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ الہام، خواب یا بواسطہ جبرئیل علیہ السلام بیان کیا ہو، کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یعنی اس کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کے بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے، ان کو احادیثِ الٰہیہ اور احادیث ربانیہ بھی کہتے ہیں، اسی نسبت کی

وجہ سے ان کا مقام احادیث نبویہ سے بڑھا ہوا ہے۔

احادیث قدسیہ کو مستقل جمع کرنے کا کام بہت سے محدثین نے انجام دیا لیکن اپنے زمانے کے مایہ ناز عالم اور محدث علامہ ابوعبدالرحمٰن عصام الدین الصبابطی علیہ الرحمہ نے سابقہ تمام کتابوں سے زیادہ جامع ترین ’’جامع الاحادیث القدسیہ‘‘ کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب بڑی جامع ہے اور مطبوع کتب حدیث میں موجود تمام احادیث قدسیہ اس میں مذکور ہیں، جو کہ 3 جلدوں میں ہے، اس کے اندر 1150 احادیث کو کتب حدیث کے حوالے کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب ’’تجلیات قدسیہ‘‘ اسی ’’جامع الاحادیث القدسیہ‘‘ کا اردو ترجمہ ہے، جو کہ 6 جلدوں پر مشتمل ہے، کتاب کی جلد اور کاغذ بہت ہی عمدہ اور خوبصورت ہے، یہ کتاب ابراہیم لائبریری، مادھو پور سلطانپور ضلع سیتامڑھی بہار انڈیا سے شائع ہوئی ہے۔

تجلیات قدسیہ کے مؤلف حضرت مولانا مفتی محمد ثمین اشرف قاسمی صاحب دامت برکاتہم ہیں، جو کہ ہندوستان کے ایک مایہ ناز عالم دین، زہد وتقویٰ میں بلند مقام پر فائز، ان کو علم حدیث سے خصوصی مناسبت ہے، آپ سچے عاشق رسولؐ ہیں۔ مفتی صاحب کو تصوف وسلوک کی کئی مشہور شخصیات مثلاً پیر طریقت حکیم محمد اختر صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی اور خلیفہ نقشبندیہ کے امین حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی عمت فیوضہم سے خلافت بھی مل چکی ہے۔ ان عظیم شخصیات کی توجہات وخلافت نے ان کے اندر علم وعمل کو ایسی جلا بخشی ہے اور ایسی مقبولیت اور محبوبیت عطا کی ہے جو کہ بہت ہی کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ حضرت مفتی فی الوقت دبئی میں تحریری اور تقریری دونوں طریقوں سے اشاعت حدیث ودین اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی مفتی صاحب کئی مفید کتابیں لکھ چکے ہیں، جیسے ’’احکام ومسائل‘‘ اور ’’علامات

ایمان‘‘ وغیرہ خاص طور پر اسی موضوع پر ’’حق جل مجدہٗ کی باتیں‘‘ کہ ’’الاتحافات السنیہ‘‘ کا ترجمہ اور تشریح بھی ہے، شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہے۔

’’تجلیات قدسیہ‘‘ کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا اشارہ خود منجانب اللہ ہوا ہے، جیسا کہ خود مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ خواب میں حضرت فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے دیدار سے اس کتاب کے لکھنے کا اشارہ ملا۔ نیز اس کتاب میں ملک وبیرون ملک کی دینی، تعلیمی اور روحانی شخصیات وبزرگان دین کی دعاؤں، تاثرات اور خیالات نے اس کتاب میں چار چاند لگانے کا کام کیا ہے۔

مفتی ثمین اشرف صاحب نے عام لوگوں اور طالبان علوم نبوت کے فائدے کو پیش نظر رکھتے ہوئے احادیث قدسیہ کا ترجمہ انتہائی سہل اور سلیس زبان میں کیا ہے، ساتھ میں تشریحات قرآن وحدیث اور اسلاف کے اقوال کی روشنی میں بہت ہی مفصل اور جامع گفتگو کی ہے اور فوائد ونکات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ احادیث کے ساتھ حوالے اور صحیح وضعیف کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز توحید وایمان کے بیان سے ہے جس میں 189 احادیث قدسیہ مذکور ہیں، اس کے بعد نماز، معراج، وضو، علم غیب، جنت، جمعہ، صدقہ و خیرات اور روزہ وغیرہ کا بیان ہے۔

احادیثِ قدسیہ کی فنی اعتبار سے یہ اہمیت ہے کہ اس میں حدیث کی نسبت صحابی سے ہوتے ہوئے، نبی اکرم ﷺ کے واسطے سے اللہ رب العزت تک پہنچتی ہے اور دوسری خصوصیت ان احادیث کی یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے جو پیغامات دیے جاتے ہیں، جو احکام بیان کیے جاتے ہیں وہ نہایت ہی تاکیدی ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن احادیثِ قدسیہ میں اللہ کے نبی ﷺ نے بعض اعمال کی فضیلتیں بیان کی ہیں اور ان پر مرتب ہونے والے بے شمار کا ذکر فرمایا ہے ان اعمال کی بھی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ احادیثِ قدسیہ

حدیثوں کی ضخیم کتابوں کا ہی حصہ ہیں، بعد کے ادوار میں ماہرین حدیث نے ایسی حدیثوں کوجمع کرنے اوران کی تشریح وتوضیح کا مبارک سلسلہ شروع کیا، چنانچہ عربی زبان میں ایسے متعدد مجموعہ ہائے احادیث مرتب کیے جاچکے ہیں۔اردوزبان میں حضرت مفتی ثمین اشرف صاحب نے تجلیاتِ قدسیہ کومرتب فرما کرایک بڑاعلمی کارنامہ انجام دیا ہے۔دوسرے یہ کہ انھوں نے ان حدیثوں کا اردوزبان میں ترجمہ وتشریح بھی کردیا ہے،اس سے اردوداں حلقے کے لیےان احادیثِ مبارکہ سے مستفید ہونا آسان ہوگیا ہے۔مفتی صاحب ایک جید عالمِ دین ہیں اورعلمِ حدیث سے انھیں خاص اشتغال ہے،اس لیے انھوں نے احادیثِ قدسیہ کی ترتیب میں بڑی دیدہ ریزی اوربصیرت مندی کا مظاہرہ کیا ہےاوراحادیث کوان کے متعلقہ مضامین کی مناسبت سے الگ الگ ابواب وعناوین کے تحت نقل کیا ہےاور پھر اس کے بعدان کاترجمہ اور پھرتشریح پیش کی ہے۔اس لئے یہ کتاب دینی وعلمی حلقوں کے لئے بے حدمفید ہے،اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی اس خدمت کوشرف قبولیت سےنوازے۔(آمین)

اسعادالقاری

بشرح صحیح البخاری

مصنف:تقریرمولاناعبداللہ صاحب

افادات

جامع المعقول والمنقول حضرت اقدس مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم،بانی ورئیس جامعہ مظہرسعادت ہانسوٹ، گجرات

گجرات کا شماردنیا کے ان خطوں میں ہوتا ہے جہاں اول مرحلہ میں حدیث کا درس شروع ہوا اورمحدثین نے اس سرزمین کودرس حدیث کی آماجگاہ بنایا۔گجرات کے بارے میں معتبرتاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہے کہ وہاں متعددصحابۂ کرامؓ کی تشریف آوری ہوئی ہے۔اس کے علاوہ خلافت راشدہ کے دور میں محدثین کی ایک جماعت نے بھی اس سرزمین کوتشریف آوری کا شرف بخشا تھا۔چناں چہ قاضی اطہرمبارکپوری ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

’’محدثین کا یہ خاندان بلیمان سے عرب پہنچا،اس زمانہ میں سندھ کی عمل داری

میں تھا، یہ خاندان پہلے بحران یمن میں آباد ہوا، پھر کسی غزوہ میں گرفتار ہوکر یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئے اس لئے مولا عمر اور مولا علی کہلاتے ہیں، آل بلیمان میں متعدد اہل علم، رواۃ محدثین اور اہل علم وفن گزرے ہیں''

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جس طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے محض تین سال بعد صحابۂ کرامؓ کا پہلا قافلہ ہندوستان کے صوبہ گجرات میں آکر خیمہ زن ہوا تھا، اسی طرح اس سرزمین کو یہ شرف بھی حاصل ہے، حدیث کے جامع اور مرتب بھی گجرات میں قیام پذیر تھے، عالم اسلام کی عظیم شخصیت حدیث پاک کے اولین مصنف محدث ربیع بن صبیح بصری رضی اللہ عنہ کے قدوم میمنت سے اسے سرفراز ہونے کا موقع ملا ہے۔

یہ ابتدائی صدی کے واقعات ہیں جس میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ محدثین کا ایک قافلہ اس سرزمین میں موجود تھا، عرصہ دراز گزر جانے کے بعد اس سرزمین میں علم حدیث کی خدمات کا سلسلہ باقی ہے، بخاری شریف کی سب سے پہلی شرح یہیں لکھی گئی، حالیہ دنوں میں کئی ایسے نامور محدثین ہیں جن کا تعلق اسی سرزمین سے ہے، ایک ایسے ہی نامور محدث جامع المعقول والمنقول حضرت اقدس مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم ہیں جن کے درس حدیث سے صرف گجرات نہیں بلکہ پوری علمی دنیا معطر ہو رہی ہے۔

صوبہ گجرات میں تقریباً چالیس سے زائد ایسے ادارے ہیں جہاں دورۂ حدیث شریف کی تعلیم دی جاتی ہے ان میں ایک اہم ادارہ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ ہے جو اپنی تعلیم، حسن انتظام، قرآن مقدس کی نمایاں خدمات اور ٹھوس صلاحیت کے حامل رجال کی تیاری کے حوالے سے اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے، اس ادارے میں 15 دسمبر 2003 میں حضرت مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے ہاتھوں درس

حدیث کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد بخاری شریف کا درس حضرت مولانا عبداللہ صاحب رئیس جامعہ سے متعلق کیا گیا۔

مولانا عبداللہ صاحب عظیم اوصاف کے حامل، فقہ اسلامی کے رمز شناس، حدیث پاک میں گہرائی و گیرائی رکھنے والے، تفسیر میں مہارت تامہ کے حامل عالم دین شمار ہوتے ہیں۔ علم حدیث سے آپ کی مناسبت، وسعت مطالعہ اور غزارت علم کی وجہ سے آپ کا درس بخاری امتیازی شان کا حامل ہوا کرتا ہے، آپ کے درس میں نص حدیث، مفہوم حدیث، مدارک اجتہاد، فقہ بخاری، ابواب وتراجم اور غریب حدیث پر سیر حاصل بحث کرنے کے ساتھ شروح وحواشی اور متعلقہ بحث پر مکمل بصیرت سے روشنی ڈالی جاتی ہے، آپ اپنے درس میں بخاری شریف اور حدیث سے متعلق تمام کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، شاگردوں کے سامنے علم حدیث کا سمندر بہا دیتے ہیں، آپ سے درس بخاری کا سبق پڑھنے والے طلبہ نے آپ کے اسباق کو نوٹ کرنا شروع کر دیا تقریباً پانچ سالوں تک طلبہ نے حضرت کی تقریر لکھنے کا اہتمام کیا۔

آپ کے درس کی نمایاں خصوصیت کی وجہ سے بارہا یہ درخواست کی گئی کہ آپ کی تقریر کو بعض طلبہ نے نوٹ کیا ہے اسے اگر اشاعت کے مرحلے سے گزار دیا جائے اور زیور طبع سے آراستہ کر دیا جائے تو افادۂ عام ہو جائے گا اور ملت اسلامیہ کی ایک بڑی تعداد آپ کے علم سے استفادہ کرنے کے قابل ہوگی لیکن آپ کی کسر نفسی راہ میں حائل رہی اور یہ کام نہیں ہو سکا۔ بعد میں جامعہ کے شعبۂ نشر واشاعت نے ازخود اس جانب توجہ دی، جامعہ کے ایک استاذ مولانا مشتاق احمد قاسمی بستوی کو حضرت کی تقریر مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی چناں چہ انہوں نے اپنا وقت فارغ کر کے محنت ولگن کے ساتھ اس کتاب پر کام کرنا شروع کر دیا، طلبہ کے نوٹ کو از سر نو مرتب کرنا شروع کیا، ازخود حضرت کے

درس میں شریک ہونے کا اہتمام کیا اور کئی سالوں کی محنت کے بعد حضرت رئیس جامعہ مفتی عبداللہ صاحب کے درس بخاری کی تقریر یکجا مرتب ہوکر اسعاد القاری کے نام سے منظر عام پر آئی۔

اسعاد القاری تین جلدوں پر مشتمل بخاری کی عظیم ترین شروحات میں شامل ہے، انتہائی اختصار کے ساتھ حدیث فہمی اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے، صاحب افادہ کی تقریر دل کو لگتی ہے اور مشکل ترین حدیث کا مطلب بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسعاد القاری اپنے زبان وبیان کے لحاظ سے عوام وخواص دونوں کیلئے یکساں مقبول ہے اور اس کا مطالعہ طلبہ، اساتذہ کے ساتھ عام آدمی کیلئے بھی مفید ہے۔

باب ششم

خطبات

خطبہ استقبالیہ

بموقع:	پیام انسانیت کنونشن
منعقدہ:	۱۲؍جمادی الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۶؍اپریل ۲۰۱۰ء
بمقام:	گراؤنڈ: جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، سپول، بہار

قابل احترام مہمانان ذی وقار اور سامعین عظام!

سب سے پہلے ہم جملہ اراکین، ذمہ داران، اساتذہ اور طلبائے جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ پیام انسانیت کنونشن میں آنے والی محترم شخصیتوں کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں اور اپنے تمام مہمانوں وسامعین کے بے حد ممنون ومشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت پر یہاں آنے کی زحمت اٹھائی۔ خاص طور پر نمونۂ اسلاف حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری، حضرت مولانا سلیم محمد کریم، حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، حضرت مولانا صغیر احمد رحمانی ودیگر علمائے کرام کا میں بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشا۔ میں ریاست کے محبوب وزیر اعلیٰ

762

عالی جناب نتیش کمار جی کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے کہ انہوں نے اس دوردراز علاقہ میں آنے کی تکلیف برداشت کی، ساتھ ہی ساتھ میں اپنے تمام احباب اوراس علاقے کے عوام کی جانب سے ان کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں۔

سیمانچل کی دھرتی کے باسیو!

آج کے اس پرآشوب عہد میں جب کہ ہر چہار جانب مذہبی کشمکش، ذات پات کی عصبیت اورلسانی امتیازات کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں آپ انسانی اخوت و بھائی چارہ کے پیغام کو پھیلانے کی غرض سے ایسی جگہ جمع ہیں جس کی تاریخ ہی انسان دوستی اور بقائے باہم سے عبارت رہی ہے۔لہٰذا یہ احساس تفاخر بے جا نہیں، کیونکہ بہار کی یہ دھرتی ان عظیم شخصیتوں کیلئے میدان عمل رہی ہے جن کے کارناموں پر آج پورا ملک ہی فخر نہیں کرتا، بلکہ جس کی انسانیت نوازی کو دنیا بھی تسلیم کرتی ہے۔ایسی مقدس سرزمین پر اگر ایک بار پھر تاریخ خود کو دہرانا چاہتی ہے اور انسانیت کی پے درپے تاراجی کے اس دور میں انسان دوستی کا چراغ جلانے کی کوشش ہورہی ہے تو یقیناً ہمیں مرحبا کہتے ہوئے بے پناہ خوشی ہورہی ہے کیونکہ سسکتی اوردم توڑتی انسانیت کو استحکام بخشنا وقت کی اولین ضرورت ہے۔

محترم حاضرین!

آج جب بہار کو پورے ہندوستان کے نقشے پر ایک اعلیٰ مقام دلانے کی جدوجہد میں مصروف وزیراعلیٰ نتیش کمار جی ہمارے درمیان موجود ہیں تو اس حقیقت کو بھی آپ کے گوش گزار کراتے چلیں کہ دنیا کے تین قدیم مذاہب جین مت، ہندومت اور بودھ مت کی تاریخ ریاست بہار سے ہی وابستہ ہے۔ہندو عہد میں پٹنہ جو بہار کی راجدھانی ہے، ملک کا صدر مقام تھا، جو پاٹلی پُتر، پھر پاٹلی پتر اور عظیم آباد کہلایا۔بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں سے اس شہر کی رونق تھی۔بودھ عہد کی عظیم یونیورسٹی نالندہ اور وکرم شیلا میں واقع تھی جو اسی

صوبہ کا حصہ ہے، جن کی باقیات اب زمین کی کھدائی میں مل رہی ہیں اور وہ باقیات ان دانش گاہوں کی وسعت وعظمت کا پتہ دیتی ہیں۔گوتم بدھ کو اسی خطۂ علم ومعرفت میں 'گیان' حاصل ہوا تھا۔چنانچہ 'گیا' میں اب بھی ان کی یادگار موجود ہے۔مسلم عہد حکومت سے قبل کی تاریخ میں دو بڑے حکمراں گزرے ہیں جن کی مملکت کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ان کا عدل وانصاف، رعایا کے ساتھ حسن سلوک اورامن وامان کے قیام کے سلسلہ میں ان کی کوششیں ضرب المثل تھیں۔چندر گپت اور اشوک کا 'پاٹلی پتر' پایۂ تخت تھا اور یہیں سے ان کے انصاف کا چشمہ جاری ہوتا تھا۔الغرض یہ کہ بہار ایسی ریاست ہے جس کی تاریخ مذہبی اعتبار سے بھی روشن ہے اور یہاں ہر عہد میں امن وآشتی کے دیے بھی روشن رہے ہیں۔

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

معزز سامعین!

ہم اس قابل فخر حقیقت کو بھی نہیں بھلا سکتے کہ بہار اپنے ابتدائی مسلم دور سے ہی علماء اورصوفیاء کا مرکز بنا رہا، بہار کے ایک مشہور صوفی شیخ خضر پارہ کی شہرت ہندوستان کے مغربی علاقہ تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ) نے بھی آپ سے استفادہ کیا، پھر سلطان ناصرالدین (متوفی ۱۲۶۶ھ) کا دور وہ عہد میمون ہے جس میں بہار پورے برصغیر کے علماء وصوفیاء کا قبلۂ عقیدت بن گیا۔جب امام تاج فقیہ کے پرپوتے مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ (متوفی ۷۸۲ھ) کی ولادت ہوئی، وہ ایسے صاحب نسبت بزرگ تھے کہ ان کی خانقاہ برصغیر کے طول وعرض میں علماء اور طالبین ہدایت واصلاح کا سب سے بڑا مرجع تھی، خود فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۸۸ھ) ان کا بے حد معتقد تھا اور اسی نے ان کی خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ مظفر شمس (متوفی ۷۸۸ھ) اور شیخ منہاج راستی وغیرہ اسی

سلسلہ کے بزرگوں میں تھے، جن کے وجود سے طویل عرصہ تک یہ خطہ مطلع انوار بنا رہا۔

یہ خطہ جہاں صاحبِ دل صوفیاء اور درویشوں کے لئے مشہور ہے، وہیں محقق علماء اور صاحبِ نظر فقہاء کی وجہ سے بھی اس خطہ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے، شیخ بڈھیں حقانی ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک اہم نام ہے، جو منیر کے رہنے والے تھے، آپ کا حلقۂ درس اس قدر مقبول تھا کہ شیخ طاہر ملتانی آپ سے استفادہ کے لئے ملتان سے یہاں پہنچے، شیر شاہ سوری ان کا ایسا معتقد تھا کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مغلوں کے دور میں بھی علماء بہار کی امتیازی شان قائم رہی، شاہ جہاں اپنے لڑکے اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم وتربیت کے لئے کسی عبقری عالم کی تلاش میں تھا، یہ تلاش ملا موہن بہاری کی صورت میں ثمر آور ہوئی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کا جو کام کرایا، وہ اسلامیان ہند کا سب سے نمایاں اور یادگار علمی کارنامہ ہے، اس کام کے لئے اس خداترس، صاحبِ نظر اور علم پرور بادشاہ نے پورے ملک سے اہم اور ممتاز علماء واصحابِ بصیرت فقہاء کا انتخاب کیا تھا، سرزمین بہار کے لئے مایۂ افتخار ہے کہ ان مرتبین میں چار چار نام علماء بہار کے ہیں، ملا فصیح الدین پھلواری، شیخ ریاض الدین بھاگلپوری، قاضی عنایت اللہ مونگیری اور ملا ابوالحسن دربھنگوی۔

بزرگو اور دوستو!

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ریاست بہار ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے، علماء، صلحا، اتقیاء، غوث وقطب اور دانشوران قوم وملت یہاں بڑی تعداد میں پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بے مثال خدمات جلیلہ کے باوجود انہیں نام ونمود اور شہرت سے وحشت رہی اور گمنامی ہی کو پسند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے بہار میں اکثر کے حالات مدون نہیں اور نہ ہی بعد کے دنوں میں ان کے حالات کی ترتیب و

تدوین کا کوئی اہتمام کیا گیا، گویا بہار کے اہل علم وفن ایک گمنام گلاب کے باغیچے کی طرح رہے اور عالمی سطح پر اس باغیچے کی خوشبو پھیلتی رہی اور عوام وخواص معطر ہوتے رہے۔ علمی، تحقیقی، تربیتی، تصنیفی، اصلاحی، تبلیغی، تحریکی کاموں میں علماء بہار کا اہم حصہ رہا ہے، امام منطق وفلسفہ صاحب سلم العلوم حضرت علامہ محبّ اللہ بہاریؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، صاحب عون المعبود شیخ شمس الحق عظیم آبادیؒ، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے نقیب اور بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور مجاہد آزادی حضرت سید شاہ محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کردار ہمارے دل ودماغ کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے نقوش جمیل سے ایک جہان مستفید ہوا ہے، ادیب شہیر علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی علمی، تحقیقی وتصنیفی کارناموں کو کسی طرح نہیں بھلایا جاسکتا۔

اسی طرح لاتعداد علمائے دینِ متین اس سرزمین میں پیدا ہوئے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، انہی شخصیات میں سے حضرت اقدس مولانا بشارت کریم صاحب گڑھلویؒ، حضرت مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ، مولانا ولایت علیؒ اور مولانا یحییٰ علی عظیم آبادیؒ، شاہ ولی اللہ تحریک کے علم بردار بن کر سامنے آئے اور سب سے اخیر میں علم وادب اور فقہ وشریعت کے رمز شناس حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ولی اللّٰہی تحریک کے میر کارواں کی حیثیت سے عالم اسلام میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی علماء ومفکرین نے علم وتحقیق کی بزم میں چار چاند لگایا اور پیام انسانیت کی تحریک اور اصلاح معاشرہ کی مہم کو اپنا فریضہ جان کر زبردست محنت کی اور دنیا کو یہ پیغام دیا کہ:

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

عزیز دوستو!

قصہ مختصر یہ کہ سرزمین بہار کے جس خطے کی جانب بھی آپ نگاہ اٹھا کر دیکھئے انسان دوستی اوراخوت وبھائی چارہ کی انتہائی زرخیز تاریخ آپ کا استقبال کرتی نظر آئے گی۔صوفیوں، ولیوں اور سنتوں سے لے کر مہا پرشوں تک کا ایک طویل سلسلہ ہے جن کی انسانیت نوازی ہمارے لئے اور آپ کیلئے مشعل راہ سے کم نہیں۔جنوبی بہار سے لے کر شمالی بہار تک کی تاریخ الٹ لیجئے، اولیائے کرام سے لے کر رشی منیوں تک ہر مذہب و دھرم کی بڑی ہستیاں نشان عبرت لئے کراہتی انسانیت کو پیغام محبت پیش کرتی نظر آجائیں گی۔نہ مذہب کی تخصیص ہے نہ دھرم کا بندھن۔کہیں مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کی بازگشت سنائی دے گی تو کہیں گوتم بدھ کا فلسفۂ حیات ہمارے درمیان امن وآشتی کا چراغ روشن کرتا نظر آجائے گا۔الغرض جدھر دیکھئے محبت ویگانگت کا پرچم تھامے کوئی نہ کوئی صوفی اور کوئی نہ کوئی مصلح قوم بقائے انسانی کی خاطر سینہ سپر مل جائے گا۔خود ہم اور آپ آج جہاں بیٹھ کر پیام انسانیت کا پرچم بلند کرنے کے آرزومند ہیں، یہ خطہ بھی اللہ کے ولی اور مجدد عصر مولانا سید محمد علی مونگیری نور اللہ مرقدہٗ کی توجہ خاص کا مرکز رہ چکا ہے جن کی انسان دوستی کے پیغامات کے احسانات سے یہ خطۂ ارض دبا ہوا ہے۔ایسی مقدس ہستیوں کے گہوارے میں بصد احترام معزز مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ہمیں خوشی ہو رہی ہے بلکہ امید کا ایک دیا بھی منور ہوتا نظر آرہا ہے کہ اکیسویں صدی کی اس بھاگ دوڑ والی زندگی میں دنیا کو گہوارۂ امن بنانے کی تمنا لئے ہم یہاں اس امید ویقین کے ساتھ جمع ہوئے ہیں کہ ہم دنیا کے سامنے بالعموم اور ہندوستانی قوم کے درمیان بالخصوص پیام انسانیت کا درس دیں گے،اخوت و بھائی چارے کا پیغام پیش کریں گے،انسانیت نوازی کی قدر وقیمت کا احساس دلائیں گے اور دلوں سے نفرتوں،کدورتوں اور بغض وعناد کو ختم کرنے کی کوششیں کریں گے۔

قابل صد احترام حاضرین!

علامہ سید سلیمان ندوی نے بہت ہی عام فہم اور سادے لفظوں میں انسانیت کے پیام عظیم کو واضح کیا ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقتباس آپ کو بھی پڑھ کر سناؤں۔پیام انسانیت کے تعلق سے علامہ نے تحریر فرمایا ہے:

''سچ بولنا،جھوٹ کی برائی،علم بے عمل کی مذمت،عفو عام،درگزر،توکل،صبر وشکر، حق پر استقامت،خدا کی راہ میں جان دینا،سخاوت اور خیرات کا حکم،بخل کی برائی،اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت،میانہ روی،قرابت مندوں،یتیموں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر وغرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا،عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ وخیرات،نیکی وبھلائی کی بات کرنا،آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا،کسی کو برا بھلا نہ کہنا،کسی کو نہ چڑھانا، برے ناموں سے یاد نہ کرنا،والدین کی خدمت واطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی وسلامتی کی دعا دینا،حق گوئی وانصاف پسندی، سچی گواہی دینا، فیصلہ میں عدل وانصاف،دشمنوں سے بھی عدل وانصاف،صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں کو احسان دھرنے کی برائی،فسق وفجور سے نفرت،چوری اور ڈاکہ،رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لینے کی ممانعت،حسن نیت اور دل کی پاکیزگی،پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار ومتانت،مجالس میں حسن اخلاق،ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک، شوہر کی اطاعت اور بیوی کا حق ادا کرنا،ناحق قسم کھانے کی برائی،چغل خوری اور طعنہ زنی کی ممانعت،شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت،بھوکوں کو کھانا کھلانا،ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز کرنا۔''

علامہ سید سلیمان ندوی کے ان زریں فرمودات پر غور کریں تو یہ ایسے اعمال نہیں

ہیں جن پر عمل کرنے کے لیے صرف مسلمانوں سے کہا گیا ہے بلکہ جتنی باتیں بتائی گئی ہیں وہ سبھی مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں مفید اور عام سماج میں اصلاحی انقلاب لانے والی ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم انسانیت نواز اور انسان دوست بننے کا صدق دل سے عزم کرلیں۔

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

اصحاب نظر دانشور حضرات!

چونکہ ہمارے درمیان ایک ایسے وزیر اعلیٰ تشریف فرما ہیں جن کی قدر و منزلت ہر مذہب کے لوگوں میں ہے اور ان کے کارہائے نمایاں کا اعتراف خود ان کے مخالفین کو بھی ہے ،اس کے علاوہ ہر سطح کے سیاستداں و سماجی قائدین بڑی تعداد میں یہاں موجود ہیں اس لیے میں ماضی کی ایک رپورٹ کے حوالے سے کچھ حقائق پیش کردینا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ اس پر غور کرتے ہوئے یہ حضرات کچھ ٹھوس عملی خاکہ مرتب کریں اور ترقی کی راہیں تلاش کریں۔

میں یہاں 2001 کی سروے رپورٹ سے اخذ کردہ کچھ حقائق پیش کررہا ہوں جو فکر و تشویش میں مبتلا کرنے والے ہیں لیکن یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ موجودہ عہد میں بہار میں ترقی کی کچھ ہوا چلی ہے اور کئی میدانوں میں اس ریاست کی شکل و شبیہ بدلی ہے اور خوش آئند تبدیلی کے امکانات روشن ہیں، لیکن جتنی تبدیلی اور ترقی آنی چاہیے نہیں آئی، خاص طور پر مسلمانوں کے گھر آنگن میں ترقی کا سورج طلوع نہیں ہوا ہے۔ باوجودیکہ سچر کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات کے بعد مرکزی حکومت نے جن 90 اضلاع کو اقلیتی قرار دیا ہے ان میں پورنیہ کمشنری کے چاروں اضلاع شامل ہیں۔ صورتحال کو دیکھ کر خوش آئند پیش رفت اور روشن مستقبل کی توقع ضرور کی جاسکتی ہے لیکن ابھی ترقی کا قفل کھلا نہیں ہے۔

حضرات قائدین!

اس موقع پر کچھ تلخ حقائق سرسری طور پر پیش کردینا چاہتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وزیر اعلیٰ کوسی اور پورنیہ کمشنری کی زبوں حالی کو ختم کرنے کے لیے ایک انقلابی تبدیلی کی جدوجہد کریں گے۔ ایک بات میں واضح کردوں کہ سچر کمیٹی نے گرچہ مسلمانوں کی صورتحال کو دلتوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے لیکن اس علاقہ کے راست مشاہدہ کے بعد میرا یہ ماننا ہے کہ یہاں مسلمان بھی پسماندہ ہیں اور ہندو بھی، اس لیے یہاں کی ترقی تو خصوصی پیکیج کے ذریعے ہوسکتی ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ریاست بہار میں 78.7 فیصد مسلمان یا تو غریب ہیں یا سطح غریبی سے نیچے کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ کوئی اور نہیں ریاستی حکومت سے دستوری درجہ حاصل کردہ ’’بہار اقلیتی کمیشن‘‘ کی رپورٹ کہتی ہے۔ سابقہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ریاست میں محض 47.3 فیصد مسلمان ہی خواندہ ہیں اور 60.3 فیصد مسلمانوں کی تعداد ایسی ہے جو گاؤں میں رہتی ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے بارے میں کئی چونکا دینے والی تفصیلات ہیں۔ 2001 کی مردم شماری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بہار کی 8.38 کروڑ آبادی میں تقریباً 50 فیصدی لوگ سطح غریبی سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں۔ جب کہ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی 59.5 فیصد آبادی سطح غریبی سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ 19.2 فیصد لوگ غریب ہیں۔ دونوں کو اگر ہم ملادیں تو 78.7 فیصد ہوتا ہے یعنی محض 21.3 فیصد مسلم آبادی قدرے اچھی حالت میں ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں میں ذات برادری کی حقیقت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ عام مسلمانوں کی حالت بے حد خراب ہے جو متوسط طبقے کے لوگ ہیں وہ بدترین زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

حکومتوں نے ان کی زندگی میں خوشحالی لانے کے لئے ٹھوس اقدامات نہیں کئے۔ رپورٹ کے مطابق اوسط مسلمانوں کو مناسب خورد ونوش تک کا انتظام نہیں ہے۔ دو وقت کی روٹی کے حصول کی جدوجہد میں مسلمان بیمار بھی خوب پڑتے ہیں۔ ان کے کھانوں میں مناسب مقدار میں کیلریز نہیں ہوتیں۔ عموماً شہروں میں رہنے والے مسلمان بیڑی بنانے، ہتھ کرگھا، بنکر جیسے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جہاں کام کرنے کے لئے نہ مطلوبہ روشنی فراہم ہے اور نہ جگہ۔ سیلن بھرے کمروں میں وہ قید رہتے ہیں۔ اعداد وشمار رونگٹے کھڑے کردینے والے ہیں کہ شہری علاقوں میں تو علاج ومعالجہ پر مسلمان توجہ دیتے بھی ہیں لیکن دیہی علاقوں میں 54 فیصد مسلمان علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس نہیں جا پاتے ہیں، بلکہ ان کے علاج کا ذریعہ جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ ہے۔ بہار میں سرکاری اسپتالوں کی حالت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بہار 2001 کی مردم شماری اور قومی فروغ انسانی وسائل کے محکمہ کی رپورٹ 2001 میں کہا گیا ہے کہ بہار میں صحت کے متعلق سہولیات پر سب سے کم رقم خرچ ہو رہی ہے۔ 2969 افراد (قومی اوسط 1498 افراد) پر اسپتال کا ایک بستر مہیا ہے۔ 30 ہزار کی آبادی پر ایک طبی مرکز کے ضابطہ کے خلاف 5 گنا زیادہ 169898 افراد پر ایک طبی مرکز ہے۔ یعنی صرف 9 فیصد آبادی کو طبی سہولیات مہیا ہیں۔ رپورٹ کے مطابق صرف 1.6 فیصد مسلمانوں کو ہی ایلوپیتھ علاج کے لئے سرکاری اسپتالوں کا فائدہ مل پاتا ہے۔ 0.1 فیصد مسلم یونانی علاج اور 0.9 فیصد مسلمان ہومیوپیتھ علاج پر منحصر ہیں۔

مفکرین قوم!

بہار میں تعلیم وتدریس کی حالت بھی بدتر ہے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق بہار میں عمومی تعلیم کا گراف 47.7 فیصد ہے۔ جب کہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس سے تھوڑا کم 47.6 فیصد مسلم آبادی خواندہ ہے۔ مسلمانوں میں 6.7 فیصد

گریجویٹ ہیں۔ سکنڈری پاس صرف 14.5 فیصد ہیں۔ عمومی آبادی کا فیصد اس سے دوگنے کے آس پاس ہے۔ رپورٹ پر سوال اٹھایا گیا ہے کہ 60-50 سال پہلے تک تعلیم کے ہر شعبے میں آگے رہنے والے مسلمانوں کی تعلیمی حالت آج ایسی کیوں ہے؟ بے چین کردینے والا سوال یہ ہے کہ میڈیکل، انجینئرنگ، کمپیوٹر، آئی آئی ٹی، زراعت اور ڈیری کے شعبوں میں مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں دیگر ترقیاتی اسکیموں اور سرکاری پروگراموں کا فائدہ بھی بہار میں مسلمانوں کو نہیں مل پاتا ہے۔ اندرا آواس بنانے کے معاملے میں بہار اول مانا جاتا ہے، مگر رپورٹ بتاتی ہے کہ صرف 4.1 فیصد مسلمانوں کو ہی اس کا فائدہ مل پاتا ہے۔ جواہر روزگار یوجنا میں 0.5 فیصد، آئی آر ڈی پی میں 4.5 فیصد مسلمان ہی فائدہ اٹھا سکے۔ صرف 1.3 فیصد مسلمانوں کو ضعیفی پنشن مل رہا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ 7-6 سالوں سے ضعیفی پنشن میں نئے نام شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ''انپورنا یوجنا'' صرف 0.9 فیصد مسلمانوں تک پہنچی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ریاستی سرکار ایسے غریب کنبوں کی شناخت ہی نہیں کر پائی جس کے لئے انپورنا یوجنا اور انتودے جیسی اسکیمیں ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی آبادی بڑھی ہے، لیکن روزگار گھٹ گئے ہیں۔ روزگار کے لئے روایتی ذرائع تو تقریباً ختم ہی ہو گئے ہیں۔ دونوں کے بیچ کی خلیج کافی گہری ہو چکی ہے۔ یوں مسلمانوں کے روزگار بھی کم مزدوری والے ہیں، اسی لئے ان کی آمدنی بھی کم ہوتی ہے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ بھوک اور غریبی کی ذلالت کے سبب مسلمانوں نے اپنی زمینیں اور جائیداد بیچی زیادہ ہیں خریدی کم ہیں۔ رپورٹ کے اوسط میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے 51.9 فیصد زمین یا املاک بیچی اور صرف 45.7 فیصد خریدی۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی کوششوں سے تھوڑی تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے لیکن مجموعی صورتحال تقریباً ویسی ہی ہے۔ حضرات! میں نے ایک سرسری مطالعہ

پیش کیا ہے جو ضروری نہیں کہ صد فیصد صحیح ہو لیکن کم وبیش یہی صورتحال ہے جس کا اعتراف بہت سے تجزیہ کاروں کو ہے، مجھے یقین ہے کہ ریاست کی موجودہ حکومت نے کچھ کارگر قدم اٹھائے ہیں لیکن ابھی شاید ابتدا ہوئی ہے اس لیے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی انقلابی تبدیلی آچکی ہے۔

معزز سامعین!

جس مقام پر آپ حضرات تشریف فرما ہیں وہ کوسی کمشنری کا ایک نہایت پسماندہ گاؤں ہے، اس کے پیچھے تاریخی بیرج ہے جو ۵۶ دروازوں پر مشتمل ہے، جس کی تعمیر سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو اور ویرو کرم شاہ مہندر سابق شاہ نیپال کے دور حکومت میں ہوئی تھی۔ اس علاقے میں ہندوستان کی تاریخی ندی کوسی بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری رہتی ہے، یہ ندی کہیں بہار لاتی ہے تو کہیں تباہی مچاتی ہے، بالخصوص جولائی، اگست میں یہ ندی اپنے شباب پر رہتی ہے جس کی وجہ سے مکانات اور فصلیں زیر آب ہو جاتی ہیں اور ہر سال یہاں کے مزدوروں اور کسانوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ چونکہ اس علاقے کے نوے فیصد لوگوں کا ذریعۂ معاش زراعت ہے اس لیے سیلاب ان کے لیے ہر برس قہر بن جاتا ہے اور شاید اس علاقے میں غربت کی ایک بڑی وجہ سیلاب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ہماری ان آسمانی آفات وآلام سے حفاظت فرمائے (آمین)

یہاں دو کمشنریاں ہیں، کوسی کمشنری اور پورنیہ کمشنری، دونوں کمشنریاں سات اضلاع پر محیط ہیں۔ ان دونوں کمشنریوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ شمال میں نیپال کی لمبی سرحد ہے، شمال مشرق میں ہندوستان کی سات ریاستوں سمیت اروناچل پردیش کا وہ علاقہ بھی ہے جس پر چین ہمیشہ اپنا دبدبہ قائم کر کے ہندوستان کی مشکلیں بڑھاتا رہتا ہے،

جب کہ مشرق میں مغربی بنگال کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش کی کھلی سرحد ہے، یوں سمجھا جائے کہ یہ علاقہ نیپال، چین اور بنگلہ دیش کے ہندوستان میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ چنانچہ جب جب ہند۔چین کے آسمانوں میں جنگ کے بادل منڈلاتے ہیں تو یہاں کے لوگ سراسیمگی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں لیکن جب جب موقع آیا ہے یہاں کے لوگوں نے ہندوستانی افواج کی دل کھول کر مدد کی ہے اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر ان کا جوش وحوصلہ بڑھایا ہے۔

خلوت میں غریبوں کی اجالا نہیں دیکھا
محفل میں تو اے شمع تیرا نام بہت ہے

حضرات گرامی قدر!

پیام انسانیت کنونشن میں وزیر اعلیٰ بہار عالیجناب نتیش کمار صاحب کا بالخصوص ہم استقبال کرنا چاہیں گے جن کی رہنمائی میں بہار کو روشن مستقبل کا ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔ بحیثیت وزیر اعلیٰ انہوں نے بہار کو کیا مقام دلایا؟ یہ ریاست ان کی رہنمائی میں ترقیات کے کن منازل ومراحل سے گزر رہی ہے؟ اس پر تبصرہ سے قطع نظر ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ اس ریاست پر حکمرانی کا موقع محترم وزیر اعلیٰ کو ایسے عہد میں ملا جب انسانیت کو مقدم ٹھہرانے والے افکار وخیالات کو پس پشت ڈال کر ذات وفرقہ اور طبقے کی سیاست کاری کو پروان چڑھانے کی پرزور کوشش کی جارہی تھی۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طبقاتی کشمکش پر مبنی سیاست انسانیت کی بقاء کیلئے سم قاتل سے کم نہیں لیکن اسے کیا کہئے کہ انسانیت کو پیچھے دھکیل کر ہم نے ذات و مذہب اور طبقات و دھرم کو درمیان میں لاکھڑا کرنے کی کم کوششیں نہیں کیں، جس کا نقصان ہم سبھوں نے اٹھایا۔ مگر شکر ہے کہ ہمیں بہت جلد ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کا احساس ہو گیا کہ دوستی، رواداری، اخوت، بھائی

چارہ اورامن ومحبت کی قدر وقیمت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کی کوشش کریں اورانسانیت کی بقاءاور تحفظ کویقینی بنانے کیلئے یکجاہوں۔ بقائے باہم کا نظریہ وفلسفہ جس پر انسانیت کی تشکیل وتعمیر کامکمل انحصار ہے، غائب ہو چکا ہے۔ آج سسکتی انسانیت اوردم توڑتی شرافت چیخ چیخ کرہم سے یہ تقاضا کررہی ہے کہ ہم انسانی مساوات کی قدروقیمت کوسمجھنے کی کوشش کریں اورمحاسبہ کے عمل سے گزرتے ہوئے دنیا کوگہوارۂ امن بنانے کیلئے میدان عمل میں کودیں مگر یہ یادرکھنا چاہئے کہ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم عدل وانصاف کے چشمے سے حضرت انسان کو دیکھنے کی عادت ڈالیں گے اور مذہب ونسل کی عینک کو اتار پھینکیں گے۔

محترم حضرات!

میں اس موقع پر جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی حصولیابیوں کی جانب سرسری طور پرروشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

حضرات! ہندوستان میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے اور سبھی علوم اسلامی کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں، جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے جو ہند۔ نیپال کے سرحدی علاقے میں دینی، اصلاحی اورتعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہے، جس کا شمار ملک کے ممتاز اداروں میں ہوتا ہے۔ جامعۃ القاسم کا قیام ۱۶ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ مطابق 25 مارچ 1989ء کوعمل میں آیا۔

اس علاقے کے لوگ تعلیمی، اقتصادی وسیاسی پسماندگی کی وجہ سے بے حد غربت اورقبائل کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ غربت وجہالت کا فائدہ اٹھا کرمشنری تحریک اورقادیانی بھولے بھالے عوام کوگمراہ کرتے ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ قادیانی مہم کے دام میں سیکڑوں مسلمان آگئے اوراپنا عقیدہ گنوا بیٹھے، چنانچہ تحریک تحفظ ختم نبوت

جامعۃ القاسم نے کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں قادیانی اور دیگر باطل طاقتوں کے خلاف مہم چلائی جس کے نتیجے میں سیکڑوں لوگ تائب ہوئے اور راہ راست پر آئے، یہ مہم مسلسل جاری ہے۔

جامعۃ القاسم 10 ایکڑ اراضی میں پھیلا ہوا ہے اوراس کی 18 شاخیں بھی ہیں جہاں دینی تعلیم کا معقول نظم ہے اور جامعہ کے تحت تعلیمی بیداری، اصلاح معاشرہ اور پیام انسانیت کی تحریک چلائی جاتی ہے۔ جامعہ اوراس کی شاخوں میں کل 2825 طلبہ وطالبات زیرتعلیم ہیں جب کہ ان میں سے 725 غریب ویتیم طلبہ جامعہ کے ہاسٹل میں مقیم ہیں جن کے قیام وطعام، علاج ومعالجہ اور دیگرضروری اخراجات جامعہ کی جانب سے پورے کیے جاتے ہیں۔ جامعہ کے اخراجات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں، فی الوقت اس کا سالانہ بجٹ تقریباً 94,62,301.00 روپے ہے جب کہ آئندہ برسوں میں تقریباً ایک کروڑ روپے سے زائد خرچ ہونے کے امکانات ہیں جب کہ تعمیری اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔

جامعۃ القاسم کے احاطے میں 16000 اسکوائرفٹ اراضی پر ایک عظیم الشان مسجد (جامع امام قاسم) زیرتعمیر ہے، چھت کا کام باقی ہے جوانشاء اللہ اہل خیر کے تعاون اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ جامعۃ القاسم کے احاطے میں رواق الیاس کی دوسری منزل کا کام بھی تکمیل کے مرحلہ میں ہے۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے سیکڑوں طلبہ ٹین شیڈ کے دارالاقامہ میں رہنے پر مجبور ہیں۔ جامعہ کے احاطے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یاد میں ایک عمارت بنام ”رواق ابوالحسن علی ندوی“ کا سنگ بنیاد شیخ الادب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے ہاتھوں رکھا جاچکا ہے۔ ”کوسی ہیومن انٹر کالج، شیخ زکریا میموریل ہاسپٹل، معہد عائشہ للبنات“ جامعہ کے تعمیری منصوبے میں شامل ہیں۔ جامعہ کے جملہ تعلیمی

،اصلاحی وفلاحی سرگرمیوں کو جاری وساری رکھنے اور جملہ تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ اہل خیر وصاحب توفیق حضرات جامعہ کے خصوصی تعاون کے لئے آگے آئیں۔الحمد للہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کو حضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری (نواسہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ) امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کی خصوصی توجہ وسرپرستی حاصل ہے۔

حضرات! میں اس موقع پر وزیراعلیٰ بہار محترم نتیش کمار کا ایک بار پھر خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ آزاد دینی مدارس حکومت وقت سے کسی طرح کے مالی تعاون کی نہ توقع رکھتے ہیں اور نہ لینا چاہتے ہیں، لیکن بہت سے مدارس انسانیت کے نام پر عوامی فلاح کا کام کرتے ہیں ان کی مدد اگر کی جائے تو اس کا زبردست فائدہ سماج میں نظر آئے گا کیونکہ اہل مدارس عوامی خدمت دینی جذبہ سے کرتے ہیں، اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ سے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جو مدارس رجسٹرڈ ٹرسٹ کے تحت چلتے ہیں انہیں عام سماجی تعمیر وترقی، ریلیف اور دیگر ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈ فراہم کرانے کی آسان راہ نکالیں، اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس سے بہار کے مسلمانوں کی تصویر بدل سکتی ہے اور رشوت وبدعنوانی کے جس جال کی خبریں آتی رہتی ہیں ان سے نجات مل جائے گی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست محترم علی انور رکن پارلیمنٹ کا تہہ دل سے استقبال نہ کروں کیونکہ انہوں نے محروم طبقے کو انصاف دلانے اور اچھوت قرار دی جانے والی برادریوں کو معاشرے میں یکساں مقام دلانے کیلئے لمبی لڑائیاں لڑی ہیں اور پسماندہ مسلمانوں کو ان کے حقوق دلانے کی جدوجہد میں وہ اب بھی مصروف عمل ہیں۔ ہمارا ماننا ہے کہ علی انور صاحب کو ابھی منزل نہیں ملی ہے، انہیں ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔

اس یقین واعتماد کے ساتھ میں تمام آئے ہوئے مہمانوں کا ایک بار پھر استقبال

کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا کہ پیام انسانیت کنونشن میں تاراج ہوتی انسانیت کی بقاء پر نہ صرف یہ کہ بھرپور انداز میں روشنی ڈالیں گے بلکہ اپنے اسوہ سے انسانیت نوازی کی ایسی مثالیں بھی پیش کریں گے جو دنیا کیلئے نشان عبرت اور مشعل راہ قرار پا سکے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو کہنے سننے سے زیادہ عمل کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین۔اخیر میں میں اپنے تمام معاونین ومخلصین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی شب وروز کی محنت سے یہ تاریخ ساز کنونشن ہم منعقد کرنے میں کامیاب ہوئے، خاص طور پر میرے کرم فرما جناب علی انور صاحب کا جن کا تعاون مجھے ہر مرحلہ میں حاصل رہتا ہے، جن کی معاونت سے گزشتہ دو برس قبل وزیر اعلیٰ تک ہماری رسائی ممکن ہوئی اور ہم وزیراعلیٰ کو سپول کے ضلع مجسٹریٹ شریف عالم کی غیر اسلامی وغیر آئینی سرگرمیوں سے واقف کرا سکے جس کے نتیجے میں ضلع مجسٹریٹ کا تبادلہ ہوا۔اسی کے ساتھ میں اپنے معاون اور امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری مولانا محمد یوسف انور، روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی کے سینئر سب ایڈیٹر عبدالقادر شمس، روزنامہ ہندوستان ایکسپریس نئی دہلی کے سب ایڈیٹر ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل کے جنرل سکریٹری جناب شاہ جہاں شاد، جامعۃ القاسم کے صدر مدرس مولانا حمید الدین مظاہری، مولانا ضیاء اللہ ضیاء رحمانی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مفتی عقیل انور، مولانا علی احمد رازی، سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل کے رکن مظفر حسین، مظہر حسین، ہمارے طباعتی کاموں کے ڈائریکٹر مصعب انیس عرف گڈو، آرٹ ڈیزائنر مولانا ارشد عالم ندوی اور جملہ کارکنان کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی شب وروز کی محنت سے ہی یہ تاریخ ساز اجلاس کامیاب ہو پایا۔

خطبہ استقبالیہ

بموقع:	بین الاقوامی سمینار و رسم اجراء ''متاع زندگی''
بدست:	عالی جناب نتیش کمار، وزیر اعلیٰ بہار
منعقدہ:	۱۶/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۳/نومبر ۲۰۱۱ء
بمقام:	اے.این.سنہا انسٹی ٹیوٹ، نزد گاندھی میدان پٹنہ۔
زیر اہتمام:	سیمانچل ڈیولپمنٹ فرنٹ بہار

الحمد للّٰہ رب العالمین الذی خلق الإنسان و الأرضین، اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأو ربک الأکرم، الذی علم بالقلم،علم الإنسان مالم یعلم، و صلی اللّٰہ علٰی خیر خلقه محمد بن عبداللّٰہ الأمین، و علی آله و صحبه أجمعین. أمابعد!

حضرات اہل علم ودانش!

سب سے پہلے میں یہاں موجود ممتاز علماء، اہل علم و دانش،سربرآوردہ سیاسی قائدین اورمیڈیا سے وابستہ باخبر افراد کا خیر مقدم کرتا ہوں۔آپ اس بات سے واقف ہیں

کہ ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے سے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی قیادت دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، آل انڈیا مسلم پرسنل لائبورڈ، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی جیسے تاریخ ساز اداروں کے ہاتھوں میں ہے اور یہ ہمارے لیے خوش نصیبی کی بات ہے کہ آج ان تمام اداروں کے سربراہان وذمہ داران ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہمارے لیے مسرت وشادمانی بلکہ فخر کی بات ہے کہ ہمارے درمیان ایک طرف طبقہ علماء کے سرخیل اوراس عہد کی نہایت بابرکت شخصیت خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف وسینئر نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ تشریف رکھتے ہیں تو دوسری طرف اسلامی دنیا کی مشہور شخصیت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم وانٹیگر ل یونیورسٹی لکھنؤ کے چانسلر، شیخ الادب حضرت مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی ہماری اس مجلس کی اہمیت میں چار چاند لگارہے ہیں۔ ہمارے درمیان جامعہ مظاہرعلوم سہارنپور کے سربراہ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے علوم وافکار کے امین وپاسبان حضرت مولانا سید محمد شاہد الحسنی سہارنپوری مدظلہ العالی بھی تشریف رکھتے ہیں۔اس بات سے بھی ہمارے دل ودماغ میں غیر معمولی طمانیت کے جذبات موجزن ہیں کہ اس مجلس میں ایک طرف ہندوستان خاص طور پر ریاست بہار کو دنیا کے نقشے پر بلند مقام عطا کرنے والے ہردلعزیز وزیر اعلیٰ نتیش کمار جی موجود ہیں تو دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بعد اردو صحافت کو بلند مقام عطا کرنے والے عظیم صحافی ڈاکٹر عزیز برنی مجلس کی رونق کو دوبالا کررہے ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر اختر الواسع اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان بھی ہماری دعوت پر یہاں موجود ہیں،اسی کے ساتھ ورلڈ اسلامک فورم لندن کے چیئر مین اور ممتاز قلمکار ومشہور مقرر

مولانا محمد عیسیٰ منصوری، دارالقرآن انٹرنیشنل ٹرسٹ ڈربن جنوبی افریقہ کے چیئرمین مولانا سلیم محمد کریم صاحب، وزارت اوقاف کویت سے وابستہ اور درجنوں کتابوں کے مصنف حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی اور قطر سے تشریف لانے والے مشہور مصنف مولانا محمد رحمت اللہ ندوی کی اس سمینار میں شرکت ہمارے لیے باعث صد افتخار ہے۔

حضرات گرامی!

دنیا کے تین قدیم مذاہب جین مت، ہندومت اور بودھ مت کی تاریخ ریاست بہار سے ہی وابستہ ہے۔ الغرض یہ کہ بہار ایسی ریاست ہے جس کی تاریخ مذہبی اعتبار سے بھی روشن ہے اور یہاں ہر عہد میں امن وآشتی کے دیپ بھی روشن رہے ہیں۔ چنانچہ یہ سمینار اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بین الاقوامی سمینار و تقریب رسم اجراء میں ریاست بہار اور ملک وبیرون ملک سے تشریف لانے والے مقتدر علماء، دانشوران، سیاسی قائدین، ادباء اور تمام علم دوست شخصیات کا اس سمینار میں خیرمقدم کرتے ہوئے ہمارا قلب وجگر فرحت وانبساط سے معمور ہے اور ہماری آنکھیں آپ حضرات کیلئے فرش راہ ہیں۔

محترم حضرات!

آج جب بہار کو پورے ہندوستان کے نقشے پر ایک اعلیٰ مقام دلانے کی جدوجہد میں مصروف وزیر اعلیٰ نتیش کمار جی ہمارے درمیان موجود ہیں تو اس حقیقت کو بھی آپ کے گوش گزار کراتا چلوں کہ

ہندوستان کا معاشی اعتبار سے پسماندہ، مگر علم وادب، انسانیت نوازی، انسانی اقدار کی بحالی اور بقائے باہم کا علم بردار اور تہذیب وثقافت کے باب میں بیش بہا، ریاست بہار جس کی گود میں گنگا، باگ متی، کوسی، مہانندا، کملابالان، بوڑی گنڈک اور سون

جیسی ندیاں بہتی ہیں، اس نے ہر دور میں نہ صرف یہ کہ علم وادب کو سینچا اور سیراب کیا ہے، بلکہ علم وفن اور ادب وآگہی کو اوج ثریا تک پہنچانے میں ہمیشہ کلیدی رول ادا کیا ہے اور بہار کی اردو اکیڈمی، پٹنہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، متھلا یونیورسٹی، بھاگل پور یونیورسٹی، منڈل یونیورسٹی، مگدھ یونیورسٹی اور ماضی کی نالندہ یونیورسٹی جو ایک بار پھر تشنگان علوم وفنون کی پیاس بجھانے کیلئے بے تاب ہے، پوری ریاست کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مدارس، مکاتب، دینی جامعات، اسکول، کالجز اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے انسٹی ٹیوٹ، رفاہی ادارے اور فلاحی تنظیمیں اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں اور اس ریاست کے مادی اعتبار سے مفلس، مگر باہمت علماء کی علمی، تصنیفی اور تحقیقی جلوہ گری ملک کے چپے چپے میں محسوس کی جاسکتی ہے اور مجھے کہنے دیجئے کہ تحریک ندوۃ العلماء اور ملک کی سب سے مقتدر تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جو اگر چہ یہاں سے باہر برگ وبار لائی، اس نے بھی اسی مٹی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور یہی وہ ریاست ہے جو بقول مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ”اس ریاست میں امارت شرعیہ کے قیام نے اس ریاست بہار کو ہندوستان کے تمام صوبوں پر فوقیت عطا کردی ہے اور اس سرزمین کو پورے ملک میں ممتاز حیثیت دے دی ہے“۔

بہار میں ہونے والے علمی اور عملی کام:

حضرات سامعین!

بہار علمی، تحقیقی اور تصنیفی اعتبار سے ہر عہد میں نہایت زرخیز رہا ہے چنانچہ یہاں کی مٹی سے نمودار ہونے والے ہزاروں رجال کار دنیا کے مختلف حصوں میں امتیازی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فی زمانہ بھی اسکالرس مختلف میدانوں میں مصروف عمل ہیں، گرچہ تعلیم اور انفراسٹرکچر کی سطح پر گرتے معیار کو عالی جناب نتیش کمار کی حکومت

نے سنبھالا ہے اور اصلاحات کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مسائل وسیع اور ہمہ گیر ہیں اور ان کے حل کی تدبیریں محدود۔ ایسے حالات میں وزیر اعلیٰ محترم نتیش کمار جی کو چاہیے کہ وہ اسکول، کالجز، یونیورسٹیز، ٹیکنیکل، میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں صحت منداقدامات کریں تاکہ جس طرح انہوں نے انفراسٹرکچر کی اصلاحات اور بہار کو جرائم سے پاک کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی ان کا نام روشن ہو۔

مسلمانوں کو دوہرے چیلنج کا سامنا:

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان قوم مستقل اپنی فکر اور علاحدہ شناخت رکھتی ہے، اس کا عقیدہ توحید ورسالت ہے اور اس کا تحفظ اپنا دینی اور پیدائشی فرض منصبی سمجھتی ہے، مگر اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس نے ملک وقوم کے ساتھ یکساں ترقی کرنے کے مواقع کو کبھی فراموش نہیں کیا، حالات کے تھپیڑوں کا ہمیشہ پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، اس نے اپنی نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کے تحفظ کے لئے ایک طرف گاؤں گاؤں میں مدارس کا جال بچھایا تو دوسری طرف عصری تعلیم کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہی، اس طرح اس کے سامنے دوہرے چیلنجز تھے اور ان چیلنجوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا، آج پوری ریاست کے طول وعرض کا اگر آپ جائزہ لیں تو کوئی گاؤں آپ کو ایسا نہیں ملے گا جہاں علماء کرام نے اپنی بے لوث جدوجہد کے ذریعہ دین وایمان کا چراغ نہ جلا رکھا ہو اور اس کی روشنی تنگ وتاریک گھروں میں نہ پہنچ رہی ہو۔ اس میدان میں علماء اور ریاست کے غریب عوام نے اپنی آزادانہ کاوشوں سے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائق ستائش ہے اور اسی کا فیض ہے کہ آج اس ریاست میں جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول، مدرسہ رحمانیہ سپول، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، جامع العلوم مظفر پور، جامعہ رحمانی مونگیر، اشرف العلوم

کنہواں، مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواڑہ، دارالعلوم الاسلامیہ پٹنہ، جامعہ اسلامیہ رشید العلوم قصبہ چمپانگر بھاگل پور، جامعہ قاسمیہ دارالعلوم بالاساتھ، مدرسہ امدادالعلوم راجوپٹی، جامعہ حسینیہ کشن گنج، دارالعلوم رحمانی زیرو مائل، دارالعلوم بہادر گنج، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مدرسہ مدنیہ سبل پور، مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ سمرا، جامعہ اسلامیہ خیروا، جامعہ ابن تیمیہ چمپارن، مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، خانقاہ منعمیہ میتن گھاٹ، خانقاہ فردوسیہ بہار شریف اور خانقاہ منیری منیر شریف جیسے ملک گیر اور عالمی سطح کے شہرت یافتہ دینی ادارے موجود ہیں اور تشنگان علوم نبوت یہاں دور دراز علاقوں سے آکر اپنی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ **اللھم زد فزد**

تحقیقی اور تصنیفی ادارے:

یوں تو ہندوستان میں بہت سے اداروں نے تصنیفی وتالیفی اور تحقیقی کام کئے ہیں، مگر ان میں مندرجہ ذیل چند ادارے سرفہرست ہیں اور ان اداروں نے جو علمی ذخیرہ جمع کیا ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے:

۱۔ ندوۃ المصنفین:

ملک میں تصنیف وتالیف اور دوسری زبانوں سے اردو زبان میں تراجم وتشریح کا کام اس وقت اس ادارہ نے کیا جب اس کی ملک وقوم کو اشد ضرورت تھی اور اس نے اس میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کی نظیر مشکل سے آزاد بھارت میں ملے گی۔

اسی طرح ملک کے مؤقر اور عظیم تحقیقاتی ادارے ندوۃ المصنفین، دارالمؤلفین اور دارالمصنفین نے اس کام کو آگے بڑھایا اور نہایت وقیع تحقیقات پیش کیں۔

۲۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد:

اس ادارے نے تحقیق وتصنیف کے میدان میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے علمی

اور تحقیقی سنگ میل کہا جا سکتا ہے، اس ادارے کو رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے جید عالم اور انشاء پرداز ملے جنہوں نے اپنے علمی کمالات سے معارف کو خوب سنوارا ہے۔

۳۔ کاندھلہ مظفر نگر کا علمی و تحقیقی قافلہ:

حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی صاحب مہاجر مکیؒ وغیرہ نے وہ علمی، تحقیقی، تالیفی اور تشریحی کام کئے ہیں جو نہ صرف یہ کہ برصغیر ہند و پاک میں انفرادیت کے حامل ہیں بلکہ عربوں نے بھی اس کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔

۴۔ مکتبہ یادگار شیخ سہارنپور:

مکتبہ یادگار شیخ سہارنپور نے مختصر مدت میں حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کی قیادت میں اردو و عربی کے علاوہ دیگر موضوعات پر تقریباً پچاس سے زائد نہایت وقیع اور علمی و تحقیقی کتابوں کا مجموعہ امت کے سامنے پیش کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کا قلم رواں دواں ہے اور امید کی جاتی ہے کہ عنقریب علم و تحقیق کے نئے منطقے سر ہوں گے۔

۵۔ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون:

تھانہ بھون گزشتہ صدی کے معروف مصلح، عظیم محقق اور مجتہد عالم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے جو نہ صرف مصلح تھے، بلکہ عظیم مصنف اور محقق تھے، انہوں نے اپنی تصنیفات سے اسلامی ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے تنہا اس کام کو انجام دیا، بلکہ سیکڑوں ایسے شاگرد پیدا کئے جنہوں نے ان کے اس تصنیفی اور تحقیقی مشن کو آگے بڑھایا اور آج بھی بڑھا رہے ہیں، انہوں نے چھوٹی بڑی بارہ سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، ہندوستان میں تصنیف و تالیف پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ

نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

۶۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ:

اس ادارے نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تقریباً سو کتابوں کے علاوہ دیگر اہل علم حضرات کی تصنیف کردہ کتابوں کی اشاعت کی اور بڑا علمی ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

۷۔ مکتبۃ الفرقان لکھنؤ:

لکھنؤ ہی میں ایک منفرد اسلوب کی علمی شخصیت مولانا منظور احمد نعمانیؒ کی تھی جنہوں نے انفرادی طور پر اہم علمی نقوش چھوڑے، معارف الحدیث سے کون واقف نہیں ہے، انہوں نے درجنوں کتابوں کا بیش قیمت تحفہ ملت کو دیا۔

۸۔ اشاعت اسلام ٹرسٹ دہلی:

اشاعت اسلام ٹرسٹ نے گزشتہ پچاس سالوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے علاوہ دیگر مصنفین کی علمی کاوشوں کو سمیٹنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا اور سیکڑوں کتابیں شائع کر کے بڑا کارنامہ سر کیا ہے جبکہ عصری تعلیم یافتہ افراد کو اسلام سے جوڑنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

۹۔ آبجیکٹیو اسٹڈیز دہلی:

گزشتہ پچیس سالوں میں IOS انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نے نہ صرف یہ کہ ملت کو جگانے کا کام کیا، بلکہ اس نے مختلف اور وقت کے سلگتے مسائل پر تحقیقات کروائی اور بیش بہا علمی ذخیرہ مختلف زبانوں میں شائع کر کے اپنی منفرد پہچان بنائی۔ اس ادارے کا اپنا پریس اور پبلشنگ ہاؤس ہے اور اس کی سربراہی بہار ہی سے تعلق رکھنے والی اہم سماجی اور ملی شخصیت ڈاکٹر منظور عالم کر رہے ہیں۔

۱۰۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا:

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اپنی نوعیت کا علم وتحقیق وریسرچ کے میدان میں آزاد ہندوستان کا منفرد ادارہ ہے جوفکری بھی ہے، تحقیقی اور علمی بھی ہے اور اصحاب علم کوعلم وتحقیق کے لئے تیار کرنے والی فیکٹری بھی ہے، اس ادارے نے ۲۰/سال کی مختصر مدت میں جوعلمی کارنامہ انجام دیا اور تحقیقاتی ذخیرہ جمع کیا ہے، اس کی نظیر بہت مشکل سے ملے گی، بلکہ بڑے بڑے حکومتی سطح کے ادارے اتنی مختصر مدت میں اتنے کام نہیں کرسکتے جتنا اس نے کیا ہے۔ اس ادارے کے بانی بھی ریاست بہار کے مایہ ناز عالم دین اور عالمی شہرت یافتہ شخصیت فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق مند برادرزادہ اور معروف ومشہور محقق ومصنف حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب حیدرآبادی نے اس کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کی سرپرستی میں کام آگے بڑھ رہا ہے۔

اس ادارے پر ہمیں رشک بھی ہے اور افسوس بھی، افسوس اس لئے ہے کہ اس ادارے کے بانی کا تعلق اسی ریاست سے ہے، مگر ناموافق حالات اور وسائل کی عدم فراہمی کی وجہ سے یہ پھلواری شریف پٹنہ میں قائم ہونے کے باوجود پٹنہ میں نہ رہ سکا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم ہوا اور رشک اس وجہ ہے کہ اس کے بانی کا تعلق اسی سرزمین بہار سے ہے، اس پر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں:

جہاں بھی رہے گا روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

اس ادارے نے مختصر مدت میں 100 سے زائد تحقیقی، علمی اور اسلامی قانون پر منفرد انداز کی کتابیں شائع کی ہیں جو دور جدید کا حسین تحفہ اور اس امت کی زندگی اور علماء

ہند کی عمدہ کاوشوں کا روشن نمونہ اور شریعت اسلامی کی جامعیت کا زندہ ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ فقہی انسائیکلو (انسائیکلو پیڈیا آف اسلامک جوریس پروڈنس) کا ۴۵/جلدوں میں اردو ترجمہ ہے، جو اسلامی قانون پر اردو داں طبقہ کیلئے عدیم المثال تحفہ ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے اس کام کی وجہ سے پوری عالمی برادری کی علمی دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا ہے جس پر ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یقیناً ہمیں فخر ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے، رہتی دنیا تک تاریخ علماء ہند کی ان کاوشوں کے نقوش کو مٹا نہیں سکتی۔

بہار میں تحقیقی کام:

ریاست بہار میں تحقیقی کاموں کا آغاز مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، علامہ ظہیر احمد شوق نیمویؒ سے ہوا، بعد میں حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبدالرؤف داناپوریؒ جیسی نابغہ روزگار شخصیات نے علم وتحقیق کے نئے باب کا سنہرا آغاز کیا۔ چند دہائیوں کے دوران حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ، پروفیسر عبدالمغنی اور حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کے قلم سے اہم اور نادر کتابیں منظر عام پر آئیں اور فکر وتحقیق کے میدان میں سیکڑوں فرزندوں نے نئی تاریخ رقم کی۔

۱۱۔ شعبہ نشر واشاعت امارت شرعیہ:

ادھر گزشتہ ۲۰/۲۵/سالوں میں امارت شرعیہ جس کا میدان اگرچہ علمی اور تحقیقی نہیں ہے، تاہم اس کے شعبۂ نشر واشاعت نے مختلف موضوعات پر تقریباً ۳۰/سے زائد کتابیں تحقیق وترتیب کے بعد شائع کی ہیں جسے اصحاب علم نے شوق کے ہاتھوں لیا ہے جو بلاشبہ تحقیق وتصنیف کے میدان میں گرانقدر اضافہ ہے۔

۱۲۔ مرکز المعارف والثقافہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد:

اس ادارے کے بانی حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ ہیں، جس کا مقصد بھی ریسرچ وتحقیق ہے اور اس ادارے سے ملک وبیرون ملک کی بہت سی علمی شخصیات جڑی ہوئی ہیں، (یہ بھی بتاتا چلوں کہ مولانا مرحوم کا تعلق بھی اسی ریاست سے ہے) اس ادارے کا مستقل اپنا تحقیقاتی مشن ہے۔ اس ادارہ سے وابستہ ہوکر مولانا علیہ الرحمہ نے خود کئی اہم دینی وادبی کتابیں ترتیب دیں مثلاً متاع قلم، باتیں ان کی یاد رہیں گی، چراغ راہ، تقویم اسلامی، وہ جو میری شاعری کا سبب ہوا، خلق عظیم، صفا کا فقہ اسلامی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں، اور یہ کتابیں اہل علم کے نزدیک مقبول بھی ہوئیں اور ابھی مولانا کے چھوڑے ہوئے بہت سے کام تشنۂ تکمیل ہیں، مولانا نے اس کام کو منظم کرنے کے لئے ''دارالعلوم سبیل السلام'' کے تحت تخصصات کے کئی شعبے قائم کئے اور بڑی خوش اسلوبی سے یہ ادارے اپنے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

۱۳۔ المعہد العالی الاسلامی (حیدرآباد):

بظاہر نام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی محض تعلیمی ادارہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تعلیمی، تربیتی، تالیفی اور رجال ساز ادارہ ہے، اس ادارے کے بانی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں جن کا شمار ہندوستان کے چند صف اول کے مصنفین ومؤلفین میں ہوتا ہے۔

اس ادارہ نے اب تک کم وبیش ایک سو سے زائد موضوعات پر ریسرچ کا کام انجام دیا ہے، جن میں تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں اور تحقیقات چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

۱۴۔ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ:

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول بہار کا شمار بھی مؤقر تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے جہاں تحقیق وتصنیف کا شعبہ نہایت سرگرم ومتحرک ہے۔ جس کے تحت درجنوں کتابیں ورسائل شائع ہوکر اہل علم سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' نے اب تک تقریباً دو درجن سے زیادہ اہم اور مؤقر کتابیں شائع کی ہیں اور تحقیق وتصنیف کا اس کا اپنا مستقل شعبہ ہے، جو اس کام پر مامور ہے اور ادباء، صحافی، اسلامی ریسرچ اسکالر پر مشتمل اس کی پوری جماعت ہے جو دہلی میں کام کررہی ہے، انشاء اللہ ہندی، انگریزی اور اردو میں بہت جلد اس کی مختلف تحقیقات منظر عام پر آنے والی ہیں۔

آج ہماری نگاہیں ترس رہی ہیں اور ہمارا قلب مایوس ہے کہ بہار جیسی ادبی اور ثقافتی سرزمین جہاں ملک کی سب سے مقتدر لائبریری ''خدابخش'' ہے، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ جیسی دینی اور اسلامی تحریک ہے، وہ سرزمین ندوۃ المصنفین دہلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دائرۃ المعارف حیدرآباد، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، اشاعت اسلام ٹرسٹ دہلی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا دہلی جیسے تحقیقی اداروں سے محروم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم کی اس سرزمین کے چپے چپے پر علم وتحقیق کی بزم آراستہ ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ اس وقت زمام اقتدار عالی جناب نتیش کمار جیسے علم دوست شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی علم دوستی کا ثبوت آج کی اس مجلس میں شرکت ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہر سطح پر تحقیق وتصنیف کے تربیتی مراکز قائم ہوں، اسی احساس کے تحت آج حضرات اکابر کی موجودگی میں ایک تحقیقاتی ادارے کے قیام کا اعلان کرتا ہوں، جس کا صدر دفتر پٹنہ میں ہوگا۔

امتنان وتشکر:

بہرحال ایک بار پھر میں دور دراز سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے تشریف لانے والے اپنے مہمانوں کا صمیم قلب سے استقبال کرتا ہوں اور اپنے ان کارکنان اور دوستوں کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے رات ودن کی انتھک کوششوں سے سمینار کو نتیجہ خیز بنایا۔

میں تمام احباب کا ممنون ومشکور ہوں خاص طور سے اس تقریب کے کنوینز جناب شاہ جہاں شاد صاحب جنرل سکریٹری سیمانچل ڈیولپمنٹ فرنٹ بہار، نائب کنوینز جناب محمد نسیم رحمانی صاحب نائب صدر سیمانچل ڈیولپمنٹ فرنٹ بہار، جناب عبدالقادر شمس صاحب، مولانا حمیدالدین مظاہری، قاری شمشیر جامعی، مفتی عقیل انور مظاہری، مفتی احمد نادر القاسمی صاحب، مظفر حسین رحمانی سکریٹری، مظہر حسین رحمانی خازن، شاہد عبداللہ آفس سکریٹری، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب صاحب، مصعب انیس، مولانا رضوان الحق قاسمی، مولانا عبد الواحد رحمانی صاحب، جناب مولانا محمد ارشد عالم ندوی، مولانا محمد یوسف انور، حسان جامی قاسمی، حامد عبداللہ، محمد فیاض، ظفر اقبال مدنی، شمیم اختر اور جملہ کارکنان واحباب قابل مبارک باد ہیں۔

و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

❁ ❁ ❁

خطبہ استقبالیہ

بموقع:	مسابقۃ القرآن الکریم وتعلیمی بیداری کنونشن
بتاریخ:	۱/۲/ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۴،۲۵/فروری ۲۰۱۲ء بروز جمعہ،شنبہ
بمقام:	جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار۔

الحمدللہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علٰی رسولہ الکریم.

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْأَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" "مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب: ۴۰)" "اَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ لاَ نَبِیَّ بَعْدِیْ (ابوداؤد: ۲/۲۲۴)" امابعد!

شمالی بہار کی علمی ودینی درس گاہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے ارباب حل و عقد، ذمہ داران، اساتذہ اور طلباء کرام اس عظیم الشان "تعلیمی بیداری کنونشن" میں آنے

والی تمام محترم ومعزز شخصیات کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں اور خوش آمدید پیش کرنے کو باعث فرحت وانبساط محسوس کرتے ہیں۔ہم اپنے تمام مہمانان کرام،حاضرین کے بھی بے حد ممنون ومشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت پر یہاں آنے کی زحمت گوارہ کی۔بطور خاص گرامی قدر خادم القرآن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی دامت برکاتہم بانی ورئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر،شیخ زکریا کے علوم ومعارف کے امین و پاسباں وامین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، ماہر تعلیم جناب پروفیسر اختر الواسع صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، عالی جناب شاہد علی خاں کابینی وزیر برائے اقلیتی امور وانفارمیشن ٹیکنالوجی حکومت بہار،حضرت علامہ باندویؒ کے جانشین حضرت مولانا قاری حبیب احمد باندوی مہتمم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ، نمونہ اسلاف حضرت مولانا مفتی عبداللہ مظاہری گجرات،فخر گجرات حضرت اجمیریؒ کے جانشین حضرت مولانا قاری رشید احمد اجمیری گجرات، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان علی گڑھ، حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی پٹنہ،حضرت مولانا بدرالدین اجمل قاسمی (ایم پی) آسام، حضرت مولانا مفتی سراج احمد انگلینڈ،حضرت مولانا حنیف لوہاروی گجرات،حضرت مولانا محمد اسلام قاسمی دیوبند،حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم فلاحی مہاراشٹر،حضرت مولانا احمد نصر کینٹ بنارس،حضرت مولانا مفتی ارشد فاروقی دیوبند،حضرت مولانا صغیر احمد رحمانی بگھیلی سپول، حضرت مولانا مفتی عقیل احمد قاسمی راندیر گجرات، حضرت مولانا محمد الیاس مظاہری پانولی گجرات،حضرت مولانا نظام الدین قاسمی مہاراشٹر،مفتی راشد خان القاسمی دہلی،مفتی افتخار الحسن بجنور ودیگر علمائے کرام اور شرکائے مسابقۃ القرآن الکریم وتعلیمی بیداری کنونشن کا میں بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت سے نوازا۔ایک بار پھر میں ان حضرات اکابر علماء کرام، دانشوران عظام اور ماہر سیاست داں کے علاوہ ملت وانسانیت کے زخم پر مرہم

رکھنے والے تمام ارباب بصیرت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دور دراز علاقوں سے لمبی مسافت طے کر کے اور صعوبتوں کو جھیل کر یہاں آنے کی تکلیف برداشت کی۔

بزرگو اور دوستو!

حضرات گرامی!

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ محض ایک دینی ادارہ ہی نہیں بلکہ شمالی بہار کے اس انتہائی پسماندہ علاقے میں ایک علمی تحریک ہے اور اب تک اس نے کئی محاذ پر دشمنان دین وملت سے ٹکراؤ مول لیا ہے اور الحمدللہ اسے پوری کامیابی ملی ہے، بالخصوص قادیانی فتنہ جس سے آپ حضرات اچھی طرح واقف ہیں یہ لوگ کس طرح سے ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں اقتصادی طور پر کمزور مسلمانوں کو اپنے دام میں لے کر راہ مستقیم سے انہیں بھٹکانے کے لئے سرگرم ہیں۔اس سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ گزشتہ چند سال سے ضلع سپول، سہرسہ، مدھے پورہ، ارریہ، پورنیہ، کٹیہار، کشن گنج، بھاگلپور اور مونگیر کے بعض علاقوں میں قادیانی سرگرم ہیں اور خاص طور پر ضلع سپول کو ان لوگوں نے اپنا مرکز بنا رکھا ہے،اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ چند برس قبل سپول کا ضلع مجسٹریٹ شریف عالم جو قادیانیوں کا ریاستی امیر ہے، پوری قوت سے اس باطل مہم کی سرپرستی کر رہا تھا۔الحمدللہ راقم الحروف کی تحریک اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے اساتذہ اور اراکین کی شب وروز محنت سے گمراہ ہو چکے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی گئی اور سیکڑوں لوگوں کو توبہ کرا کر راہ راست پر لایا گیا نیز ’’کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند‘‘ کے ذمہ داران کے مشورے اور تعاون سے اس کی ایک کمیٹی اور دفتر کا آغاز کر کے اصلاح معاشرہ اور قادیانی مہم کی سرکوبی کی جدوجہد شروع کی گئی جو ہنوز جاری ہے۔

جامعۃ القاسم نے سب سے پہلے قادیانی سرگرمیوں اور ضلع مجسٹریٹ شریف عالم

کی کارستانیوں سے ملک کے دوسو سے زائد علماء وقائدین کو خصوصی مکتوب کے ذریعہ آگاہ کیا، علماء واکابر نے اس مسئلہ پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ہماری ہمت بڑھائی اور حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ حکم ومشورہ دیا کہ تحفظ ختم نبوت کی اس عظیم خدمت کو انجام دینے کے لیے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں اور قادیانیوں کے بڑھتے قدم کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ چنانچہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ میں قائم ’’شعبۂ تحفظ ختم نبوت‘‘ نے کوسی کمشنری، پورنیہ کمشنری اور بھاگل پور کمشنری کے ایک درجن اضلاع کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور جائزہ کی روشنی میں ان علاقوں کی نشاندہی کی جو قادیانیت کی زد میں تھے، پھر وہاں اصلاح حال کی کوشش کی گئی، علماء وائمہ کے درجنوں تربیتی کیمپ سمیت ۱۹؍۲۰؍۲۱؍نومبر ۲۰۰۸ء کو جامعۃ القاسم کے احاطے میں ایک کیمپ منعقد کیا گیا جس میں تقریباً پانچ سو علماء وائمہ کی تربیت دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہانپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے ماہر علماء اور اس موضوع پر دسترس رکھنے والے حضرات نے انجام دی اور پھر وہیں ایک عظیم الشان اجلاس بعنوان ’’تحفظ ختم نبوت کانفرنس‘‘ منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی قاسمی (چیئرمین شرعیہ کونسل ڈیوزبری، برطانیہ)، حضرت مولانا مفتی احمد دیولہ (بانی و مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر، گجرات) جناب علی انور (ایم پی) شریک تھے۔ اس کے بعد تاراپور، بھاگلپور میں ۱۵؍دسمبر ۲۰۰۸ء کو غازی پور ضلع مونگیر میں ۱۶؍دسمبر ۲۰۰۸ء کو، ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۸ء کو جامع مسجد مونگیر میں، ۱۸؍دسمبر ۲۰۰۸ء چوڑھلی کھگڑیا میں، ۱۹؍۲۰؍۲۱؍دسمبر ۲۰۰۸ء کو سپول میں اسی طرح کے تربیتی کیمپ اور اجلاس عام منعقد کیے گئے جن میں ممتاز علماء اور مبلغین نے شرکت کی اور قادیانیت کی حقیقت سے عوام کو آگاہ کیا۔ اس دوران بڑی تعداد میں قادیانیوں نے توبہ کی اور تجدید ایمان کر کے راہ راست پر آئے۔

اس کے علاوہ دو درجن مقامات پر بڑے بڑے اجلاس منعقد کیے گئے نیز چھوٹی چھوٹی میٹنگیں کر کے حکمت عملی طے کی گئی، الحمدللہ اس میں کافی حد تک کامیابی ملی، دوسری طرف راقم الحروف نے ایک وفد کے ساتھ بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار سے تین بار ملاقات کی اور قادیانی ڈی ایم کی سرگرمیوں سے انہیں آگاہ کیا، چنانچہ وزیر اعلیٰ نے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا اور آئی اے ایس افسر شریف عالم کا تبادلہ ہوگیا۔ باوجود اس کے قادیانی اثرات اتنی گہرائی تک پھیل چکے ہیں کہ انہیں جلد زائل کرنا مشکل ہو رہا ہے، تاہم ہمارے رفقاء اس میں اس وقت بھی سرگرم ہیں۔

محترم سامعین!

قرآن مجید ایک سراپا اعجاز کتاب ہے، اس کا ایک ایک لفظ علم وحکمت کا خزانہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر دور، ہر خطہ کے ہر ایک انسان کی مکمل راہنمائی کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اسلام دشمنوں کی طرف سے برپا کئے گئے خطرناک طوفان میں بھی اس کی عظمت ووقار میں رتی بھر فرق نہ آیا اور نہ قیامت تک آئے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ قرآن کریم ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر حیات بعد الموت تک کے سارے مسائل اور ضابطے موجود ہیں۔ قرآن حکیم جہاں ہمیں خدا کی عبادت وریاضت کی مکمل تعلیم دیتا ہے وہیں اس میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تجارتی رموز ومسئلے بھی مذکور ہیں یعنی قرآن مقدس صداقت وحقانیت کا مظہر ہے۔ دین ودنیا کی فلاح وکامیابی کا ضامن ہے۔ علوم وفنون کا سرچشمہ اور گیرائیوں اور گہرائیوں کا بحر ناپیدا کنار ہے، یہ وہ کوزہ ہے جس میں سمندر سمو دیا گیا ہے تبھی تو زمین سے لے کر آسمان تک اور ازل سے لے کر ابد تک کے تمام حالات اس میں سمٹ آئے ہیں۔

قرآن کریم کی سحر انگیزی اور قوت وتاثیر کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

دیوبندیؒ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں بہت سے واقعات تحریر کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے سرداران ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق جو دن کے اجالوں میں قرآن پاک مٹانے پر کمربستہ رہتے تھے لیکن رات کی تاریکی میں وہ بھی چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے اور اس کی حلاوت وچاشنی سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اس کو سننے میں ایسے محو اور مستغرق ہوجاتے تھے کہ انہیں رات گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ بہت سے لوگ قرآن پاک کی سحر انگیزی سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔

حضرات محسنین!

مسابقۃ القرآن الکریم اور تعلیمی بیداری کنونشن کے موقع پر مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی تأمل نہیں کہ مدارس کے نظام تعلیم میں وحی الٰہی کو جو مقام ومرتبہ ملنا چاہئے اور کلام الٰہی کی تعلیم وتفہیم کی جو برکت محسوس ہونی چاہئے اس میں کافی کمی، نقص اور کوتاہی پائی جاتی ہے، قرآن مجید کی تعلیم وتفہیم سے ہماری نئی نسل کو جو قوت حیات ملنی چاہئے وہ نہیں مل پارہی ہے، ایسے نازک حالات میں جب کہ چہار جانب سے دشمنان اسلام کتاب الٰہی پر سوال اٹھارہے ہیں، ہماری ذمہ داری ہے کہ پوری قوت کے ساتھ طلبہ میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کریں۔ اسی طرح ہمیں دوراندیشی اور حکمت عملی سے دشمنوں کی ناپاک سازشوں کو ناکام کرنا ہوگا۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو موجودہ مسائل کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ قرآن کریم کی جن آیات کو بطور خاص تنقید واعتراض کا نشانہ بنایا جارہا ہے ان کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ شبہات خود بخود ختم ہوجائیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ قرآن پاک پر جس منصوبہ بندی کے ساتھ حملے ہورہے ہیں اس منصوبہ بندی کے ساتھ ہم اس کا دفاع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکے ہیں۔

اسیر مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے پونے چار سالہ اسیری سے رہائی کے بعد اکابر علماء کی موجودگی میں فرمایا تھا:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیاوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دوسبب معلوم ہوئے ہیں۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کا اختلاف اور خانہ جنگی، اسی لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی بقیہ زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن مجید کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کو بھی قرآن مجید کی اس اہمیت ومعنویت کا بھرپور ادراک واحساس تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تباہی کو مہجوریٔ قرآن کا نتیجہ قرار دیا۔

خوار مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چوں شبنم برزمین افتندہ اٗ
دربغل داری کتاب زندہ اٗ

ایک دوسری جگہ اقبالؒ کہتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ دودل مضمراست
ایں کتاب نیست چیزے دیگراست

اللہ رب العزت اس مسابقۃ القرآن الکریم اور تعلیمی بیداری کنونشن کو دین وملت کے حق میں مفید بنائے۔ ہم قرآن کریم سے متعلق ایسے تمام کاموں کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں۔ بالخصوص خادم القرآن مولانا غلام محمد وستانوی صاحب مدظلہ العالی کا جو ایک عرصہ سے شاندار اور منظّم طریقہ سے قرآن پاک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے (آمین)

ملت اسلامیہ کے جیالو!

یہ مسابقۃ القرآن الکریم کا انعقاد بھی دراصل شیخ وستانوی کی توجہ خاص اور انہی کی مرہون منت ہے، آج جو ہم اس پروگرام کا شاندار انعقاد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اگر حضرت وستانوی صاحب جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں فرماتے تو اس مسابقہ کا انعقاد ناممکن تھا۔ ہم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی پاک کتاب اور کلام الٰہی کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اسی سے یہ بھی دعا گو ہیں کہ قرآن پاک سے منسوب اس حقیر کوشش کو شرف قبولیت بخشے اور آئندہ بھی ہمیں اس طرح کی علمی، دینی و دعوتی خدمت کے مزید مواقع عطا فرمائے۔ (آمین)

معزز علمائے کرام اور سامعین!

''تعلیمی بیداری کنونشن'' کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ علم کی اہمیت، افادیت اور اس کی معنویت کی اس وقت پوری دنیا نہ صرف قائل ہے بلکہ اس کے حصول کیلئے نت نئے اصول مرتب کئے جارہے ہیں جس کے توسط سے وہ کامیابی کے ایک کے بعد ایک معرکے سر کرتے جارہے ہیں مگر ہم جہاں تھے وہیں ہیں۔ ایک طرف غیر قومیں علم کی بدولت ترقی کے بام عروج پر فائز ہیں اور دوسری طرف ہماری قوم علم سے دوری اور غفلت کے سبب پستی

کی طرف جارہی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ قبل اسلام علم کی کوئی خاص قدر ومنزلت نہیں تھی، پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ الامین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپؐ کے وجود مسعود نے مسلمانوں کے اندر علم وفن کی جستجو اور تلاش شعور وآگہی کا جذبہ پیدا کردیا، اس کے بعد علم کی ایسی بہار چلی جس سے جہالت کی تاریکی دور ہوئی اور دنیا علم کی روشنی سے جگمگا اٹھی، پورا عالم انسانیت علم وحکمت اور صنعت وحرفت کے زریں اصول سے آگاہ ہوا۔ ہر طرف علم کا بول بالا ہوا اور پورا کرۂ ارض نور علم سے منور ہوا۔ دنیائے علم وفن، طب وجراحت، طبیعات، کیمیا، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ابن نفیس، عمر خیام، ابن اللہ، الہیثم جیسے حکمائے وقت پر آج بھی ملت فخر کرسکتی ہے۔

حضرات گرامی!

افسوس صد افسوس کہ آج صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، جو قوم شروع سے ہی علم وقلم کی طاقت وقوت اور عرفان ومعرفت کی معنویت سے پوری طرح واقف تھی، جوارض وسما، بحر وبر، نباتات وحیوانات کی تخلیق پر تحقیق کی بدولت بلند مقام پر فائز تھی اور دنیائے علم وعرفاں کے میدان میں جس کی امامت تسلیم کی جاچکی تھی آج وہی قوم تعلیم وتعلم سے دور ہے۔ بصارت وبصیرت سے محروم ہے، جہالت وناخواندگی اس کی پہچان ہے، غربت وافلاس اس کا مقدر ہے، حالت یہ ہے کہ جو قومیں عقل وخرد سے عاری اور علم وہنر سے بے بہرہ تھیں وہ تعلیمی میدان میں ہم سے بہت آگے نکل کر ہمیں آئینہ دکھا رہی ہیں۔

اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری اس حالت کیلئے ملک و ریاستوں کی حکومتیں ذمہ دار ہیں۔ سیاسی جماعت اور فرقہ پرست طاقتوں نے مسلمانوں کو ہر محاذ پر ناکام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ خاص کر تعلیمی، معاشی میدانوں میں ہماری خستہ حالی اور بدحالی کے لئے جس غیر مساویانہ، غیر منصفانہ اور متعصّبانہ رویہ کا مظاہرہ کیا ہے

اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رنگ ناتھ مشرا کمیشن اور سچر کمیٹی کی رپورٹوں کو پڑھنے کے بعد ہماری آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں کہ اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت جس نے ملک کی آبیاری کی، ہندوستان کو استعماریت سے آزاد کرانے اور ملک وملت کی تعمیر کے لئے پچاسی ہزار علماء نے تختۂ دار کو بھی قبول کیا، قید وبند کی صعوبتوں کو بھی گلے لگایا اور کالا پانی کے لئے جلاوطنی سے بھی گریز نہیں کیا، جبکہ آج ان کی اولاد اور وہی قوم سب سے زیادہ پسماندہ اور بدحال ہے۔ آج دنیا کے طریقۂ علاج میں امراض معلوم ہوتے ہی فوراً علاج کے تدابیر تلاش کئے جاتے ہیں، مگر مسلم امہ کا مرض معلوم ہو گیا ہے پھر بھی علاج کی تدابیر کا کوئی نظم نہیں کیا گیا، آخر یہ عمل کس بات کا غماز ہے؟______ جاگو! جاگو! جاگو!

بقول شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبالؒ:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حضرات گرامی!

ہماری پسماندگی اور ناخواندگی کی شرح میں تشویشناک حد تک کمی کے جو اسباب ہیں ان کو میں آپ کے گوش گزار کرتا چلوں:

۱۔ مسلم آبادیوں میں مکاتب اور اسکولوں کا نہ کھولا جانا
۲۔ سرکاری اور مشنری اسکولوں میں مسلم طلبہ کے ساتھ ناانصافی، حوصلہ شکنی اور قصداً نتائج کا متاثر کرنا تاکہ بڑے اداروں اور پیشہ ورانہ کورسز میں داخلہ نہ ہو سکے۔
۳۔ بڑے تعلیمی اداروں میں مسلم طلبہ کے داخلہ کے لئے نامناسب شرطیں اور رکاوٹیں پیدا کرنا۔
۴۔ مختلف فنی اور معلوماتی کورس میں داخلہ نہ ہونا۔

۵۔ موزوں مضامین کے انتخاب، پیشہ ورانہ تعلیم، تعلیمی وظائف، قرضے، رعایتیں اور بیرون ملک میں اعلیٰ کاموں کے مواقع کا فراہم نہ ہونا۔
۶۔ مسلم طلبہ کی آئی آئی ٹی کی تربیت کے لئے کسی بندوبست کا نہ ہونا۔
۷۔ ذہین، محنتی اور ذی استعداد طلبہ کے لئے کوچنگ کا معقول انتظام نہ ہونا۔
۸۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی توسیع وترقی میں غیر ضروری دشواریوں کو کھڑا کرنا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں جن پر ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ حکومتیں توجہ نہیں دے رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی کھلے دماغ سے تسلیم کرنا چاہئے کہ تعلیم کے سلسلہ میں ہم نے کبھی بھی اپنے فکر وخیال اور کردار وعمل پر سنجیدہ غور وفکر نہیں کیا، اپنی ترجیحات میں تعلیم کو دوسرے نمبر پر رکھا اور اپنا کوئی مستقل تعلیمی نظام نہیں بنایا۔ نیز اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کو اسلام کے منافی سمجھ کر کافی عرصہ سے تحقیق وجستجو اور جدید ٹیکنالوجی کے میدان میں کوئی مثبت رول نہیں ادا کیا ہے۔ حالانکہ ترقی کے لئے جتنے مواقع اور وسائل وذرائع غیر قوموں کے پاس ہیں اس سے ملت اسلامیہ پیچھے نہیں ہے۔

ان وسائل وذرائع کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنے کی اور علم وتحقیق کے میدان میں پیش رفت کرنے کی اشد ضرورت ہے، فطرت کا قانون ہے جو بڑھنا چاہتا ہے قدرت اس کی مدد کرتی ہے اور غیب سے اس کی مدد کرتی ہے۔ اس لئے حالات کا رونا بند کر کے نئے فکر وعزم کے ساتھ اپنے حالات میں تبدیلی لانے کیلئے مستحکم جدوجہد ناگزیر ہے۔ اپنا ایک تعلیمی ایجنڈا تیار کریں اور اس کے مطابق کوشش کرنا قوم کی پسماندگی کو دور کرنے کا بہترین علاج وتدارک ہے۔ آج اس عزم وارادہ کے ساتھ تعلیمی بیداری کنونشن سے جائیں گے۔ قوم میں تعلیمی بیداری کے فرائض کو پوری ایمانداری سے انجام دیں گے۔ اپنے بچوں، پڑوسیوں کے بچوں

اور محلے کے بچوں کو مدارس واسکول کالجز تک ضرور پہنچائیں گے۔ (انشاء اللہ)۔

مہمانان ذی وقار!

میں ایک بار پھر دور دراز سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے تشریف لانے والے اپنے مہمانوں کا صمیم قلب سے استقبال کرتا ہوں اور اپنے ان کارکنان اور دوستوں کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے رات ودن کی انتھک کوششوں سے کنونشن کو نتیجہ خیز بنایا۔

میں تمام احباب کا ممنون ومشکور ہوں بطور خاص مولانا محمود الحسن ایوبی صاحب، جناب عبدالقادر شمس صاحب، مولانا حمید الدین مظاہری، قاری شمشیر عالم جامعی، مفتی عقیل انور مظاہری، مفتی احمد نادر القاسمی صاحب، مظفر حسین رحمانی سکریٹری، مظہر حسین رحمانی خازن، شاہد عبداللہ آفس سکریٹری، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، مصعب انیس، مولانا رضوان الحق قاسمی، مولانا عبدالواحد رحمانی، مولانا محمد ارشد عالم ندوی، مولانا محمد یوسف انور، مولانا حسان جامی قاسمی، حافظ حامد عبداللہ، مولانا محمد فیاض، ظفر اقبال مدنی، مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی پٹنہ، جناب شاہ جہاں شاد، محمد نسیم رحمانی، مولانا محمد طارق نعمانی دیوبند، مولانا بدرالدجی کٹیہار، مفتی علیم الدین قاسمی ارریہ، مولانا منظور نعمانی پورنیہ، مولانا نعمت اللہ قاسمی اکل کوا، مولانا نورالہدیٰ قاسمی سپول، مولانا انعام الحق قاسمی بھاگل پور، ماسٹر شمس تبریز راندیر سورت، جناب نیر خورشید پٹنہ، قاری عظیم الدین رحمانی دربھنگہ، مولانا تاج الدین قاسمی چمپارن، شمیم اختر اور جملہ اساتذہ ومخلص طلبا، کارکنان واحباب قابل مبارک باد ہیں جنہوں نے ہر طرح کا تعاون کیا۔ جزاکم اللہ خیرا لجزاء

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

خطبہ صدارت

بموقع: سمینار انٹرنیشنل

بعنوان: بدیع الزماں سعید النورسی کے نقطۂ نظر کے تناظر میں اسلام اور جدیدیت

زیر اہتمام: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
استنبول فاؤنڈیشن برائے سائنس وثقافت، ترکی

بمقام: FTK سینٹر برائے انفارمیشن ٹیکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

بتاریخ: ۲۵ر تا ۲۷ر ربیع الاول ۱۴۳۴ھ بمطابق ۷ر تا ۹ر فروری ۲۰۱۳ء

الحمد للہ رب العٰلمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وعلیٰ من تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین، اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ، تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: تَرَکتُ فِیکُم أَمرَینِ لَن تَضِلُّوا إِن تَمَسَّکتُم بِھِمَا کِتابَ اللّٰہِ وسُنَّتِي.

اسٹیج پر تشریف فرما معزز مہمانان، گرامی قدر! پدم شری جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب، پروفیسر جناب سید رضی احمد کمال صاحب، جناب ڈاکٹر محمد ارشد صاحب، ڈاکٹر زبیر ظفر خان صاحب اور محترم سامعین کرام، بزرگو، دوستو، پیارے ساتھیو، دینی بہنو، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور استنبول فاؤنڈیشن ترکی جن کی مشارکت سے ’’اسلام اور جدیدیت‘ کے عنوان سے سہ روزہ اہم دینی، تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی پروگرام منعقد ہو رہا ہے اس کے لئے میں دل کی گہرائی سے ذمہ داران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اس کے بعد یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس لائق نہیں تھا کہ مجھے کرسیٔ صدارت پہ بٹھایا جائے اور میں بیٹھوں، مگر استاذ گرامی آج کے پروگرام کے روح رواں ممدوح عالی قدر جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب (اللہ ان کی عمر وعمل میں برکت عطا فرمائے) کے حکم کی تعمیل میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔

بہرحال مجھے کچھ کہنا ہے اور وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کے پروگرام کی مناسبت سے کچھ باتیں عرض کروں گا۔

دوستو! میں کل سے جب اس انٹرنیشنل کانفرنس کا آغاز ہوا اس وقت سے پروگرام میں شریک ہوں، بہت قیمتی باتیں اور اس سیشن کے مقالات بھی سامنے آئے، میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا، میں جو کچھ شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کے حالات زندگی کے بارے میں اخذ کرسکا ہوں وہ یہ کہ اسلام اور دین کے خادم اور اسلام سے محبت کرنے

والے اس سپاہی کے اندر امت اور دین کے بارے میں جو تڑپ ہونی چاہئے وہی تڑپ اور اضطراب شیخ بدیع الزماں سعید نورسی علیہ الرحمہ کی زندگی میں محسوس کرتا ہوں۔

بہی خواہان ملت! آپ جانتے ہیں کہ دین اسلام کی بنیاد وحی الٰہی پر قائم ہے اور اس کے سرمدی اصول غیر متبدل اور نا قابل تغیر ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وحی الٰہی کی بنیاد پر ترتیب پانے والا معاشرہ نہ تو غیر مہذب ہوتا ہے اور نہ پسماندہ۔ مفکرین یورپ کو اس بات کی پریشانی رہتی ہے کہ وہ کونسی چیز ہو جس کی بنیاد پر مسلم معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ چنانچہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے نئ سے نئ تھیوری وفلسفہ پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ صدی ’’جدیدیت‘‘ کی صدی تھی۔ جدیدیت اصل میں ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کا نام ہے جو گزشتہ دو صدیوں کے یورپ میں ’’روایت پسندی‘‘ Tranditionalism اور کلیسائی استبداد کے ردعمل میں پیدا ہوئیں اور ’’مابعد جدیدیت‘‘ ان افکار کے مجموعے کا نام ہے جو جدیدیت کے بعد اور اکثر اس کے ردعمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ مابعد جدیدیت کے نظریہ کا گہرائی سے عام لوگوں کو اگرچہ علم نہیں ہوتا لیکن وہ محسوس وغیر محسوس طریقوں سے اپنی عملی زندگی اور رویوں میں اس کے اثرات قبول کر لیتے ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ افکار، نظریات، آفاقی صداقت، مقصدیت اور آئیڈیا لوجی سے لوگوں کی دلچسپی کو کم کر دیا جائے۔ اسلام کی نظر میں یہ خطرناک موڑ ہے کہ انسان اصول ومقاصد پر عدم یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔

محبان گرامی! بہرحال میں نے ان کی زندگی میں دو باتیں بہت اہم پڑھیں ایک شخصیت سازی کا جذبہ اور طریقۂ کار اور دوسرے محمد عربی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے پر افراد و جماعت اور نئی نسل کے مضبوط گروہ کو تیار کرنا، جو ایک طرف اپنے اندر خود اعتمادی کی قوت رکھتے ہوں اور دوسری طرف صحابۂ کرامؓ جیسا اللہ کے

دین اور انسانیت کو راہ راست پر لانے کیلئے مر مٹنے کا حوصلہ اور یہی وہ اہم اور طاقتور جذبہ تھا جس نے شیخ بدیع الزماں سعید نورسی علیہ الرحمہ کو اپنے مشن اور فکر وعمل میں کامیابی سے ہمکنار کیا، جو ترکی کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

انہوں نے جو افراد تیار کئے ان میں وہی اسپرٹ اور احیائے دین کا وہی بے لوث جذبۂ صادق پایا جاتا ہے جو اپنے دین اور اسلام کے تئیں صحابۂ کرامؓ میں پایا جاتا تھا، جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ، تَرٰاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ''میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہر کام میں رسولؐ کا طریقہ جب تک ایک مسلمان اور ملی و دینی کام کرنے والے افراد میں نہیں ہوگا کامیابی نہیں مل سکتی اور شیخ بدیع الزماں علیہ الرحمہ نے اسی کو پیش نظر رکھا اور اسی لئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں یہ نصیحت فرمائی:
''تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي''۔

حضرت شیخ بدیع الزماں نے اپنے رسول کے طریقہ کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے داعی، قائد اور رہنما تیار کئے، جس کی مثال خود موجودہ ترکی کے شیخ الکل محمد فتح اللہ گولن آفندی موجود ہیں۔

ان کی زندگی سے ہمیں یہ روشنی ملتی ہے کہ ہمیں بھی آج مسلکی، فکری اور جماعتی و گروہی بندشوں میں جکڑی ہوئی امت کے درمیان اور بالخصوص نئی نسل میں اسی طرح سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں بس اتنا کہوں گا کہ اسلام ہمیشہ اور قیامت تک آنے والی انسانیت کی ابدی رہنمائی کیلئے آیا ہے، یہ اللہ کا آخری دین ہے، چاہے عہد جدید ہو یا آنے والا کوئی اور عہد، جس کا جو بھی نام دیا جائے، انسانیت کی رہنمائی کرتا رہے گا، حضرت اجمیری، حضرت

نظام الدین، حضرت مخدوم یحییٰ اشرف منیری، شیخ احمد سرہندی، علامہ ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، الامام محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا یحییٰ علی، مولانا ولایت علی عظیم آبادی، جعفر تھانیسری اور شیخ بدیع الزماں سعید نورسی رحمہم اللہ اور ان جیسے خدام دین انشاء اللہ پیدا ہوتے رہیں گے، اللہ نے اس کا اعلان فرمادیا ہے اور یہ آخری پیغام ہے ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا''

اسلام ہمیشہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ انسانیت کو آگے بڑھاتا رہے گا، چاہے ماڈرن ایج ہو یا قیامت تک آنے والا کوئی اور عہد۔

بہرحال دوستو! شیخ بدیع الزماں سعید نورسی اور امت کے ان جیسے افراد کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں کام کا جذبہ ہو تو حالات اس کی راہ نہیں روکتے۔ آج بھی اس جذبہ کی ضرورت ہے۔

میں اپنی بات اس پر ختم کرتا ہوں کہ

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ شیخ بدیع الزماں سعید نورسی اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے والے حضرات علماء ومبلغین اور رجال کار کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہماری کوششوں کو اپنے فضل سے قبول فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

کلیدی خطبہ

بموقع:	تیرہواں کل ہند مسابقۃ القرآن الکریم
بتاریخ:	۱۶؍تا ۱۸؍ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۷؍تا ۱۹؍اپریل ۲۰۱۴ء
بمقام:	حج ہاؤس، سی۔ایس۔ٹی (وی ٹی) ممبئی
زیر اہتمام:	ادارہ دعوۃ السنّہ مہاراشٹر، ممبئی

الحمدللّٰہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علٰی رسولہ الکریم.
أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ”اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْأَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ“ وَقَال اللّٰہ تعالیٰ: وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاً“ وقال النبی ﷺ ”خَیْرُکُم مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ و عَلَّمَہُ“ امابعد!

وطن عزیز کے شہر عروس البلاد ممبئی کی اس قرآنی و ایمانی مجلس میں جلوہ افروز علوم ربانی کے آفتاب و ماہتاب، ملت اسلامیہ ہند کی آرزوؤں کے مرکز مخدوم ومکرم مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، علامۃ العصر حضرت مولانا ابوظفر حسّان ندوی ازہری صاحب مدظلہٗ، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت فیوضہم جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، خادم القرآن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب دامت برکاتہم بانی ورئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر، ماہر تعلیم، عظیم ملی دانشور جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند وسابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، خادم ملت عالی جناب سراج الدین قریشی صاحب صدر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، شیخ القراء حضرت مولانا قاری مشتاق احمد صاحب، بانی ومہتمم جامعہ عالیہ عرفانیہ، لکھنؤ، ناشر القرآن حضرت مولانا قاری فرقان مہربان علی القاسمی المدنی صاحب، بانی ومہتمم جامعۃ القرآن والسنّہ الخیریہ بجنور، صاحبزادہ عارف باللہ قطب ربانی حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ، حضرت الحاج مولانا ارشاد احمد صدیقی صاحب، عالی جناب فیصل علی صاحب گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا، عالی جناب حافظ محمد عاصم قاسمی صاحب صاحبزادہ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، خادم القرآن والتجوید قاری محمود الحسن صاحب، محبّ گرامی حضرت مولانا مفتی احمد نادر القاسمی باحث ورفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، قابل احترام جناب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی صاحب ایڈیٹر ماہنامہ معارف قاسم جدید وسب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب دہلی اور آج کے پُروقار اور تاریخی ”مسابقۃ القرآن الکریم“ کے روح رواں، آرگنائزر وداعی اور خادم السنّہ حضرت مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی صاحب زید مجدہٗ، شہر ممبئی کے ملی اور قومی عظمت کے محور ومرکز الحاج جناب عبدالقادر صاحب سپاری والا، الحاج جناب عرفان صاحب اَلّانہ، الحاج جناب ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر صاحب، الحاج جناب عبدالحفیظ صاحب ریشم والا، الحاج جناب ہارون بھائی موزہ والا، الحاج جناب اشفاق صاحب کل ہند

مکاتب قرآنیہ، الحاج عبدالغنی صاحب اطلس والا، الحاج جناب محمد اقبال صاحب چوہان، الحاج جناب ذاکر حسین صاحب چوہان، لائق احترام سیاسی قائد الحاج جناب ابوعاصم اعظمی صاحب (ایم ایل اے)، شہر ممبئی کے جملہ خیرخواہان وبہی خواہان ملت اسلامیہ، دانشوران قوم اوراس نورانی بزم میں شرکت کیلئے تشریف لانے والے حضرات علماء کرام ومندوبین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم حضرات اہالیان ممبئی!

یہ آپ کیلئے کس قدر عزت وشرافت اور سعادت کی بات ہے کہ آپ اس وقت امت کے کریم طبقہ اور مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان ہیں اور دنیا کی سب سے عظیم نعمت قرآن کریم کی برکت سے اپنے آپ یہ سعادت آپ کے گھر چل کر آگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سعادت کو قبول فرمائے۔ (آمین) آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ یہ موقع آپ کے ہاتھ آیا (الحمد للہ علیٰ ذالک)۔ میں سب سے پہلے اس نعمت عظمیٰ کی یافت اور ''مسابقۃ القرآن الکریم'' کے انعقاد پر مخدوم گرامی جناب مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی صاحب اوران کے معاونین ومخلصین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

حضرات گرامی!

یہ بات ہم سب کے علم میں یقیناً ہوگی کہ کسی بھی نوعیت سے کلام اللہ کی خدمت انجام دینے والا انسان بہت ہی عظیم اور قابل قدر ہوتا ہے، کیونکہ یہ خدمت توفیق باری تعالیٰ کے بغیر ممکن نہیں، ورنہ جن لوگوں کے پاس وسائل اور دولت کی بھرمار ہے وہ قرآن مقدس کی تعلیمات کوفروغ دینے کیلئے بہت کچھ کر سکتے ہیں،لیکن یہ بات سب کے مشاہدہ میں ہے کہ کتاب عظیم کی خدمت کا یہ شرف ان کے حصہ میں نہیں آیا۔ کتنے ہی ایسے خوش نصیب لوگ ہیں جو تہی دست اور وسائل زندگی سے محروم ہیں،مگر قرآن مجید کی خدمت میں

اپنی زندگیاں قربان کررہے ہیں، یقیناً ایسے سعادت مندوں کیلئے یہ بشارت ہے:

''خَیرُکُم مَن تَعَلَّمَ القُرآنَ وَعَلَّمَہ''

(تم میں سب سے بہترین وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے)۔

ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک مفلوک الحال اور ناتواں شخص نے مرضیٔ رب سے خدمت دین کا ارادہ کیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے ایک ننھا سا پودا لگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ننھا سا پودا ایک تناور شجر بن گیا اور ایک دنیا اس سے سیراب ہونے لگی۔تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کے لئے دور دراز سے آنے لگے، وہ شہروں کی آرام وآرائش والی زندگی کو تج کرایک دور افتادہ گاؤں کا رخ کرنے لگے جہاں سہولیات نام کی کوئی چیز نہیں۔قرآن کریم سے محبت اور والہانہ عقیدت کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے اوراس مخلصانہ جدوجہد کے سبب سسکتی اور دم توڑتی انسانیت کو چین وسکون کی دولت بے بہا حاصل ہوئی۔

اس ضمن میں صرف ازہر ہند دارالعلوم دیوبند اوراس کے بانی، برصغیر میں دینی نظام تعلیم کے مجدد، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہی مثال کافی ہے۔حضرت نانوتوی ہندوستان کے ایک ممتاز، باعزت، صدیقی خاندان کے فرد، جلیل القدر عالم، حدیث وفقہ اور فلسفہ وعلم کلام کے عالی مرتبہ ماہر، تصوف کے رمز شناس، علوم اسلامی کے شناور، اسرار شریعت کے راز داں، زوال ملت کے نبض شناس، میدان جنگ کے حوصلہ مند سپاہی اور مجاہد نیز مغلیہ دور حکومت کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے بافیض، دینی علمی ادارہ، بلکہ ملت اسلامیہ کی آبرو اور قافلہ دیوبند کے سالار باوقار تھے۔انہوں نے اشاعت دین، خدمت کلام الٰہی، علوم اسلامیہ کے فروغ اور دعوت و تبلیغ کیلئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔اگر ہم یہ کہیں کہ آج ہندو پاک میں علم کی جو شمع

روشن ہے وہ آپ ہی کی فکرِ رسا اور جدو جہد کا فیض اور مولانا مملوک علیؒ کی تربیت کا نتیجہ ہے تو یہ قطعی غلط نہ ہوگا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں قرآن مجید، حدیث، سنت وشریعت کی جو گرہ کشائی فرمائی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت کا ایک منفرد حصہ ہے۔ خصوصاً شریعت اور عقائد واعمال کی حکمتوں اور اسرار وحکم پر حضرت مولانا کے افادات وتحریرات، ایک نئے اور مستقل علم کلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کے خلوص، جذبۂ صادق اور جدو جہد و دینی قربانیوں کا ہی ثمرہ ہے کہ علماء دیوبند علوم وفنون کے ہر شعبے میں نمایاں حیثیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ صرف قرآن کریم سے متعلق علماء دیوبند کی تالیفات وتصنیفات کا احاطہ کریں تو یہ کام بھی آسان نہیں ہے۔ البتہ بطور نمونہ چند کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے، جن سے قارئین اندازہ لگاسکیں گے کہ کتاب وسنت کی تشریح وتطبیق سے متعلق علماء دیوبند کی یہ کس قدر جلیل القدر، ادق اور منفرد تالیفات ہیں جن کے ذریعے امت کو نفع کثیر پہنچ رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک پہنچتا رہے گا، بالخصوص اہل سنت والجماعت کے اس طائفہ منصورہ کی قرآنی اور تفسیری خدمات دیکھ اور پڑھ کر نہ صرف یہ کہ سرفخر سے اونچا ہوجاتا ہے، بلکہ ہر قاری کو (بقول خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی) اس جماعت کے جماعت حقہ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔

علماء دیوبند کی قرآنی وتفسیری خدمات کے چند نمونے

1- ترجمۃ القرآن بزبان اردو. شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔

2- تکملہ فوائد شیخ الہند: شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانیؒ، سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ سے آخر قرآن تک۔

3- تفسیر بیان القرآن ۱۲ حصص: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، یہ

مبارک تفسیر نفائس جلیلہ وفوائد قیّمہ اور انتہائی نادر ابحاث پر مشتمل ہے، یہ ترجمہ الفاظ وتراکیب اور لغوی وصحفی اسلوب سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ مولانا مودودی جیسے ماہر ونقاد مفسر قرآن نے اس کو الہامی ترجمہ وتفسیر ہونے کا اعتراف کیا ہے، اردو زبان میں لکھی جانے والی تفسیروں میں نہ صرف یہ کہ اہم تفاسیر میں اس کا شمار ہے، بلکہ سند کی حیثیت حاصل ہے۔

4- خلاصۂ تفسیر بیان القرآن: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

5- فتح المنّان فی تفسیر القرآن: مولانا عبدالحق دہلوی دیوبندیؒ، یہ تفسیر آٹھ ضخیم جلدوں میں اردو وعربی دونوں زبانوں کے ابحاث پر مشتمل ہے۔

6- البیان فی علوم القرآن: یہ بھی مولانا عبدالحق دیوبندیؒ کی کتاب ہے اور قرآنیات پر لکھی گئی اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔

7- مُشکِلات القرآن: امام العصر الشیخ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، یہ کتاب عربی زبان میں ہے، انتہائی اعلیٰ ابحاث اور علمی وتحقیقی مواد پر مشتمل ہے۔

8- اعجاز القرآن: شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانیؒ

9- ترجمہ قرآن مع فوائد تفسیریہ: اردو زبان میں، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی تصنیف ہے

10- حاشیہ تفسیر البیضاوی: عربی زبان میں، مولانا عبدالرحمٰن اَمروہویؒ

11- حاشیہ تفسیر الجلالین: مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندیؒ

12- سَبقُ الغایات فی نَسق الآیات: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اس کا جدید ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں مولانا محمد عبیداللہ اسعدی شیخ الحدیث جامعہ ہتھورا باندہ و سکریٹری برائے سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی کی تحقیق وتعلیق سے ''ایفا پبلیکیشنز''

جو گابائی سے شائع ہوا ہے۔

13- تفسیر معارف القرآن: آٹھ ضخیم جلدوں میں، مفتی اعظم محمد شفیع دیوبندیؒ، یہ تفسیر اردو زبان کی مستند اور عام فہم اور مقبول عام وخاص تفسیر ہے۔

14- تفسیر معارف القرآن: علامہ محمد ادریس کاندھلویؒ

15- مقدمۃ تفسیر القرآن: محدث العصر مولانا یوسف بنّوریؒ

16- یتیمۃ القرآن فی مشکلات القرآن: محدث العصر علامہ محمد یوسف بنّوریؒ

17- رسالہ اسرار قرآنی: قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، یہ رسالہ اردو زبان میں ہے، آیات قبلہ کے اسرار پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع اسرار و مقاصد شریعت ہے۔

18- تقریرات متعلقۃ تفسیر قرآن: مولانا عبید اللہ سندھی دیوبندیؒ کی تقریر کا مجموعہ ہے اور ان کے بعض شاگردوں نے قلم بند کیا ہے۔

19- حاشیہ تفسیر مدارک: بعض علماء دیوبند

20- فوائد تفسیریۃ. مولانا احمد علی لاہوریؒ

21- ہدیۃ المہدیین فی تفسیر آیۃ خاتم النبیین: مولانا مفتی شفیع دیوبندیؒ

22- عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اس کتاب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ آیات کی تفصیلی شرح کی گئی ہے اور بلند پایہ علمی فوائد ومعارف پر مشتمل ہے۔

23- مقدمہ تفسیر القرآن: عربی زبان میں، مولانا محمد مولانا سالم دیوبندیؒ

24- خاتم النبیین: امام العصر الشیخ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، یہ علمی وتحقیقی کتاب آیۃ خاتم النبیین کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہے۔

25- درس تفسیر قرآن: اردو زبان میں، مولانا حسین علی تلمیذ حضرت گنگوہیؒ

26- معالم العرفان فی دروس القرآن: مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، یہ تفسیر اردو زبان میں ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

27- ضرورۃ القرآن: مولانا زاہد الحسینی تلمیذ حضرت حسین احمد مدنیؒ

28- اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

29- آداب القرآن: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

30- التحریر فی اصول التفسیر: مولانا محمد مالک کاندھلوی ابن الشیخ العلامۃ محمد ادریس کاندھلویؒ

31- منازل العرفان فی علوم القرآن: مولانا مالک کاندھلویؒ

32- قصص القرآن: چار جلدوں میں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تلمیذ امام العصر الشیخ علامہ انور شاہ کشمیریؒ

33- اردو ترجمہ تفسیر الجلالین: مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ

34- اردو ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل: حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ

35- اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر: حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ، ترجمہ نہایت عام فہم اور سادہ اسلوب میں ہے۔

36- درس قرآن مع اردو ترجمہ: مولانا عبد الحی فاروقی فاضل دیوبندؒ

37- تاریخ القرآن: عربی زبان میں، مولانا عبد الصمد صارم فاضل دیوبندؒ کی کتاب ہے۔

38- درس قرآن: حافظ الحدیث والقرآن مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت درخواستیؒ کا یہ تفسیر قرآن کا درس انتہائی نادر علمی وتفسیری فوائد ونکات پر مشتمل ہے۔

39- ارض القرآن: علامہ سید سلیمان ندویؒ

40- کشف الرحمٰن: مولانا احمد سعید دہلویؒ، اس تفسیر پر مقدمہ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کا ہے

41- معارف القرآن: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ

42- تعلیم القرآن: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ

43- لغات القرآن: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ

44- تذکرۃ المفسرین: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ

45- علوم القرآن: علامہ شمس الحق افغانیؒ

46- احکام القرآن: علامہ شمس الحق افغانیؒ

47- مفردات القرآن: علامہ شمس الحق افغانیؒ

48- مشکلات القرآن: علامہ شمس الحق افغانیؒ

49- شرح تفسیر البیضاوی: علامہ محمد ادریس کاندھلویؒ

50- ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن: علامہ سرفراز خان صفدرؒ

51- احسن البیان فیما یتعلق بالقرآن: علامہ اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ

52- مرآۃ التفسیر: علامہ اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ

53- مقدمہ تفسیر البیضاوی: علامہ اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ

54- حاشیہ تفسیر جلالین: عربی میں، مولانا احتشام الحق کاندھلویؒ

55- لغات القرآن: علامہ عبدالرشید نعمانیؒ

56- انوار القرآن: علامہ محمد نعیم دیوبندیؒ

57- روح القرآن: شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ

58- اردو ترجمہ تفسیر ابن عباس: علامہ عبدالرحمٰن کاندھلویؒ

59- تدوین القرآن: علامہ مناظر حسن گیلانیؒ

60- تفسیر القرآن: علامہ شائق احمد عثمانیؒ

61- فیض الرحمٰن: علامہ یعقوب الرحمٰن عثمانیؒ

62- مفتاح القرآن: علامہ شبیر از ہر میرٹھیؒ

63- جواہر التفاسیر: علامہ عبدالحکیم لکھنویؒ

64- درس القرآن: علامہ اخلاق احمد دیوبندیؒ

65- غایۃ البرہان فی تاویل القرآن: علامہ سید حکیم حسنؒ

66- علوم القرآن: علامہ عبیداللہ قاسمیؒ

67- فہم القرآن: علامہ سعید احمد قاسمیؒ

68- الروض النضیر شرح الفوز الکبیر: علامہ حنیف گنگوہیؒ

69- الفوز العظیم شرح الفوز الکبیر: علامہ خورشید انور فیض آبادیؒ

70- معالم التنزیل: علامہ محمد علی صدیقی کاندھلویؒ

71- مرشد الحیران الی فہم القرآن: علامہ محمد طاہرؒ

72- العرفان فی اصول القرآن: علامہ محمد طاہرؒ

73- البرہان فی اصول القرآن: علامہ محمد طاہرؒ

74- نیل السائرین فی طبقات المفسرین: علامہ محمد طاہرؒ

75- سمط الدرر فی ربط الآیات والسور: علامہ محمد طاہرؒ

76- مقدمہ تفسیر القرآن: علامہ محمد سالم دیوبندیؒ

77- احکام القرآن: علامہ عبدالعزیز ہزارویؒ

78- تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن: علامہ عبدالقادر جامی ہزارویؒ
79- عمدۃ الفکر فی تفسیر سورۃ العصر: علامہ عبدالقادر جامی ہزارویؒ
80- تفسیر جوار القرآن: علامہ غلام اللہ خانؒ
81- اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر: علامہ انظر شاہ کشمیریؒ
82- البیان فی علوم القرآن: علامہ ممتاز علی دیوبندیؒ
83- تفسیر القرآن: علامہ حبیب احمد کیرانویؒ
84- تفصیل البیان فی علوم القرآن: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
85- دلائل القرآن علیٰ مسائل النعمان: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
86- احسن الاثاث فی النظر الثانی فی التفسیر المقامات الثلاث: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
87- آداب القرآن: حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
88- شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن پر حاشیہ: علامہ احمد علی لاہوریؒ
89- آیات محکمات: علامہ الحکیم علاء الدین الصدیقیؒ، تلمیذ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
90- تفسیر الحاوی علی البیضاوی: علامہ جمیل احمدؒ

امت کی موجودہ پستی کا سبب قرآن کریم سے دوری

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے قرآن پاک سے دوری کے سبب ہی امت مسلمہ اقوام عالم کی نظروں میں بے وقعت ہوگئی۔ نتیجہ کے طور پر فلسطین، چیچنیا، عراق، افغانستان، میانمار، شام، مصر اور پاکستان میں ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے خون کا پیاسا ہے اور چہار جانب قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ اس انتشار کا واحد

علاج قرآن کی بنیادوں پر متحد ہونا ہے، یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس کے ذریعے اُمت مسلمہ اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرا سکتی ہے۔

قرآن پاک کی ہدایت حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اُن باتوں کو تسلیم کیا جائے جن کو قرآن نے بیان کیا ہے اور جس کی تشریح پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں صاف صاف لفظوں میں فرما دی ہے۔ یہ خطبہ مکمل طور پر انسانیت کے تحفظ کیلئے بہترین ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے:

’’تمام تعریفیں اللہ ہی کے واسطے ہیں ہم اس کی ہی حمد کرتے ہیں اسی سے ہی مدد مانگتے ہیں اور اپنے عمل کی خرابیوں سے توبہ کرتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسکا کوئی شریک نہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں‘‘

نسلِ انسانی میں نسلی تفاخر کے خاتمے کے بارے میں فرمایا:

لوگو سن لو! زمانۂ جاہلیت کے تمام رسم و رواج آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لوگو! تمہارا رب ایک، تمہارا باپ آدم ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی، پر کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کالے پر، کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری نہیں ہے۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو۔ تم سب پر ایک دوسرے کا خون، عزتیں اور مال حرام ہے، خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

زمانۂ جاہلیت کے تمام قوانین منسوخ کرتے ہوئے فرمایا: زمانۂ جاہلیت کے تمام جھگڑے اور قتل عام کو بند کیا جاتا ہے۔ پھر انسانیت کی تا قیامت ہدایت کیلئے بہت لاجواب حدیث بیان فرمائی جسے ہر مؤرخ نے نقل کیا۔

’’میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو

گے کبھی گمراہ نہ ہو گے ایک کتاب اللہ اور دوسری اس کے رسول کی سنت۔‘‘

اگر تم نے ان کو مضبوطی سے تھام لیا کبھی گمراہ نہ ہو گے۔اس کے بعد دین کی کاملیت کا اعلان ہوا جو کہ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳ میں ہے۔

اس تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو قرآن کے مطالعے سے، پیغمبر کے کردار سے اور صحابۂ کرامؓ کی زندگی سے سمجھا جائے۔

اے کاش! آج امت مسلمہ کو اس کا احساس ہو جاتا کہ قرآن مجید کی شکل میں روئے زمین پر سب سے بڑی نعمت جو اس کو دی گئی ہے، یہی کتاب عظیم ہے۔ع

اے کاش کہ ہو جاتی قرآں سے شناسائی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے مالٹا کی تنہائیوں میں غور وخوض کر کے اس بیمار ملت کے لیے جو دوا تجویز کی تھی اے کاش اس ملت نے اگر اس نصیحت پر عمل کیا ہوتا تو شاید آج حالات اتنے ناگفتہ بہ نہ ہوتے۔حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ اس سلسلے میں شیخ الہندؒ کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرا ان کے آپس کے اختلاف اور خانہ جنگی۔اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں گا کہ قرآن کریم کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے‘‘

آگے مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

’’حضرت شیخ الہندؒ نے جو باتیں فرمائی ہیں، اصل میں وہ دو نہیں ایک ہی ہے اس

لیے ہمارے اختلاف میں شدت اس وجہ سے ہوئی کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا، اس لیے کہ قرآن مرکز تھا اور جب وہ اس مرکز سے دور ہوتے چلے گئے تو ایک دوسرے سے بھی دور ہوتے چلے گئے‘‘۔

اصحاب رسولؐ کا قرآن سے شغف:

قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ اصحاب رسولؐ کو قرآن سے کس قدر شیفتگی تھی اور وہ قرآن سے کس حد تک متاثر تھے، اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ایک غزوہ میں حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دونوں کی باری باری پہرہ دینے کی ڈیوٹی تھی۔حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ رات کے پہلے حصے میں سو جائیں، میں پہرہ دوں گا۔ جب حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ نے پہرہ دیتے ہوئے دیکھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو انہوں نے نماز پڑھنی شروع کر دی، اتنے میں ایک مشرک آیا اور اس نے تیر مارا۔حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ نے نماز کے دوران ہی تیر کھینچ کر نکال دیا اور نماز میں مصروف رہے، مشرک نے دوسرا تیر مارا، حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، انہوں نے کھینچ کر تیر نکال دیا، مشرک نے تیسرا تیر مارا تو انہوں نے تیر نکالا، تلاوت ختم کی اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو جگایا۔حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے کہا، آپ نے مجھے پہلا تیر لگنے پر ہی جگا دیا ہوتا؟ فرمایا میں نماز میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، اس لیے میں نے سورت مکمل کیے بغیر نماز ختم کرنا مناسب نہ جانا، مگر جب دشمن نے بار بار تیر اندازی کی تو میں نے نماز ختم کر کے آپ کو جگا دیا۔اللہ کی قسم، اگر مجھے اندیشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جس جگہ پہرہ دینے کے لیے متعین فرمایا ہے، اسے خطرہ لاحق ہے تو میں سورت

پڑھتا ہی رہتا، یا یہ سورت مکمل ہو جاتی یا اسی میں میری جان چلی جاتی‘‘۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین قرآن شریف کو جلد جلد پڑھ ڈالنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتایا گیا کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ ان میں سے ایک رات میں دو یا تین بار قرآن پڑھ ڈالتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، ان لوگوں نے پڑھا، مگر نہ پڑھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات قیام فرماتے تھے اور اس میں البقرہ، آل عمران اور النساء سورتیں پڑھتے تھے۔ اگر اس میں خوش خبری ہوتی تو اللہ تعالیٰ سے اسے طلب کرتے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آیت پڑھتے جس میں ڈرایا گیا ہے تو اللہ سے اس کی پناہ مانگتے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے ایسے حسین وجمیل اور خوشرو نوجوان تھے کہ آنحضرتﷺ بھی ان کا تذکرہ کرتے تو فرماتے کہ:

’’مکے میں مصعب سے زیادہ کوئی حسین وخوش پوشاک اور پروردہ نعمت نہیں ہے‘‘

مدینہ منورہ کے حق پرستوں نے دربارِ نبوت میں درخواست بھیجی کہ ہماری تعلیم و تلقین پر کسی کو مامور فرمایا جائے، سرورِ کائنات نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ آپ کی نگاہ جوہر شناس نے اس خدمت کے لئے مصعب کو منتخب کیا اور چند زریں نصائح کے بعد انہیں مدینہ منورہ کی طرف بھیج دیا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہو کر تعلیمِ قرآن اور اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں جو بیش بہا خدمات انجام دیں اور جس حسن وخوبی کے ساتھ عقائد ومحاسنِ اسلام بیان کر کے مدینے کی فضا کو اسلام کے لئے ہموار کیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک پورا باب ہے اور اسلامی دعوت کی آئندہ مرکزی عمارت کے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آخری بات:

قرآن کریم انسانیت کے فوز وفلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے، قرآن کریم تحفظ حقوق انسانیت کا سب سے بڑا داعی ہے، امن عالم کا سب سے بڑا پیامبر ہے، اخوت و بھائی چارہ کا سب سے بڑا نقیب ہے، زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال ومیانہ روی کا سب سے بڑا مبلغ ہے، خیر وسعادت کا سب سے بڑا ترجمان ہے، تشدد ومنافرت اور ظلم واستحصال کا سب سے بڑا مخالف اور عدل وانصاف کا سب سے بڑا نگہبان ہے۔ رہتی دنیا تک انسانیت اس سے فیضیاب ہو کر سرخرو وکامران ہوتی رہے گی۔ اس لیے امت مسلمہ کو زندگی کے اسباب اختیار کرنا چاہئے اور وہ اسباب ہیں پروردگار عالم کے فرمان قرآن کریم اور رحمۃ للعالمین کی سنتوں کی اطاعت وپیروی۔ قرآن پر ایمان لانا، قرآن کا پڑھنا، قرآن کا سمجھنا، قرآن پر عمل کرنا اور قرآن کی تبلیغ کرنا ہی قرآن کریم کے بنیادی حقوق ہیں۔

مسابقۃ القرآن الکریم بھی یقیناً یہ ہمارے اسلاف اور علمائے ربانیین کی خدمت قرآن کے تسلسل کا ایک اہم حصہ ہے، جس کی بنیاد ہندوستان میں خادم القرآن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی دامت برکاتہم نے رکھی اور قرآن کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا، محبّ قرآن کریم جناب حضرت مولانا شاہد ناصری الحنفی بڑے خوش نصیب ہیں جنہوں نے اپنے اسلاف کی روایت کو مضبوطی سے تھاما ہے اور اللہ کے کلام کو دنیا تک پہنچانے کو انہوں نے اپنا وظیفۂ حیات بنالیا ہے۔ ان کی یہ جدوجہد قرآن کریم کی خدمت میں زندگی گزارنے والے اسلاف کی روحوں کے لئے حسین خراج عقیدت ہے۔

اس موقع پر میں مولانا موصوف کا بیحد ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا اور کچھ لکھنے کا حکم فرمایا۔ چونکہ میں گزشتہ ایک ماہ سے بیرون ملک کے سفر پر ہوں

اوراس سے پہلے ’’جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ‘‘ کی جامع مسجد ’’جامع الامام محمد قاسم النانوتوی‘‘ کی چھت کی ڈھلائی کے کاموں میں بیحد مصروف رہا۔الحمدللہ یہ کارعظیم اس کی توفیق سے ۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۳؍فروری ۲۰۱۴ء بروز اتوار مکمل ہوا۔اس کے بعد میں متحدہ عرب امارات گیا وہاں سے سلطنت عمان اور پھر دبئی واپسی ہوئی اوراس کے معاً بعد چونکہ عمرہ کا ارادہ تھا اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور حرمین کی زیارت کیلئے مورخہ ۲۸؍مارچ ۲۰۱۴ء کومکۃ المکرّمۃ پہنچا۔عمرہ سے فراغت کے بعد چندایام وہیں مقیم رہااور پھر اس وقت دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں ہوں۔

اس قدر مصروفیت میں کچھ لکھنا کتنا دشوار ہوتا ہےاس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں،تاہم محبّ گرامی مولانا شاہد ناصری الحنفی صاحب کا حکم تھااور یہ چندسطریں بے ترتیب سپرد قرطاس کردیا ہے،اس امید پر کہ اس کم مایہ کا خلوص تصور کرتے ہوئے قبول کیا جائے گا۔دوسری طرف مکہ مکرمہ سے مجھے ساؤتھ افریقہ کے سفر پر روانہ ہونا تھا،مگر مولانا ناصری صاحب کی محبت میرے عزم سفر پہ غالب آئی اور میں نے درمیان میں ہی اپنے آگے کا سفر ملتوی کرکے مولانا کے حکم کی تعمیل اور قرآن کریم کی نسبت پہ اس اہم پروگرام میں شرکت کواپنی خوش بختی تصور کیااور ۱۵؍اپریل ۲۰۱۴ء کو پروگرام میں شرکت کیلئے ہندوستان واپسی کا ارادہ کرلیا۔میں پورے خلوص ومحبت کے ساتھ آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ہمیں شرکت کا یہ خوبصورت موقع عنایت فرمایا اور عروس البلاد ممبئی میں اس تاریخی پروگرام کے انعقاد پر جناب مولانا شاہد ناصری الحنفی آرگنائزر مسابقۃ القرآن الکریم کو اپنے تمام رفقاء کے ساتھ ایک بار پھر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ محبّ قرآن جناب والا کی اس عظیم قرآنی خدمت اور شہر کے جملہ محبین ومخلصین اور معاونین کے مخلصانہ تعاون کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور وابستگان کتاب الٰہی کیلئے نافع اور مفید

بنائے،آمین۔اوراس موقع پر اس امت سے یہ آرزو کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ آپ اپنا رشتہ اللہ کی کتاب سے مکمل طور پر مربوط کرلیجئے،دنیا وآخرت کی ہرنعمت آپ کا استقبال کرے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بجی ہوئی تھی، محبت کی آبرو اُن سے
وہ اِس زمانے میں، اَگلے زمانے والے تھے
(کلیم عاجزؒ)

خطبہ افتتاحیہ

بموقع:	امیر شریعت سادس وجنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کی حیات وخدمات پر انٹرنیشنل سمینار
بمقام:	صابو صدیق ٹیکنیکل کالج ممبئی
بتاریخ:	۷؍ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۸؍جنوری ۲۰۱۶ء
زیر اہتمام:	جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ سپول، بہار ادارہ دعوۃ السنہ مہاراشٹر

الحمدللّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم.
أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب: ۴۰)" "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" (آل عمران: ۱۹) "اَنَا خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (ابو داؤد: ۲/۲۲۴)" امابعد!

ہندوستان کی سیکڑوں تحریکات کی آماجگاہ، تہذیب وثقافت کا پاسبان، صنعت وتجارت کی بین الاقوامی منڈی، مسلمانوں کا اولین میزبان، اسلامی روایات کا امین وشاہد، اسلاف واکابر کی توجہ کا مرکز، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی تیز وتند لہروں، ملک کی ہزاروں بیواؤں، یتیموں، مفلسوں اور کمزور ولاچار کی کفالت کا ذمہ دار، ہر ہندوستانی کے دلوں کی امنگوں کا محور اور مشرق ومغرب، شمال وجنوب ہر چہار جانب کی تازہ ہواؤں میں اپنی ناز بردار زلفوں کو لہرا کر بھارت کی سرزمین کو خوشبوؤں سے معطر کرنے والے تاریخی شہر عروس البلاد ممبئی میں منعقد ہونے والے اس عظیم الشان "انٹرنیشنل سمینار" میں آنے والی تمام محترم و معزز شخصیات کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں اور خوش آمدید پیش کرنے کو باعث فرحت و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ ہم اپنے تمام مہمانان کرام، حاضرین کے بھی بے حد ممنون ومشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت پر یہاں آنے کی زحمت گوارہ کی۔ بطور خاص مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ وناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، شیخ زکریا کے علوم ومعارف کے امین وپاسباں وامین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، خانوادۂ قاسمی کے ترجمان حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دار العلوم دیوبند وقف، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ماہر تعلیم جناب پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے اقلیتی لسانیات حکومت ہند نئی دہلی، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، الحاج عبدالستار یوسف شیخ صاحب فاؤنڈر سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، حضرت مولانا علی انور قاسمی چیئرمین الحسنات فاؤنڈیشن لندن، حضرت مولانا مفتی عباس بسم اللہ مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل وشیخ الحدیث جامعۃ القرأت کفلیتہ گجرات، حضرت قاری اسماعیل بسم اللہ بانی ومہتمم

جامعۃ القرأت کفلیتہ گجرات، حضرت مولانا مفتی ارشد فاروقی شیخ الحدیث دارالعلوم زکریا دیوبند، جناب ڈاکٹر ظہیر قاضی صدر انجمن اسلام ممبئی ودیگر علمائے کرام، دانشوران عظام و سامعین کا میں بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت سے نوازا۔

آپ حضرات جیسے پاسبان ملت کا استقبال کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا ہوں اور اپنے ہر دلعزیز دوست اور شریک فرحت وغم گرامی قدر حضرت مولانا محمد شاہد ناصری الحنفی ڈائریکٹر ادارہ دعوۃ السنہ و مدیر مسئول ماہنامہ مکہ میگزین کا تہہ دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے اس خاکسار کو اپنی رفاقت وتعاون سے آپ کے قدوم میمنت میں استقبال کے چند پھول نچھاور کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں اپنے رب کریم کی بارگاہ میں سربسجود ہوں کہ اس نے آپ حضرات کی خدمت کا شرف عظیم بخشا اور توفیق ارزانی فرمائی۔ سچ کہا ہے کسی نے:

اللہ اگر توفیق نہ دے بندے کے یہ بس کی بات نہیں

حضرات گرامی قدر!

آج ہم لوگ جس شخصیت کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، یوں تو وہ شخصیت ہمارے علمی اور ملی حلقے کے لیے محتاج تعارف نہیں، ملک وملت کے لیے ان کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں اور ان کی یہ بے نظیر قربانیاں ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔ انہوں نے ملت کی خدمت کے لیے جس ایثار وقربانی اور اخلاص و للّٰہیت کا ثبوت دیا ہے، اپنے آپ کو ملت کے غم میں جلایا اور پگھلایا ہے اور فقیرانہ زندگی گزار کر سب کچھ ملت کے نام پر کر دیا اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ایسے بے لوث اور مجاہدانہ زندگی گزارنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ آج کا یہ انٹرنیشنل اور تاریخی سمینار ان کی خدمات کا ادنیٰ سا اعتراف ہے، ہمیں امید ہے کہ ہمارا یہ سمینار اپنے بزرگوں

کی خدمات کے اعتراف کی روایات کو باقی رکھنے اور ان کی قربانیوں اور جہد مسلسل کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سمینار کا انعقاد کر کے ہم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے، بلکہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کا ہر عمل لوگوں پر قرض ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف کا یہ حق تھا کہ ان کی شخصیت پر سمینار کیا جائے اور ان کے نقوش کو محفوظ و منضبط کیا جائے۔ تاکہ بعد کے لوگوں کو اپنے آباواجداد کی خدمات پر ناز کرنے کا حق حاصل رہے اور یہ کہہ سکیں:

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلہم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

بزرگان محترم!

میں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ ہم نے اس سمینار کے لیے عروس البلاد ممبئی کا انتخاب کیوں کیا؟ آپ حضرات کے علم میں یہ بات ہوگی کہ حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کو دنیا دو حیثیتوں سے جانتی ہے۔ ایک امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے ناظم وامیر اور دوسرے ملت اسلامیہ ہند کے متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے طویل المدت تک جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز رہ کر بے مثال خدمات۔ ان کی یہ دونوں خدمات ان کی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں۔ میں اس وقت قصداً امارت شرعیہ کی خدمات پر اظہار خیال نہیں کروں گا۔ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی خدمات کی طرف اشارہ کرنا ضروری تصور کرتا ہوں تاکہ آپ حضرات پر یہ بات آشکارا ہو جائے کہ اس انتخاب میں کیا مناسبت ہے۔

داستاں ان کی زندگی کی
کچھ نہ کچھ یاد تو لائے گی

دراصل یہی وہ سرزمین ہے جو مسلم پرسنل لاء بورڈ کے حوالے سے ان کی خدمات کے آغاز کی گواہ ہے۔۱۹۷۲ء میں جب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا کنونشن ہوا تھا جس میں اس مؤقر ادارے کا بنیادی خاکہ پیش کیا گیا اور تجویز منظور ہوئی اور اس شہر کے پانچ لاکھ غیور مسلمانوں کی موجودگی میں اس حیات بخش پلیٹ فارم کا اعلان کیا گیا۔حضرت مولانا سید نظام الدینؒ اس وقت بھی ملت کے ان چند مؤقرین اور عباقرہ میں سے ایک تھے جنہوں نے ملت کو متحد کرنے اور دین وشریعت کے تحفظ کا حلف اٹھایا تھا اور اس سرزمین پر ہی اٹھایا تھا۔اس لیے ہم نے سوچا کہ اس نسل کو یہ بتایا جائے کہ اس نئی صبح کا آغاز یہیں سے ہوا تھا جس کی شفاف کرنوں سے آج بھی ۲۵ رکروڑ ہندوستانی مسلمان روشنی حاصل کررہے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے انشاءاللہ۔

مولانا مرحوم کے ہی الفاظ میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ:

کچھ لالہ وگل کی رنگت میں کچھ خاک نشیمن کی تہہ میں
جو کچھ بھی ہے باقی گلشن میں عنواں ہے میرے افسانوں کا

بزرگان ملت!

اس موقع پر ممبئی کی تاریخ اور یہاں کی ملت جو ماضی کی تاریخ سے وابستہ رہی ہے اس کا تذکرہ نہ کیا جائے تو تاریخ کے اوراق اور تحریریں ادھوری رہ جائیں گی۔ہم سب سے پہلے حضرت شیخ مخدوم علی بہائیؒ کا ذکر کرتے ہیں ،علماء گجرات کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ

شیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی گجرات کے سرمایہ ناز ہیں ،آپ کی ولادت 776 ہجری میں ہوئی ، یادایام کے مصنف علامہ حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ نے شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا وجود کہیں اور ہوا ہوتا تو ان کی سیرت پر کتنی کتابیں لکھی جاچکی ہوتیں

اور فخریہ لہجہ میں مؤرخین ان کی داستان کو دہراتے ،شیخ مہائمی کے مفصل حالات موجود نہیں ہیں تاہم ان کی چند اہم تصانیف کا ذکر ملتا ہے،جن میں تبصرۃ الرحمٰن ، تیسر المنان یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے،اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ قرآن مجید کی تمام آیات کو باہم مربوط کر کے ایسے دلنشیں طریقے سے بیان کیا ہے،جس کو پڑھ کر انسانی ذہنوں کے دریچے کھل جاتے ہیں،ان کی دوسری کتاب انعام الملک العلام ہے،حضرت کی وفات 835 ہجری میں ہوئی۔آپ کی ایک اور تصنیف تنویر الجنان ہے،اس نسخہ الف کے کاتب محمد فاضل ہیں،انہوں نے 1159 میں اس کا انتساخ کیا،کاتب نے دوسرے ورق پر ان تمام کتابوں کے نام کے مخففات،ان کے مصنفین کے نام کے ساتھ درج کئے ہیں،جن میں زیر نظر مخطوطہ کے حاشیہ میں اقتباسات اور تالیفات ہیں،تنویر الجنان، یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے، دیکھئے راقم الحروف کی کتاب ذکراً قائماً تذکرہ علماء گجرات صفحہ نمبر 24۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف بھی حضرت مہائمی کی ہیں۔ادلۃ التوحید،اجلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید، النورالازہر فی کشف سر القضاء والقدر،فصوص النعم فی شرح خصوص الحکم،الرتبۃ الرفیعہ، فی الجمع والتوفیق بین اسرار الحقیقۃ وانوار الشریعۃ ،امحاض النصیحہ ،مشرع الخصوص فی شرح الفصوص،زوارف اللطائف فی شرح عوارف المعارف، ترجمہ لمعات عراقی،مراۃ الحقائق ،اراۃ الدقائق شرح مراۃ الحقائق ،استجلاء البصر فی الردعلیٰ استقصاء النظر،الوجود شرح اسماء المعبود،فقہ مخدومی ،فتاوی مخدومیہ،رسالہ عجیبہ۔

(جامع مسجد بمبئی تاریخ کے آئینے میں صفحہ نمبر 5-4 مرتب محمد اشفاق قاضی)

جامع مسجد ممبئی اور کتب خانہ محمدیہ:

ممبئی کی ڈھائی سو سالہ قدیم تاریخ میں جامع مسجد ممبئی کی جو اہمیت ہے اسے ہندوستان کی ملی تاریخ کا روشن مینار کہا جاسکتا ہے۔

جامع مسجد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مفتی اشفاق قاسمی نے لکھا ہے:

جامع مسجد ممبئی کا سنہ تاسیس 1775 عیسوی ہے، مدرسہ محمدیہ کی بنیاد 1835 میں رکھی گئی اور کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جو 1903 میں باضابطہ طور پر قائم کیا گیا، یہ کتب خانہ بہت ہی اہمیت کا حامل اور بہت سے نادر و نایاب مخطوطات اور قدیم مطبوعات کا ذخیرہ ہے، بڑے بڑے اصحاب علم ومرتبت، مثلاً علامہ شبلی نعمانی، علامہ عبدالعزیز المیمنی، قاضی اطہر مبارکپوری رحمہم اللہ جیسی عظیم شخصیات نے اس سے کسب فیض کیا ہے، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے عظیم اداروں کے خطوط کتب خانہ کو موصول ہوئے ہیں، دہلی یونیورسٹی، مدینہ یونیورسٹی، اور کئی بڑے بڑے اداروں کے وفود اس سے استفادہ کے لئے آتے رہے ہیں، انفرادی طور پر تحقیق مخطوطات وغیرہ کے سلسلے میں خطوط ارسال کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے، اس کتب خانہ کی کتابیں یکجا کرنے، ان کو مرتب کرنے کا سہرا انیسویں صدی کے کوکنی عالم مولانا یوسف کھٹکھٹے صاحب کے سر ہے، موصوف نے فہرست کتاب خانہ مدرسہ محمدیہ کے نام سے کتب خانہ کی تمام ہی کتابوں کی فہرست بھی مرتب کی ہے، جو 1341 ہجری میں مطبع رحمانی واقع حجرہ محلہ بمبئی سے شائع ہوئی، پھر ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے کتب خانہ کے 188 اردو مخطوطات کا تعارف بھی 1956 میں تیار کیا تھا جو کئی مرتبہ شائع ہوا، 2011 میں جب جناب عبدالصمد ابن عبدالقدوس النذیر صاحب نے کتب خانہ کی عربی کتابوں کا تعارف خزانہ جامع موموبائی کے نام سے شائع کیا۔

قطب ممبئی مولانا عبدالعزیز بہاریؒ:

میں یہاں پر قطب ممبئی حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب براری رحمۃ اللہ علیہ کا نام لئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جو عروس البلاد ممبئی میں 1930 میں تشریف لائے اور علم دین

اور اصلاح امت کی شمع روشن کی، آپ کا اسم گرامی اصلی بابو جان تھا، آپ کے والد کا نام شیخ صمدانی تھا۔ خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر علم کے قدرداں تھے، چناں چہ انہوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم کی جانب توجہ دی، حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمود عالم رحمۃ اللہ علیہ انہی دنوں دیوبند سے فارغ ہوکر وطن آئے ہوئے تھے، شیخ صمدانی نے ان سے درخواست کی کہ وہ بابو جان کو دینی تعلیم دیں، مولانا محمود عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بابو جان کو محنتی اور ذہین دیکھ کر اپنی شاگردی میں لے لیا اور ابتدائی تعلیم دی، اس کے بعد اس وقت کے مشہور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں بھیجا جہاں بابو جان کی قابلیت اور اہلیت کو دیکھ کر سارے اساتذہ خوش ہوئے اور محبت کی نظر سے دیکھنے لگے اور بابو جان کا عرفی نام ختم کر کے عبد العزیز تجویز کر دیا، مدرسہ امدادیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ آئے اور وہاں سے سند حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ محدث عصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری، علامہ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری رحمہم اللہ وغیرہ آپ کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں، مولانا عبدالعزیز تینوں بڑے اداروں سے فارغ ہوکر وطن پہنچے تو والدین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اپنے دالان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، تین سال تک بغیر کسی معاوضہ وتنخواہ کے محض اخلاص وللّٰہیت کی بنیاد پر تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں۔ حضرت مولانا کی علمی صلاحیت کا دور دور تک شہرہ ہونے لگا، عام لوگ اپنے دینی مسائل کی گتھی سلجھانے کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں آنے لگے، انہی دنوں بہار کی قدیم دینی درس گاہ جامعہ عربیہ اشرف العلوم کنہواں سے آپ کو دعوت تدریس ملی جہاں چھ سالوں تک آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔

1930 میں ممبئی تشریف لے گئے چناں چہ جامع مسجد ممبئی کے مدرسہ محمدیہ میں صدر مدرس کے منصب جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس کے بعد نمازی منزل دوٹانکی میں دارالعلوم

امدادیہ کی بنیاد رکھی اور وہاں صدر مدرس اور مفتی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، مولانا ممبئی میں مفتی مہاراشٹرا اور مولانا بہاری کے لقب سے مشہور تھے، جمعیۃ علماء مہاراشٹر کی بنیاد بھی مولانا نے ہی رکھی تھی اور زندگی بھر اس کی خدمت کرتے رہے، مولانا نے علماء کے لئے ممبئی کی فضا ہموار کی، اس موقع پر جب جلالۃ الملک شاہ سعود خادم الحرمین الشریفین کی آمد ہوئی تو ان کی خدمت میں جمعیۃ علماء مہاراشٹر کی جانب سے آپ نے ہی خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، شاہ سعود اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی خدمت میں تمغہ اور تلوار پیش کرکے ان کی ہمت افزائی کی، آپ کے نام سے میرا روڈ ممبئی میں ایک مدرسہ دارالعلوم عزیزیہ قائم ہے، مولانا بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے سیتامڑھی ضلع میں واقع گاؤں برار جو آپ کا آبائی وطن ہے وہاں بھی ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ تعلیم الدین برار رکھا، مولانا کی وفات 1966 میں ضلع مظفرپور ادرائی بیشی نامی گاؤں میں ہوئی اور اپنے آبائی گاؤں برار میں مدفون ہوئے۔

(بحوالہ تذکرہ علماء بہار، مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی جلد نمبر 1 صفحہ نمبر 179-80)

یہی وہ حضرت مولانا عبدالعزیز بہاری ہیں جن کی دعوت پر سب سے پہلے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند غالباً 1937 کے اواخر یا 1938 کے اوائل میں ممبئی تشریف لے گئے اور دارالعلوم دیوبند اور اپنے اکابر واسلاف کے علوم ومعارف سے اہل ممبئی کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ عظیم اصلاح معاشرہ کی بنیاد رکھی اور خلق خدا کو اپنے فیض سے سیراب کیا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد وحدت امت کے داعی قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ملک میں 1972 یعنی مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کے بعد دوسری مرتبہ ایک بار پھر امت کو جوڑنے اور متحد کرنے کی تحریک چلائی تو اس کے لئے بھی

شاندار اتحاد ملت کنونشن منعقد کرکے اسی سرزمین سے وحدت امت کی آواز بلند کی۔

خصوصیت عروس البلاد:

شہر ممبئی کی خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس شہر کے غیور اور متمول مسلمانوں نے ہمیشہ ملک کے طول وعرض میں بسنے والے غریب، نادار مسلمانوں، سیکڑوں مساجد ومدارس اور ملی اداروں کی کفالت کا بھرپور فریضہ ماضی میں بھی انجام دیا اور آج بھی انجام دے رہے ہیں اور اسی کی برکت ہے کہ اللہ رب العالمین نے اس شہر کے مسلمانوں کو عزت وشرافت اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے دنیا میں مقبولیت اور شہرت عطا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے صدقے میں یہاں کی غیور قوم کو زندہ وسلامت رکھے اور ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔

اکابر کی خدمت میں ایک دیرینہ گزارش:

اس وقت میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور یہ زندہ احساس ہے۔ یہاں اکابرین ملت جمع ہیں۔ یہ گھڑی اس امت کے لیے احتساب کی گھڑی ہے، میں نے دنیا کے بیشتر ملکوں کا سفر کیا ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے نہ جانے کتنی تباہی وبربادی دیکھی ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ اس قوم اور اس ملت کو دشمنوں سے کم اور اپنوں سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ یہ باتیں ہمیں کہنے کی اس لیے جرأت ہو رہی ہے کہ ہمارے مخدوم گرامی قدر مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ وناظم ندوۃ العلما لکھنؤ، شیخ زکریاؒ کے علوم ومعارف کے پاسبان حضرت مولانا محمد شاہد سہارنپور، خانوادۂ قاسمی کے ترجمان حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، فقہ اسلامی کے رمز شناش حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، قدیم صالح اور جدید نافع کے سنگم عظیم دانشور جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب

جیسے سرپرستان اور ملت کی قدآور شخصیات یہاں تشریف فرما ہیں۔

آج عالمی تناظر سے الگ خود ہندوستانی تناظر میں اس ملت کو سیکڑوں چیلنج کا سامنا ہے۔ایک طرف اس ملک میں مدارس اور ملی اداروں کی بقاو تحفظ پر سوالیہ نشان ہے تو دوسری طرف اس قوم کو غربت وافلاس، جہالت و ناخواندگی نے نگل رکھا ہے۔کبھی پرسنل لاء کو چیلنج کیا جاتا ہے تو کبھی ہمارے وجود کو مشکوک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مسلسل گروہی اختلافات اس ملت کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔خودغرضی، نفس پرستی نے ہمیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ دن بہ دن اس ملک میں یہ ملت تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے کی طرح بکھرتی جارہی ہے۔اب ہماری قوم کا مستقبل ہم سے سوال کررہا ہے کہ کیا یہ ملت اسی طرح ٹوٹتی بکھرتی اور اپنوں کی نفسانفسی کا شکار ہوکر زوال پذیر ہوکر قوم پارینہ کا داستان بن جائے گی یا کوئی اٹھے گا اور اسے سہارا دے گا۔آپ حضرات اکابر کی سرپرستی وفرماں برداری پر ہمیں فخر ہے۔آپ کی قیادت یقیناً ہماری زندگی کی علامت ہے۔ تحفظ شریعت کی جدوجہد کے ساتھ بلکہ پہلے تحفظ وحدت ملت ہمارے لیے ضروری ہوگیا ہے۔اپنی ذات پر ملت کے مفادات کو ترجیح دینے کا سبب صاحب سمینار کی زندگی سے یقیناً ہمیں یہ سبق ملتا ہے۔ہمیں امید ہے اس پر ضرور سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

آخری بات:

آخر میں ایک بار پھر دل کی گہرائی سے اپنے آنے والے مہمانوں اور جملہ مخلصین ومحبین کا استقبال کرتا ہوں، اس مؤقر انٹرنیشنل سمینار کا افتتاح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور آپ کا دل کی گہرائی سے ممنون ومشکور ہوں کہ آپ حضرات نے موسم کی اس ناہمواری اور سخت سردی کے باوجود سفر کی زحمت گوارہ کی اور ہماری دعوت پر تشریف لائے اور حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کے تئیں اپنی محبت ویگانگت کا ثبوت فراہم کیا۔آپ کی آمد نے ہمارے لڑکھڑاتے

ہوئے قدموں کو سہارا دیا ہے۔ہم آپ کی صحت اور درازئ عمر کے لیے دعا گو ہیں۔اللہ تبارک و تعالیٰ آپ حضرات کا سایہ عاطفت تادیر اس امت پر قائم ودائم رکھے۔آمین

اس موقع پر شہر ممبئی کے اپنے تمام مخلصین ومحبین اور معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا قیمتی تعاون دیا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور ہمارے یہاں آنے اور کہنے سننے کو حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کے لیے، جناب ایڈوکیٹ عبدالرحیم قریشی صاحبؒ جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے ہم لوگ اب ان کی خدمت سے محروم ہوگئے، جن کا انتقال مؤرخہ 14 جنوری 2016 کو ہوگیا، ان کی رحلت بھی ملت کے لئے کسی عظیم سانحہ سے کم نہیں ہے، ان کے لئے بھی اور ہم سب کے مخدوم شہر ممبئی کی لاج حضرت مولانا سید شوکت علی نظیرؒ امام وخطیب جامع مسجد ممبئی جن کی شخصیت سے نہ صرف اس شہر بلکہ پوری ملت کو فائدہ پہنچا، ان کے لئے بھی اور ہمارے محترم ومخلص معاون ملت جناب حاجی عبدالرزاق کالسیکرؒ جو رصاصی کے نام سے مشہور تھے، الحمد ٹرسٹ کے بانی کے لئے بطور ایصال ثواب قبول فرمائے۔آمین یارب العالمین

و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

رب کعبہ مجھے معاف کردے

ہر خطا پہ شرمسار ہوں میں
اے خدایا گناہ گار ہوں میں

جان کر بھول کر جو کیا ہے
ہے پتہ مجھ کو اس کی سزا ہے

تیری چوکھٹ پہ سر نہ جھکایا
بس زمانے کو اپنا بنایا

تیری رحمت ہی تو آسرا ہے
تجھ سے کہنے کو کچھ نہ بچا ہے

میرے سجدوں پہ ایسی نظر کر
میں اندھیروں میں ہوں تو سحر کر

ان دعاوں میں ایسا اثر دے
رب کعبہ مجھے معاف کردے

نیکیوں سے مجھے جوڑ دے تو
پھر میرا رخ ادھر موڑ دے تو

ایسا رستہ مجھے تو دکھا
ہرخطا پہ شرمسار ہوں میں
اے خدایا گناہ گار ہوں میں

میرے سجدوں پہ ایسی نظر کر
میں اندھیروں میں ہوں تو سحر کر
ماوں سے ہے بڑھ کے پیار تیرا
اور تیرے سوا کون میرا

گر نہ جاوں مجھے تو اٹھا
ہر خطا پہ شرمسار ہوں میں
اے خدایا گناہ گار ہوں میں

جان کر بھول کر جو کیا ہے
ہے پتہ مجھ کواس کی سزا ہے

میرے سجدوں پہ ایسی نظر کر
میں اندھیروں میں ہوں تو سحر کر
اے خدایا گناہ گار ہوں میں
جان کر بھول کر جو کیا ہے

ہے پتہ مجھ کو اس کی سزا ہے
تیری چوکھٹ پہ سر نہ جھکایا
بس زمانے کو اپنا بنایا
تیری رحمت توبس آسرا ہے

تجھ سے کہنے کو کچھ نہ بچا ہے
میرے سجدوں پہ ایسی نظر کر
میں اندھیروں میں ہوں تو سحر کر
ان دعاوں میں ایسا اثر دے
رب کعبہ مجھے معاف کر دے

هندونیپال کی سرحد پر رشد وہدایت اور تعلیم وتبلیغ کی عظیم درس گاہ

جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ

کے خوبصورت مناظر

رواق امام محمد الیاس الکاندھلویؒ

جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ (تعمیراتی کام تکمیل کے مرحلہ میں)

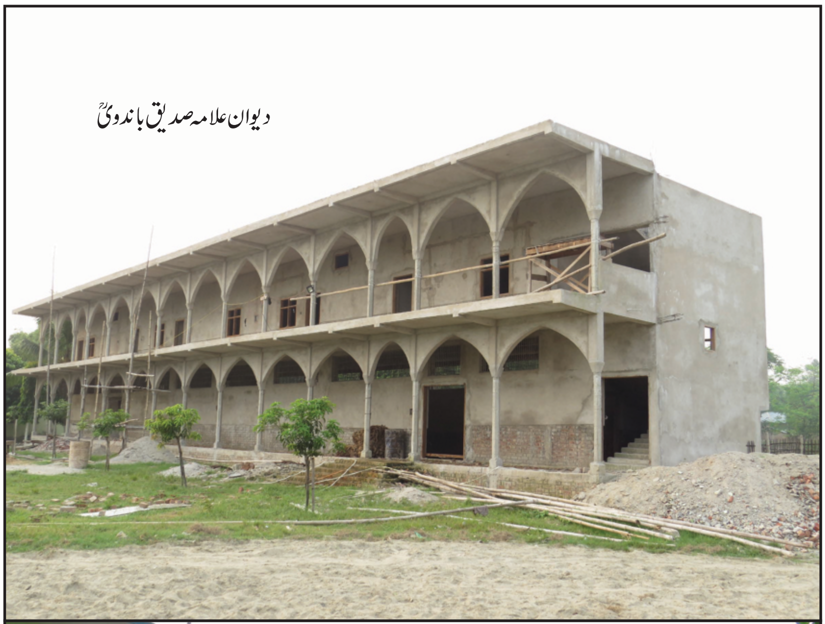

دیوان علامہ صدیق باندویؒ

رواق امام محمد الیاس الکاندھلویؒ

مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

جامعہ عائشہ الصدیقہؓ للبنات

مرکز الامام ابی الحسن علی حسنی ندویؒ الاسلامی

دوسو بیڈ پر مشتمل الامام المحدث محمد زکریا کاندھلویؒ چیری ٹیبل ہاسپٹل ونرسنگ کالج

’’القاسم اسلامک یونیورسٹی‘‘ کے مجوزہ تعمیری منصوبے کی جھلکیاں

انسان کالج • انجینئرنگ کالج • امام الہند مولانا آزادؒ سینئر سکنڈری اسکول وٹیکنیکل سینٹر

ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ

مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیة
Zakir kureshi
Arch. Consultant / Interior Designer

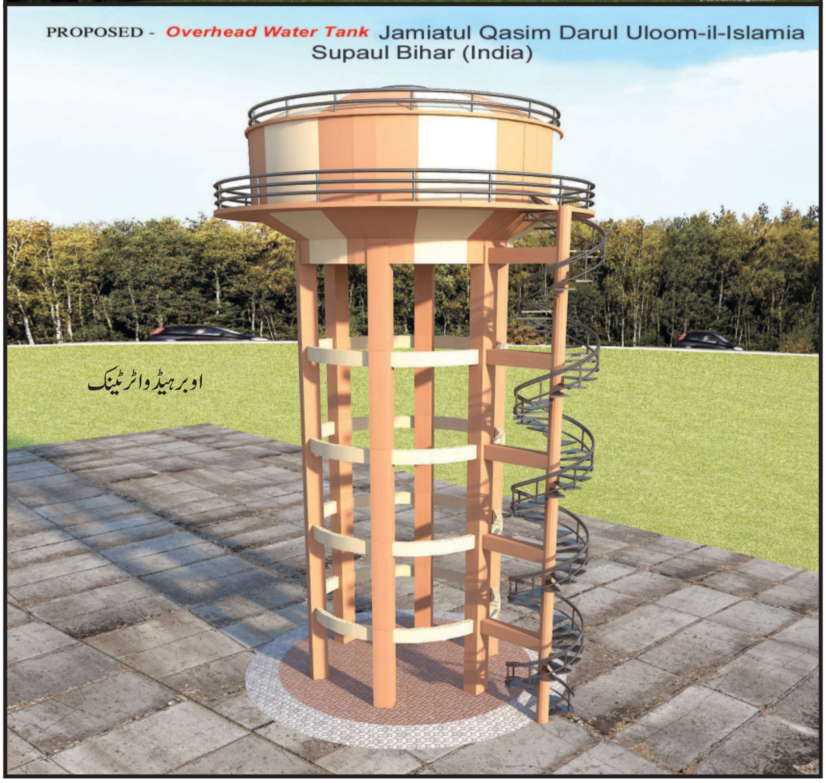
PROPOSED - Overhead Water Tank Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia
Supaul Bihar (India)
اوورہیڈ واٹر ٹینک

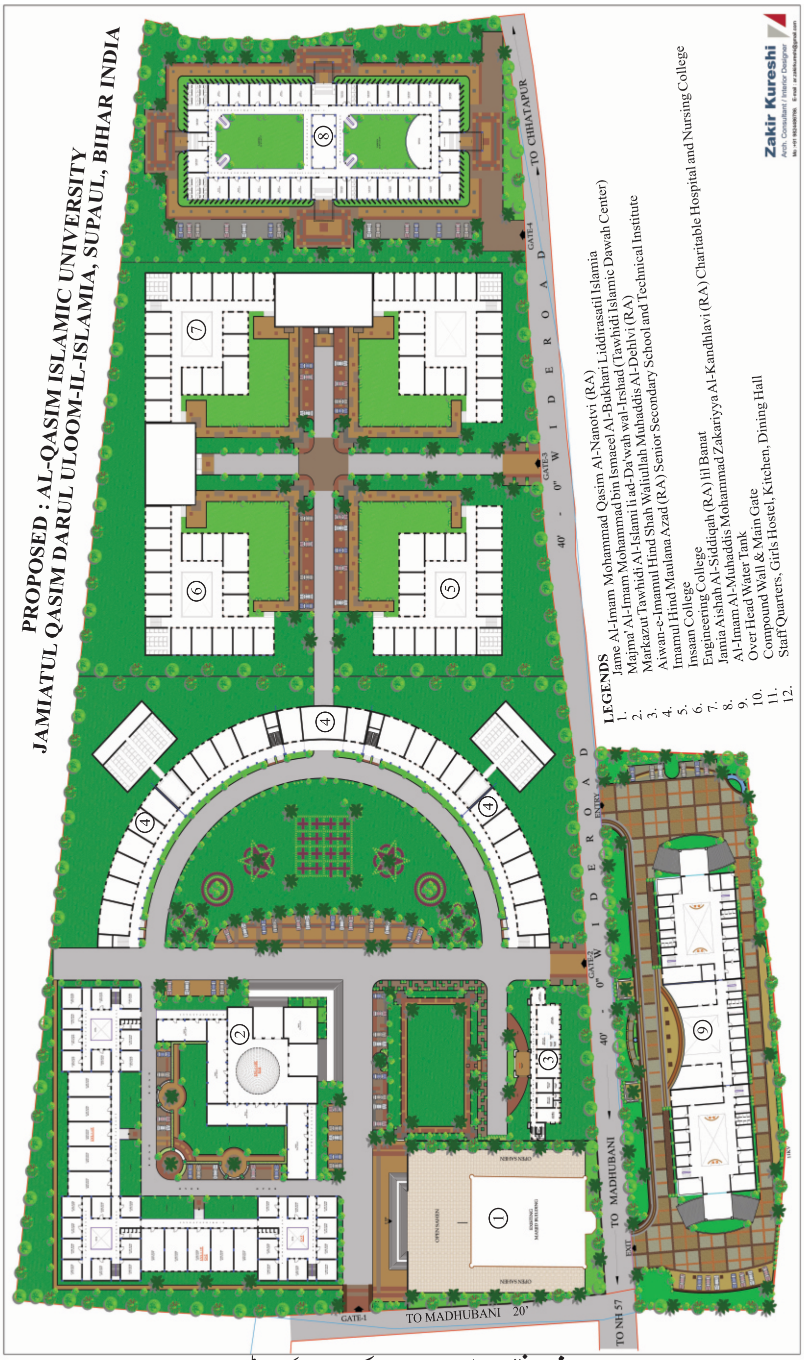

مجوزہ نقشہ: القاسم اسلامک یونیورسٹی

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور ''القاسم اسلامک یونیورسٹی'' کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو بہی خواہان ملت اسلامیہ، صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہٗ کا پاک ارشاد ہے:

''جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے'' (الکہف: ۳۰، ترجمہ: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ ''ترجمان القرآن'')

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia

At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:

K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002